سچی کہانیاں، آپ بیتیاں، جگ بیتیاں

ماہنامہ سرگزشت کراچی

عید مبارک

نومبر 2012

نگران اعلیٰ

معراج رسول

حکیم وقت: اس صاحب قلم کا زندگی نامہ جس نے علم کے دریا بہائے

معذور مسیحا: وہ نہ ہل سکتا ہے نہ بول سکتا پھر بھی نامور سائنسداں ہے

اندھیرے اجالے: دلوں کے تار پر جھنکار بن جانے والی سچ بیانی

سرگزشت
اٹارنی جنرل
ادارہ
ایک صفحے میں مکمل ایک نادر روزگار کا تعارف خاص

گفت وشنید
شہرِ خیال
آپ کی باتیں، آپ کے مشورے اور آپ کے سوال

شخصیات
حکیمِ وقت
ڈاکٹر ساجد امجد
زندگی میں انقلاب برپا کرنے والے اہلِ قلم کا زندگی نامہ

تذکرہ خاص
معذور مسیحا
ریاظ احمد
معذوری کی انتہا پر پہنچ کر بھی وہ سائنس میں نئی جہت تلاش کر رہا ہے

گیت سنگیت
باغی
ابن کبیر
وہ باغی بن کر بغاوت کے گیت گاتا تھا

جہاں نما
آذری کا دیس
عبدالغفار راجپوت
پڑوس کے ایک مسلم ملک کا مختصر سا جائزہ جہاں اخلاق کی فراوانی ہے

جنگل کتھا
جہدِ زندگی
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
وہ جنگل کی دشواریوں میں آسانیاں پیدا کر رہی تھی

فلم وصحافت
فلمی الف لیلہ
علی سفیان آفاقی
فلم وصحافت کی کہی ان کہی باتیں، بھولی بسری یادیں

شکار کتھا
لور بوائے
ابراہیم جمالی
سندر بن میں کھیلے گئے شکار کا احوال شکاریات پڑھنے والوں کی مدارات

معلومات
خطِ نستعلیق
محمد ایاز راہی
فنِ تحریر سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اس ملک کا تحفہ خاص

پراسرار
پُراسرار گلاب
عفان آزاد
اس انوکھے گلاب کے پودے تلے ایسی کیا خاص بات تھی

کھیل
جادوگر
صائمہ اقبال
وہ کھیل کے میدان میں پہنچتے ہی کمالات دکھانا شروع کر دیتا تھا

حیرت انگیز
ناقابلِ یقین
امیمہ سلیم
ایسے حیرت انگیز واقعات بہت کم رونما ہوتے ہیں

معاشرت
سراب
کاشف زبیر
مثبت ولولوں سے گندھی تہلکہ خیز داستان، لہو گرم کرنے والی تحریر

پہلی سچ بیانی
اندھیرے اجالے
زرینہ
اس کی زندگی میں اندھیرا تھا مگر بیوی کے آنے سے کیسا اجالا پھیل گیا

دوسری سچ بیانی
ردّی والا
شین فرحت خان
ایک باعمل ردّی فروش کی حیرت انگیز روداد

تیسری سچ بیانی
لغزش
ڈاکٹر ممتاز عمر
اس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ ایسا ہوگا

چوتھی سچ بیانی
آسیب
ارشد محمود
بیوی کے شوہر کی تصویر اس کے لیے وبالِ جان بن گئی

پانچویں سچ بیانی
انصاف
گلناز
وہ عورت تھی اس لیے پولیس والوں نے عجب انداز سے تفتیش کی

چھٹی سچ بیانی
انسان
سلطان احمد
دو روٹی کی خاطر انسان کیسے کیسے سوانگ بھرتا ہے

ساتویں سچ بیانی
سبق آزما
مبشر احمد
اس نے اپنا بچہ اسے سونپ دیا تھا

آٹھویں سچ بیانی
ترازو
محمد فصاحت انصاری
ان دونوں میاں بیوی میں کیسی ذہنی ہم آہنگی تھی

نویں سچ بیانی
سمجھوتا
شائستہ خاور
ایک عورت اور بدروح کی ایک ناقابلِ فہم کہانی

سوغات
پارچے
قارئین / ادارہ
دنیا بھر سے مختلف موضوعات پر معلومات انکشافاتی پارچے

ماہنامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوق طبع ونقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت ...
قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر ...
WWW.PAKSOCIETY.COM

جلد 23 ❖ شمارہ 01 ❖ نومبر 2012ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیرہ اعلیٰ : عذرا رسول

مصور: شاہد حسین

شعبۂ اشتہارات

منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789

نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391

رانا محمد حمید 0323-2895528

نمائندہ لاہور فراز علی نازش 0300-4214400

قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زرِ سالانہ 700 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقامِ اشاعت: C-63، فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ، کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200 Fax :35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

MEMBER APNS CPNE

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

اس وقت تمام اخبار و رسائل اور ٹی وی چینلز کا پسندیدہ موضوع ہے ملالہ...... ملالہ یوسف زئی کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کا ملال ہمیں بھی ہے۔ کچھ لوگ اسے مظلوم تو کچھ سازش کا حصہ قرار دے رہے ہیں۔ اس طرح سے ایک دوسرے سے الجھ رہے ہیں کہ جیسے اس صدی کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے...... اور ہم جیسے کم عقل محوِ حیرت ہیں کہ اس ایک نام پر سب نے مہنگائی، خون ریزی یہاں تک کہ آقائے نامدار کے نام کے ساتھ ہونے والی گستاخی کو بھی بھلا دیا۔ اگر بغور دیکھیں تو سمجھ آجائے گی کہ عالمی پیمانے پر ایک بہت بڑی سازش ہے جس کے نتائج دس بیس سال بعد ظاہر ہوں گے اور خدانخواستہ انتہا سے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ غور کریں، یکایک مشرق سے مغرب تک جتنے بھی مسلمان ممالک ہیں سب میں انتہا پسندی عروج پر نظر آنے لگی ہے۔ دہشت گردی کو زندگی کا معمول بنا دیا گیا ہے اور ان کارروائیوں کی خوب خوب تشہیر بھی کی جا رہی ہے۔ تاکہ دیگر اقوام کی نظروں میں مسلمان ایک جارح، ظالم، تشدد پسند قوم قرار پا جائے۔ لیبیا میں جس طرح خون ریزی کی گئی، شام میں متحارب گروپ ایک دوسرے کو قتل کر کے لاشوں کی نمائش کر رہے ہیں یا پھر شام اور ترکی کو آپس میں لڑانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ یہ سب کیا ہے......؟ کہیں یہ ثابت کرنے کی کوشش تو نہیں ہے کہ رحمت اللعالمینؐ کے ماننے والے ظالمینِ عالم بن کر ابھر رہے ہیں اس لیے تمام اقوام مل کر ان کا احتساب کریں۔ وقت آگیا ہے کہ اب ان کی آنکھیں کھل جائیں ورنہ بقول محسن احسان

کیسے کیسے لوگ مستقبل کی تدبیروں میں تھے
اور ہم سے بے خبر خوابوں کی تعبیروں میں تھے

معراج رسول

اٹارنی جنرل

سرگزشت

1923ء میں برہان پور بھارت میں پیدا ہونے والے بچے کے بارے میں کسے خبر تھی کہ ایک دن یہ بچہ ایک نئی مملکت کے قیام اور استحکام میں نمایاں کردار ادا کرے گا۔ دیگر بچوں کی طرح اسے بھی ابتدائی تعلیم گھر میں دی گئی پھر اسے شہر کے سب سے معتبر تعلیمی ادارے رابرٹ سن اسکول میں داخل کرایا گیا۔ وہیں سے اس نے میٹرک کی سند حاصل کی پھر مزید تعلیم کے لیے بمبئی بھیج دیا گیا۔ یوں بھی صوبہ گجرات، سندھ و مہاراشٹر کے چھوٹے بڑے شہروں کے لوگ حصولِ روزگار اور تعلیم کے لیے بمبئی کو ترجیح دیتے تھے۔ اسی لیے اسے بمبئی بھیجا گیا تھا۔ یہاں کی یونیورسٹی سے اس نے ایل ایل بی کیا پھر مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے ولایت چلا گیا۔ اس نے داخلے کے لیے لنکنز اِن کو ترجیح دی تھی۔ یہیں سے اس نے بیرسٹری کی تعلیم حاصل کی اور پھر بمبئی لوٹ آیا۔ ابتدائی ایام سے ہی اسے سیاست سے دلچسپی تھی اور یہی دلچسپی اسے عزت و شہرت کا حامل بنا رہی تھی۔ اب لوگ اسے احترام سے مخاطب کرنے لگے تھے۔ اسے عزت دینے لگے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ہند میں مسلمانوں کے ساتھ متعصبانہ برتاؤ کیا جاتا ہے۔ انہیں اُچھوت کے برابر لانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اس برتاؤ کے وہ خود بھی شکار ہو چکے تھے اس لیے وہ مسلم لیگ کے قریب آتے جا رہے تھے۔ ان کی سرگرمیوں کا محور اور مقصود تحریک پاکستان تھا۔ وہ زور و شور سے کوشاں تھے کہ کسی بھی طرح مسلمانوں کو ان کا حق مل جائے۔ ایک الگ وطن حاصل ہو جائے۔ ان کی دلچسپی کو قائداعظم نے بھی محسوس کر لیا تھا اور انہیں اپنا سیکریٹری مقرر کر لیا تھا۔ انہیں صحافت سے بھی دلچسپی تھی اور گاہے بہ گاہے اخبارات میں مضامین بھی تحریر کرتے رہتے تھے۔ بمبئی سے شائع ہونے والے روزنامہ "مارننگ ہیرالڈ" کے منیجنگ ڈائریکٹر بھی رہے، پھر جب ان کے خواب کو تعبیر ملی اور مسلمانانِ ہند کا مطالبہ مان لیا گیا۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان وجود میں آگیا تو وہ بھی پاکستان منتقل ہو گئے۔ 1948ء میں انہیں پہلی مرتبہ پاکستان کا اٹارنی جنرل منتخب کیا گیا وہ اس عہدے پر 1958ء تک رہے۔ اس تقرری سے ملک کو بھی فائدہ پہنچا۔ جب جناب آئی آئی چندریگر کا انتقال ہو گیا تو ان کو کمپنی لا کمیشن کا چیئرمین بھی مقرر کر دیا گیا، پھر دریاؤں سے متعلق بین الاقوامی کمیٹی اور انٹرنیشنل لا کمیشن کی مجلس انتظامیہ کا رکن بھی مقرر کر دیا گیا۔ انٹرنیشنل لا ایسوسی ایشن کی پاکستانی شاخ اور قانونی امداد کی سوسائٹی کے صدر بھی رہے۔ کئی بین الاقوامی قانونی اجتماعات اور کانفرنسوں میں پاکستان کی نمائندگی بھی کی۔ 1964ء میں دوبارہ پاکستان کے اٹارنی جنرل مقرر کر دیے گئے۔ جولائی 1966ء تا مارچ 1968ء وہ پاکستان کے وزیر خارجہ بھی رہے۔ 1977ء میں چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے قانونی مشیر اور وفاقی وزیر مامور ہوئے۔ 1979ء میں قانون اور پارلیمانی امور کے وزیر بنے۔ بیت المقدس کے مسئلے پر 1967ء میں قرارداد پیش کرنے والے کی حیثیت سے کافی شہرت حاصل کی تھی اور 1964ء میں ستارہ پاکستان کا اعزاز بھی حاصل کر چکے تھے۔ جنوری 1985ء تا 1988ء اسلامی کانفرنس کے سیکریٹری جنرل بھی رہے۔ 12 اکتوبر 1999ء کو چیف ایگزیکٹو کے مشیر مقرر ہوئے۔ لکھنے لکھانے سے خصوصی دلچسپی تھی۔ متعدد کتابیں بھی لکھ چکے تھے جن میں پاکستان ایٹ اے گلانس، جناح آف پاکستان، لیڈرز کارسپانڈنس ود جناح، ریوولیشن آف پاکستان، فنڈامنٹل رائٹس اینڈ کانسٹی ٹیوشنل ریمیڈیز آف پاکستان، پاکستان ریزولیشن اینڈ ہسٹارک لاہور سیشن، فاؤنڈیشن آف پاکستان (دو جلد) سم آسپکٹس آف قائداعظم لائف آور، کلیکٹڈ ورکس آف قائداعظم محمد علی جناح کافی مشہور ہوئی تھیں، آپ کا پورا نام شریف الدین پیرزادہ ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

شہرِ خیال

✉ اعجاز حسین منٹھار کا تجزیہ نور پور تھل خوشاب سے ”پرچا ہاتھ میں آئے تو سب سے پہلے اپنا خط تلاش کر کے پڑھتا ہوں اس کے بعد دوسروں کے خیالات اور تبصروں پر نظر ڈالتا ہوں یوں بہت سی معلومات بھی حاصل ہو جاتی ہیں۔ علم دوست، میں ممتاز حسن مرحوم کے بارے میں تفصیل سے پڑھنے کو ملا ہے وہ لگن اور شوق میں اپنی مثال آپ تھے۔ لوگ خوش قسمت ہیں جو ایسے نادرِ روزگار شخصیت کے دائیں بائیں رہے اور ان کی عادات اپنائیں ہمیں ایسے پاکستانیوں پر فخر ہے۔ وقت کی بچت کرتے ہوئے ہم اپنے پسندیدہ سلسلے ”فلمی الف لیلہ“ کی طرف جا نکلے۔ کل کی بات ہے کہ ہم نے اسے ایک مضمون سمجھتے ہوئے پڑھا لیکن یہ جتنا طویل ہوتا گیا، چسکے اتنے بڑھتے گئے، ہزار ہا معلومات سے مستفید ہوئے اور گھر بیٹھے کسی حد تک فلم بینی، اداکاروں، گلوکاروں اور مصنفین سے ملاقات کا شوق پورا ہوا اور سچی بات ہے پورا پورا لطف لیا اور داد تو محترم بھائی علی سفیان آفاقی کے ذہن کی دینی چاہیے کہ کس ذمے داری سے معلومات فراہم کر رہے ہیں کبھی بھولے ہیں نہ تھکے ہیں۔ ہمیں اتنی صحت مند تفریح دینے پر ان کے لیے درازیِ عمر کی دعا کرتے رہتے ہیں۔ اس بار انہوں نے رنگیلا اور عمر شریف سے متعلق جو معلومات دی ہیں قابلِ قدر ہیں اور نایاب تصاویر کے لیے بھی ان کے شکر گزار ہیں۔ ”قاتل“ دراصل اعتراف ہے بلکہ اسے انٹرویو کے کھاتے میں بھی ڈالا جا سکتا ہے۔ کوئی ماہرِ نفسیات، قانون دان یا صحافی حتمی رائے قائم نہیں کر سکتا کہ ایک نازک دل، خوش مزاج اور ہنستے مسکراتے انسان کو کیا ہو جاتا ہے کہ وہ وحشی بن جاتا ہے۔ مختلف اوقات میں مختلف محرکات فرض کر لیے جاتے ہیں۔ کئی ایسے نازک مزاج دیکھے ہیں جو انگلی سے خون بہتا نہیں دیکھ سکتے لیکن ایسا وقت آیا کہ اسی کمزور دل انسان نے دشمنوں کو قتل کیا۔ آج صبح جیو ٹی وی پر خبر چل رہی تھی کہ دشمن کے پانچ مردوں کو اغوا کر کے قتل کر دیا وجۂ عناد یہ تھی کہ ملزموں کے سات افراد قتل کر دیئے گئے تھے پھر قانون بھی تو ایسا ہے کہ یہاں انصاف نہیں ملتا۔ ”سراب“ پڑھتے ہوئے قاری کو اپنے تاثرات کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے کیونکہ جیسے جیسے صورتِ حال بدلتی ہے، سانس کا اتار چڑھاؤ جاری رہتا ہے یہاں مار دھاڑ، دھما کے اور گردن مروڑ نا روز مرہ کا معمول ہے لیکن ہم ڈھلتی عمر کے ساتھ کمزور دل ہو گئے ہیں یہاں جیسا حال شہلا کا لکھا ہے یہ کام انسانی شکل میں پھرتے درندوں کا ہے۔ یہ جسم کا پوسٹ مارٹم ڈاکٹروں سے بڑھ کر کرتے ہیں بلکہ قصابوں کو بھی کھلے عام مات دے رہے ہیں۔ شہلا کیسی مرد مار عورت تھی وہ بھی قتل و غارت اور چیر پھاڑ میں ماہر تھی لیکن ساری چالاکیاں دھری رہ گئیں اور ایسی اذیت تھی کہ جان دے دی۔ اللہ کسی مسلمان کو جہنم میں نہ لے جائے ورنہ انسانیت کی تذلیل کرنے والوں کا وہاں حال دیکھنے والا ہوگا۔ سچ بیانیوں میں سرورق کے رنگوں میں بامقصد اور شاہکار کہانی کا انتخاب کیا جاتا ہے لیکن کبھی نارمل انداز میں لکھی گئی اور عام واقعات پر مشتمل کہانی بھی شامل ہو جاتی ہے۔ ”خالی ہاتھ“ بھی اسی نوعیت کی کہانی ہے جس میں سنسنی خیز، تجسس اور دھما کا خیز موڑ کا فقدان ہے البتہ اندازِ تحریر، تسلسل اور ترتیب لاجواب ہے۔ دنیا کتنی وسیع ہے۔ دفتر، پارکوں اور یار دوستوں کی محفل میں کتنے ہنگامے اور رونق ہوتی ہے مگر جب گھر میں ٹی وی کی سہولت ہو اور مطالعہ کا چسکا لگ جائے تو تنہائی کا خیال ہی کب آتا ہے بلکہ خود تنہائی کے لیے الگ کونہ تلاش کیا جاتا ہے، دوسری بات یہ ہے کہ وہ خوش قسمت تھے جو زرینہ کے شر سے محفوظ رہ گئے۔ ”عورت ایک پہیلی“ کا اختتام پڑھ کر حیران بیٹھا ہوں، عظمیٰ ایک عورت تھی، بیوی تھی، خاوند کی پسندیدہ عورت تھی جو اپنے دکھ سکھ اسی سے شیئر کرتا تھا لیکن اس نے ہمدرد اور وفادار بیوی کا کیسا نقاب پہنا ہوا تھا کہ کوئی آنکھ شناخت نہ کر سکی اور وہ موقع ملتے ہی گھر کے سکون والے ماحول کو تلپٹ دکھا دیتی، کتنا خطرناک ذہن پایا تھا کہ اپنے والدین کی زیادتی کی سزا اپنے شوہر کو دیتی رہی، وہ جتنی کاہاں تھی زاہدہ اس سے بڑھ کر بے وقوف تھی جو ازدواجی زندگی کو داؤ پر لگائے رہی اور برباد ہونے سے بال بال بچی۔ بھلا ایک شریف مرد ایسی عیاری کا کہاں تک مقابلہ کر سکتا ہے۔ ”تجربہ“ کا دی تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ چرب زبان تھا اب اسی ہنر کو کام میں لا کر مال بنا رہا ہے۔ کافی دلچسپ کہانی ہے۔ ”شریف غنڈا“ جیسے کردار گاؤں اور قصبوں میں عام طور پر پائے جاتے ہیں حالات ایسے بن جاتے ہیں کہ دھونس دھاندلی قائم رکھنا مجبوری بن جاتا ہے۔ ”پہلا شو“ کی منا شانے سوکھے تنکوں کو خود آگ

دکھائی جس میں خود بھی جل گئی۔ اسے کام مل گیا تھا جھوٹا پیار جتانے کی ضرورت ہی کیا تھی یوں اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچی اور رقابت میں اس حد تک چلی گئی کہ دو انسانوں کی جان لے لی۔ ابھی پڑھنے کو کافی کچھ موجود ہے لیکن خط لیٹ ہونے کے ڈر سے اتنا ہی پڑھ سکا ہوں۔

✉ از سعید احمد چاند کا فکر نامہ کراچی سے ”معراج رسول صاحب اپنے اداریہ میں حکمرانوں کو کتنا بھی جھنجوڑ ڈالیں مگر ان کے کانوں پر جوں رینگنے والی نہیں۔ ویسے وہ دعوے تو کرتے ہیں کہ آئندہ الیکشن میں بھی عوام ہمیں منتخب کرے گی مگر یہ ان کی خام خیالی ہے۔ اس سے تو مشرف صاحب کا دور بہت اچھا تھا۔ نہ اتنی مہنگائی تھی اور نہ اتنی لوڈ شیڈنگ، لوگ کہتے تھے کہ اگر مشرف چلا گیا تو پھر دھما کے نہیں ہوں گے اور نہ ٹارگٹ کلنگ ہوگی۔ مگر اب کیا ہو رہا ہے؟ روزانہ آٹھ دس آدمیوں کو ٹھکانے لگا دیا جاتا ہے اور قاتل کو نہیں پکڑا جاتا۔ کوئٹہ اور پشاور کے علاوہ بھی دھما کے ہوتے رہتے ہیں مگر کوئی پُرسانِ حال نہیں۔ پٹرول پر آئے دن پیسے بڑھتے رہتے ہیں مگر یہ لوگ خوابِ خرگوش سے نہیں جاگتے۔ پاکستان کو بنانے میں ہمارے بزرگوں نے قربانیاں دیں آج پاکستان کا شیرازہ بکھرتے دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ اللہ ہی رحم کرے اس ملک پر، یک صفحی سرگزشت میں نقی محمد کی سرگزشت پڑھی۔ ان کے متعلق جان کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ اب آتے ہیں تبصروں کی طرف۔ اختر صبا، خالد یوسفی، رانا فیصل جاوید، تفسیر عباس، احمد خان توحیدی، رانا محمد شاہد، اعجاز حسین ستھار، حکیم سید محمد رضا شاہ، سدرہ بانو کے طویل تبصرے پسند آئے۔ مختصر تبصروں میں ابن مقبول، جاوید احمد صدیقی، ڈاکٹر محمد اے ملک، محمد اسماعیل اجاگر، معراج الدین بن یحییٰ نے بھی خوب لکھا۔ ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی بھائی صاحب ذرا جلدی خط پوسٹ کر دیا کریں، آپ تو پرانے لکھنے والوں میں سے ہیں، پھر بھی اتنی تاخیر؟ پرانے قارئین میں سے ایم اے خالق بھٹی، مہوش رفیق، غلام یاسین نوناری، رانا حبیب الرحمٰن، رانا محمد سجاد، راجا ثاقب نواز ثاقب، پروین چوہدری، شبانہ حنیف، عبدالرؤف عدم، ڈاکٹر تہذیب الحسن ملتان، رخسانہ انجم عظیمی، اریشہ غزل، ڈاکٹر روبینہ نفیس بھی غیر حاضر تھیں۔ مہوش رفیق کی شہرِ خیال میں آمد بہار کے تازہ ہوا کے جھونکے کے مانند محسوس ہوئی، ہم نے سوچا چلو یہ ڈاکٹر روبینہ نفیس کی کمی شاید پوری کر دیں گی۔ میں غیر حاضر ہونے والے قارئین کے نام اس لیے لکھتا ہوں کہ کچھ تو ان سے انسیت ہو گئی اور کچھ اس وجہ سے کہ سرگزشت کی اشاعت بڑھے۔ اس دفعہ بیت بازی میں منظر علی خان لاہور، واصف علی مظفر گڑھ، محمد انیس دریا پار بھکر، محمد سعید قاسمی ڈلوالی، اکبر حسین کوٹ سیداں، منظر فہیم لاہور، نجمہ اسفندیار ہری پور، مرزا فرحان بیگ حیدر آباد، تنویر رفیق کراچی، نسرین صدف کراچی، ایم افضل کھرل عظیم والا نکانہ صاحب کے شعر پسند آئے۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ ڈاکٹر ساجد امجد کا ”روح مناظر“ اے۔ آر راجپوت کی ”خونخوار عورتیں“ سید عدنان ذاکر علی کا ”سفیر موسیقی“ صائمہ اقبال کا ”شہنشاہِ جرم“ اور سچ بیانیوں میں جمیلہ یوسف کا ”انسان“ خوشبو کا ”گلاب“ ظفری کا ”وہمی“ راحیلہ منصور کا ”مہمان“ شکیلا فرقان علی کا ”وعدہ“ ڈاکٹر احمد صدیقی کی ”لغزش“ پسند آئیں۔ آفاقی صاحب کی ”فلمی الف لیلہ“ اور کاشف زبیر کا ”سراب“ حسبِ معمول اچھی جا رہی ہیں۔

✉ طاہرہ گلزار کی آمد پشاور سے ”اور دوستو! میرا خط سرگزشت میں تیسرے نمبر پر اور اتنی تفصیل کے ساتھ شائع ہوا۔ مجھے میرے چھوٹے سے بھائی عمیر آف کوٹلہ نے میسج کر کے کہا کہ باجی آپ کا خط اتنی تفصیل کے ساتھ شائع ہوا کہ میں پڑھتے پڑھتے تھک گیا۔ انکل میں بہت خوش ہوئی یقین نہیں آ رہا کہ واقعی یہ تبصرہ میں نے لکھا ہے۔ میں بھی تفسیر عباس بھائی اور دوسرے دوستوں سے اتنا سیکھ چکی ہوں، اتنی قابل ہو گئی ہوں کہ میرے قلم سے بھی اتنے گوہر نایاب نکل سکتے ہیں۔ سدرہ بانو کی کہانی ”خالی ہاتھ“ کی زرینہ کو بتانا چاہ رہی تھی کہ میں آپ سے زیادہ خوب صورت ہوں۔ کونے میں ہمیں پاکستان کی پیدائش کا سال بتا کر انکل نے یہ جتایا ہے کہ تفسیر بھائی اب بوڑھے ہو گئے ہیں اس لیے اس بار ہمیں اپنے منفرد اور دلچسپ تبصرے سے محروم رکھا۔ تفسیر بھائی یہ اچھی بات نہیں ہے اور ٹائٹل پر انکل نے آپ کو سگریٹ پیتے ہوئے دکھایا ہے۔ یہ اس سے بھی بری بات ہے اور قیمت 60 روپے کے ساتھ کونے میں انڈیا کو جلتے بھنتے دکھایا گیا کہ ہمارے یہی فائٹل میں پہنچنے پر جل گئے ہیں۔ اس بار تو سب دوست تمام لکھنے والوں کی تاریخ درست کرنے پر تلے ہوئے نظر آئے۔ اچھی بات ہے بس کسی کی دل آزاری نہ ہو کہ یہ آپ کی کم علمی اور میری علمی برتری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کسی کو تعلیمی برتری عطا کی ہے کسی کو ہنرمندی عطا کی ہے، کسی کو ایسا دماغ عطا کیا ہے کہ کمپیوٹر کی طرح ہر مسئلے کا حل سوچتا ہے، کوئی انکل معراج اور آنٹی عذرا جیسی تحریر کار ہوتے ہیں تو کوئی ذاکر انکل جیسے شاہکار تخلیق کرنے والے۔ لیکن بہت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہم ایسے نایاب ہیروں کی حفاظت نہیں کرتے۔ اس ملک کا ہر نوجوان قدیر خان اور ڈاکٹر عطاء الرحمٰن اور عبدالسلام جیسے بن سکتے ہیں۔ کتنے ہی نوجوان جاوید میانداد، عامر سہیل، وقار یونس، شعیب اختر، شاہد آفریدی اور شعیب ملک بن سکتے ہیں۔ اگر ہم ان کو حسد، کینہ اور گندی سیاست سے نکال کے صرف ایک کھلاڑی کی حیثیت سے کھیلنے دیں۔ انکل میں سرگزشت کے ذریعے کرکٹ والوں سے التجا کرتی ہوں کہ خدا کے لیے شعیب ملک کو اپنی گندی سیاست کی وجہ سے خراب نہ کریں جو گراؤنڈ میں تین طرح کا فائدہ ٹیم کو دیتا ہے اور شعیب ملک سے بھی التجا ہے کہ پلیز اپنے کھیل پر بھرپور توجہ دو انکل میرے ملک کے جوانوں پر اللہ تعالیٰ کا بہت کرم ہے بس ان کو کوئی آپ جیسا، ستار ایدھی، انصار برنی اور زیڈ۔ اے بھٹو جیسے رہنما چاہیے۔ کیوں انکل کیا میرے ملک کے نوجوان آپ، کاشف زبیر، طاہر جاوید مغل اور محی الدین نواب نہیں بن سکتے؟ معاشرے کو یہ ادیب ہی سنوار سکتے ہیں۔ اب کہانیوں کی طرف آتی ہوں، میں پہل کچی داستانوں سے کرتی ہوں۔ اس لیے خطوط اور انکل کے اداریے کے بعد پہلی کہانی خالی ہاتھ پڑھی۔ دوسری کہانی عورت ایک پہیلی۔ چوتھی کہانی شریف غنڈا واقعی آج کے زمانے میں ایسے غنڈے کہاں ہیں جو محبت کرنے والوں کو ملا دیتے ہیں۔ جو کہتے ہیں کہ محبت تعلق کا نہیں جذبے کا نام ہے۔ کہانی نادیدہ عشق، سچ کہتے ہیں کہ دوسری مخلوق بھی وجود رکھتی ہے اور میں تو اس چیز کی گواہ ہوں۔ میرا ذاتی تجربہ ہے۔ کچھ حد تک میرے ساتھ بھی ہے۔ کہانی پہلا شو دل ہلا دینے والا واقعہ ہے۔“

✉ ناصر حسین رند کا بہاولپور سے تبصرہ ”کافی مہینے بعد خط لکھ رہے ہیں، سرگزشت پڑھ تو مسلسل رہے تھے لیکن شہرِ خیال میں شرکت سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

محروم رہے۔ یہ سرگزشت کی محبت تھی کہ ہر لمحہ ہر وقت ہر جگہ سرگزشت کی جانب توجہ رہی! وہ بھلا کیسے، یہ ہمارا خط پڑھنے کے بعد آپ کو محسوس ہوگا۔ اس خط میں چند مشورے اور تجویز پیش خدمت ہے، اور امید ہے توجہ دیں گے۔ 2012ء اپنے اختتام کو ہے، یہ سال اہلِ ادب پر بھاری رہا۔ کیسے کیسے منفرد ادیب اور نادر لوگ ہم سے بچھڑ گئے، اور کتنے حیران کن واقعات ہوئے، اس کی تفصیل مراسلے کی صورت میں اس خط کے بعد روانہ کردی جائے گی۔ انشاء اللہ۔ 2012ء رخصت ہوا اور 2015ء جنوری سرگزشت کی سلور جوبلی ہوگی، اس کو منفرد بنانے کی وجہ سے یہ خط لکھا جارہا ہے۔ سلور جوبلی نمبر ایسا نمبر ہو جو پچھلے تمام نمبروں کا ریکارڈ توڑ دے۔ (انشاء اللہ، آپ کی تجویز بورڈ کے سامنے رکھی جائے گی، خیال بہت اچھا ہے) آپ کے پاس صرف دو سال کا وقفہ ہے! اس لیے اس پر کام شروع کردیں۔ دو تین نمبروں کا سوچا، نمبر 1 سلور جوبلی نمبر جس میں ان لوگوں کی سرگزشت ہو، جن کے عروج کو دوسرا کوئی نہ پہنچ سکا۔ جیسے بادشاہت میں حضرت سلمان علیہ السلام، جنہوں نے جنوں، ہوا اور ہر چیز پر حکومت کی حکیم لقمان، سب سے بڑے حکیم حکمت والے انسان ان سے بڑا حکیم آج تک نہیں گزرا۔ شیکسپیئر، سب سے بڑا لکھاری الہامی کتابوں کی طرح پڑھا جانے والا ادیب دانشور۔ آئن اسٹائن، تاریخ کا مشہور ترین سائنس دان جس کی ایجادات کا شمار بہت زیادہ ہے۔ لیونارڈو ڈاونچی، دنیا کے عظیم ترین فن پارے ''مونا لیزا'' کا خالق، عظیم مصور لیلاوتی، علم الاعداد علم ہندسہ کی معراج کو پہنچنے والی ہستی جو ایک نگاہ ڈال کر بڑے سے بڑے درخت کے پھل اور پتوں کا شمار بتا دیتی تھی، علم ہندسہ کی ایک اعلیٰ اور عمدہ کتاب کی تخلیق کار اس کے علاوہ بے تحاشا لوگ ہیں اور اپنے کام میں معراج کو پہنچے جن کو سرگزشت تلاش کرے گا۔ نمبر 2 باہمت نمبر۔ جن لوگوں نے دنیا میں اپنی جسمانی معذوری کے باوجود اپنا مقام پیدا کیا۔ آج کے مشہور سائنس دان ''سٹیفن ہاکنگ'' جو اس وقت ایک گوشت کے لوتھڑے کی صورت اختیار کرچکے ہیں لیکن اس کے باوجود ہمت نہیں ہاری اور ایک ایسی نایاب کتاب تخلیق کی ہے جس نے پوری دنیا میں ایک ریکارڈ قائم کیا ہے۔ شیخ یاسین، حماس کے سربراہ جو کہ غالباً نابینا تھے۔ جن کو اسرائیل سیکرٹ سروس موساد نے شہید کردیا۔ 3۔ ہمارے کاشف زبیر صاحب، سرگزشت کے زبردست لکھاری اس کے علاوہ دنیا اور پاکستان میں بے شمار لوگ ہیں جن پر لکھا جاسکتا ہے۔ ہمارے شہرِ خیال کے ساتھی سعید احمد چاند صاحب نے نمبر کے شمارے میں فرمایا کہ عشق ناکام نمبر میں ڈاکٹر ساجد امجد صاحب سیمسن ڈیلائلہ پر لکھتے۔ تو جناب یہاں پر ہم عرض کرتے چلیں کہ سیمسن اینڈ ڈیلائلہ کوئی عاشقانہ کردار نہ تھا۔ وہ بنی اسرائیل کے ایک انتہائی طاقت ور پیغمبر تھے جنہیں ہم حضرت شمعون علیہ السلام اور اہلِ مغرب سیمسن کہتے ہیں۔ ویسے اس پر بھی ایک نمبر سرگزشت کا نکل سکتا ہے۔ جیسے ہرکولیس! دیومالائی کردار، تارزن جیسا افسانوی کردار پر تحقیق کی جائے یہ کیسے وجود میں آیا۔ قدیم عراق سے مٹی کی بارہ تختیوں پر ملنے والی ''گل گامش'' کی داستان جو نہ صرف اب تک معلوم تاریخ کے حوالے سے انسان کا پہلا ادبی شاہکار ہے، بلکہ یہی وہ داستان ہے جو ہزاروں برس قبل مسیح جنوب مغربی ایشیائی زبانوں میں ترجمہ ہوئی۔ ہمارے ہاں یہ داستان 60 کی دہائی میں ترجمہ ہوئی جسے سید سبط حسن جیسے لکھاری نے لکھا۔ محترم پرویز بلگرامی کی شخصیت کے بارے میں روزنامہ ایکسپریس کے بڑے صفحے پر انٹرویو نظروں سے گزرا جس کی اس قدر خوشی ہوئی جو بیان سے باہر ہے اور ان کے خیالات سے آگاہی ہوئی اور وہ صفحہ کاٹ کر ہم نے اپنی فائل میں محفوظ کرلیا۔ اب آخر میں سرگزشت پر تھوڑا تبصرہ۔ ''ٹائم مشن'' جیسے لازوال ناول کے خالق کی ایک زبردست تحریر۔ سو سال پہلے کہی باتیں سچ ہورہی ہیں، دیویاں، ایک معلوماتی تحریر تھی۔ زرد پٹی اور نادیدہ عشق پُراسراریت نمبر کے سلسلے کی کڑی تھی۔ جو پسند آئی۔ کافی مہینوں بعد سہیل احمد عباسی صاحب آئے، ان کے ہمارے ویب اور ہماری مادری زبان کی تعریف ہم پر فرض ہے۔ آپ سے نوے کی دہائی کا تعلق ہے۔

✉ معراج الدین کا خلوص نامہ مردان سے ''اداریے میں معراج رسول صاحب حالات کی ترجمانی کا فریضہ انجام دیتے نظر آئے۔ اہلِ وطن کو ہر طرف سے غموں نے گھیرا ہوا ہے۔ گیارہ ستمبر کے پُرآشوب حادثے سے ہم ابھی سنبھلے نہیں تھے کہ اہلِ کفر نے ہمارے ایمان پر وار کیا۔ جس سے ہر صاحبِ ایمان کا دل پارہ پارہ ہوگیا۔ لیکن ہمارے سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ اپنے ہی مسلمان بھائیوں کو مار کر ان کے املاک کو جلا کر اور تباہ کرکے ہم نے کیا حاصل کیا۔ مردان میں GPGC مردان کی قیمتی لائبریری جلادی گئی، عام لوگوں کی گاڑیاں جلادی گئیں۔ اس سے اہلِ کفر کا کیا بگڑا؟ کیا ہم پُرامن اور متحد ہوکر ان کو منہ توڑ جواب نہیں دے سکتے۔ یک صفحی سرگزشت میں پہلی بار ایک عظیم ریاضی دان اور ماہر طبیعیات سے متعارف ہوئے۔ ''شہرِ خیال'' میں تو اس بار ساتھیوں نے کمال کردکھایا۔ اتنے خوبصورت تبصرے۔ تو خیدی صاحب آپ جیسے بہترین مبصر سے میں اتنے بے ربط خط کی توقع نہیں تھی۔ طاہرہ باجی نے اپنی غیر حاضری کا ازالہ ایک مفصل اور بہترین تبصرے سے کیا۔ لیکن مردوں کے بارے میں ان کے خیالات پڑھ کر تو ہمارے ہوش گم ہوگئے۔ ملک جاوید صاحب کا تبصرہ، اختر صبا کے تبصرا کتو بردونوں تبصرے اور رانا سجاد صاحب، تینوں کے تبصرے لاجواب تھے۔ مہوش باجی، آپ اضافی باتوں کے ساتھ سرگزشت کی تحریروں پر بھی اپنا اظہارِ خیال کیا کریں۔ سدرہ بانو جی! کا تبصرہ گویا کراچی کی ڈائری تھی۔ اللہ اہلِ کراچی سمیت تمام اہلِ وطن پر رحم کریں۔ عبدالسلام صاحب کو ہم خوش آمدید کہتے ہیں اور ان کے ''کامیاب عشق نمبر'' کی ہم بھی حمایت کرتے ہیں۔ علم دوست، انتہائی معلوماتی تحریر تھی۔ لیکن موت اور حیات بعد الموت، کے بارے میں اقبال کے خیالات جان کر ہمیں حیرت ہوئی کیونکہ وہ تو قرآن وحدیث سے ثابت ہے۔ گونگی، عجیب تحریر تھی۔ میرے خیال میں ایسا ممکن ہے کیونکہ انسان رہنے سہنے کا جو ڈھنگ دیکھتا ہے وہی اپناتا ہے ''پرواز'' میں ہربرٹ واقعی لاجواب تھا۔ Avatar جیسی فلمیں میرے خیال میں ان کے تخیلاتی ناولوں کے ماخوذات پر مبنی ہے۔ جال، سے ملتی جلتی جعل سازشی اور بلیک میلنگ کے طریقے تو ہمارے معاشرے میں بھی عام ہے۔ ایاز راہی نے تو دیویوں کے بارے میں تاریخ کے بخیے ادھیڑ دیے۔ اگر یہ تحریر کوئی تاریخ دان لکھتا تو شاید اسے پی ایچ ڈی کی ڈگری مل جاتی۔ ماشاء اللہ۔ رسالے کی قیمت بڑھانے کے بارے میں ہم ادارے سے متفق ہیں۔ اتنی مہنگائی میں اتنا خوبصورت، معلوماتی اور اتنا زیادہ صفحات والا رسالہ صرف 60 روپے میں فراہم کرنا، ادارے کی بے لوث علم دوستی کا مظہر ہے۔''

✉ ملک محمد جاوید سرکانی درانی کی چھچھ سے تشریف آوری ''بدنام زمانہ فلم کے خلاف جس بھونڈے اور مذموم طریقے سے احتجاج کیا گیا یہ انداز محبانِ رسولؐ کو زیب نہیں دیتا۔ ہادی عالم کی ناموس کے لیے ایسی بدتنگی اور تخریبی رویہ سراسر تعلیماتِ رسولؐ کے خلاف تو ہے ہی ساتھ میں بے نتیجہ عمل بھی ہے یہ کام عالمی سطح پر منظم طریقے سے کیے جانے کا ہے۔ اقوامِ عالم مل کر ایسی عالمی قانون سازی کا مطالبہ کریں کہ دنیا کی کسی بھی مذہبی شخصیت کی توہین کو ایک عالمی انسانی جرم قرار دے کر مجرم کو قرار واقعی سزا دلوائی جائے چاہے وہ شخصیت الہامی عقائد سے متعلق ہو یا غیر الہامی اور اس مطالبے کی زیادہ ذمے داری اقوام مسلم پر عائد ہوتی ہے کیونکہ اسلام ہی وہ واحد دین ہے جو احترام مسلم کے علاوہ احترام آدمیت کا درس بھی دیتا ہے اور مذہبی رواداری احترام آدمیت کا ارفع ترین درجہ ہے۔ احتجاج کے نام پر کیے گئے ان ہنگاموں سے کئی مجبور اور بیمار لوگوں کی زندگی اجیرن کی گئی۔ املاک کو قصداً نقصان پہنچایا گیا اور درجنوں افراد کی موت کا بھی سبب بنے۔ حدیث مبارک کا مفہوم ہے ''ایک انسان کا قتل ساری انسانیت کے قتل کے برابر ہے'' وہ لوگ خود ہی غور کریں جو ان انسانوں کی موت کا بلاواسطہ یا بالواسطہ سبب بنے۔ طاہرہ گلزار صاحبہ ہماری ادھوری حاضری کا آپ کو اتنا دکھ ہوا، ذرہ نوازی ہے آپ کی۔ یہ بھی معلوم ہو کہ درست لفظ مسالا ہوتا ہے۔ مسالا اور مصالحہ کے معنی کسی معیاری لغت میں دیکھ لیں۔ اختر صبا صاحب آپ نے ڈاکٹر روبی، جناب عبدالخالق بھٹی اور راجا ثاقب صاحب جیسے باکمال تبصرہ نگاروں کے ساتھ ساتھ اس ناچیز کو بھی اپنا قلمی پیشوا مانا یہ کسرِ نفسی ہے آپ کی ورنہ تھوڑی تعلیم والا بندہ ہوں۔ چنگیز کے والد کا صحیح نام یسوگائے بہادر ہے اور چنگیز کا اصل نام غوجن نہیں تموچین ہے اور لقب چنگیز قاآن ہے۔ ہمارے مورخین نے آسانی کے لیے قاآن کو خان اور مغرب والوں نے کین (کان) جیسے ہولاکو قاآن کو ہلاکو خان۔ رانا سجاد ہم نے تو کسی کا دل نہیں توڑا شاید تیزی میں آپ صحیح جملہ نہیں لکھ پائے بہرحال مہربانی ہے کہ یاد رکھا۔ طاہر الدین بیگ صاحب دلا بھٹی دوسری دفعہ 1958ء میں نہیں 1985ء میں بنائی گئی۔ عشق کامیاب نمبر کے تقاضے بڑھ رہے ہیں جس کے لیے کچھ نام یہ بھی ہوسکتے ہیں۔ چنگیز خان و بورتائی خاتون۔ جلال الدین اکبر اور جودھا بائی، نور جہاں، جہانگیر۔ ممتاز محل شاہ جہاں، اشفاق احمد اور بانو قدسیہ وغیرہ اگر عشق کے مفہوم کو وسیع کرکے دیکھیں تو ملک وملت اور اعلیٰ مقاصدِ زندگی سے عشق کرنے والی کئی مثالی اور قابلِ تقلید ہستیاں تاریخ عالم میں ملیں گی اور زندہ موجود بھی ہیں۔ دور جہان ساز انگیریزی مصنفین۔ ایچ جی ویلز اور میکیلن کے دلچسپ حالات زندگی پڑھنے کو ملے مغرب میں جنسیت سے پاک ناول لکھ کر اتنی مقبولیت حاصل کرنا میکیلن کے فنی کمال کا ثبوت ہے۔ اس کے ناول گنز آف نیوارون پر بنائی گئی فلم کئی دفعہ دیکھنے کے باوجود اب بھی دیکھنے کی خواہش ہے مگر جیمز بونڈ کی فلموں میں ایسی کوئی کشش نہیں حالانکہ نصف صدی سے بانڈ فلموں کا سلسلہ چل رہا ہے بلکہ اس سے بھی پہلے ٹی وی اور ریڈیو کے لیے بھی آئن فلیمنگ کے ناولوں کو اپنے اپنے انداز میں ڈھالا گیا۔ میکیلن نے ساری مقبولیت اپنے کمال سے حاصل کی جبکہ آئن فلیمنگ کے پشت پر پوری برطانوی قوم تھی میکیلن کو باوجود مقبولیت کے یہ تعاون حاصل نہیں تھا کیونکہ وہ ڈچ تھا۔ برطانوی قوم میں جہاں اور کئی کاریگریاں موجود ہیں وہاں اپنی ادنیٰ چیز کو منوانے کا فن بھی جانتی ہے۔ فلمی الف لیلہ میں آفاقی صاحب کا قلم پوری شان سے چلا ساتھ ہی استاد بڑے غلام علی خان اور کندن لال سہگل کی تصاویر نے بھی الگ ہی حسن پیدا کیا۔ مختار آزاد، صائمہ اقبال، ڈاکٹر عبدالرب بھٹی، طارق عزیز خان، اے آر راجپوت، اے ایس صدیقی، سید احتشام اور محمد ایاز راہی نے بھی پسندیدگی کا سامان فراہم کیا۔ یک صفحی سرگزشت تو شخصیات کی سوانح حیات کا عرق ہوتا ہے۔

✉ انجم فاروق ساحلی کا مکتوب لاہور سے ''ٹائٹل پر قیمت کے اضافے نے ایک جھٹکا دے دیا۔ یہ دوراب جھٹکوں کا ہی ہے، مہنگائی برابر جھٹکے دے رہی ہے۔ سابقہ ترتیب میں سرگزشت 17 یا 18 تاریخ کو مل جاتا تھا باقی پرچے بعد میں آتے تھے۔ اب ہمیں انتظار کی کوفت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ہمارے نزدیک پرانی ترتیب ہی ٹھیک تھی۔ (اب تو جو تاریخ مقرر ہوگئی اس سے مفر ممکن نہیں) خط کو اول نمبر پر شائع کرنے کا شکریہ، شہرِ خیال قارئین کی آرا اور خلوص سے سجا ہوا تھا۔ پروفیسر رضی الدین صدیقی واقعی اپنے کام سے زندہ وجاوید ہیں۔ فلمی الف لیلہ میں اس بار ابتدائی گفتگو متاثر کن تھی۔ ''پروازِ تخیل'' اور ''جنگجو لکھاری'' دونوں شخصیت نامے خوب تھے۔ نیوران کے جیالے بڑے سائز میں شاہکار کے تحت سید قاسم محمود نے شائع کیا تھا (اصل نام نیوران کی توپیں ہیں اسی نام سے فلم بھی بنی ہے) اثر نعمانی نے اسپیئر میکیلن کے جس ناول کا ترجمہ کیا وہ ''سونے کی چوری'' تھا۔ کامران پیرزادہ راولپنڈی والوں کی فہرست میں موجود ہے۔ ہم جو، دلچسپی سے بھرپور اچھی تحریر تھی۔ قاتل، جال اور موت کے قریب متاثر نہ کرسکیں۔ فساد بھی خوب تھی۔ زرد پٹی جدت کے لحاظ سے چونکا دینے والی تھی۔ سراب ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔ تجربہ آپ بیتی خوب تھی۔ گونگی معلوماتی تحریر ہے واقعاتی دلچسپی کم تھی۔ موت کے قریب آپ بیتی میں صفحہ نمبر 144 پر درج ہے۔ ''شیر بعض افراد سے زیادہ ذہین ہے'' جانور کا قابل جانوروں سے ہی موازنہ ہوتا ہے۔ جانوروں میں جبلت ہوتی ہے اور وہ ایک متعین ڈیوٹی سرانجام دیتے ہیں جبکہ انسان صاحبِ اختیار ہے اور ترقی میں آگے بڑھ رہا ہے۔ سرگزشت اپنی نوعیت میں منفرد ہے اور علمی تحقیقی تحریروں کا مرقع ہوتا ہے، اس لیے ہر طرح سے لائبریری کے قابل ہے۔ دوسری آپ بیتیوں میں شریف فنڈا اور خواہشات ناآسودہ، اچھی تحریریں تھیں۔''

✉ ڈاکٹر ایم اے مالک کا ای میل گلین وڈ، میری لینڈ امریکا سے ''میرے پچھلے خط میں جسے آپ نے شہرِ خیال میں جگہ دی، بتایا تھا کہ تمام جریدے بروقت موصول نہ ہونے کی وجہ سے تبصرے میں دیر ہوسکتی ہے۔ اس لیے اگلے ماہ کے شمارے میں اسے شامل کرلیں اس ماہ آپ کے تینوں میگزین نومبر کے آخر میں موصول ہوئے۔ میں ان تین تحریروں کے بارے میں کچھ کہنا چاہوں گا جو ابتدائی 82 صفحات پر آئے ہیں۔ روح مناظر از ڈاکٹر ساجد امجد۔ گستاخی معاف، میں کہنا چاہوں گا کہ ڈاکٹر صاحب ایسے مضامین تحریر کررہے ہیں جو عام دلچسپی کے نہیں ہوتے، یہ آسان بھی ہے کہ چند کتابیں پڑھ کر ایک مضمون تیار کردیا جائے۔ اس مضمون نے 26 صفحات کا احاطہ کیا لیکن بور ثابت ہوا۔ میں مسلسل دیکھ رہا ہوں کہ آپ کے کچھ رائٹرز بور مضامین لکھے

WWW.PAKSOCIETY.COM

جارہے ہیں۔ مثلاً اولاد چنگیز، از مختار آزاد، سھو گیان از ابن کبیر، انٹرنیٹ کے دور میں گوگل میں لاگ آن ہو کر معلومات جمع کی اور تحریر کی شکل دے دی گئی (ہم اپنے قارئین کی دلچسپی کو مدنظر رکھ کر شمارہ ترتیب دیتے ہیں ہمارے قارئین جو پڑھنا چاہتے ہیں وہی ہم پیش کرتے ہیں۔ معلومات کی ترسیل سرگزشت کا خاصہ ہے۔ انہی مضامین کو سب سے زیادہ پسند کیا گیا) 60 روپے قیمت ہونا ضروری ہے۔ اس میں شامل تحریریں ایک کتاب جتنی ہوتی ہیں جو تین چار سو روپے کے برابر ہے۔ اس لیے یہ اضافہ منصفانہ ہے۔"

✉ محسن علی موم کا ای میل "کافی عرصے بعد محفل میں حاضر ہوا ہوں، اس مرتبہ سرگزشت کافی لیٹ ملا اس لیے چند کہانیاں ہی پڑھ سکا ہوں۔ سراب ہمیشہ کی طرح خوب جارہی ہے۔ فلی الف لیلہ کی یہ قسط شاندار رہی۔ آفاقی صاحب سے گزارش ہے کہ ممتاز مفتی کے بارے میں بھی کچھ لکھیں۔ اولمپک پر غالباً پہلے بھی سرگزشت کے صفحات پر لکھا جاچکا ہے؟ باقی کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔ محفل میں تمام دوستوں کے تبصرے خوب تھے۔"

✉ نوید نقوی، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور سے رقم طراز ہیں "خداوند تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ محترم معراج رسول صاحب اور آپ کو صحت و تندرستی عنایت فرمائیں (آمین) تاکہ آپ اسی طرح ملک و قوم کی خدمت کرتے رہیں اور دعا گو ہوں کہ آپ کا ادارہ بھی دن دگنی رات چوگنی ترقی کرتا رہے۔ میں یہ دوسرا خط لکھ رہا ہوں اور پہلے خط میں لکھ چکا ہوں کہ نویں جماعت سے ہی سرگزشت کا قاری ہوں اور یقین مانیں اب جبکہ میں ایم ایس میڈیا اسٹڈیز دی اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور سے کر رہا ہوں اور ماسٹر تک پہنچ گیا ہوں لیکن جنرل نالج اور اردو کا استاد سرگزشت کو ہی سمجھتا ہوں (آپ کی محبت کا شکریہ) سرگزشت کی تمام تحریریں لاجواب ہوتی ہیں Specialy آفاقی صاحب کی فلی الف لیلہ معلومات سے بھرپور اور ادبی ہوتی ہے۔ سرگزشت کے توسط سے اپنے ہمسایہ عبدالخالق بھٹی صاحب کو سلام پیش کرتا ہوں کہ صحافت کے میدان میں ان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔"

✉ محمد عامر ساحل نے ڈیرہ اسماعیل خان سے لکھا ہے "کافی انتظار کے بعد آج 2 اکتوبر کو صبح 10 بجے نیوز اسٹال سے سرگزشت کا شمارہ ملا اور اس امید سے جلدی جلدی جائزہ لیا کہ میری آپ بیتی چھپی کہ نہیں جب شمارہ کھولا تو دیکھا تو میری آپ بیتی کا تو کہیں نام و نشان ہی نہیں اور تو اور پچھلے 2 ماہ سے میں خطوط لکھ رہا ہوں ان کا بھی جواب نہیں دیا۔ مجھے اپنی عشق کی آپ بیتی کے چھپنے کا بہت بے چینی سے انتظار ہے۔ پلیز آپ سے میری گزارش ہے کہ آپ جلد از جلد میری آپ بیتی چھاپ دیں اور میرے اس خط کا جواب بھی دیں یہ نہ ہو کہ پچھلے خطوط کی طرح یہ بھی ردی کی ٹوکری کی نظر ہو جائیں۔ شمارہ ابھی تک پڑھا نہیں ہے اگر پڑھا بھی ہوتا تو مجھے شمارے میں موجود کہانیوں پر تبصرہ کرنا بالکل نہیں آتا اور آپ میرے 2 سوالوں کے جواب لازماً اور ضرور ضرور دیں کہ 1 میری آپ بیتی کب چھپے گی اور 2۔ ہمارے شہر ڈیرہ اسماعیل خان میں آج کل سرگزشت شمارہ اتنی لیٹ کیوں پہنچتا ہے آج بھی 2 اکتوبر کو ملا۔ آخر مسئلہ کیا ہے اور آج شمارے کے سرورق پر موٹے حرف میں 60 لکھا تھا اور دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ 10 روپے شمارے پر بڑھ گئے چلو خیر ہے 60 کا کیا اس سے ڈبل ٹرپل بھی مہنگا ہو جائے تو ہم تو پھر بھی اپنے محبوب شمارے کو ضرور خریدیں گے۔ چاہے اس کے لیے تن کے کپڑے بھی نہ خریدیں مگر یہ شمارہ ضروری ہے کیونکہ اس طرح کا تاریخی سبق آموز واقعات اور سچ پر مبنی شمارہ اور کوئی نہیں کم از کم پاکستان میں تو کوئی نہیں ہے اور نہ کبھی ہو سکتا ہے۔ (آپ کی آپ بیتی سرگزشت کے مزاج کی نہیں ہے)

✉ بشریٰ افضل، بہاولپور سے لکھتی ہیں "ایک صلحی سرگزشت میں محسن ریاضی کو پڑھا، ہماری معلومات کے ذخیرے میں اچھا خاصا اضافہ ہوا۔ بے تابی سے شہرِ خیال کی محفل میں داخل ہوئے۔ کافی طویل غیر حاضری کے بعد اپنی محفل میں دستک دے رہے ہیں۔ کچھ مصروفیت نے ٹائم نہ دیا مگر سرگزشت ہم ضرور پڑھتے تھے۔ تھوڑی فرصت ملی ہے تو قلم سنبھال لیا کہ اب تو کافی نئے لوگ اس محفل میں آگئے ہیں انجم فاروقی ساحلی و کنڑی اسٹینڈ پر سنبھل کر کھڑے ہوں خوشی سے گر ہی نہ جائیں مبارک ہو جی۔ طاہرہ گلزار آپ نے بڑی خوبصورت باتیں کی ہیں جو حقیقت پر مبنی ہیں لکھنے کا انداز بھی دلبرانہ لگا۔ اب تو پشاور کو بھی دشمنوں کی نظر لگ چکی ہے۔ اللہ سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے (آمین) طاہر نے تفسیر صاحب کی خوب خبر لی ان کی زیادتی ہے کہ پانچ شادیاں کر ڈالیں۔ طاہر جی ہماری دنیا میں مرد کی اجارہ داری ہے تبھی تو عورتوں کی عزت نہیں کرتے۔ طاہرہ جی مجھ سے ہی دوستی کریں گی ضرور بتایئے۔ ہمیں دیکھ لیں لوگ ہمیں بھول چکے ہیں حالانکہ ان کی پرانی لکھاری ہوں۔ اب ان سب کو یاد آجاؤں گی میں تو اس محفل کو بہت انجوائے کرتی ہوں۔ اس محفل سے ایک سوال ہے کہ مجھے این جی او کے بارے میں مکمل معلومات درکار ہیں۔ این جی او میں کام کرنا چاہتی ہوں۔ میں لاعلم ہوں اگر کسی کو بتانا ہو تو ضرور بتائے (پاکستان بھر میں ٹن کے حساب سے این جی او ہے آپ اپنے مزاج کے اعتبار سے کسی ایک کا انتخاب کرلیں)

✉ رانا حبیب الرحمٰن کی گوجرہ سے تشریف آوری "آج کل وطنِ عزیز جن حالات سے دوچار ہے وہ ہم سب کے لیے دعوتِ فکر ہے کہ پاکستان کو ان مشکلات و مصائب سے کس طرح اور کیسے چھٹکارا حاصل ہو سکتا ہے۔ پاکستان جو ابھی ترقی کی راہ پر گامزن ہے بے شمار سیاسی و سماجی اور اقتصادی مسائل سے دوچار ہے خاص طور سے اب جبکہ ہمارا ایک بازو یعنی مشرقی پاکستان جو چند افراد کی غلطیوں اور ذاتی مفاد پرستی کی وجہ سے ہم سے علیحدہ ہو چکا ہے اور ساری قوم کو شرمندگی و ندامت کا سامنا کرنا پڑا۔ محبِ وطن عوام کو یہ دکھ سہنا پڑا، وہاں بہت سے ایسے پیچیدہ مسائل اور بہت سی مشکلات نے بھی ہمیں گھیر لیا۔ جو اسے ترقی کی راہوں پر لے جانے کے بجائے دوبارہ پستی کی جانب گامزن ہے اسی طرح غصے پر قابو پانے اور بدلہ لینے کی طاقت رکھتے ہوئے بھی دوسروں کی غلطیوں سے درگزر کرنا ہی تحمل ہے اور بردباری کا جوہر ہے بعض اوقات انسان دوسروں کی غلطیوں پر آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ حالانکہ وہ خود بھی ان غلطیوں کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ غور و فکر سے کام لے اور تحمل اور بردباری کو کام میں لائے تو اس

کے حق میں بہتر ہے، پاکستان میں آئے دن جو قتل و غارت، فتنہ و فساد رونما ہوتے ہیں اس کا سبب زیادہ تر یہی اشتعال ہے کہ نہایت معمولی بات پر انتقامی کارروائی کر بیٹھتا ہے۔ جس پر بعد میں اسے پریشانی بلکہ پشیمانی بھی ہوتی ہے۔ اسی طرح محض علم اور بردباری کو چھوڑ دینے کے باعث انتقام در انتقام کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس سے بے شمار جانیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ مقدمات کے چکر چلتے ہیں، دولت کا... زیاں ہوتا ہے۔ دونوں پارٹیاں عدالتوں میں انصاف کے لیے ذلیل و خوار ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل جرائم بڑھتے جارہے ہیں۔ یہ باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔ اب چلتے ہیں پرچے کی طرف سب سے پہلے شہرِ خیال میں پہنچے اور انجم فاروق کو کرسیِ صدارت پر براجمان پایا مختصر اور جامع تبصرے پر پہلی پوزیشن مبارک ہو۔ نمبر 2 پر احمد خان توحیدی صاحب جمعۃ الوداع کی بابرکت شام اور ہاکر کی سب سے پہلی بوہنی کروانے والے ٹھہرے واہ بھئی واہ۔ احمد توحیدی صاحب کہیں آپ روزے کے لیے کھجوریں لینے کے لیے قطار میں کھڑے تو نہیں ہوئے تھے طاہرہ گلزار صاحبہ بے وفائی آپ کر رہی ہیں جو وقت پر نہیں آئیں اور الزام دوسروں کو۔ خوشیوں پر اتنا خوش بھی نہ ہوں ہمارا پاکستان جو ہے نا یہ وہ پرانی والی سندھی تہذیب نہیں چھوڑ سکتا یعنی سندھ کے گوٹھوں میں زمینداروں کے قصے تو سب نے پڑھے سنے ہوں گے یہی حال ہمارے سیاستدانوں کا ہے۔ طاہر گلزار صاحبہ ایک بات آپ نے یاد کرادی بتاتا چلوں میں نے ماہنامہ میں خط، تبصرہ تحریریں دوست حاصل کرنے کے لیے شروع کیے تھے لیکن ایک سال میں بھی کسی نے دوستی کے لیے ہاں نہیں کی، ہم اتنے بھی برے نہیں ہیں خیر۔ طاہر صاحب تبصرہ چھوٹا لکھا کریں دوسروں کو بھی جگہ مل سکے۔ ملک جاوید صاحب کا تبصرہ کچھ تاریخی لگا۔ رانا محمد سجاد صاحب بھائی کیا حال ہیں شکریہ آپ نے تو یاد کرلیا۔ رانا محمد شاہد، مہوش رفیق، خالد یوسفی، سدرہ بانو ناگوری، طاہر الدین بیگ، ایم افضل کھرل کے تجزیے پسند آئے۔ میں نے کہانی جس کا نام قسمت کے کھیل بھیجی تھی اس کا کیا بنا، کیا ردی کی ٹوکری میں جگہ خالی رہ گئی تھی (جی ہاں، سرگزشت میں شائع ہونے والی تحریروں جیسی تحریر ہوتی تو جگہ ضرور ملتی) کہانیوں میں سب سے پہلے فیورٹ کہانی سراب پڑھی۔ جہاں شہباز ملک صاحب ثاقب حسن کی واپسی کے بعد کسی دوسری ڈکیت کے گروہ کے ہتھے چڑھ گئے۔ لڑکی کا اپنے ساتھیوں کو گالیاں دینا اور ان کا بھی بدمزہ نہ ہونا تو بھی کہا جاسکتا ہے سن کر گالیاں رقیب بدمزہ نہ ہوا۔ اور پھر شہباز کو قید کر دیا گیا۔ باقی اس دفعہ رائٹی، ورائٹی اور لڑکی نئے کردار شامل ہوئے ہیں۔ شہباز ملک صاحب سخت سے سخت حالات میں بھی مصیبت میں بھی بازی اپنے حق میں پلٹا لیتے ہیں میں شہلا مر چکی ہے اور پولیس کی سائرن کی آواز بھی قریب ہے اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ فلی الف لیلہ، ہم جو، پُرسکون سمندر، قاتل، دیویاں، زر و پٹی معلوماتی کہانیاں تھیں۔ سچ بیانیوں میں پہلے نمبر پر مکافاتِ عمل اور دوسری نادیدہ عشق انعام یافتہ معلوم ہوئیں۔ وجود زن، شریف غنڈا، خالی ہاتھ، خواہشات ناآسودہ بھی بہترین سچ بیانیاں تھیں۔ بیت بازی میں نوشین عارف، رقیہ قیصر، نسرین اختر، نسرین امتیاز اور ناہید خان کے اشعار پسند آئے علمی آزمائش 82 میں ناصر حسین، شیریں بانو، نصرت جاوید، نوید احمد سلطان، فتح عالم کو انعام پانے پر مبارک باد۔ پارچوں میں کراچی سے احمد سعید قائم خانی، رحمت بخش، ریحان شیخ، ملک ثاقب تنولی، مسلمانوں کی علمی روایت مولانا ظفر علی، وغیرہ بھی بہت خوبصورت تھیں۔"

✉ سدرہ بانو ناگوری کا خلوص نامہ کراچی سے "انکل سرگزشت، کی تاریخ میں جو ردوبدل کیا گیا ہے تو تبصرہ بھیجنے کی تاریخ میں کتنی توسیع کی گئی ہے (اب اہم 16 تاریخ تک آنے والے خطوط شامل کررہے ہیں) سرورق ہر بار کی طرح خوب رہا، سرگزشت، کی قیمت میں 10 روپے کا اضافہ کیا گیا ہے جو کہ عاشقانِ سرگزشت کے لیے زیادہ نہیں کیونکہ ہمیں اس میں اتنا دلچسپ اور منفرد مواد پڑھنے کو ملتا ہے کہ آپ کی پوری ٹیم خصوصی مبارک باد کی مستحق ہے اس مرتبہ ابتدا سراب، سے کرتے ہیں شہلا اپنے انجام کو پہنچی۔ دراصل اس کو اس انجام تک پہنچنا ہی تھا وہ جس بے سمت سفر کر رہی تھی اس سفر میں موت بلکہ انتہائی دردناک موت اچانک ہی آدبوچتی ہے اور آدمی بے بسی سے ہاتھ پھیلائے اسے تکتا ہی رہ جاتا ہے، کاشف زبیر نے ایک شاندار منفی کردار کو اس کے شایانِ شان انجام تک پہنچایا اور اس نازک موقع پر بھی اپنے مثبت کردار شوبی، کی عظمت کو برقرار رکھتے ہوئے لبلبی دبانے سے باز رکھا۔ شہلا کے انجام پر یہی کہوں گی دل کے دریا کو کسی روز پار اتر جانا ہے۔ اس قدر بے سمت نہ چل لوٹ کے گھر جانا ہے۔ شہرِ خیال کی محفل بھی حسبِ معمول رہی طاہرہ گلزار، مہوش رفیق اور رانا محمد سجاد کا تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ، ویسے طاہرہ باجی سچ ہے کہ آپ بھی کمال کا لکھتی ہیں کیونکہ یہ آپ سب کی محبت اور خلوص ہی ہے جو بار بار محفل میں آنے کی دعوت دیتا ہے بس اسی طرح اپنی رائے سے آگاہ کرتے رہیے گا۔ انکل آپ نے ایم افضل کو جو جواب دیا ہے وہ سمجھ میں نہیں آیا براہِ کرم دوبارہ دیکھیے۔ اے آر راجپوت، موت کے قریب، لے کر آئے اور متاثر کر گئے۔ (ہم صنفِ شاعری یعنی غزلیں نظمیں، قطعات وغیرہ شامل نہیں کرتے، انتہائی ضرورت ہو تو بات دیگر ہے۔ لیکن صنفِ شاعری پر مضامین ضرور دیتے ہیں۔ مثلاً کسی شاعر کی سوانح حیات کسی بحر پر بحث، کسی شاعر کی شاعری پر مضمون) سوروں کے شکار اور کتے کی بہادری پر مشتمل یہ کہانی بہت پسند آئی۔ فلی الف لیلہ میں اس بار صفحہ نمبر 117 پر تصویر دیکھ کر دل اداس ہو گیا کہ ہر عروج کو زوال ہے، ماضی کی 4 خوبصورت اداکاراؤں کا بڑھاپا دیکھ کر وہ مصرعہ یاد آگیا "کھنڈرات کہہ رہے ہیں عمارت عظیم تھی" زرد پتی، ندا بخاری نے کرائی اور عقل سے ماورا کہہ کر خود کو ہی اس کی نفی کر دی بہرحال وقت گزاری کے لیے پڑھی جاسکتی ہے اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ محبت کی طاقت ہے۔ سچ بیانیوں میں پہلی آپ بیتی خالی ہاتھ، پڑھی زرینہ کا کردار متاثر کر گیا۔ اس نے اپنے محبوب کی خاطر اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔ مگر افسوس وہ پھر بھی خالی ہاتھ ہی رہی۔ اپنے آخری وقت تک اپنے محبوب کو پانے میں ناکام رہی۔ دوسری سچ بیانی شاہد صاحب کی پڑھی۔ عورت واقعی پہیلی ہے محبت کرنے پر آئے تو اپنی تمام تر وفا نچھاور کر دے اور انتقام پر اتر آئے تو تباہ کر کے رکھ دے۔ خواہشات ناآسودہ صائمہ کراچی سے اپنی داستان رقم کرتی ہیں۔ دولت کی ہوس نے اسے اتنا پاگل کر دیا کہ اس نے اپنی محسنہ کے احسانات فراموش کر دیئے آپ اس کی قاتل نہیں ہیں مگر گل زمان کو یہ راستہ آپ نے ہی دکھایا تھا۔ نومبر کا شمارہ بلترا عید کے بعد ملے گا تو انکل آنٹی اور تمام اہلِ وطن کو عید کی مبارک باد قبول ہو۔"

✉ رانا محمد شاہد، بورے والا سے لکھتے ہیں "اکتوبر کے اداریے میں معراج صاحب نے ایک اہم نکتے کی طرف اشارہ کیا۔ ہوشربا مہنگائی نے

WWW.PAKSOCIETY.COM

جہاں دوسری بہت سی چیزوں کو متاثر کیا ہے۔ وہیں کتابوں اور رسالوں کی قیمت بڑھنا بھی فطری امر ہے۔ پھر ہمارے ہاں لوگ لکھنے پڑھنے سے زیادہ کھانے پینے کے شوقین ہیں کہ ایک دن کھانے پر 5 ہزار روپے خرچ کردیں گے مگر 500 روپے کی کتاب انہیں بہت مہنگی لگے گی۔ کتاب کی عظمت کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ علم اور کتاب کو کوئی زوال نہیں۔ امیر تیمور ایک مشہور فاتح گزرا ہے، اس نے 42 ممالک فتح کیے۔ تیمور کے سوانح نگار لکھتے ہیں۔ تیمور کے پاس اتنی دولت تھی کہ وہ اسے گھوڑوں اور گدھوں پر لادا کرتا تھا اور سیکڑوں کی تعداد میں موجود یہ گھوڑے اور گدھے قطار میں سمرقند پہنچتے تھے اور یہ کسی ایک مہم کی دولت ہوتی تھی۔ تیمور کا شمار ان چند نادر و نایاب لوگوں میں ہوتا تھا جو اپنے دونوں ہاتھوں سے بیک وقت کام لے سکتے تھے۔ جس طرح جنگ میں وہ دونوں ہاتھوں کا استعمال کرسکتا تھا، اسی طرح وہ دونوں ہاتھوں سے لکھ بھی سکتا تھا۔ اس کا حافظہ بھی حیران کن تھا۔ وہ ایک بار کی سنی اور پڑھی بات کبھی نہیں بھولتا تھا۔ اس کی یہ ساری کامیابیاں، اس کی نہ ختم ہونے والی دولت اور اس کے 42 مفتوح ممالک زمین کا رزق بن گئے لیکن تیمور کی ایک چیز زمانے کی دست برد سے بچ گئی اور وہ تھی اس کے ہاتھ سے لکھی کتاب۔ اس کی سوانح عمری "میں ہوں تیمور" امیر تیمور کی یہ کتاب قلمی نسخے کی صورت میں مختلف ہاتھوں سے ہوتی ہوئی 1783ء میں پہلی بار برطانیہ میں شائع ہوئی۔ پھر 40 زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا اور یہ 229 برسوں سے مسلسل پڑھی جارہی ہے۔ یہ لکھنے کی عظمت ہے، کتاب کی عظمت ہے کہ سب کچھ ختم ہوگیا لیکن کتاب کی صورت امیر تیمور تاریخ میں آج بھی زندہ ہے۔ پروفیسر رضی الدین صدیقی کی جدوجہد سے عبارت یک نفسی سرگزشت نے معلومات میں اضافہ کیا۔ شہر خیال میں طاہرہ گلزار کا طویل تبصرہ عورت نامہ زیادہ لگ رہا تھا جس میں مردوں کو ہر معاملے میں قصوروار ٹھہرایا گیا تھا۔ ٹھیک ہے کسی حد تک ان کی باتیں ٹھیک بھی ہوں گی۔ طاہرہ بی بی کی باتیں عورت کی وفاداری اور مرد کی بے وفائی کا ہی احاطہ کرتی نظر آئیں۔ حالانکہ آپ نے یقیناً پڑھا ہوگا کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے تو کیا ناکام مرد کے پیچھے عورت کا ہاتھ نہیں ہوسکتا؟ ہر اچھی چیز کا کریڈٹ خود لینا اور بری چیز کا دوسرے کو دے دینا ہماری عام روایت ہے۔ آپ شاید جاب کرتی ہیں، سیلف میڈ ہیں، اس لیے ذرا زیادہ جذباتی ہیں۔ علی سفیان آفاقی صاحب نے فلمی الف لیلہ میں لکھا کہ "بعض مبصرین کے نزدیک راجیش کھنہ بورے والا میں پیدا ہوئے تھے، بعد میں امرتسر چلے گئے۔ میرے خیال میں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ وہ کراچی یا لاہور میں پیدا نہیں ہوئے تھے ورنہ بھی مبصرین کو معلوم ہوتا۔ یہ ایک حساس موضوع ہے، اس کی مثالیں دی جاسکتی ہیں مگر پھر کبھی سہی کیونکہ ہمارے ہاں بات کو مثبت سے زیادہ منفی پہلوؤں پر دیکھنے کا چلن عام ہے۔

✉ احمد خان توحیدی، کراچی سے لکھتے ہیں "سرگزشت 29 ستمبر کو شام وصول ہوا، دنیا بھر میں بم دھماکے، پیٹرول بم، مہنگائی بم، اس لیے ہم بھی عادی ہوگئے ہیں۔ معراج رسول صاحب بیس فیصد قیمت بڑھ جانے پر معذرت یہ آپ کا حسن ظن ہے۔ موجودہ حالات میں قیمت یہ بھی کم ہے۔ ستمبر 1965ء کے بعد ہم مسلمانوں کی نااتفاقی، نائن الیون کی یلغار، اب پھر نائن الیون لاہور و کراچی میں آگ کا سمندر، مالکان نے مزدوروں کا خون چوسا، اسپکٹرز قرض کیوں پورا کرتے، اسٹیل مل کی حالت ہی دیکھ لیں 7 سال سے ہزاروں لوگ ڈیوٹی پر آئے بغیر تنخواہ وصول کرتے ہیں۔ ادھر ہمارا ازلی دشمن گستاخ فلم ڈال کر فرار ہوگیا اور ہم اپنے گھر کو خود ہی تباہ کررہے ہیں۔ مجھے مربوط خط کا حکم تاخیر سے ملنے پر تبصرہ مطالعہ کے بغیر کیسے ہو؟ (خط موصول ہونے کی تاریخ میں بھی اضافہ دیا گیا) طاہرہ گلزار پشاور کا تبصرہ گڈ مگر طویل تھا۔ ستمبر کی تنخواہ عید کی وجہ سے 20 اکتوبر تک ملنے کی امید ہے ورنہ وسط نومبر میں ملتی، ہر چیز ماہانہ لے کر گزارہ کرتے ہیں۔ رانا سجاد مظفر گڑھ، طاہر الدین بیگ، سدرہ بانو، رانا فیصل جاوید، سہیل عباس، رانا شاہد، ملک جاوید سرکانی کے تبصرے گڈ مگر طویل تھے۔ علم دوست از ڈاکٹر ساجد، لاجواب اسٹوری تھی۔ جس انسان پر قائد اعظم، قائد ملت کا اعتماد، سفر میں ساتھ اس کی عظمت تعارفِ محتاج نہیں ہے۔ البتہ گکھنڈی موسیٰ خان گوجرانوالہ جہاں دیکھی بھالی گلیاں، ایک درجن سے زیادہ دوست و بھائی کسی نے ممتاز حسن کا ذکر نہ کیا۔ غالباً کراچی آباد ہوکر واپس نہ گئے۔ کاش تھری پیس، عیاش بے ضمیر راشی لٹیرے ممتاز حسن کے نقش پا ہوتے سکون کی میٹھی نیند سیکورٹی میں گھرے مرضی کی تفریح سے بھی محروم۔ گونگی، مختار آزاد، آپ نے صابر حسین راجپوت (گرم لہو رکھنے کا ہے ایک بہانہ) یاد تازہ کردی۔ گڈ اسٹوری پرواز، ہربرٹ نے ہمت نہ ہار کر ثابت کردیا۔ معذور کبھی مجبور نہیں۔ فساد، ایسا تو کئی بار انڈیا میں کھلاڑیوں کے ساتھ ہوچکا، مہم جو، بیرل باہمت خاتون، فلمی الف لیلہ، شہنشاہ غزل کے تذکرے نے پھر رُلا دیا، آفاقی انکل، ساتھیوں کا شکوہ درست، تقریباً ساڑھے 17 سال بادام مہنگے مگر حافظہ اتنا کمزور نہیں ہے۔ اقبال بانو قتیل شفائی ملتان و بلی بوڑھوں کا رمضان، شبنم، محمد علی ، وڈ بن گھوش، زیبا، کافی تذکرہ شبنم کے گھر ڈکیتی قصہ، فلمیں ختم، مواد کہاں سے آئے؟ پُر سکون سمندر، جنگجو لکھاری اور دیویاں، پسند نہ آئیں، قاتل و جال جرائم پیشہ کہانیاں، وقتی گزارہ تھی موت کے منہ میں، گڈ اسٹوری، کتنا وفادار جانور ہے۔ زرویٹی، میری کی ولن سے محبت رنگ لائی، سراب میں بھی فلمی الف لیلہ کی طرح دوبارہ تحریر، نیا سلسلہ شروع کریں، صومالی قزاقوں اغوا ہونے والوں کی کہانیاں لکھیں۔ سچ بیانیاں، خالی ہاتھ، الف شین نے عالیہ سے بے وفائی تو نہ کی، عالیہ کی رحلت کے بعد زرینہ کی لازوال محبت دونوں کو شادی کرکے تنہائی دور کرنی چاہیے۔ عورت ایک پہیلی، عظمیٰ نے ناگن بن کر پیار بھرا گھر برباد کیا۔ انجام درست، تجربہ، خوب فنسی آئی، فی الوقت سو فیصد مرد، مسجوے بن کر گھر گھر بھیک طلب کرتے ہیں وقاص کی سماجی خدمات درست، سونیا کو ٹھکرانا غلط، شریف غنڈا، ٹیوشن کی آڑ میں میرے دو دوست بھی شاگرد لڑکیوں سے شادی کرچکے۔ جائز شرعی طریقہ اچھی بات ارسلان جیسے لوگ باضمیر نیک ضمیر رکھتے ہیں۔ نادیدہ عشق، کلام پاک میں ناری مخلوق کا ذکر موجود، خدا جانے سلمان کس حال میں ہے؟ پہلا شو، تماشا و نارزن کی المناک موت قلبی دکھ، شین الف بوڑھا زندگی بھر ضمیر کا مجرم آخرت کی سزا الگ۔ مکافات عمل، بدبختی کی آگ لگانے والوں کا انجام، بانو اور افشاں جیسا ہی ہوتا ہے۔ خواہشات نا آسودہ، صائمہ نے شیر علی کی باتوں میں آکر اپنی محسن بیگم صاحبہ سے بے وفائی کی سزا پائی۔ حلال کی روزی پر شکر نہ کرنے والوں کا انجام۔ شیر علی جیسا ہی ہوتا ہے۔ مجموعی طور شمارہ اچھا ہے، اہلِ محفل کو سلام۔"

✉ رانا محمد سجاد نے مظفر گڑھ سے لکھا ہے "انجم فاروقی ساحلی صاحب صدارت کے عہدے پر فائز تھے جناب مبارک ہو ایک ماہ کے لیے آپ اس عہدے پر فائز رہیں گے۔ اس کے بعد آگے بڑھنے کے بجائے معراج رسول صاحب کے صفحات پر نگاہیں مرکوز کیں۔ ہمیشہ کی طرح وہی دردمندانہ لہجہ، وہی التجا ارباب اختیار سے، لگتا ہے اس قوم کی قسمت میں صرف آنسو بہانا ہی رہ گیا ہے۔ جلنا کڑھنا اس کا مقدر بن گیا ہے۔ غربت کی آگ نے 300 افراد کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ حادثات زندگی کا حصہ ہیں ان سے فرار ممکن نہیں لیکن ان کی طرف سے غفلت برتنا اور جو اس کے ذمے دار ہیں وہ اپنی ذمے داریوں سے فرار اختیار کریں یہ ناقابلِ معافی ہے۔ اس کے بعد ایک اور خبر آئی کہ آگ کو تو بجھالیا گیا تھا پھر پتا نہیں کیسے بھڑک اٹھی؟ ملتان کے حوالے سے یہ خبر اخبارات کی زینت بنی کہ بہت سی فیکٹریوں میں ایمر جنسی راستہ ہی نہیں ہے۔ اب اس کو کیا کہا جائے۔ اگلی پانچ سال کی مدت حاصل کرنے میں حکمران اتنے مگن ہیں کہ وہ اس پر غور کرنا ہی گوارا نہیں کریں گے۔ دوسری خبر نے ایمان و روح کو زخمی کردیا۔ ویسے اگر ان کی طرف سے ایسی خباثتیں ظاہر کی جائیں تو اتنا حیران ہونے کی ضرورت نہیں بھلا جو قوم اپنے پیغمبروں کو طرح طرح کے القاب سے پکار سکتی ہے ان پاکیزہ ہستیوں پر شرمناک الزامات لگا سکتی ہے تو رسول اللہ ﷺ پر الزامات کوئی انہونی بات نہیں۔ بغض اسلام بار بار ظاہر ہورہا ہے۔ انشاء اللہ یہ اپنی حسد کی آگ میں جل کر ہی مریں گے۔ چراغ مصطفوی کو گل کرنا ان بدبختوں کی اوقات نہیں۔ چاہے کتنی ہی فلمیں کیوں نہ بنوالیں اس رسول کا تذکرہ ہمیشہ بلند رہے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ افسوس بھی ہوا کہ عشق رسول کے نام پر جو کچھ ہماری شاہراہوں پر ہوا۔ نہ جانے ہمیں کب عقل آئے گی کہ اس طرح ہم انہی لوگوں کے عزائم کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ ملکی سیاست پر تھوڑا تبصرہ کرلیتے ہیں۔ ملکی سیاسی فضا میں ان دنوں چھ نکات کی بازگشت سنائی دے رہی ہے خدا کرے یہ مجیب کے چھ نکات نہ ہوں۔ قومی ٹیم حسب توقع قوم کو پھر مایوس کرکے وطن واپس لوٹ آئی۔ خیر اب تو ہم عادی ہوچکے ہیں۔ "محسن ریاضی" میں رضی الدین صدیقی کے بارے میں پڑھ کر بہت خوشی ہوئی نام تو کئی مرتبہ سنا لیکن تعارف اچھی طرح پہلی بار ہوا۔ کیا ان پر پہلے بھی کوئی تحریر چھپ چکی ہے؟ (جی نہیں) احمد خان توحیدی کا خط بھی خوب رہا۔ پھر اس کے بعد محترمہ طاہرہ گلزار صاحبہ کے خط کو پڑھنا شروع کیا۔ موصوفہ نے اپنا زورِ قلم مرد کو بے وفا، ظالم، فریبی ثابت کرنے میں صرف کیا۔ حالانکہ یہ بات سراسر غلط ہے عورت بھی تو اس معاملے میں برابر کی قصوروار ہوتی ہے صرف مرد کو ہی قصوروار ٹھہرانا کہاں کا انصاف ہے۔ خط کی ہر دوسری تیسری سطر میں محترمہ کی تان مرد کی بے وفائی پر آکر ٹوٹتی ہے۔ ملک جاوید محمد سرکانی کا تبصرہ بھی شاندار رہا۔ رانا فیصل جاوید ہمارے شہر سے تشریف لائے۔ جناب حاضری دیتے رہیے گا۔ اختر صبا صاحب آئے چنگیز خان کا نام تموجن تھا یا تموجن اول الذکر پڑھا ہے کتابوں میں۔ امید ہے وضاحت کریں گے۔ رانا محمد شاہد کا تبصرہ مختصر تھا۔ سہیل احمد عباسی، جناب آپ نے جس کتاب کا تذکرہ کیا پڑھنے کا اشتیاق ہوگیا ہے۔ وجے لکشمی پنڈت کا تذکرہ تو سرسری طور پر ہم نے بھی سنا ہے کہ گاندھی کی مکاری کی وجہ سے لکشمی پنڈت مسلمان ہوتے ہوتے رہ گئی کیونکہ گاندھی نے لکشمی کو کہا کہ اگر تم اس کی خاطر دین چھوڑ سکتی ہو تو وہ تمہاری خاطر اپنا دین کیوں نہیں چھوڑ سکتا۔ عاشق حسین نے مذہب کی تبدیلی سے صاف انکار کردیا۔ یہیں سے ان کی راہیں جدا ہوگئیں۔ سہیل احمد کھتری اپنے تبصرے کے ساتھ آئے۔ مہوش رفیق نے آغاز ہی ناراضی سے کردیا۔ تقی محمد کی جو فرمائش کرکے آپ نے ہمارے قلم کی بات چھین لی۔ خالد یوسفی کا تبصرہ بھی پسند آیا۔ سدرہ بانو کراچی سے حاضر ہوئیں۔ کراچی کے شب و روز گزرتے ہیں ہر روز قتلِ عام کی خبریں۔ بس دعا ہی کرسکتے ہیں طاہر الدین بیگ تفصیلی تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔ بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔ عبدالسلام آرائیں، آپ کی فرمائش نوٹ کرلی خوش ہوجائیں۔ ایم افضل کھرل کا مختصر تبصرہ بھی پسند آیا۔ رسالے کے بارے میں ان کے خیالات پسند آئے۔ شمارے کی پہلی کہانی کی طرف بڑھے، ممتاز حسن کے بارے میں پڑھ کر حیرت ہوئی کہ ایک شخصیت اتنے سارے کام کرلے ایسے ہی لوگ اس وطن عزیز کے ماتھے کا جھومر ہیں اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت کرے۔ ویسے ایک تجویز ہے کہ جتنی بھی کتابوں کا ذکر ہو ان کے اقتباس شائع کردیے جائیں تو تحریر زیادہ دلچسپ ہوسکتی ہے۔ گونگی، حساس دلوں کو جھنجوڑتی تحریر تھی۔ ابن کبیر، ایچ جی ویلز لے کر آئے مصنفین کے بارے میں پڑھنا ہمیشہ پسند رہا ہے، بہت پسند آئی غربت کی چکی میں پس کر یہ افراد آسمانِ ادب کے روشن ستارے بنے۔ فساد، صائمہ اقبال کی تحریر، اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ امپائر نے گول کو فاول کیوں قرار دیا۔ بہرحال امپائر کا ایک فیصلہ کتنے لوگوں کی جان لے گیا۔ مہم جو، بہرل نے اپنی جرأت مندی سے ایک کارنامہ انجام دیا۔ فلمی الف لیلہ پسند آئی گلوکاراؤں کا تذکرہ کیا مہدی حسن کا تذکرہ ادا اس کرگیا۔ استاد بڑے غلام علی خان کا تذکرہ اگر تفصیل سے ہوجائے تو کتنا بہتر ہوتا۔

✉ ایم اے خالق بھٹی کا خلوص نامہ الہ آباد رحیم یار خان سے "اس مرتبہ اپنا لیٹر فیکس کررہا ہوں کیونکہ گزشتہ تین ماہ سے کوریئر سے بھیج رہا ہوں لیکن ادارے تک نہیں پہنچ پاتا ہے۔ شہر خیال کو دیکھ کر سخت مایوسی اور کوریئر پر غصہ آتا ہے۔ اس بار ڈاکٹر ساجد امجد کی علم دوست، مختار آزاد کی دلچسپ تحریر گونگی، ابن کبیر کی پرواز تخیل، صائمہ اقبال کی فساد، ڈاکٹر عبدالوہاب بھٹی کی مہم جو، علی سفیان آفاقی کی فلمی الف لیلہ، محمد ایاز راہی کی دیویاں پڑھی ہیں۔ واقعی سرگزشت کا نئے اور انوکھے موضوع پر سچے اور تفصیلی مضامین چھاپنے کا جو سلسلہ ہے وہ واقعی ادارہ کی محنت کی عکاسی کرتا ہے اور قارئین کو بھی اپنی گرفت میں رکھتا ہے۔ سچ بیتیوں میں عورت ایک پہیلی، نادیدہ عشق، پہلا شو، وجود زن، مکافات عمل، واقعی خامے کی چیزیں ہیں۔ شہر خیال میں کرسی صدارت پر انجم فاروق ساحلی براجمان تھے۔ اس دفعہ طاہرہ گلزار نے خوب تبصرہ کیا ہے، ملک جاوید محمد سرکانی، رانا فیصل جاوید، رانا محمد شاہد، طاہر الدین بیگ کے تبصرے بہت عمدہ ہیں۔ یک نفسی میں پروفیسر رضی الدین صدیقی کی علم دوستی اور اعزازات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ کبھی کبھی ٹی وی آرٹسٹوں کے بارے میں بھی مضامین شامل کرلیا کریں، عین نوازش ہوگی۔"

تاخیر سے موصول ہونے والے خطوط۔

کیمرا ساجد، کوئٹہ۔ محمد عارف شیخ، چنیوٹ۔ ناصر علی خان، توصیف ملک، احمد حسن سیفی، کراچی۔ نگار حسن، حسن ابدال۔ زاہد سہو، چک نمبر 13/3 ارسلان حسن، ناصر زیب خان، کوٹ ڈی جی خان۔ احمد راجپوت، لاہور۔ فدا حسین سہو، نور بانو، کوئٹہ۔ سلطان خان، اشفاق حسن، پشاور

WWW.PAKSOCIETY.COM

حکیمِ وقت

ڈاکٹر ساجد امجد

اس نابغۂ روزگار، اقلیم قلم، فسوں ساز تحریروں کے خالق نے اپنے قلم سے ایک تاریخ مرتب کی اس کی جدائی کا سن کر دربارِ حیدرآباد میں آہ و فغاں کا بازار گرم ہوگیا تھا کیونکہ لوگ اسے علم کا سمندر سمجھ رہے تھے۔ ایسا ماحول دیکھ کر وہ خود بھی ہجرت سے تائب ہونے پر غور کرنے لگا مگر لاہور کی مٹی اسے آواز دے رہی تھی سو اسے لوٹنا ہی تھا۔

ایک بڑے قلمکار کا زندگی نامہ

شیرانوالہ دروازہ، لاہور میں واقع اسلامیہ ہائی اسکول کے گراؤنڈ میں مولوی صاحب کا وعظ ہو رہا تھا۔ یہ وعظ ہر جمعہ کو ہوتا تھا۔ تمام بچے آگے پیچھے قطار در قطار بڑے ادب سے بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ایک زوردار تھپڑ کی آواز آئی۔ لڑکوں نے گھوم کر دیکھا دو لڑکے گتھم گتھا ہو چکے تھے۔ بڑی مشکل سے دونوں کو چھڑایا گیا۔

ان لڑکوں میں ایک ایم۔ ایم شریف تھا دوسرا خلیفہ عبدالحکیم۔

اس لڑائی کے بعد دونوں کو اساتذہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ دونوں ایک دوسرے سے ناواقف تھے۔ غلطی بھی دونوں کی تھی لہٰذا دونوں کو سرزنش کے بعد چھوڑ دیا گیا۔

ایم۔ ایم شریف باہر نکلا تو اس کا ایک دوست اس کے انتظار میں کھڑا تھا۔

''کیا ہوا شریف۔''

''کچھ نہیں۔ ماسٹر جی نے ڈانٹ ڈپٹ کر چھوڑ دیا' اسے بھی مجھے بھی۔''

''چلو اچھا ہوا۔ میں تو ڈر ہی گیا تھا کہ نہ جانے کیا ہو۔''

''یار یہ تو بتا' یہ بدتمیز تھا کون؟''

''ارے تم نہیں جانتے۔ اس کا نام ہے خلیفہ عبدالحکیم ڈار۔''

''ابے یہ نام ہے یا پورا شجرۂ نسب۔''

''یہ تو مجھے نہیں معلوم لیکن یہ لڑکا ہے بڑا چھپا رستم۔ ابھی ساتویں جماعت میں ہے لیکن شاعری کرتا ہے۔ ایک نظم کشمیری میگزین لاہور میں چھپ بھی چکی ہے۔''

''شاعری اپنی جگہ لیکن ہے بدتمیز۔''

''ہاں' ذرا سر پھرا ہے۔''

شریف یہی باتیں کرتا ہوا اسکول سے دور نکل آیا تھا۔ اس کا دوست کسی اور طرف مڑ گیا۔ اب وہ اکیلا تھا۔ اس کا ذہن پھر اس جھگڑے کی طرف لوٹ گیا جس سے وہ ابھی ابھی نمٹ کر آرہا تھا۔ پھر اسے اپنے حریف کا نام یاد آگیا۔ خلیفہ عبدالحکیم ڈار۔ جھگڑے سے زیادہ اب وہ اس نام میں الجھا ہوا تھا۔ اسے ایک مرتبہ ہنسی آگئی۔ وہ کتنا چھوٹا لڑکا ہے اور نام کتنا بڑا اور عجیب ہے۔ عبدالحکیم تک تو ٹھیک تھا لیکن یہ خلیفہ اور ڈار کیا ہے۔ وہ لڑکا اور خلیفہ! اسے پھر ہنسی آگئی۔ وہ اسی سوچ میں تھا کہ گھر کا دروازہ آگیا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی اس کا سامنا والد صاحب سے ہوگیا۔ وہ ابھی تک ''خلیفہ'' اور ''ڈار'' میں الجھا

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوا تھا۔ اس کے والد ہی اس مشکل کو حل کر سکتے تھے۔ یوں بھی اس کے والد نے اس سے کہا ہوا تھا کہ اسکول سے آتے ہی وہ اسکول کے بارے میں انہیں پوری رپورٹ دیا کرے۔ وہ باپ کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور جھگڑے کی پوری تفصیل ان کے سامنے بیان کر دی۔

"تم نے بالکل ٹھیک کیا۔ گالی کا جواب تھپڑ ہی ہوتا ہے مگر وہ لڑکا تھا کون۔"

"اس کا نام ایسا ہے جسے سن کر میری طرح آپ بھی ہنسیں گے۔ مجھ سے بھی قد میں کم ہے اور نام ہے خلیفہ عبدالحکیم ڈار۔"

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔"

"عبدالحکیم تو ٹھیک ہے لیکن یہ خلیفہ اور ڈار کیا ہے؟"

"میں تمہیں بتاتا ہوں۔ یہ لڑکا چہل بیبیاں میں رہتا ہے نا؟"

"یہ تو مجھے نہیں معلوم۔"

"تمہیں نہ معلوم ہو لیکن یہ خاندان اسی محلے میں آباد ہے۔ اس خاندان کے بزرگ پشمینے اور ڈوری بافی کا کام کثرت سے کرتے تھے۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد بھی اس فن کا اکتساب اس خاندن کے لوگوں سے کرتی تھی لہٰذا رفتہ رفتہ یہ بزرگ خلیفہ بمعنی استاد کہلائے جانے لگے۔ یہ لقب اب تک چلا آتا ہے۔"

"اور یہ "ڈار" کیا ہے۔"

"اس کی بھی سن لو۔ قدیم ہندو راجا جب کشمیر کے حکمران تھے تو ملک کشمیر مختلف درّوں پر تقسیم کیا گیا تھا۔ ہر درّے پر شیر دل آدمی مقرر کیا جاتا تھا تاکہ وہ دشمنوں سے ملک کو محفوظ رکھ سکے۔ سنسکرت میں درّے کو دوار کہتے تھے۔ ڈار کا لفظ دوار سے نکلا ہے یعنی درّے پر مامور حفاظتی "دوار پتی" کا خاندان۔"

اسی خاندان کے دو افراد صدیق ڈار اور رمضان ڈار کشمیر سے ہجرت کر کے لاہور آئے۔ رمضان ڈار نے ایک چھوٹا سا کارخانہ لگایا اور خلیفہ رمضان کہلائے۔

"یہ خاندان ابھی تک نہایت باعزت خاندان ہے۔ نہایت مذہبی لوگ ہیں۔ بس غصہ آگیا ہوگا جو اس لڑکے نے گالی بک دی تم اسے نظر انداز کر دو۔ ہو سکے تو اس سے دوستی کر لو۔"

شریف نے اپنے والد کی باتوں کو بڑے غور سے سنا اور پھر کھیل کود میں مصروف ہو گیا۔ نام کا معما حل ہو چکا تھا اس لیے اب اس کے ذہن میں کوئی الجھن نہیں تھی۔

دوسرے دن وہ اسکول گیا تو باپ کی باتیں اس کے ذہن میں گردش کر رہی تھیں۔ خلیفہ عبدالحکیم اسے پھر نظر آیا تو وہ اس کے قریب چلا گیا۔ خلیفہ کی آنکھوں میں عجیب سی شرارت تھی۔ چہرے پر ایسا رعب بھی تھا کہ شریف پیچھے ہٹ گیا لیکن پھر اسے باپ کی نصیحت یاد آگئی۔ "ہو سکے تو اس لڑکے سے دوستی کر لینا۔"

وہ اس کے بالکل قریب پہنچ گیا لیکن سخت مرعوب تھا، بہر حال اس نے ہمت کی۔

"یار کیا ابھی تک ناراض ہو۔" شریف نے کہا۔

خلیفہ نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیوں؟ کیا تم ناراض نہیں۔"

"ایک جگہ پڑھتے ہیں پھر غصہ کیسا۔ میں دوستی کے لیے ہاتھ بڑھاتا ہوں۔"

"تین دن ناراض رہنے کی اجازت تو ہمارا دین بھی دیتا ہے۔ ابھی تو ایک ہی دن ہوا ہے۔ دو دن اور گزر جائیں تو پھر بات کریں گے۔"

خلیفہ عبدالحکیم نے کھا جانے والی نظروں سے شریف کی طرف دیکھا اور شریف کو پیچھے ہٹنا پڑا۔

دو دن گزر گئے تو شریف کو اس کے پاس جانا نہیں پڑا۔ وہ خود قریب آیا۔ "یار گالی کا جواب تو گالی ہونا چاہیے تھا۔ میں نے گالی بکی تھی تم بھی گالی بک دیتے۔ تم نے تھپڑ کیوں مارا۔"

"خلیفہ، بات یہ ہے کہ میں دیہاتی ہوں۔ گالی تو مجھے آتی نہیں ہے البتہ ہاتھ بہت چلتے ہیں۔"

"چلو پھر اس شرط پر دوستی کرتے ہیں کہ آئندہ تم بھی گالیاں سیکھو گے۔ دیہاتی نہیں رہو گے۔"

دونوں نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا اور آگے بڑھ کر ایک دوسرے کو گلے لگا لیا۔

جب دوستی ہو ہی گئی تو خلیفہ کی شخصیت کے بہت سے پہلو ایم۔ ایم شریف پر کھلتے چلے گئے۔ اس نے دیکھا کہ یہ لڑکا بلا کا بذلہ سنج ہے۔ ایسے ایسے فقرے کستا ہے کہ ان فقروں کا جواب کسی کے پاس نہیں ہوتا۔ اس لیے اکثر لڑکے اس کے سامنے آتے ہوئے کتراتے تھے۔ وہ دل کا بہت اچھا تھا لیکن آنکھوں میں ایسی شرارت ناچتی رہتی تھی کہ اکثر لڑکے خوف زدہ ہو جاتے تھے۔ یہ راز بھی کھلا کہ وہ

بہت اچھا شاعر ہے۔ اردو اور فارسی کی استعداد اپنے ہم جماعتوں سے کہیں زیادہ رکھتا ہے چنانچہ جب اسکول میں ادبی انجمن قائم ہوئی تو خلیفہ عبدالحکیم کو اس کا سیکریٹری بنایا گیا۔

☆☆☆

رمضان ڈار کے تین لڑکے تھے۔ ان میں ایک خلیفہ عبدالرحمان بھی تھے جو اندرون اکبری دروازہ محلہ چہل بیبیاں میں واقع جدی مکان میں مقیم تھے۔ یہ مکان مغلوں کی حویلی کا ایک حصہ تھا جس کا نام مغلوں کے زمانے میں مبارک حویلی تھا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ ابوالفضل اور فیضی کے والد شیخ مبارک اس حویلی میں رہا کرتے تھے چنانچہ ان ہی کے نام پر یہ حویلی مبارک حویلی کہلاتی تھی۔

خلیفہ عبدالرحمن کی دوسری بیوی رحیم بی بی جب امید سے ہوئیں تو خلیفہ عبدالرحمن کی خوشی دیدنی تھی۔ پھر وہ وقت بھی آیا انہوں نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ خلیفہ عبدالرحمن نے اس بچے کا نام خلیفہ عبدالحکیم تجویز کیا۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ یہی وہ بچہ ہے جو اُن کے خاندان کا نام روشن کرے گا۔

یہی بچہ جب چار سال کی عمر کو پہنچا تو مکان کے سامنے واقع مٹھا شاہ والی مسجد میں پڑھنے کے لیے بٹھا دیا گیا۔ یہ صرف اس لیے تھا کہ وہ ابھی چھوٹا تھا۔ پڑھنے کے لیے کہیں دور نہیں جا سکتا تھا۔ رحیم بی بی اسے بہت عزیز رکھتی تھیں اور ایک پل کے لیے بھی آنکھوں سے اوجھل کرنے کی روادار نہیں تھیں۔

خلیفہ عبدالرحمن زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے لیکن گلستان، بوستان کا مطالعہ گہری نظر سے کیا تھا۔ جب چراغ جل جاتا تو وہ گھر کے بچوں کو لے کر بیٹھ جاتے اور شیخ سعدی کی ان کتابوں میں بیان کردہ سبق آموز اور دلچسپ قصے بچوں کو سناتے۔ وہ یہ دیکھ کر حیران ہوتے تھے کہ عبدالحکیم کم عمر ہونے کے باوجود ان قصوں کو بڑے غور سے سنتا ہے۔ نہ صرف سنتا ہے بلکہ طرح طرح کے سوال بھی کرتا جاتا ہے۔ ایک دن تو وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ مجھے لگتا ہے حکیم آگے چل کر اردو فارسی میں بڑا نام پیدا کرے گا۔

عبدالحکیم کو مسجد کے مدرسے میں پڑھتے ہوئے ایک سال ہو گیا تھا۔ ایک دن مدرسے جانے کا وقت ہو گیا تھا اور حکیم گھر سے غائب تھا۔ جب اِدھر اُدھر ڈھونڈ کر بھی وہ نہ ملا تو تشویش ہوئی۔ اس کا بڑا بھائی خلیفہ ابراہیم بھی ڈھونڈ ڈھانڈ کر واپس آگیا تو رحیم بی بی اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ سکیں۔ اسی وقت محلے کے کسی آدمی نے آکر بتایا کہ انہوں نے عبدالحکیم کو مسجد وزیر خان کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ خلیفہ عبدالرحمن نے فوراً اپنی چھڑی سنبھالی اور مسجد وزیر خان کی طرف چل دیے۔ انہوں نے دیکھا کہ مسجد کے بالمقابل وسیع میدان میں بہت سے چھوٹے بڑے لڑکے جمع ہیں۔ وہ بھی اس طرف چل دیے کہ شاید عبدالحکیم ان بچوں میں کہیں ہو۔ اس میدان میں لٹو گھمانے کے مقابلے ہوا کرتے تھے۔ اس وقت بھی ایسا ہی ایک مقابلہ ہو رہا تھا۔ بچوں کے شور وغل سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ جو پارٹی جیت جاتی تھی آسمان سر پر اٹھا لیتی تھی۔ خلیفہ عبدالرحمن کو اس کھیل سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ان کی آنکھیں تو بیٹے کو تلاش کر رہی تھیں۔ وہ انہیں ایک جگہ بیٹھا نظر آگیا۔ وہ بھی دوسرے بچوں کے ساتھ مل کر تالیاں بجا رہا تھا۔ وہ اس کے قریب پہنچے اور کان سے پکڑ کر اسے اوپر اٹھا لیا۔ حکیم کی نظر جونہی باپ پر پڑی اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ خلیفہ عبدالرحمن سوچ کر تو یہ گئے تھے کہ وہ جہاں بھی نظر آیا ہاتھ میں دبی چھڑی سے اس کی کھال ادھیڑ دیں گے لیکن اس وقت اس کی حالت دیکھ کر انہیں رحم آگیا۔ یہ بھی اچھا نہیں لگا کہ اتنے بچوں کے سامنے اسے مارنا شروع کر دیں۔

عبدالحکیم کی عادت تھی کہ بات بات پر رو دیا کرتا تھا لیکن اس وقت باپ کے خوف سے اس کے آنسو جم گئے تھے۔ باپ کو خوف ہوا کہ اسے سکتہ ہی نہ ہو جائے۔ انہوں نے اس کا کان چھوڑ دیا اور بڑے پیار سے گھر چلنے کو کہا۔

"بیٹا حکیم، تم یہاں لڑکوں میں بیٹھے ہو اور میں تمہیں تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔ چلو گھر چلو۔"

"آپ یقیناً مجھے ماریں گے۔"

"کیوں ماروں گا۔ تم لٹو گھما تھوڑی رہے تھے صرف دیکھ رہے تھے۔"

"مجھے گھومتے ہوئے لٹو اچھے لگتے ہیں۔"

"میں تمہیں خود یہ مقابلے دکھانے کے لیے لایا کروں گا فی الحال تو گھر چلو۔"

وہ اسے لے کر گھر آگئے۔ وہ گھر پہنچا تو رحیم بی بی بھی اسے ڈانٹنا بھول گئیں۔ اس کے بجائے خود اتنا رو دیں کہ چپ کرانا مشکل ہو گیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

جب وہ رات کو سونے کے لیے بستر پر چلا گیا تو خلیفہ عبدالرحمٰن نے اس کی ماں سے کہا۔

''جانتی ہو حکیم کو میں کہاں سے پکڑ کر لایا ہوں۔ مسجد وزیر خان کے سامنے لٹو گھمانے کے مقابلے ہوتے ہیں، یہ وہاں تھا۔''

''کہیں بھی تھا۔ میرا بچہ مجھے مل گیا مجھے تو یہ خوشی ہے۔''

''صرف خوشی کی نہیں سوچنے کی بات بھی ہے۔ یہ اب اتنا بڑا ہو گیا ہے کہ اتنی دور جا سکتا ہے اور ہم اسے گھر کے سامنے کی مسجد میں بھیج رہے ہیں۔ اب ہمیں اسے اسکول میں داخل کرا دینا چاہیے۔ خبردار جو اب تم نے مخالفت کی۔''

''میں تو اس لیے کہتی تھی کہ گھر سے دور کہاں پڑھنے جائے گا۔''

''اب جا سکتا ہے۔ میں کل ہی اسکول میں داخل کرا دوں گا۔ اب ہمارا تمہارا زمانہ نہیں ہے کہ کوئی کاروبار کرنے گا۔ آج کے زمانے میں تعلیم بڑی ضروری ہے۔''

دوسرے دن وہ بیٹے کو لے کر موچی گیٹ پہنچ گئے جہاں انجمن حمایت اسلام کے تحت چلنے والا اسکول واقع تھا۔ یہ اسکول ''لال کھوہ کا اسکول'' کہلاتا تھا۔

خلیفہ عبدالحکیم بڑے ذوق شوق سے اسکول جانے لگا۔ جب وہ تیسری جماعت پاس کر چکا تو اس کے والد نے اسے اسلامیہ ہائی اسکول شیرانوالہ دروازہ میں داخل کرا دیا۔

یہ اسکول ہی وہ ادارہ ثابت ہوا جہاں اس کی ادبی صلاحیتوں کی پرورش ہوئی۔

اسکول میں ادبی محفل باقاعدگی سے ہوتی تھی۔ عبدالحکیم اسکول میں داخل ہوتے ہی اس محفل میں شامل ہونے لگا، وہ چھوٹی چھوٹی نظمیں لکھنے لگا تھا۔

ساتویں جماعت تک آتے آتے وہ اتنا مقبول ہو گیا اور قابلیت کا سکّہ ایسا جما دیا کہ اسے بزم ادب کا سیکریٹری بنا دیا گیا۔ اور جب اس کی ایک نظم کشمیری میگزین میں شائع ہوئی تو پورے اسکول میں دھوم مچ گئی وہ جس طرف سے گزرتا اس کے ہم عمر لڑکے اسے دیکھ دیکھ کر رشک کرتے۔ اساتذہ بھی اسے قدر کی نگاہوں سے دیکھنے لگے تھے۔

وہ ابھی طالب علمی کے دور سے گزر رہا تھا کہ ایک عظیم حادثے سے دوچار ہونا پڑا۔ وہ اچانک اپنے شفیق باپ کی شفقت سے محروم ہو گیا۔

بارہ سال کی عمر میں یتیمی کا داغ کوئی معمولی سانحہ نہیں تھا۔

وہ اس سانحے کو بھی برداشت کر لیتا لیکن خاندانی سیاست نے اس کا جینا دوبھر کر دیا۔ اس کی ماں چونکہ اس کے باپ کی دوسری بیوی تھیں لہٰذا چچاؤں نے بھائی کے مرتے ہی ان کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں۔ جو ان کا حصہ بنتا تھا وہ بھی دینے سے انکار کر دیا۔ اب بچوں کی تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ مالی پریشانی کا سامنا بھی رحیم بی بی کو کرنا پڑا۔ انہوں نے گھر کا خرچ چلانے کے لیے دھان پر سے چھلکا اتارنے کا پرانا کام شروع کر دیا اور اس سلیقے سے گھر چلانا شروع کیا کہ بچوں کو در بدر نہ ہونے دیا۔

خلیفہ عبدالحکیم کی تعلیم میں معمولی سا تعطل آیا لیکن وہ پھر اپنی تعلیم کی طرف متوجہ ہو گیا۔ یہ عجیب بات ہوئی کہ تعلیم سے زیادہ شاعری کا شوق شدت اختیار کر گیا۔ اس کی وجہ لاہور کی ادبی فضا بھی ہو سکتی تھی۔

حکیم احمد شجاع کے والد حکیم شجاع الدین نے ایک اردو بزم مشاعرہ انجمن اتحاد کی بنیاد ڈالی تھی جس نے لاہور کی ادبی فضا کو گرما دیا تھا۔ ایسے ایسے معرکتہ الآراء مشاعرے منعقد ہوئے کہ لاہور میں لکھنؤ کی یاد تازہ ہو گئی۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے ایک بیٹے حکیم امین الدین نے ان مشاعروں کو جاری کیا۔ ان مشاعروں میں سر عبدالقادر، سر محمد اقبال، سر شہاب الدین، خواجہ رحیم بخش، خواجہ کریم بخش اور ایسے ہی دوسرے شاعر اور شاعر پرست شریک ہوتے تھے۔ ان مشاعروں کی کارروائیاں شائع بھی ہوتی تھیں۔ خلیفہ عبدالحکیم ابھی ان مشاعروں میں جانے کے قابل تو نہیں ہوا تھا لیکن ان مشاعروں کی شہرت چپکے چپکے اس کی تربیت کر رہی تھیں۔ وہ مختلف موضوعات پر نظمیں لکھ لکھ کر چھپا تا رہتا تھا پھر وہ ادبی پرچوں کی طرف راغب ہوا۔ اس میں جن شاعروں کا کلام شائع ہوتا تھا وہ اسے بہ غور پڑھتا تھا اور پھر اسی انداز کی نظمیں اور غزلیں کہنے کی کوشش کرتا تھا اور بزعم خود یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ وہ شاعری کے لیے نہایت موزوں طبیعت لے کر آیا ہے۔ خصوصاً اقبال کی شاعری اسے اپنی طرف متوجہ کرتی تھی۔ وہ اسی رنگ میں شاعری کرنے کا خواہاں ہو گیا تھا۔

یہ اس کا تربیتی دور تھا نمائشی نہیں۔ کوئی جانتا بھی نہیں

تھا کہ لاہور کی دنیائے شاعری میں ایک نئے شاعر کا اضافہ ہو چکا ہے۔

گھر کے حالات دگرگوں تھے لیکن وہ دل لگا کر تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ سوچا کہ وہ تعلیم کو خیرباد کہہ کر ماں کا ہاتھ بٹائے لیکن رحیم بی بی نے اس کی حوصلہ شکنی کی۔

''تمہارے باپ کا خواب تھا کہ تم نئے زمانے کی تعلیم حاصل کرو۔ ان کا خواب ٹوٹنے مت دینا۔'' اس نے ماں کی نصیحت کو گرہ میں باندھا اور میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کر لیا۔ اس زمانے میں لاہور کے گلی کوچے سرسید کی تعلیمی تحریک کی آوازوں سے گونج رہے تھے۔ ایک ایسا جوش پیدا ہو گیا تھا کہ ہر گھرانا اپنی اولاد کو علی گڑھ میں تعلیم دلانے کا آرزومند تھا۔ عبدالحکیم کا تعلیمی ریکارڈ بھی نہایت شاندار تھا۔ یہ ارمان اس کے دل میں بھی چٹکیاں لے رہا تھا کہ وہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے علی گڑھ جائے۔ رزلٹ آنے کے بعد وہ کئی دن اداس گھومتا رہا۔ گھر کی مالی مشکلات کا اسے علم تھا۔ ماں سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ رحیم بی بی پریشان تھیں کہ وہ فرسٹ ڈویژن میں پاس ہونے کے باوجود اتنا غم زدہ کیوں ہے۔ آخر جب ان سے نہ رہا گیا تو انہوں نے پوچھ ہی لیا۔

''حکیم، تجھے تو خوش ہونا چاہیے۔ تو اتنے اچھے نمبروں سے پاس ہوا ہے۔ پھر تو اتنا دکھی کیوں ہے۔ تو مجھ سے کچھ چھپا رہا ہے۔ کہیں تو فیل تو نہیں ہو گیا۔ مجھ سے جھوٹ ہی کہہ دیا ہو۔''

''نہیں ماں۔ تمہاری جان کی قسم! میں پاس ہو گیا ہوں۔ فرسٹ ڈویژن آئی ہے میری۔''

''پھر کیا بات ہے۔''

عبدالحکیم نے سوچا سچی بات بتا کر ماں کو دکھی کرنے کا کیا فائدہ۔ اس نے جھوٹ کا سہارا لیا۔

''اب میں نے میٹرک کر لیا ہے۔ سوچتا ہوں پڑھائی چھوڑ کر کہیں نوکری کر لوں۔''

''سچ بتا، کیا تیرا پڑھنے میں دل نہیں؟''

''نہیں ماں، میں تو کتابوں کے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔''

''پھر تو یہ سوچتا ہو گا پڑھائی کے لیے پیسے کہاں سے آئیں گے۔''

''سچی بات یہی ہے۔''

تو نے یہ سوچا بھی کیسے۔ میں ابھی زندہ ہوں۔ تو میرا مرا منہ دیکھے اگر پڑھائی چھوڑنے کی بات کی۔''

عبدالحکیم نے یہ اب بھی نہیں بتایا کہ وہ علی گڑھ جانا چاہتا ہے اس لیے اداس ہے۔ وہ دوسرے دن گیا اور کرسچن کالج فارمین میں داخلہ لے لیا۔

اس نے غلطی یہ کی کہ سائنس کے مضامین اختیار کر لیے۔ کسی کے مشورے سے یہ غلطی کر بیٹھا تھا۔ اب کتابیں کھولیں تو معلوم ہوا کہ ان مضامین سے کوئی رغبت ہی نہیں۔ ادبی ذہن رکھنے والا عبدالحکیم سائنس کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر رہ گیا۔ چند ماہ گزارنے کے بعد احساس ہوا کہ سارا سال سر پھوڑنے کے بعد بھی کچھ حاصل نہ ہو گا۔ اس نے کالج چھوڑ دیا۔

اس عرصے میں ماں پر یہ حقیقت کھل چکی تھی کہ عبدالحکیم کی خواہش علی گڑھ جانے کی تھی۔ بعض رشتے داروں کو بھی رحم آیا اور اتنے پیسے جمع ہو گئے کہ وہ علی گڑھ جا سکتا تھا۔ (غالباً جائیداد میں اس کا حصہ اسے مل گیا تھا)

اس نے علی گڑھ پہنچ کر فرسٹ ایئر میں داخلہ لے لیا۔

علی گڑھ کا تو ماحول ہی دوسرا تھا۔ آب و ہوا ہی مختلف تھی۔ وہ کھل اٹھا۔ ایک نئی امنگ نے اس کے دل میں کروٹیں لیں۔ یہاں کی آزاد فضا، ڈسپلن، تعلیمی معیار سب کچھ اس کی مرضی کے مطابق تھا۔ اس نے آرٹس کے مضامین لیے تھے لہٰذا کتابوں میں بھی اس کا دل لگ رہا تھا۔ ایک ہی عمارت کے نیچے مختلف علاقوں کے طلبہ کی موجودگی بھی اس کے لیے نیا تجربہ تھا۔ نیا اور پُرکشش۔ اسے یقین ہو گیا کہ یہاں بہت کچھ سیکھنے کو ملے گا۔

وہ ابھی فرسٹ ایئر میں تھا کہ ایک فی البدیہہ تقریری مقابلے کا انعقاد ہوا۔ یہ تقریری مقابلہ انگریزی میں تھا۔ پانچ منٹ کی تیاری کے بعد دس منٹ کی تقریر کرنی تھی۔ موضوع ظاہر ہے پہلے سے متعین نہیں تھا۔ ہر طالب علم کو اسی وقت کوئی موضوع دیا جانا تھا اور پانچ منٹ کے بعد تقریر کرنی تھی۔

اس نے ان شرائط کو دیکھا اور شرکت کے لیے اپنا نام لکھوا دیا۔ وہ اسکول کے زمانے میں تقریریں کر چکا تھا۔ اب تک اس کا ذاتی مطالعہ بھی خاطر خواہ ہو چکا تھا لیکن فی البدیہہ تقریر کرنے کا یہ پہلا موقع تھا جبکہ اس مقابلے میں ایم۔اے کے طلبہ بھی حصہ لے رہے تھے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس کے سامنے تقریر کا موضوع آیا The effect of Sorrounding on character

اس نے پانچ منٹ میں اپنے ذہن کو اس موضوع پر تقریر کے لیے آمادہ کیا اور تقریر کرنے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ وہ تقریر کر رہا تھا۔ طلبہ اور جیوری کے افراد دم بخود اسے سن رہے تھے۔ وہ فرسٹ ایئر کا طالب علم تھا لیکن معلوم ہوتا تھا کوئی عظیم دانش ور ہے جو قوم سے مخاطب ہے۔ تقریر کی روانی قابلِ دید تھی۔ دلائل قابلِ رشک تھے۔ اعتماد قابلِ تحسین تھا۔

جب نتائج کا اعلان ہوا تو فرسٹ ایئر کا یہ طالب علم اول انعام کا مستحق ٹھہرا۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ اس کے روشن مستقبل پر اب کسی کو شک نہیں رہا تھا۔

اسی سال اسے ڈیبیٹنگ یونین کا صدر بنا دیا گیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب کوئی جونیئر (Junior) لڑکا صدر منتخب ہوا ہو۔

ایف۔اے کرنے کے بعد اس نے فلسفہ پڑھنے کی غرض سے اسٹیفن کالج دہلی میں داخلہ لے لیا۔

اس مضمون سے کچھ ایسی ذہنی ہم آہنگی تھی کہ آتے ہی اساتذہ کی آنکھوں کا تارا بن گئے۔ ایک استاد پروفیسر سین تو ایسے مداح ہوئے کہ دوستوں کی طرح ساتھ رہنے لگے۔ ساتھ رہنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ چلتے پھرتے لیکچروں کا سلسلہ چلتا رہے۔ کلاس کے اندر تو مخصوص نصابی موضوعات ہی زیرِ بحث آ سکتے ہیں اور پھر دوسرے طلبہ کے ذہنی معیار کو بھی مدِنظر رکھنا پڑتا ہے لیکن جب وہ عبدالحکیم کے ساتھ ہوتے تو ہر قسم کے موضوعات پر بحث ہوتی۔ حکمتِ رومی پر بات ہوتی، افکار غالب زیرِ بحث آتے۔ سائنس اور مذہب پر نکات بیان کیے جاتے۔ عشق اور عقل کے رموز بیان ہوتے۔ خلیفہ عبدالحکیم ہر موضوع پر اساتذہ سے بحث کرتا۔ پروفیسر سین کبھی کبھی تو چونک کر اس کی طرف دیکھتے۔ انہیں محسوس ہوتا کہ وہ کسی طالب علم سے نہیں اپنے کسی ہم عصر استاد سے بحث کر رہے ہیں۔ وہ یہ کہنے پر اکثر مجبور ہو جایا کرتے تھے کہ عبدالحکیم میرا وہ شاگرد ہے جو ایک نامور فلسفی بن کر ہندوستان کے افق پر چمکے گا۔

شاعری کا جو چسکا وہ لاہور سے لے کر آیا تھا اس میں کمی نہیں آئی تھی۔ کالج میں جب بھی کوئی سیاسی شخصیت یا حکومتی نمائندہ آتا تو وہ اس کی شان میں نظم لکھ کر سب سے پہلے اسٹیج پر پہنچتا۔ تقریری مقابلہ ہوتا تو وہی اس مقابلے کی جان ہوتا۔

اس دوران اس کا لاہور آنا جانا بھی لگا رہتا تھا لہٰذا شاعری کا شوق ماند نہیں پڑا تھا۔ اقبال کی شاعری کے اثر سے اس وقت کے نوجوانوں میں فلسفیانہ خیالات شاعری میں پیش کرنے کا رجحان عام تھا۔ عبدالحکیم تو فلسفے کا طالب علم تھا۔ اس کی غزلوں میں فلسفیانہ و حکیمانہ خیالات جا بہ جا نظر آنے لگے۔

غرض ہے زندگی سے سعیِ پیہم
اس سے ہے حصولِ ہر دو عالم

.....

کوئی ہستی نہیں یہاں جس میں
بے کراں گنجِ ممکنات نہیں

.....

ذوقِ تقلید تو ہے دونی ہمت کا ثبوت
راہ اپنی دل زندہ کوئی ایجاد کرو

.....

اے بے خبر ہے غیرتِ صد کیمیا یہ عشق
مٹی کو زر بنائے اگر اک نظر کرے

.....

بے عشق ہستی ہے تشنہ کامی
بے عشق دل ہے بے آب ماہی

.....

اک فقر ہے جس سے سرِ جبریل، ہوا خم
اک فقر ہے جس سے کہ ہے تذلیلِ گدائی

.....

کسی حسنِ باقی سے کر عشق پیدا
جو چاہے کہ داخل نہ ہو فانیوں میں

.....

ہے فنا اور بقا زیر و بم موجِ وجود
جس کا ساحل ہی نہیں ہم نے وہ دریا دیکھا

.....

اس ہنگامہ شعر و سخن میں امتحان کا زمانہ آ گیا۔ رزلٹ آیا تو اساتذہ کی پیش گوئیاں سچ ثابت ہوئیں، صوبے بھر میں اول آ کر فلسفے کا ریکارڈ قائم کر دیا۔ اسی امتیاز پر اسے تعلیمی فلسفے کے علاوہ مہاراجا قاسم بازار کا تمغا ملا۔

میاں فضل حسین مرحوم ان دنوں اسلامیہ کالج لاہور کے سیکریٹری، انہوں نے اس کا بے مثال کارنامہ

دیکھ کر کالج میں پروفیسری کا عہدہ پیش کیا۔ دوسری طرف اسپیکر مدارس کشمیر کی جانب سے پیش کش ہوئی کہ شیخ مقبول حسین ریونیو منسٹر کشمیر اسے اپنے دفتر کا سپرنٹنڈنٹ بنانا چاہتے ہیں۔

اس نے ان دونوں پیش کشوں کو ٹھکرا دیا اور مزید تعلیم کے لیے ایم۔اے میں داخلہ لے لیا۔ ایم اے میں آ کر تو اس کے جوہر... نظروں کو خیرہ کرنے لگے۔ ''نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو'' والا معاملہ تھا۔

انہی دنوں لاہور کے برکت علی محمڈن ہال میں ایک مشاعرہ ہوا۔ اس مشاعرے میں اسے بھی مدعو کیا گیا۔ یہ مشاعرہ اس لیے بھی یادگار بن گیا کہ اس میں آغا حشر کاشمیری کی شرکت بھی متوقع تھی۔ کئی دن پہلے ہی سے تیاریاں شروع ہو گئیں۔ اقبال کو بھی اس مشاعرے میں شرکت کرنی تھی۔

عبدالحکیم اس وقت ایم۔اے کا طالب علم تھا اور بہ مشکل بائیس سال عمر ہو گی۔ بڑے بڑے جید اساتذہ کی موجودگی میں اس نے امیر مینائی کی زمین میں یہ غزل پڑھی۔

کون کہتا ہے تجھے دیدۂ تر پیدا کر
بارشِ تیرِ حوادث میں جگر پیدا کر
گرم رو ہو کہ جہاں نقشِ قدم ہو تیرا
اس کفِ خاک میں بھی برق کے پر پیدا کر
تو اگر چاہے کہ گم ہو شبِ تاریک تری
سینۂ چاک یہ اندازِ سحر پیدا کر
قطرہ آغوشِ تلاطم میں گہر بنتا ہے
آبرو چاہے تو طوفاں میں گہر پیدا کر
خواہشِ تیغ کو ہے قوتِ بازو کی بھی شرط
آرزو تاج کی ہے تجھ کو تو سر پیدا کر
تیغِ ہستی کے لیے سنگِ فساں ہے پیکار
راہ ایمن ہے تو خود اس میں خطر پیدا کر

اس غزل کو سن کر آغا حشر بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے کچھ لوگوں سے کہا، اس لڑکے کو پکڑ کر میرے سامنے لاؤ۔ جب وہ حاضر ہوا تو انہوں نے یہ تاریخی جملہ کہا۔

''سچ تو یہ ہے برخوردار کہ اس عمر میں، میں اس سے اچھی غزل نہیں کہہ سکتا تھا۔''

یہ جملہ جونہی مشاعرے سے باہر نکلا اس غزل کی اور عبدالحکیم کی دھوم مچ گئی۔ ہر طرف چرچے ہو رہے تھے۔ علامہ تاجور نجیب آبادی نے رسالہ مخزن میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا

''خلیفہ صاحب پنجاب کے ان قابلِ قدر ہونہار نوجوانوں میں ہیں جن پر عملی دنیا ناز کرے گی..... قدرت کی فیاضیاں دیکھیے کہ خلیفہ صاحب کو شاعری کی دنیا میں بھی وہی مرتبہ حاصل ہے جو جہانِ فلسفہ میں۔ ڈاکٹر اقبال کے بعد پنجاب بھر میں آپ سے بہتر کوئی شاعر نہیں۔''

علامہ تاجور جیسے ادیب کی رائے معمولی وقعت نہیں رکھتی تھی۔ اس کی شہرت یکدم زمین سے آسمان پر پہنچ گئی۔

وہ دہلی واپس گیا تو شہرت کا تاج اس کے سر پر رکھا ہوا تھا۔

ایم۔اے کے امتحان کے لیے اس نے مولانا روم کے فلسفیانہ افکار پر مقالہ لکھا۔ رومی کو منتخب کرنا اور ان پر ایک بصیرت افروز مقالہ لکھنا اس امر کی نشاندہی کرتا تھا کہ وہ اسلامی افکار سے بطور خاص رغبت رکھتا ہے اور دیگر نوجوانوں کی طرح مغرب کے فلسفے پر جان نہیں چھڑکتا۔

اس کے محسنوں میں علامہ اقبال بھی تھے جن سے وہ شاید اسی طرح عشق کرتا تھا جس طرح رومی سے۔ اس امتحان کا رزلٹ بھی حسبِ امید سامنے آیا۔ نہ صرف ایم۔اے پاس کیا بلکہ پنجاب بھر میں اول آیا اور تمام فرسٹ ڈویژن پاس شدگان میں بھی سرفہرست رہا۔

وہ دلی سے لاہور آ گیا۔ شاعر کی حیثیت سے اس کی شہرت تو ہو ہی چکی تھی۔ لاہور کی ادبی محفلوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

ذوالفقار علی خان پٹیالے سے آ کر لاہور میں مقیم ہوئے تو ان کی اقامت گاہ ایک اور ادبی محفل کا مرکز بن گئی۔ 1917ء میں جب خلیفہ عبدالحکیم ایم۔اے کا امتحان دینے کے بعد لاہور آیا تو ذوالفقار علی خان کے گھر پر ادبی محفلیں عروج پر تھیں۔ لاہور کے تمام قابلِ ذکر شعرا یہاں جمع ہوتے تھے۔ علامہ اقبال ان محفلوں کی روح تھے۔ عبدالحکیم بھی ان محفلوں میں شریک ہونے لگا۔ یہاں اقبال کی قربت نصیب ہوئی تو وہ ان کی خدمت میں شاگردی کے لیے حاضر ہو گیا۔ اقبال بھی اس جوہرِ قابل کو پہچان چکے تھے۔ وہ اقبال کو اپنا کلام دکھانے لگا۔

اس رشتے نے اسے اقبال کے طرزِ شاعری میں ڈھال دیا۔ اس کی شاعری میں کم و بیش وہی عناصر نظر آنے لگے جن سے اقبال کی شاعری کا خمیر اٹھا تھا۔ صدیوں کی غلامی سے مخمور اور مردہ دل قوم کو خوابِ غفلت سے جگانا،

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماضی کی عظمت پر آنسو بہا کر حال اور مستقبل سے آنکھیں موند لینے والوں کو حقیقت کا آئینہ دکھانا، انسان کو اس کی خودی کی رفعت اور اس کی بے کراں وسعت کا یقین دلا کر اس کے عمل اور مقام کا تعین کرنا، غلط قسم کے معتقدات کی نشان دہی کرتے ہوئے کلمہ حق کہہ گزرنا۔ یہ اور اس قسم کے دیگر عناصرِ ترکیبی اس کی شاعری کا طرۂ امتیاز بننے لگے۔

مجھے اس کی جستجو ہے جو قریب تر ہے جاں سے
نہ کبھی سمجھ میں آیا یہ وصل یا جدائی
ترے حسن نے کیے ہیں مہ و آفتاب پیدا
کہ ہے عشق کی بدولت یہ ظہور خود نمائی

.....

موجِ رواں ہے زندگی گر کے بھی سر اٹھائے جا
لعل و گہر کا بن چراغ بادیں جگمگائے جا
گل نے کہا کہ عندلیب میں بھی ہوں چاکِ پیرہن
تو بھی مری طرح سے جی درد میں مسکرائے جا
چھوڑ دے فکر بیش و کم کیا ہے جہاں کا رنج و غم
عشق سے دل میں نور کر حسن سے لو لگائے جا
فیض کا در نہ بند کر حوصلہ کچھ بلند کر
دے کے یہاں یہ لے حیات کھو کے یہاں یہ پائے جا

اردو شاعری میں مناظرِ فطرت پر گنتی کی نظمیں ملتی ہیں۔ چند شعرا مثلاً نظیر اور اقبال نے اس طرف توجہ دی۔ اقبال کی پیروی میں عبدالحکیم نے لاتعداد نظمیں کہیں جن میں مناظرِ فطرت کی عکاسی کی گئی تھی۔

.....

بادل سیاہ فام اٹھا جھومتا ہوا
مستی میں کوہسار کا منہ چومتا ہوا
(کیف بہار)

.....

پتّوں پہ پڑی ہوئی ہے کچھ اوس
اپنے لبِ تر سے ہے چمن بوس
چمکائے فلک نے شب کو تارے
تھوڑے سے زمیں پہ ہیں اتارے
(شبنم)

.....

آگئی وہ جھومتی کالی گھٹا
خوب پی کر مست متوالی گھٹا
رحمتوں کی گرد کی پالی ہوئی
بجلیوں اور چشمکوں والی گھٹا
(کالی گھٹا)

بے کاری کے دنوں میں شاعری اور دوستوں کے سوا اسے کوئی کام ہی نہیں تھا۔ تکیہ سادھواں میں رات کے وقت محفل جمتی تھی جس میں سارے دوست شرکت کیا کرتے تھے۔ ان دوستوں میں ایک صاحب قاضی مختار احمد بھی تھے جو وکالت کے امتحان کی تیاری کر رہے تھے۔ ایک دن مذاق مذاق میں عبدالحکیم نے ان سے کہا ''آج کل بے کار بیٹھا رہتا ہوں۔ اگر تم قانون کی کتابیں میرے سامنے پڑھ دیا کرو تو تمہاری بھی پڑھائی ہو جائے گی اور انہیں سن کر میں بھی امتحان میں بیٹھ جاؤں گا۔''

قاضی صاحب نے بھی ازرہِ مذاق کہا ''مجھے دس روپے ماہوار دے دیا کرو تو میں یہ فریضہ ادا کرنے کے لیے تیار ہوں۔

خلیفہ نے یہ شرط منظور کر لی اور ایل ایل بی میں داخلہ لے لیا۔ اب صورت یہ تھی کہ قاضی صاحب کتابیں پڑھتے تھے اور عبدالحکیم ان مضامین کو ذہن نشین کرتا جاتا۔ ذہانت اور حافظے کا یہ عالم تھا کہ جو کچھ سنتا یاد کر لیتا۔

امتحان سر پر آ گیا۔ یہ دونوں امتحان میں شریک ہوئے۔ دلچسپ بلکہ مزیدار بات یہ ہوئی کہ نتیجہ نکلا تو قاضی صاحب فیل اور عبدالحکیم نہایت اچھے نمبروں سے کامیاب ہو گیا۔ قاضی صاحب عرصے تک کہتے رہے کہ تمہارے پڑھانے کے چکر میں، میں اپنی تیاری نہ کر سکا تھا۔

اس نے ایل ایل بی کر ضرور لیا تھا لیکن وکالت کو بہ طور پیشہ اختیار کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ وہ کسی ایسی ملازمت کی تلاش میں تھا جو اس کے ذوق کا سامان بھی مہیا کرے اور آمدنی کا ذریعہ بھی ہو۔

اقبال بھی جانتے تھے کہ خلیفہ کو ملازمت کی تلاش ہے۔ وہ اپنی طرف سے بھی اس کے لیے کوشش کر رہے تھے۔ وہ ایک دن ان سے ملنے پہنچا تو وہ جیسے اس کا انتظار ہی کر رہے تھے۔

''خلیفہ اچھا ہوا تم آ گئے۔ میں آدمی بھیج کر تمہیں بلوانے ہی والا تھا۔''

''دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔ آپ نے یاد فرمایا اور میں آ گیا۔''

''حیدر آباد سے چیف منسٹر سر اکبر حیدری کا خط آیا ہے'' اقبال نے اسے بتایا۔ ''عثمانیہ یونیورسٹی کھلی ہے اور

انہیں فلسفے کے لیے پروفیسر کی ضرورت ہے۔ اس کا جواب میں نے لکھ دیا کہ میں ایسا آدمی بھیجنا چاہتا ہوں جس کی بابت آپ محسوس کریں گے کہ وہ بھی اقبال ہے۔''

یہ اتنی بڑی سفارش تھی کہ اس کا تقرر ہو جانا لازمی تھا۔ اقبال نے اس سے کہہ بھی دیا تھا کہ وہ تقرری کے خط کے لیے تیار رہے۔ خط کسی بھی وقت آ سکتا ہے۔

جوانی کی عمر تھی۔ ایسی تاکیدوں کی پروا کسے ہوتی ہے۔ اسے لاہور میں ہونا چاہیے تھا لیکن وہ اپنے دوست ملک عبدالمجید کے ہمراہ ایک پہاڑی مقام ''مسوری'' چلا گیا۔ دونوں کی جیب میں سو سو روپے تھے۔ وہ کرنال سے ہوتے ہوئے مسوری جا پہنچے اور ایک بڑے ہوٹل میں قیام کیا۔ دوسرے دن جب بل آیا تو پندرہ روپے کا تھا۔ عبدالحکیم اپنی عام زندگی میں نہایت کفایت شعار تھا، زیادہ خرچیلا نہیں تھا۔ یہ بل دیکھ کر وہ سوچ میں پڑ گیا۔

''یار مجید، ہم ایک دن میں پندرہ روپے خرچ کر بیٹھے ہیں۔ یہ ہوٹل تو ہمیں محتاج کر دے گا۔ ہم یہاں ایک مہینے کے لیے آئے ہیں۔ اس حساب سے تو ہمیں پندرہ دن میں ہی بستر باندھنا پڑ جائے گا۔''

''یہ تو ہے۔''

''جلدی اٹھو یہاں سے اور کوئی سستی جگہ ڈھونڈو۔''

بات عبدالمجید کی سمجھ میں بھی آ گئی۔ دونوں نے بارلو گنج میں ایک بنیے کی دکان کے اوپر دو کمرے اور غسل خانہ بیس روپے ماہوار کرائے پر لے لیا۔

بارلو گنج کے قریب لڑکوں کے اسکول میں ایک تالاب تھا۔ عبدالمجید کو تیراکی کا شوق تھا۔ اس نے یہ جگہ ڈھونڈ لی۔

''ایسے کمال کا تالاب ڈھونڈا ہے کہ تمہیں مزہ آ جائے گا۔''

''تالاب ڈھونڈا ہے؟''

''ہاں بھئی۔ مزے سے تیراکی کریں گے۔''

''مگر مجھے تو تیرنا آتا ہی نہیں۔''

''ارے! تمہیں تیرنا نہیں آتا۔ یہ پہلا کام ہے جو تمہیں نہیں آتا۔'' عبدالمجید نے کہا۔ ''خیر، میں تیرتا رہوں گا اور تم بیٹھ کر دیکھتے رہنا۔''

''یہ کوئی تفریح ہوئی۔ میں کیا وہاں بیٹھ کر مکھیاں ماروں گا۔''

''تم مجھے دیکھ کر تیرنا سیکھنا۔''

''جناب مجھے اس کام سے کوئی دلچسپی نہیں۔''

''یار، میرے ساتھ تو چلو۔''

عبدالمجید زبردستی اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ عبدالمجید پانی میں اتر گیا اور وہ کنارے پر بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد اسے اپنی شکست کا احساس ہوا۔ سوچا پانی میں کود جائے لیکن وہ دیکھ رہا تھا کہ پانی بہت گہرا ہے۔ اسے ایک ترکیب سوجھی، وہ کمرے میں گیا اور بستر کی چادر اٹھا لایا۔ اس کا ایک سرا اپنی کمر سے باندھ لیا اور دوسرا عبدالمجید کو تھما دیا اور ہدایت کر دی کہ بہ وقتِ ضرورت کھینچ لے۔ وہ پانی میں کودا تو چادر کی گانٹھ کھل گئی۔ پانی اتنا گہرا تھا کہ وہ ڈوبتا چلا گیا۔ عبدالمجید تیراک تھا لیکن کسی ڈوبتے کو بچانا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ عبدالمجید نے جان پر کھیل کر اسے باہر نکالا اور خلیفہ نے عہد کیا کہ وہ زندگی میں کبھی پانی میں پاؤں نہیں ڈالے گا۔

اس رات وہ بڑے بھیانک خواب دیکھتا رہا تھا۔

صبح اٹھا تو اقبال کا خط اس کا منتظر تھا۔ وہ انہیں بتا چکا تھا کہ وہ بارلو گنج میں ہے۔ اس کے باوجود اقبال کا خط آنا خلافِ توقع تھا۔ اس نے خط پڑھا تو اقبال نے اسے فوراً طلب کیا تھا۔ حیدر آباد سے اسے ملازمت کی پیش کش ہوئی تھی۔ وہ یہ موقع گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ اب ٹھکانا چھوڑنے کے لیے پیسے کی تلاش ہوئی جو اس وقت شاید بارلو گنج میں نہیں تھا۔ اس کا کرایہ اسے دینا تھا اور وہ مل نہیں رہا تھا۔ وہ اسے بتائے بغیر ہی لاہور آ گیا۔ لاہور آ کر بہ ذریعہ منی آرڈر کرایہ بھیجا۔

یہ نوکری اس کے مطلب کی تھی۔ حیدر آباد کی ادبی شہرت اس کے کانوں تک پہنچ چکی تھی۔ ہندوستان بھر کے شعرا اس مسلمان ریاست میں جمع تھے۔ دارالترجمہ کی شہرت بھی اس تک پہنچ چکی تھی۔ جامعہ عثمانیہ کے اس دارالترجمہ کے تحت ہونے والے تراجم بھی اس کی نظر سے گزر چکے تھے، جامعہ عثمانیہ میں اردو ذریعہ تعلیم تھی۔ وہاں کے اساتذہ نے اردو زبان کو وسیع کرنے اور نصاب کے لیے کتب مہیا کرنے کے لیے مختلف زبانوں کے تراجم اردو میں کیے تھے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ مولوی عبدالحق، سید عبداللطیف، عبدالباری ندوی، الیاس برنی، ہارون خان شروانی جیسے جید علما وہاں جمع ہیں۔ ایک گلدستہ ہے جو اس ریاست میں سشامِ جاں کو مہکا رہا ہے۔ اسے خوشی ہو رہی تھی کہ وہ بھی اس گلدستے میں شامل ہونے جا رہا ہے۔ وہاں رہ کر ان علما کی صحبتوں سے فیض یاب ہونے

WWW.PAKSOCIETY.COM

کا موقع ملے گا۔

ہدایت کے مطابق حیدرآباد جا کر سر اکبر حیدری سے ملا۔ ان کی مہمان نوازی نے اسے یہ احساس ہی نہیں ہونے دیا کہ وہ حیدرآباد میں ہے۔

''آپ کی تقرری کے احکامات پہلے ہی جاری ہو چکے ہیں۔ جب تک آپ کے رہنے کا بندوبست نہیں ہو جاتا آپ میرے غریب خانے پر قیام کریں گے۔''

اس کے وہم و گمان میں کبھی نہیں آسکتا تھا کہ ریاست کا چیف منسٹر اسے اپنا مہمان بنائے گا۔ اسے یقین آ گیا کہ ان لوگوں کی علم دوستی جامعہ عثمانیہ کو ضرور بامِ ترقی پر پہنچائے گی۔

دوسرے دن وہ یونیورسٹی گیا تو وہاں پہلے سے موجود اساتذہ نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ خصوصاً پروفیسر ہارون خان شروانی اور وحید الدین سلیم پانی پتی تو اس سے اس طرح پیش آئے جیسے برسوں کے شناسا ہوں۔ پروفیسر ہارون خان شروانی نے تو پہلے ہی دن اسے اپنے بنگلے پر قیام کرنے کی پیش کش کر دی۔

''چیف منسٹر کے بنگلے پر رہ کر آپ کو وہ بے تکلفی نصیب نہیں ہو سکے گی۔ آپ اپنا سامان لے کر میرے گھر چلے آئیے۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔''

وہ خود یار باش تھا۔ سر اکبر حیدری کے گھر سے وہ ہارون شروانی کے گھر منتقل ہو گیا۔ پروفیسر صاحب کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ کس کو اپنے گھر لے جا رہے ہیں۔ یہ اندازہ تو اس وقت ہوا جب فرصت سے باتیں کرنے کا موقع ملا۔ پروفیسر صاحب یہ کہنے پر مجبور ہو گئے۔

''عبدالحکیم علم و فضل کا دیو ہے اور ایسا دیو جو کسی کتاب میں مقید نہیں ہو سکتا۔ معمولی معمولی مسائل پر اس کی گفتگو علم کے دریا بہاتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نرم سیر دریا کی تہ میں سمندروں کی طغیانی پوشیدہ ہے۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی شخص ذوقِ سلیم رکھتا ہو اور اس سے مرعوب نہ ہو۔''

اس اعلیٰ درجے کی علمی قابلیت کے باوجود تکبّر اور غرور قریب ہو کر نہیں گزرا تھا۔ بذلہ سنجی اور مزاح آفرینی طبیعت کا حصہ تھی لہٰذا اس کے پہنچتے ہی ہارون شروانی کا بنگلا، کلب بن گیا۔ وہ تمام حضرات جو یونیورسٹی کلب میں جمع ہوتے تھے، ہارون شروانی کے بنگلے پر جمع ہونے لگے۔ خلیفہ کی بذلہ سنجیاں اپنے عروج پر ہوتیں۔ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ کوئی بہت بڑا عالم ہے لیکن جب کوئی سنجیدہ موضوع چھڑ جاتا تو پھر علم کے ایسے دریا بہتے کہ سب خاموش بیٹھے سنتے رہتے۔

یہ محفلیں رات گئے تک جگمگاتی رہتیں۔ احباب رخصت ہو جاتے تو خلیفہ کے کمرے سے گنگنانے کی آوازیں آنے لگتیں۔ اس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ کوئی نظم یا غزل کہنے میں مشغول ہے۔ خدا جانے وہ سوتا کب تھا کیونکہ سحر خیز تھا۔ صبح ہوتے ہی اٹھ بیٹھتا تھا۔

اس بنگلے کی پشت پر ایک خانہ باغ تھا۔ وہ علی الصباح اٹھ جاتا اور ناشتے کے بعد اس باغ میں نکل آتا۔ ایک درخت کے نیچے آرام کرسی پڑی ہوئی تھی اس پر بیٹھ جاتا اور کوئی نہ کوئی کتاب پڑھنے میں مشغول ہو جاتا۔ یہ ساڑھے دس بجے تک جاری رہتا کیونکہ گیارہ بجے یونیورسٹی پہنچنا ہوتا تھا۔ دوپہر کو یونیورسٹی سے واپس آتا تو کھانے کے بعد کچھ دیر کے لیے آنکھ جھپکتا۔ یہ ایسا وقت ہوتا تھا کہ کوئی اس کی نیند میں خلل اندازی نہیں کر سکتا تھا حتیٰ کہ کوئی سرکاری کام بھی اسے بیدار نہیں کر سکتا تھا۔ یونیورسٹی میں اگر کوئی میٹنگ ہوتی تو اس وقت نہیں رکھی جا سکتی تھی۔

بیدار ہونے کے بعد وہ پھر اسی باغ اور اسی کرسی پر نیم دراز ہو جاتا۔ یہ سلسلہ مغرب تک رہتا پھر احباب جمع ہو جاتے۔ مطالعہ موقوف گفتگو دراز، کبھی کبھی شام کا حصہ یونیورسٹی کلب میں گزرتا جہاں سارا وقت دوستوں سے چھیڑ چھاڑ میں مصروف رہتا۔

وہ صرف علمی صحبتوں ہی کا مردِ میدان نہیں تھا بلکہ کلاس کے اندر بھی اس کا ایک منفرد انداز تھا۔ اسے خشک لیکچر بازی کا رسمی طریقہ پسند نہیں تھا۔ اس کا اندازِ تدریس یہ تھا کہ طلبہ کی جماعت میں فلسفیانہ مسائل و مباحث پر بے تکلف گفتگو کرتا جیسے ہم صحبتوں سے تبادلہ خیالات ہو رہا ہے۔ اس سے طلبہ میں ذوقِ تجسّس بیدار ہوتا۔ طلبہ اس کی دلچسپ تقریر سننے میں محو ہو جاتے۔ کوئی درسی کتاب اس کے سامنے نہ ہوتی۔ جو کچھ ہوتا وہ اس کا بے پناہ مطالعہ ہوتا جو وہ طلبہ کے حوالے کر رہا ہوتا۔ درمیان میں رومی، سعدی، حافظ، غالب اور اقبال کے اشعار سناتا جاتا۔

اس کی اسی مقبولیت نے اس کا شمار یونیورسٹی کے بہترین اساتذہ میں کر دیا تھا۔ اس کا نمبر دوسرا تھا۔

☆☆☆

''اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے''

اب کے جو وہ لاہور گیا تو گرفتاری کا سامان سامنے تھا۔ ماں نے اس کے لیے پہلے ہی لڑکی دیکھ رکھی تھی۔ مشورہ کیا حکم ملا کہ بس شادی کرنی ہے۔ ماں کے سامنے انکار کی تو جرات نہیں تھی لیکن اپنی مجبوریاں ضرور بیان کر دیں۔

''ابھی تو میری نوکری کو پورے دو سال بھی نہیں ہوئے ہیں۔ میرے قدم تک جائیں تو پھر سوچوں گا۔''

''تمہارے پاس وقت ہوگا، میرے پاس نہیں ہے۔ میں چاہتی ہوں جتنی جلدی یہ کام ہو جائے اتنا اچھا ہے۔ میں نے تمہاری پسند اور معیار کا پورا خیال رکھا ہے۔ لڑکی میری کوئن کالج میں زیرِ تعلیم رہی ہے۔ گھریلو کام کاج میں بھی طاق ہے۔ سلائی کڑھائی بھی خوب جانتی ہے۔ اچھے گھر کی ہے۔ عمر بھی 19 سال ہے۔''

''اماں جان، کیوں اس پر ظلم کرتی ہیں۔ اس کی تعلیم ادھوری رہ جائے گی۔ تعلیم تو مکمل کرنے دیں۔''

''تمہیں تعلیم دلانے کا شوق ہے۔ یہ شوق بھی پورا کر لینا۔ شادی کے بعد بھی پڑھ سکتی ہے۔''

وہ ماں کے آگے مجبور ہو گیا۔

اب سوال یہ تھا کہ شادی کے بعد اپنی بیوی (خدیجہ) کو رکھے گا کہاں۔ وہ تو خود پروفیسر ہارون کے بنگلے میں قیام پذیر تھا۔

وہ حیدرآباد آیا اور علیحدہ مکان لے کر لاہور چلا آیا۔ شادی کے بعد خدیجہ کو لے کر حیدرآباد آ گیا اور علیحدہ مکان میں رہنے لگا۔ کچھ عرصے بعد اپنا ذاتی بنگلا بنوا لیا تھا۔

چھٹیاں ختم ہوئیں تو وہ ایک مرتبہ پھر تدریسی عمل میں مشغول ہو گیا۔

شادی کے دو سال بعد ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام اس نے عارف حکیم رکھا۔

یہ لڑکا ایسا مبارک ثابت ہوا کہ اسی سال یونیورسٹی نے اسے اسکالرشپ پر جرمنی بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی عبدالغنی، اپنی اہلیہ اور خورد سال عارف حکیم کے ہمراہ یورپ روانہ ہوا اور پی ایچ۔ ڈی کے لیے ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔

اس نے ایم۔ اے میں رومی پر تحقیقی مقالہ لکھا تھا۔ اس کام کو آگے بڑھاتے ہوئے اس نے ڈاکٹریٹ کے لیے بھی رومی کا انتخاب کیا اور فلسفۂ رومی پر تحقیق کا آغاز کر دیا۔ رومی کی مابعد الطبیعیات اس کا موضوع تھا۔

سوانحی خاکہ

نام..... خلیفہ عبدالحکیم
والد..... خلیفہ عبدالرحمن
تعلیم..... ایم۔ اے
(سینٹ اسٹیفن کالج دہلی)
پی ایچ۔ ڈی
(ہائیڈل برگ یونیورسٹی، جرمنی)
ایل ایل۔ بی (لا کالج لاہور)
ملازمت..... جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن
امر سنگھ کالج، سری نگر
ناظم تعلیمات
بانی..... ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور
تاریخ پیدائش..... 12 جولائی 1894ء
وفات..... 30 جنوری 1959ء
تدفین..... میانی صاحب قبرستان، لاہور

کچھ دن بعد ہی خلیفہ یہ محسوس کرنے لگا کہ خدیجہ کی ہمراہی کی وجہ سے تحقیقی کام میں خلل واقع ہو رہا ہے۔ وہ خدیجہ سے یہ بات کہتے ہوئے ہچکچا رہا تھا کہ وہ واپس چلی جائے اور جب کہنے کی ہمت ہوئی تو یہ رکاوٹ درمیان میں آ گئی کہ خدیجہ حاملہ تھی۔ اب بچے کی پیدائش تک اس کا رکنا ضروری تھا۔

وقت مقررہ پر بچی کی پیدائش ہوئی۔ اس کا نام صوفیہ رکھا گیا۔ بچی بہت کمزور تھی اور یہاں کی آب و ہوا اسے راس نہیں آ رہی تھی۔ اب ضروری ہو گیا تھا کہ خدیجہ لاہور چلی جائیں جہاں بچی کی دیکھ بھال کرنے والے سب موجود ہیں۔ خدیجہ واپس آ گئیں لیکن بچی کی زندگی نہیں تھی۔ دس ماہ بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

1920 میں اس نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر لی۔ جرمنی سے واپسی پر وہ عثمانیہ یونیورسٹی میں صدر شعبۂ فلسفہ مقرر ہوا۔ تنخواہ میں بھی اضافہ ہوا اور مراعات بھی بڑھ گئیں۔ عزت و مرتبہ میں بھی اضافہ ہوا۔ شہر کے مشہور لوگوں میں آمد و رفت بڑھ گئی خصوصاً بہادر یار جنگ سے دوستانہ مراسم پیدا ہوئے۔

حیدرآباد علما، فضلا اور اہلِ کمال کا مرکز بنا ہوا تھا۔ بلند پایہ شاعر اور ادیب بھی وہاں کھنچے چلے آتے تھے۔ اس

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماحول میں اس کے اندر کا شاعر ایک مرتبہ پھر بیدار ہوا۔ تحقیقی کاموں نے کچھ دنوں کے لیے شاعری کے شوق کو پسِ پشت ڈال دیا تھا۔ حیدرآباد کے دوبارہ قیام نے اس شوق کو پھر ابھارا۔ اس نے کثرت سے نظمیں اور غزلیں کہیں۔ اس کا کلام مخزن اور مجلہ عثمانیہ میں باقاعدگی سے شائع ہونے لگا البتہ اسے مشاعروں سے رغبت نہیں تھی کیونکہ اسے رسمی شاعری اور رسمی مشاعروں سے نفرت تھی۔ شاعروں میں مدعو کرنے والے خوشامد درآمد سے رام کرلیتے تو چلا جاتا ورنہ اس کی کاوشیں اس کی بیاض اور رسائل تک محدود رہتیں۔

اسی قیامِ حیدرآباد کے زمانے میں اس کی ملاقات پروفیسر وحیدالدین سلیم پانی پتی سے ہوئی۔ انہی کی صحبتوں کا اثر تھا کہ عبدالحکیم کو فلسفی ہونے کے باوجود تصوف سے رغبت ہوئی۔ وحیدالدین سلیم تصوف پر یقین رکھتے تھے ان کی والدہ حضرت غوث علی شاہ کے پاس بطور خدمت گار رہتی تھیں۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ تصوف پر کتنا یقین رکھتے ہوں گے۔ عبدالحکیم سے دوستی کے بعد انہوں نے اسے بھی اس طرف راغب کیا۔ عبدالحکیم کو آنکھوں دیکھے تجربات اور مشاہدات بتایا کرتے تھے اور عبدالحکیم کا علمی ذہن ان واقعات کی نفسیاتی تشریح کرنے کے ساتھ ساتھ ان پر اپنے یقین کا اظہار بھی کرتا تھا۔ آہستہ آہستہ، اس پر صوفیانہ خیالات کا غلبہ ہونے لگا۔ وہ فلسفی ہونے کے باوجود یہ کہنے لگا۔

''عالمِ ہست و بود صرف مادّیت ہی پر مبنی نہیں ہے اور جو کچھ بھی یہاں ہے مادّہ ہی کے اظہار و نمود کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ روحانی عالم بھی موجود ہے جس کا اس عالمِ اسباب سے گہرا تعلق ہے۔''

اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا تھا۔

''انسانی قوتیں یا کرامات کوئی کمال نہیں۔ ان کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہی بلند انسان ہے جس کے اندر روحانی و اخلاقی اقدار موجود ہیں۔''

وہ یہ بھی کہتا تھا۔

فقر و درویشی صرف مسلمانوں کی جاگیر نہیں بلکہ جس طرح بلند انسان فرقہ وارانہ جھگڑوں سے بلند تر ہوتا ہے اسی طرح اعلیٰ صوفی بھی قومی تعصبات سے بالاتر ہوتا ہے۔''

کہتے ہیں شاعری اور تصوف کا چولی دامن کا ساتھ ہے یا یوں کہہ لیجیے کہ صوفیانہ خیالات کے اظہار کے لیے شاعری سے کامیاب اور کوئی ذریعہ نہیں۔

تصوف کے مطالعہ کے بعد اس کی شاعری بھی ایک نئے رنگ سے آشنا ہوئی۔

آنکھ جس سمت اٹھائی ترا جلوہ دیکھا
ذرّے ذرّے کو یہاں ناصیہ فرسا دیکھا
ہے تری راہ میں ہر ایک قدم چشمۂ نور
ہم نے ہر نقشِ قدم کو یدِ بیضا دیکھا
جس کو دعویٰ ہے کہ ہوں خلوتِ جاں میں مستور
شوقِ جلوت میں اسے انجمن آرا دیکھا
ڈھونڈتی جس کو نظر تھی وہ نظر میں تھا خیال
جو کسی جا پہ نہیں ہے اسے ہر جا دیکھا
شوقِ محفل بھی ہے اور اس پہ کم آمیزی بھی
کثرتِ دہر میں ہم نے اسے تنہا دیکھا

خلیفہ عبدالحکیم کے ملنے والوں میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو دارالترجمہ سے وابستہ تھے۔ عبدالحکیم کی علمی حیثیت کا تقاضا تھا کہ وہ علمی سرمایہ دوسروں تک منتقل کرے۔ جامعہ عثمانیہ کو ایسی کتابوں کی ضرورت بھی تھی۔ علمی صلاحیت سے سب واقف تھے کہ اگر وہ تصنیف و تالیف کے میدان میں اترے تو اردو زبان پر بہت سے احسان کر گزرے گا۔ ان احباب نے اسے تراجم کی طرف راغب کیا۔ یہیں سے اس کی تصنیفی زندگی کا آغاز ہوا۔

اس نے پہلا ترجمہ ہسٹری آف فلاسفی کا کیا۔ اردو میں اس کتاب کا نام تاریخ فلسفہ ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی نے اسے شائع کیا۔ دوسری کتاب ہسٹری آف ماڈرن فلاسفی تھی جسے اس نے تاریخ فلسفہ جدید کے نام سے اردو کے قالب میں ڈھالا۔ تیسری کتاب ''مختصر تاریخ فلسفہ یونان'' کا ترجمہ تھی۔

ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنے والے کا کمال یہ ہوتا ہے کہ مترجم دونوں زبانوں پر یکساں قدرت رکھتا ہو۔ خاص طور پر علمی تراجم میں اس وصف کا ہونا بہت ضروری ہے۔ اصطلاحات کا تعم البدل سب سے بڑی مشکل ہوتا ہے۔ ان مشکلات پر عبور حاصل کرنے کے لیے مترجم کی نہ صرف اصل مصنف تک کامل رسائی ضروری ہے بلکہ اس کا اس مضمون پر ہمہ جہت عالم ہونا بھی لازمی ہے۔

خلیفہ عبدالحکیم کو فلسفے پر غیر معمولی عبور حاصل تھا۔ انگریزی اور اردو پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ اسی لیے

اس کے ترجموں کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا تھا جیسے اصل مصنف انگریزی کے بجائے اردو میں لکھ رہا ہے۔ ''تاریخ فلسفہ'' کے بارے میں ایک بات بڑی شدومد سے کہی جاتی ہے کہ اردو نثر کی روح انگریزی زبان میں ضم ہوگئی ہے۔

اس نے اپنی اس قدرت کو پہچان لیا تھا جو اسے ترجمہ کرنے پر حاصل تھی لہٰذا جامعہ عثمانیہ کی ملازمت کے بعد بھی اس کے متعدد تراجم شائع ہوئے۔

ایسے ہی تراجم میں مشہور کتاب بھگوت کا ترجمہ ہے۔ اس لیے بھی اہم ہے کہ یہ ترجمہ منظوم ہے جس سے عبدالحکیم کی شاعرانہ قدرت کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

عبدالحکیم نے بھگوت گیتا کا ایک ترجمہ زمانہ طالب علمی میں پڑھا تھا۔ اس کے اکثر برجستہ اشعار اس کے لوحِ ذہن پر ثبت ہوگئے تھے۔ دل میں ارادہ بھی ہوا تھا کہ وہ بھی اس کا ترجمہ کرے لیکن اس وقت اس کے ترجمے کی جرات نہ کرسکا لیکن یہ خواہش دل میں پلتی رہی تھی۔ اس دوران اس نے گیتا کے اکثر تراجم پڑھ ڈالے۔ متعدد مضامین بھی دیکھے۔

یہ کام اس لیے اور بھی مشکل ہوگیا تھا کہ اس سے پہلے اس کتاب کے نثر و نظم میں بہت سے تراجم ہوچکے تھے۔ اس نے جب غور کیا تو دو قسم کے تراجم سامنے آئے۔ کچھ لوگوں نے لفظی ترجمہ کیا تھا کچھ نے آزاد ترجمہ کیا تھا۔ دونوں نقائص سے پاک نہیں تھے۔ لفظی ترجمہ کرنے والوں نے گیتا کی روح کو پامال کردیا تھا جبکہ آزاد تراجم میں مطالب و مفاہیم میں افراط و تفریط پیدا ہوگئی تھی۔ عبدالحکیم نے ان نقائص کو سامنے رکھتے ہوئے راستہ تو لفظی ترجمہ کا اختیار کیا لیکن اس طرح کہ لفظی ترجمہ ہوتے ہوئے بھی گیتا کی روح سے سرِ مو انحراف نہ کیا۔

آزاد ترجمہ کا راستہ اختیار اس لیے نہیں کیا کہ بقول خود

''ایک عظیم الشان الہامی تعلیم کے ساتھ یہ آزادی گستاخی معلوم ہوئی۔''

لفظی ترجمہ کیا اور اپنی طرف سے صرف ان الفاظ کا اضافہ کیا جو شعر کا وزن پورا کرنے کے لیے ضروری تھے اور ان سے مطلب و مقصد میں کمی واقع نہیں ہوئی۔

''بھگوت گیتا کے ''سونے'' کے ساتھ ساتھ اس ترجمے میں میرے الفاظ کے ''جو'' بھی شریک ہیں لیکن اصل کے ساتھ ملا کر اس ترجمے کو پڑھنے والے کو اس کا اندازہ ہوجائے گا کہ جو الفاظ میں نے اپنی طرف سے

اردو تصانیف

افکارِ غالب، اسلام کا نظریۂ حیات، حکمتِ رومی، داستانِ دانش، فکرِ اقبال، تشبیہاتِ رومی، دیوانِ حکیم۔ 75 سے زیادہ مقالات۔ انگریزی مقالات۔

.....

تراجم

تاریخ فلسفہ، تاریخ فلسفہ جدید (اول، دوم)
مختصر تاریخ فلسفہ یونان، واردات روحانی، بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ۔

ڈالے ہیں وہ محض بہ غرض و فرق نہیں ہیں بلکہ اکثر جگہ پر ان کا مقصد تشریحی ہے اور کوشش یہ کی گئی ہے کہ ترجمہ درست ہونے کے ساتھ تشریح اور شعریت سے ہم آغوش رہے۔''

(دیباچہ بھگوت گیتا)

اس کا ترجمہ دیگر ترجموں کی موجودگی میں نہایت وقیع اور جامع ہے۔ بعض اشعار سلاست کا بہترین نمونہ ہیں۔ اس سادگی کے باوجود مطالب کو اس طرح سمیٹا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔

یہ جانیں نہ قاتل نہ مقتول ہیں
جو ایسا سمجھتے ہیں مجہول ہیں
حقیقت ہے جو آفریدہ نہیں
وہ دستِ قضا سے بریدہ نہیں
ہر اک روح ہے نفخِ روحِ ازل
نہ اس میں تغیر نہ اس میں بدل
یہ جوہر نہ ہرگز گھٹے اور بڑھے
نہ کاٹے چھٹے اور نہ اترے چڑھے
جو اس راز سے آشنا ہوگیا
وہ عارف سراپا بقا ہوگیا
بدن کی یہ سب صورتیں ہیں لباس
بدلتی نہیں جس سے جاں کی اساس
اگر جامہ ناپاک ہو اور کہن
ہے بہتر اتر جائے وہ پیرہن
جو آلودہ ہو پیرہن پھینک دے
اسی طرح جاں پہ بدن پھینک دے

WWW.PAKSOCIETY.COM

ابھرتے، سنورتے، گزرتے ہیں سب
عدم کی طرف عود کرتے ہیں سب
اٹھاتی ہے سر جیسے دریا سے موج
گھڑی بھر کا ہے سب غرور اوراوج

وہ اپنی زندگی کے خوشگوار ترین دن گزار رہا تھا کہ کشمیر سے بلاوا آگیا۔ مہاراجا کشمیر اور نظام حیدر آباد کے درمیان نہ جانے کیا باتیں ہوئیں کہ خلیفہ عبدالحکیم کے پاؤں حیدر آباد سے اکھڑ گئے۔

امر سنگھ کالج سری نگر کے پرنسپل کی اسامی خالی ہوئی تھی۔ حکومت کشمیر نے نظام حیدر آباد سے خلیفہ صاحب کی خدمات مستعار مانگ لیں۔ اسے یہ احکامات ملے تو تھوڑی دیر کے لیے پریشانی طاری ہوگئی۔ حیدر آباد میں رہنے کے لیے بنگلا بنوالیا تھا۔ بہت سا سامان تھا جو سب کشمیر لے جانے کا نہیں تھا۔ اسے بیچنا پڑتا۔ دوسری طرف مناظر کشمیر نگاہوں کے سامنے گھوم رہے تھے۔ کشمیر اس کے آباؤاجداد کا وطن بھی تھا اور اب وطن کی خدمت کا موقع مل رہا تھا۔ ان سب باتوں نے مل جل کر اسے کشمیر جانے پر رضامند کرلیا۔ سفر کی تیاریاں ہونے لگیں۔ تمام اثاثہ اونے پونے بیچ دیا۔ ہفتوں تک دعوتیں اور عصرانے ہوتے رہے۔ طلبا اور اسٹاف میں ہردلعزیزی اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ سب ہی شان وشوکت سے رخصت کرنا چاہتے تھے۔

کچھ دن پرنسپل شپ کے عہدے پر رکھنے کے بعد اسے ناظمِ تعلیمات بنادیا گیا۔ اس سے پہلے یہ عہدہ غلام السیدین کے پاس تھا۔

یہ عہدہ عبدالحکیم کے مزاج کے قطعی ناموافق تھا۔ یہ ایک قسم کی کلرکی تھی جس کے لیے وہ مجبور کردیا گیا تھا۔ وہ سچے دل سے اپنے آبائی وطن کی خدمت کرنا چاہتا تھا مگر حکومت کشمیر تعلیم کو تجارتی طریقے پر لانا چاہتی تھی۔ حکومت اور خلیفہ کی پالیسیوں میں بڑا اختلاف تھا۔ اس کے باوجود اس نے کشمیر میں چار سال گزار دیے۔ اس دوران شیخ عبداللہ سے گہرے مراسم ہوگئے تھے۔

سچ تو یہ ہے کہ کشمیر کا حُسنِ بے مثال اس کے پاؤں کی زنجیر بنا ہوا تھا۔ یہاں کے قدرتی مناظر اس کی شاعری کو نکھارنے میں معاون ثابت ہورہے تھے۔ اس دور کی تمام شاعری منظر نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔

پیدا کیے چنار نے کیا بے شمار ہاتھ
بہرِ دعا زمیں نے اٹھائے ہزار ہاتھ
خورشید تیری راہ میں ہے اِک گدائے نور
پھیلا کے بیٹھتا ہے سرِ رہگزار ہاتھ
بادِ صبا کچھ اس طرح کلیوں کو چھوگئی
جیسے حسین طفل کرتے ہیں پیار ہاتھ

اس کا ارادہ تھا کہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد کشمیر کو مستقل ٹھکانا بنالے گا باقی زندگی یہیں بیٹھ کر لکھنے پڑھنے میں بسر کرے گا۔ خدیجہ بھی اس کا ساتھ دینے کو تیار تھی۔

''خدیجہ بیگم، کشمیر کے باغ اور دریا ہر وقت مجھے اپنی طرف کھینچتے رہتے ہیں۔''

''حکیم صاحب، آپ شاعر ہیں اور شاعروں میں یہ مرض عام ہے۔ یاد ہے آپ نے ایک مرتبہ طنز کرتے ہوئے مجھ سے کہا تھا، ''خدیجہ! سہیلیاں تو خوبصورت بنایا کرو۔''

''ارے ہاں یاد آیا'' عبدالحکیم نے زوردار قہقہہ لگایا۔ ''سچ بتاؤ کیا غلط کہا تھا۔ میرا بس چلے تو تمام بدصورت لوگوں کو برقع پہنادوں۔''

''جب ذوقِ جمال کا یہ عالم ہے تو آپ کو کشمیر کیوں پسند نہ آئے گا۔''

''سوچتا ہوں ملازمت سے فراغت کے بعد زندگی کے باقی دن یہیں گزاردوں۔ بولو میرا ساتھ دوگی۔''

''آپ تو اس طرح قول وقرار کررہے ہیں جیسے آپ کہیں اور رہیں گے میں کہیں اور۔''

''سوچتا ہوں ابھی سے تیاری کرلی جائے۔ رہنے کا ٹھکانا بنالوں۔ کتابیں ابھی تک حیدر آباد میں پڑی ہوئی ہیں۔ سوچتا ہوں یہاں مکان بن جائے تو کتب خانہ بھی یہیں اٹھالاؤں۔''

''آپ نے جب یہاں قیام کا ارادہ کرلیا ہے تو میں آپ کے ساتھ ہوں۔''

خلیفہ عبدالحکیم نے ذاتی جائداد پیدا کرکے ''نسیم باغ'' میں ایک بنگلا تعمیر کرالیا۔ وہ اپنی کتابوں کا قیمتی ذخیرہ بھی یہاں لے آیا جو اس نے ربع صدی کے عرصے میں جمع کیا تھا۔

خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ کشمیر کے سیاسی حالات وقت کے ساتھ ساتھ دگرگوں ہوتے چلے گئے۔ تقسیم ہند کی

بازگشت سنائی دی پھر کشمیر فسادات کی لپیٹ میں آگیا۔ اب یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ وہ جبری نقل مکانی پر مجبور ہوگیا۔ اس حال میں کشمیر چھوڑنا پڑا کہ مکان کے ساتھ ساتھ کتابوں کا ذخیرہ بھی وہیں رہ گیا۔

وہ پھر حیدر آباد آگیا تھا۔ اس مرتبہ اسے عثمانیہ یونیورسٹی میں ڈین آف آرٹس فیکلٹی مقرر کیا گیا۔

پاکستان بن چکا تھا۔ لاہور، پاکستان کا حصہ بن گیا تھا۔ اس کا خاندان لاہور میں تھا اور وہ یہاں بیوی، ایک بیٹے اور بیٹی کے ساتھ ہندوستان میں تھا۔

دوسال بعد یعنی 1949ء میں وہ ملازمت سے سبکدوش ہوگیا۔ اسے نہایت عزت واحترام سے رخصت کیا گیا۔ یونیورسٹی میں نہایت شاندار الوداعی تقریب منعقد ہوئی۔ اس نے اس موقع کی مناسبت سے یہ الوداعی نظم پڑھی۔

وہ کیا صحبتیں بذلہ انگیز تھیں
میں اب ان کو ڈھونڈوں کہاں الوداع
جدائی مری جامعہ سے ہے یوں
کہے جسم کو جیسے جاں الوداع
بہت اس میں کیں زمزمہ سنجیاں
وہ لطفِ زبان وبیاں الوداع
بس اب آگیا پارسائی کا دور
جوانی کی خرمستیاں الوداع
مرے سامنے ہے نئی زندگی
پرانے زمان ومکاں الوداع
نیا باغ ہوگا نیا اشتیاق
قدیم ہم نوا قمریاں الوداع
وطن بن گئی تھی زمینِ دکن
تھا جس پر وطن کا گماں الوداع
بنائیں گے خلوت میں کاشانہ اب
عمارات رفعت نشاں الوداع
زمانے میں کس چیز کو ہے ثبات
بہاروں کو کہہ دے خزاں الوداع
ہے اب فتنہ انگیزیوں کا ہجوم
گیا آشتی کا سماں الوداع
نہ وہ مے کدہ اور نہ ساقی رہے
فقط ذاتِ حق ہے جو باقی رہے
اب نہ وہ ساقی رہا تھا نہ میکدہ۔ جوانی کے بہترین

نثر پارہ، خلیفہ عبدالحکیم

اقبال کے نزدیک اشتراکیت میں حق وباطل کی آمیزش ہے اس میں جود لکشی اور مفاد کا پہلو ہے وہ حق کے عنصر کی وجہ سے ہے۔ دنیا میں رزق کی عادلانہ تقسیم عین دین ہے اور اس معاملے میں روس نے جو کوشش کی ہے وہ سراہنے کے لائق ہے۔ حضرت مسیح نے فرمایا کہ انسان کی زندگی فقط روٹی سے نہیں اسے روحانی غذا کی بھی ضرورت ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسان روح کے علاوہ جسم بھی رکھتا ہے اور نفس وبدن کا رابطہ کچھ اس قسم کا ہے کہ پیٹ میں روٹی نہ ہو تو انسان نہ حقوق اللہ ادا کرسکتا ہے اور نہ ہی حقوق العباد۔ اس لیے اسلام نے معاش رزق کی عادلانہ تقسیم وتنظیم کو بھی جزوِ دین قرار دیا۔''
(از فکرِ اقبال)

دن دکن کی سرزمین پر گزارے تھے لیکن پاکستان بن چکا تھا۔ یہاں بھی اس کا مستقبل روشن تھا لیکن پاکستان اور لاہور کی محبت اس کا دامن کھینچ رہی تھی۔ اب اس کے ملک کو اس کی ضرورت تھی۔ ابھی تک راستے کھلے ہوئے تھے۔ فسادات کا زور بھی ٹوٹ گیا تھا۔ اس نے پاکستان جانے کی ٹھان لی۔

وطن بن گئی تھی زمینِ دکن
تھا جس پر وطن کا گماں الوداع

اس نے کسی سے نہیں چھپایا کہ وہ پاکستان جارہا ہے۔ اس کی ہردلعزیزی کا یہ عالم تھا کہ وائس چانسلر بہ نفسِ نفیس اسے خدا حافظ کہنے آیا۔

وہ لاہور پہنچا تو دنیا ہی بدلی ہوئی دیکھی۔ وہ کئی دن برابر سر جھکائے لاہور کی گلیوں میں گھومتا رہا۔ جگہ جگہ فسادات کے نشان نظر آئے۔ ہندوستان سے آنے والے مہاجرین ابھی پوری طرح آباد نہیں ہوسکے تھے۔ وہ ان بے گھروں کو دیکھ دیکھ کر کڑھتا رہا۔

وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ نیا ملک اسلام کے نام پر قائم ہوا ہے۔ اس کی کامیابی اسی میں ہے کہ اسلامی نظریات کو عملی شکل دی جائے۔ اس کے لیے وہ اکیلا کچھ نہیں کرسکتا ایک ادارے کی ضرورت ہے جو اپنی کاوشوں سے اجتہادِ فکر کا فریضہ انجام دے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

مغربی تعلیم کے لادینی اثرات سے مسلمان نوجوانوں کا ذہن مسموم ہو چکا تھا۔ اسلام کی قدیم تعبیر ان کے لیے بے اثر ہو چکی تھی۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ اسلام کی خوبیوں کے باوجود اس کے عملی فوائد سے مایوس ہو چکا تھا۔ اس طبقے میں ایک ذہنی انقلاب پیدا کرنے کے لیے ایک ایسے ادارے کی ضرورت تھی جس کے تحت ایسی کتابیں شائع کی جائیں جن کے ذریعے مسلمانوں کے ثقافتی اور عملی کارناموں کو زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق پیش کیا جا سکے۔ اس ادارے کے تحت نوجوانوں کو یہ بتایا جائے کہ اسلام کا دامنِ فکر اس لائق ہے کہ اس دور کے مسائل کو حل کر سکے۔ اس ادارے کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہونا چاہیے کہ قدیم وجدید طبقے میں جو فاصلے پیدا ہو گئے ہیں ان کو حتی المقدور دور کیا جائے۔ قدیم وجدید علوم کے جاننے والے ایک ساتھ بیٹھ کر تحقیقی کام کریں۔

اس بہت بڑے کام کے لیے کثیر سرمائے اور حکومتی سرپرستی کی ضرورت تھی۔ ایک عمارت ہو، کتابوں کا ذخیرہ ہو۔ مصنفین کی خدمات لی جائیں۔ کتب کی اشاعت کے لیے سرمایہ ہو۔ ظاہر ہے یہ کام ایک یا چند افراد کے بس کا نہیں تھا۔

کتابوں کی اشاعت کے ساتھ ساتھ سیمینار منعقد کرنا اور اکابرین کے لیے جلسے منعقد کرانا، ان بزرگوں کے افکارِ عالی سے نوجوانوں کو متعارف کرانا بھی مقصود تھا۔

خلیفہ عبدالحکیم نے یہ تمام پروگرام اور عزائم ایک کاغذ پر تحریر کیے اور دوڑ دھوپ میں لگ گئے۔ اپنے پرانے دوست غلام محمد (گورنر جنرل پاکستان) کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس ادارے کا ایک خاکہ ان کے سامنے رکھا۔ اس کی ضرورت واہمیت پر روشنی ڈال کر انہیں قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے اور بالآخر ''ادارۂ ثقافت اسلامیہ'' کی بنیاد ڈالنے میں کامیاب ہو گئے۔

وہ جانتے تھے کہ تنہا خود کام کرنا اتنی اہمیت نہیں رکھتا جتنا اپنے گرد ایسے آدمیوں کو جمع کرنا ہوتا ہے جو آپ کے کام کو آگے بڑھائیں۔ ادارہ قائم ہوتے ہی وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے بشیر احمد ڈار، شاہد حسین رزاقی، محمد حنیف ندوی، رئیس احمد جعفری اور مولانا جعفر شاہ پھلواری جیسے مایہ ناز مصنف اپنے گرد جمع کر لیے۔ ان کی مفید تصنیفات نے اسلامی فکر کو روشن کر دیا۔

وہ مفکرِ اسلام تھے۔ اس ادارے کا نام اسلامک ریسرچ سینٹر یا انسٹی ٹیوٹ رکھ سکتے تھے لیکن انہوں نے بعد میں اس کی خود وضاحت کی کہ ادارۂ ثقافت اسلامیہ نام رکھنے کی وجہ یہ تھی کہ ادارے کا دائرۂ عمل وسیع تر ہو جائے۔ اگر میں اس کے نام کو صرف اسلامی تحقیق تک محدود کر لیتا تو ہم مذہب کے دائرے سے باہر نہ نکل سکتے۔ اسلامی ثقافت کے نام نے ادارے کے لیے کام کی بہت سی راہیں سجھائی ہیں۔ ان میں مذہب بھی شامل ہے۔

انہوں نے یہ ادارہ صرف بنایا نہیں بلکہ اسے چلایا بھی۔ وہ بہترین منتظم ثابت ہوئے۔ اس کا ثبوت وہ گراں مایہ کتابیں ہیں جو ادارۂ ثقافت اسلامیہ نے چند برسوں میں کثیر تعداد میں شائع کیں۔

اس ادارے کی تعمیر کے بعد انہوں نے اپنی زندگی کے آخری دس سال اس کے استحکام کے لیے وقف کر دیے۔ تصنیف وتالیف کا بیش تر کام اسی دور میں ہوا۔ ان مقالات کا تو کوئی شمار ہی نہیں جو اس ادارے کے تحت نکلنے والے مجلہ ثقافت میں شائع ہوئے، باقاعدہ تصنیفات بھی اسی دور میں شائع ہوئیں۔

اسی زمانے میں ان کے قلم کے جوہر کھلے اور انہوں نے ایسی کتابیں اور مقالے لکھے جو جدید اسلامی افکار کی تاریخ میں ایک روشن ترین باب کی حیثیت رکھتے ہیں۔

1950ء میں جس سال ثقافت اسلامیہ کی بنیاد رکھی گئی اسی سال سینٹ ہال میں اقبال ڈے منایا گیا۔ انہوں نے اس میں ''اقبال عاشقی کا گناہ گار نہ تھا'' کے موضوع پر ایسی مسحور کن تقریر کی کہ ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

وہ زمانہ طالب علمی میں بھی بہترین مقرر رہے تھے۔ کئی فی البدیہہ مقابلے جیت چکے تھے اور اب تو ان کے علم و فضل کا کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا۔ انہوں نے موضوع کا وہ حق ادا کیا کہ دلوں کو گرما دیا۔

1951ء میں لاہور کی آرٹ کونسل میں اقبال ڈے منایا گیا جس میں انہوں نے صدارتی خطبہ پیش کیا اور ثابت کیا کہ اقبال، اسلامی ثقافت کا شاندار نمونہ ہیں۔ ان کی شاعری سے صحیح اسلامی سمت متعین کی جا سکتی ہے۔

اس سے اگلے سال امریکا کی مشہور یونیورسٹی ''نوٹرے ڈیم'' کی دعوت پر امریکا گئے جہاں ایک بین الاقوامی مذاکرے میں حصہ لیا۔ اس کا موضوع تھا ''اسلام میں تصورِ قانون'' بعد میں ان کا خطبہ دوسرے اراکین کی تحریروں کے ساتھ کتابی شکل میں شائع ہوا۔

امریکا سے واپسی پر وہ ایران گئے جہاں سفارت خانہ ایران میں یوم اقبال کی تقریب تھی۔ اس جلسے میں انہیں بھی تقریر کرنی تھی۔ ایران میں تھے اور بات اقبال کی فارسی شاعری کی تھی لہٰذا انہوں نے فارسی زبان میں تقریر کی جس میں انہوں نے حاضرین کو بتایا کہ اقبال نے ملائیت پر کیوں نکتہ چینی کی ہے۔

یہ ان کی پہلی فارسی تقریر تھی۔ اگرچہ لہجہ ایرانی نہ تھا مگر زبان صاف اور آواز میں اعتماد تھا۔ بذلہ سنجی سے یہاں بھی باز نہ آئے۔ تقریر کے دوران ہال قہقہوں سے گونجتا رہا۔ اس تقریر کو ریڈیو ایران نے نشر بھی کیا۔

پاکستان اور ایران کے سیاسی روابط کا یہ ابتدائی دور تھا۔ اس مختصر دورے میں خلیفہ صاحب نے ایرانی علما اور اکابر سے ملاقاتیں کیں اور لسانی وثقافتی رشتوں کو استوار کیا۔ ایرانیوں کو قائل کیا کہ اسلامی وثقافتی پس منظر میں پاکستان ہی ان کی اصل دوستی کا مستحق ہے۔

پاک ایران دوستی کی راہیں ہموار کرنے میں ان کا بھی حصہ رہا۔

یہ دور اُن کی بے پناہ مصروفیت کا دور تھا۔ آپ کے تجربات سے فیض یاب ہونے کے لیے لوگ آپ کو مجلس در مجلس لیے پھرتے تھے۔ آئے دن ریڈیو کے پروگراموں میں شریک ہونا پڑتا تھا۔ بیرونِ ملک سے بھی دعوت نامے آتے تھے۔

اشتراکیت اور مادّیت کی یلغار سے خوف زدہ ہو کر مغربی ممالک کے عیسائیوں نے کوشش کی کہ دنیائے اسلام کے مفکرین کے ساتھ مل کر اس لادینی نظامِ فکر کا مقابلہ کریں۔ ان کی اس پیش کش کا مسلمانوں نے مثبت جواب دیا۔ خلیفہ صاحب کی شہرت بھی اسلامی مفکر کی تھی لہٰذا لبنان میں ہونے والی اس بین الاقوامی مجلسِ مذاکرہ میں انہیں بھی مدعو کیا گیا۔

اس مذاکرے میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا:

''اسلام اس لحاظ سے دوسرے مذاہب کے مقابلے میں زیادہ خوش قسمت ہے اور اس میں اس کام کی پوری پوری صلاحیت موجود ہے کہ وہ نئی نسل کے سامنے اپنے نظریۂ حیات کو بہترین شکل میں اور موجودہ حالات کے تقاضوں کے مطابق پیش کر سکے۔ اگر ہم نے کوشش کی تو بہت جلد مسلمان تہذیب وتمدن کے علم بردار بن سکتے ہیں اور باقی اقوام کے ساتھ امن وانصاف اور دوستی کی بنیاد پر نئی زندگی کی شمع روشن کر سکتے ہیں۔''

اس مذاکرے میں ان کی تقریر نے ایسا سماں باندھا کہ فیصلہ ہوا، خلیفہ عبدالحکیم اور شیخ بہجت بیطار متحدہ امریکا اور کینیڈا کا دورہ اس انجمن کے نمائندے کے طور پر کر کے وہاں کے لوگوں کے سامنے اسلامی دنیا کے نقطہ نظر کی تشریح کریں اور اسلام کے امن وآشتی کے پیغام کو ان تک پہنچائیں۔

پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام بین الاعلیٰ اسلامی مجلسِ مذاکرہ بھی منعقد ہوئی جس میں ایران کے چند علما بھی شامل تھے۔ مذہبی معاملات میں خلیفہ صاحب کی بلند اور وسیع نظر اور مشرق ومغرب کے فکری اور ادبی علوم سے گہری آشنائی سے یہ سب علما متاثر ہوئے۔

علامہ اقبال اب اس دنیا میں نہیں رہے تھے لیکن خلیفہ عبدالحکیم ثابت کر رہے تھے کہ وہی اقبال کے صحیح جانشین ہیں۔ اب ان کا شمار اسلامی مفکر کی حیثیت سے کیا جا رہا تھا۔ یہ اسلامی مفکر یہ بتا رہا تھا کہ اسلامی افکار کی ازسرِنو تشکیل کی جائے اور اسلام کی اساسی قدروں اور عصری تقاضوں میں ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ اسلام کے اصول اس طرح دنیا کے سامنے پیش کیے جائیں کہ اسلام ایک ساکن وجامد مذہب کے بجائے ایک متحرک دین اور حیات بخش قوت ثابت ہو۔''

ترجمہ ولیم بائرن

دیکھا کل رات ایک سادہ خواب
مجھ پہ گویا کھلا ہے مخملد کا باب
میرا بچہ جو دے گیا تھا داغ
اس کا جنت میں ڈھونڈتی تھی سراغ
ہاتھ میں اس کے بجھ گیا تھا دیا
فقط اس کا ہی بے ضیا تھا دیا
شکوہ سنجی میں اس نے منہ کھولا
روٹھی آواز میں وہ یوں بولا
میری اماں نہ اب کبھی رونا
آنسوؤں سے کبھی نہ منہ دھونا
نہ رکا تیرے آنسوؤں کا جوش
اس سے میرا چراغ ہے خاموش
(ماں کا خواب)

WWW.PAKSOCIETY.COM

وہ اسلام کو سرسید اور ان کے بعض معاصرین کی طرح مغرب کی عینک سے دیکھنے کے بجائے مغرب کے علوم کو اسلام کے زاویۂ نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس معاملے میں وہ اقبال کے ہم نوا تھے۔ علامہ اقبال اور خلیفہ عبدالحکیم کے فلسفیانہ افکار اس لحاظ سے اہم ہیں کہ ان میں مسائلِ دینیہ سے لے کر مسائلِ زیست تک ہر امر کو قرآن وسنت کے مطابق پرکھا گیا ہے۔ مذہب کی تشکیلِ جدید یا تعمیرِ جدید میں نئی زندگی کے تقاضوں کو قرآنی تعلیمات سے مطابقت دی گئی ہے۔

اپنے خیالات کی شرح کے لیے انہوں نے ایک کتاب ''اسلامی نظریۂ حیات'' تصنیف کی۔ اس میں انہوں نے ''سائنس اور مذہب'' ''مذہب اور فطرت'' ''خدا پر ایمان کا فلسفہ'' ''صفاتِ خداوندی'' ''خالق ومخلوق کا رشتہ'' ''عبادت کی حقیقت'' ''اخلاق'' ''غصہ، خیر وشر'' وغیرہ پر فلسفیانہ بحثیں کیں۔

ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے قیام کے بعد وہ مکمل طور پر تصنیفی زندگی کی طرف آ گئے تھے۔ انہوں نے اس دور میں ایسی کتابیں اور مقالے لکھے جو جدید اسلامی افکار کی تاریخ میں ایک روشن ترین باب کی حیثیت رکھتی ہیں۔

مولانا روم سے ان کا تعلق بلاواسطہ بھی تھا اور اقبال کے واسطے سے بھی۔ یہی وہ تعلق تھا جس نے انہیں ''حکمتِ رومی'' تصنیف کرنے پر مائل کیا۔

اس کتاب کو انہوں نے سات معرکہ آرا ابواب میں تقسیم کیا۔

کتاب کے آغاز میں انہوں نے یہ بتایا کہ مثنوی کے بارے میں لوگوں کی کیا رائے ہے۔ مولانا نے مثنوی میں کیا کیا مضامین ادا کیے ہیں اور ان کو کس طرح تشبیہات سے واضح کیا ہے اور پھر مولانا کے افکار کو تشریحی انداز میں پیش کیا۔

انہوں نے مثنوی کو تفسیرِ قرآن سے مماثلت دی اور اس کی ایک اہم وجہ یہ بتائی کہ تمام فرقے مثنوی سے سند حاصل کر کے اپنے عقائد کا اثبات کرتے ہیں۔

آغاز کے فوراً بعد عبدالحکیم نے جو باب باندھا اس کا عنوان ہے ''عشق'' اس میں انہوں نے بتایا کہ مولانا روم کے نظریۂ حیات کا لب لباب یہ ہے کہ روحوں کا اصلی مرکز اور مقام ذاتِ الٰہی ہے۔

''وحی والہام'' کے جواب میں مثنوی سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مولانا روم وحی والہام میں فرق نہیں کرتے۔ وہ ماورائے عقل وحس کے لیے ''وحی'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔

اس باب میں صوفیا کے تجربات ونظریات کو جدید علوم کی روشنی میں بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔

''وحدت الوجود'' کا مسئلہ صوفیہ کا اہم ترین مسئلہ رہا ہے۔ خلیفہ صاحب کا بیان ہے کہ اسلامی نظریہ وحدت الوجود کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے سوا کسی چیز کا وجود نہیں، جو کچھ ہے اس کی ذات کا مظہر ہے۔

انہوں نے وحدت الوجود کے مباحث میں تصوف کے بارے میں مختلف گروہوں کے حوالے دے کر اپنی وسعتِ علمی کا ثبوت دیا ہے۔

مثنوی کا سب سے اہم باب آدم کے بارے میں ہے۔ خلیفہ صاحب نے اس کی تشریح بھی خوب کی ہے۔

''مولانا روم نے آدم کی حقیقت قرآنی تعلیمات کے مطابق بیان کی ہے۔ عقل کے مختلف مدارج میں عقل انسانی سے لے کر عقل الٰہیہ کے مدارج کو انسانی ارتقا کا مرتبہ قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں نطشے اور ڈارون یا برگسان انسان کی تقسیم میں اور انسان کے مقام ومدارج کے تعین میں رومی کی گرد تک نہیں پہنچ پائے۔

انسان جس قدر باطن کو صاف کرتا ہے اس قدر اس کی آگاہی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ خلافتِ رہبر کی منزلت حاصل کر لیتا ہے۔

مولانا روم کے نظریات کو صحیح طور پر اگر کسی نے سمجھا تھا تو وہ اقبال تھے۔ خلیفہ صاحب نے رومی اور اقبال کے نظریات کو وضاحت سے بیان کر دیا۔

اس کتاب کے شائع ہوتے ہی خلیفہ عبدالحکیم کا شمار اسلامی فلسفیوں میں کیا جانے لگا۔ ہر طرف ان کے کام کی دھوم مچ گئی۔

اس کتاب کے دو سال بعد ان کی کتاب ''فکرِ اقبال'' سامنے آئی جس زمانے میں یہ کتاب لکھی گئی اقبال پر دو اہم کتابیں شائع ہو چکی تھیں۔ ڈاکٹر یوسف حسین کی ''روح اقبال'' اور عبدالسلام ندوی کی ''اقبال کامل''۔ ان کتابوں کی موجودگی میں فلسفہ عبدالحکیم کی کتاب نے اپنا لوہا منوایا اور یہ اس عشق کی بدولت ہوا جو انہیں اقبال سے تھا۔

یہ کتاب ایک ایسا شفاف آئینہ ہے جس میں فکرِ اقبال کا چہرہ اپنی تمام رعنائی کے ساتھ نظر آتا ہے۔ زبان وبیان

اور اندازِ تحریر ایسا شگفتہ، رواں اور دلچسپ کہ پڑھنے والا اکتاتا نہیں۔ بصیرت افروز، جامع اور محققانہ۔

ایک اور کتاب افکارِ غالب کے نام سے لکھی عبدالحکیم اور غالب کا رشتہ یہ تھا کہ دونوں فلسفی تھے اس لیے ضروری تھا کہ وہ غالب کے فلسفے یا فلسفیانہ اشعار پر قلم اٹھائیں۔

کسی نے غالب کے فارسی اور اردو اشعار کی شرح اس انداز میں نہیں کی تھی کہ اس کے فلسفیانہ یا حکیمانہ مطالب کے خدوخال نکھر کر سامنے آ جائیں۔ اس کمی کو خلیفہ عبدالحکیم نے پورا کر دیا۔

انہوں نے غالب کو مفکر کی حیثیت سے خوب سمجھا اور پھر تشریح اس قدر دل نشیں انداز میں کی کہ خواص وعوام برابر کا لطف اٹھا سکیں۔

ان کے ایک ہم کار حنیف ندوی کا بیان ہے کہ ادارۂ ثقافت اسلامیہ میں صبح دس بجے چائے کا وقفہ ہوتا تھا۔ تمام مصنفین ایک جگہ جمع ہوتے تھے۔ خلیفہ عبدالحکیم بھی شامل ہو جاتے۔ چائے کا دور بھی چلتا رہتا اور علمی گفتگو کے دروازے بھی کھل جاتے۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ محفل مجلسِ مذاکرہ میں تبدیل ہو جاتی۔ ایسی ہی ایک مجلس میں استدلال کے مختلف اسالیب پر بحث چھڑ گئی۔ یہ بات منطق سے نکل کر قرآن کی تشبیہات تک پہنچ گئی اور پھر اس پر تبادلہ خیال ہوا کہ بات کو سمجھانے میں تشبیہ خشک دلائل سے زیادہ مفید ثابت ہوتی ہے۔ کسی نے حضرت مسیح کی تمثیلات کا ذکر چھیڑ دیا۔ خلیفہ عبدالحکیم نے مثنوی رومی کا مطالعہ کیا تھا۔ حکمتِ رومی جیسی کتاب لکھ چکے تھے، فرمایا کہ تشبیہ وتمثیل کے ذریعے شریعت کے معانی جس طرح رومی نے واضح کیے ہیں اس میں ان کا کوئی دوسرا شریک نہیں۔ حافظہ ایسا قوی تھا کہ مثنوی کے ایسے اشعار پڑھنے شروع کر دیے جن میں تشبیہ کا حسنِ بے باک اپنے جلوے دکھا رہا تھا۔

''حضرت، اتنے اشعار تو آپ نے حافظے کی مدد سے سنا دیے اگر آپ تحقیق فرمائیں تو اس سے کہیں زیادہ مثالیں جمع ہو جائیں گی۔'' کسی نے کہا۔

''کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔''

''تو کیوں نا اس موضوع پر ایک باقاعدہ کتاب لکھی جائے۔ ''تشبیہات رومی'' اور یہ کام آپ کے سوا ہم میں سے کوئی نہیں کر سکتا۔''

''موضوع خاصا وسیع ہے اور اس پر ایک کتاب یقیناً لکھی جا سکتی ہے لیکن دوسرے بکھیڑے مہلت کہاں دیتے ہیں۔ اب یہی دیکھیے امریکا کی انڈیانا یونیورسٹی نے کنووکیشن ایڈریس پڑھنے کے لیے دعوت نامہ بھیجا ہے۔ جانا تو پڑے گا۔ یہ میری عزت نہیں پاکستان کا اعزاز ہے۔''

''یہ کام تو چلتے ہی رہیں گے۔ آپ کتاب کے لیے مواد جمع کرتے رہیے۔''

''دیکھیے۔ اللہ نے چاہا تو میں یہ کام بھی کر ہی لوں گا۔''

20 مارچ 1958ء میں انہوں نے اسلامیہ کالج لاہور کے جلسہ تقسیم اسناد میں خطبہ پڑھا۔ یہ خطبہ ان کی شگفتہ مزاجی اور بلند فکری کا دلکش نمونہ تھا جس میں انہوں نے کہا۔

''بلند ہمت قوموں کا شیوہ یہ نہیں کہ حالات کی مرثیہ خوانی کریں اور نہ یہ سوچیں کہ ایک آدمی کے کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ قوم افراد کے مجموعے کا نام ہے۔ ایک شخص کے نفس کا انقلاب دوسروں میں انقلاب پیدا کرتا ہے۔ نفس کی نیکی اور بدی متعدی ہے۔ دیانت داری اور خودداری کی مثال قائم کریں۔ تنگ نظروں کو نشانۂ ملامت بنانے کے بجائے اپنے اندر وسعتِ نظر پیدا کریں۔ رفاہ وفلاح کو دین کا اہم جزو بنائیں۔ پاکستان بناتے وقت جو وعدے کیے گئے تھے کہ آزاد ملک میں اس کی معیشت، معاشرت و سیاست کو پاکیزہ اور عادلانہ اسلامی اخلاق میں ڈھالیں گے اور یہی باہمت قوم کا شیوہ ہے۔''

ایک اور نثر پارہ

غالب کے کلام میں اکثر اردو اور فارسی شعرا کے مقابلے میں زیادہ تنوع ہے۔ ریختہ کا کلام زیادہ تر غزلوں پر مشتمل ہے۔ غالب کی طبیعت میں گو نا گونی تھی جو غزل کے لیے موزوں تھی اس لیے ان کے ہاں ہر قسم کے افکار وتاثرات ملتے ہیں مگر امتیازی خصوصیت حکیمانہ اندازِ تفکر ہے فلسفے کی نہیں بلکہ فلسفیانہ شاعری کی۔ غالب نہ صوفی ہیں نہ فلسفی مگر صوفیانہ افکار سے لذت حاصل کرتے ہیں اور اپنے حسنِ بیان سے لذت بخشتے ہیں۔''

(افکار غالب)

WWW.PAKSOCIETY.COM

غیر ممالک سے لیکچر دینے کی دعوتیں انہیں سر اٹھانے کی فرصت نہیں دے رہی تھیں لیکن وہ ''تشبیہات رومی'' کی تکمیل میں دلجمعی سے مشغول رہے۔ لکھنے پڑھنے کا کام سفر میں بھی جاری رکھا۔

اندرونی مصروفیات بھی کچھ کم نہیں تھیں۔ ان کی قابلیت اور خلوص سے ہر کوئی فائدہ اٹھانے کے لیے آگے بڑھتا تھا چنانچہ جب حکومت پاکستان نے اسلامی قوانین کو جدید زمانے کی معاشرتی ضرورت کے مطابق ڈھالنے کا ارادہ کیا اور سفارشات مرتب کرنے کے لیے زکوٰۃ کمیشن بٹھایا تو اس کی سربراہی کے لیے خلیفہ عبدالحکیم کے سوا کون ہوسکتا تھا۔

اس کمیشن نے سفارش کی کہ زکوٰۃ فنڈ کو معاشرتی فلاح و بہبود کے کام میں بھی خرچ کیا جائے۔ خالص شرعی اصطلاح ''ابن السبیل'' کا استعمال کیا یعنی زکوٰۃ میں ابن السبیل کی مد بھی شامل ہے۔ جدید رجحان کے علما موجودہ زمانے میں سڑکوں کی توسیع و مرمت، ریلوے، تار، ڈاک خانہ وغیرہ کو ابن السبیل کی مد کے مترادف سمجھتے تھے مگر قدیم فکر کے علما نے اس کی مخالفت کی۔ یوں یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔

کچھ عرصے بعد حکومت نے عائلی کمیشن کی تشکیل کی تو نظرِ انتخاب عبدالحکیم ہی کی طرف گئی۔ انہیں اس کمیشن کا سیکریٹری بنایا گیا۔ اس تقرری کی وجہ ان کی روشن خیالی تھی۔ خاص طور پر عورتوں کے حقوق کے بڑے داعی تھے۔ ان کی نجی زندگی بھی اس کی گواہ تھی اور ان کے خیالات بھی۔ انہوں نے سیکریٹری بنتے ہی قرآن وحدیث سے استدلال کے سلسلے میں چھان بین شروع کردی کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ جس طرح زکوٰۃ کمیشن کے سلسلے میں مولوی حضرات کی جانب سے مخالفت ہوئی تھی اب بھی کی جائے گی۔

انہوں نے قرآن وحدیث سے ایسی سندیں جمع کرلیں جو اُن کے موقف کی صحیح ترجمانی کرسکیں اور عورتوں کو ان کے حقوق دلانے میں معاون ثابت ہوں۔ ان سندوں کی بنیاد پر انہوں نے رپورٹ مرتب کی اور حکومت کو پیش کردی۔

اس رپورٹ کے بعد گورنمنٹ نے فیملی لا آرڈیننس جاری کردیا جس میں عورتوں کے حقوق کی ضمانت دی گئی تھی۔

☆☆☆

1959ء کی بات ہے کہ ممتاز ادیب اور بینکار ممتاز حسن لاہور آئے ہوئے تھے۔ ممتاز حسن سے ان کا رشتہ سمدھی کا بھی تھا۔ عبدالحکیم کے صاحب زادے عارف عبدالحکیم کی شادی ممتاز حسن کی صاحب زادی ذکیہ سے ہوئی تھی۔

ممتاز حسن نہایت شائقِ علم آدمی تھے۔ بیوروکریٹس میں شاید ہی کوئی ہو جس کا ذوقِ علم اتنا توانا ہو۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ علم جہاں سے ملے اسے حاصل کرلو۔ لاہور آئے تو اشتیاق ہوا کہ تصوف کے بعض نکات پر اپنے سمدھی خلیفہ عبدالحکیم سے گفتگو کی جائے۔ یہاں یہ عالم کہ خلیفہ صاحب کے لیے فرصت عنقا، کبھی ایک کمیشن کی میٹنگ ہے کبھی دوسرے کمیشن میں جانا ہے۔ کبھی پنجاب یونیورسٹی میں کوئی تقریر ہے کبھی ریڈیو پر کوئی مذاکرہ ہے۔ کچھ نہیں تو احباب گھیرے ہوئے ہیں۔ ان سے نہیں تو ممتاز حسن سے ملاقات کا بہانہ ہے۔ کبھی تنہائی ملی تو بہت قلیل۔ موضوع طویل فرصت قلیل۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ حکیم صاحب کسی بہانے کراچی آئیں گے اور ممتاز حسن کے گھر قیام کریں گے۔ میزبانی کا لطف بھی اٹھائیں گے اور تصوف پر دل کھول کر باتیں بھی کریں گے۔

قدرت بھی اس ملاقات کے لیے انتظامات کررہی تھی۔ جلد ہی یہ موقع مل گیا۔ کراچی میں انٹرنیشنل کانگریس کا اجلاس تھا۔ وہاں کچھ مغربی محقق بھی آئے ہوئے تھے۔ خلیفہ صاحب کو بھی دعوت ملی جہاں آپ کو اسلام کا نظریہ بہ صورت تقریر پیش کرنا تھا۔ سوچا مراد بر آئی۔ اجلاس میں شرکت بھی ہوجائے گی اور ممتاز حسن کے گھر قیام کریں گے۔ فوراً بذریعہ تار ممتاز حسن کو خبر کردی۔

کراچی پہنچ کر اجلاس میں شرکت کی اور حسبِ وعدہ ممتاز حسن کے گھر آگئے۔

خلیفہ صاحب کہیں باہر گئے ہوئے تھے ممتاز حسن گھر پر ہی تھے۔ اس وقت کچھ لکھنے میں مصروف تھے کہ خلیفہ صاحب تشریف لے آئے۔ آتے ہی باتھ روم چلے گئے۔ باتھ روم سے آنے کے بعد ممتاز حسن کی میز کے سامنے آکر کھڑے ہوگئے۔

''آپ تشریف رکھیں۔ میں ذرا یہ کام ختم کرلوں تو بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔'' ممتاز حسن نے کاغذوں پر نظریں جمائے جمائے کہا۔

خلیفہ صاحب کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ ممتاز حسن نے نظر اٹھا کر دیکھا تو ہوش اُڑ گئے۔ خلیفہ صاحب کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ دایاں ہاتھ دل پر رکھا ہوا تھا اور کہہ رہے تھے ''اوہ میرا دل! پہلے کبھی یہ کیفیت نہیں ہوئی تھی۔''

ممتاز صاحب گھبرا کر اٹھے اور خلیفہ صاحب کے بھاری بھرکم وجود کو صوفے پر لٹا دیا۔

اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

''میں ڈاکٹر باقر بول رہا ہوں۔ معلوم ہوا حکیم صاحب آپ کے گھر ٹھہرے ہوئے ہیں تو سوچا ان سے وقت لے کر ملاقات کرلوں۔''

''باقر صاحب آپ اس وقت ہیں کہاں۔''

''میں ڈاکٹر رفیع کے کمرے میں ہوں۔''

''آپ فوراً پہنچیں۔ حکیم صاحب کو غش آگیا ہے۔''

یہ کہہ کر انہوں نے فون رکھ دیا۔ پھر کرنل جعفر کو فون کردیا۔ انہوں نے ڈاکٹر بھیج دیا۔

باقر صاحب پہنچے تو خلیفہ صاحب صوفے پر لیٹے تھے اور ڈاکٹر انجکشن لگا رہا تھا۔ ڈاکٹر نے انجکشن لگا کر نبض ٹٹولی۔ دل کی دھڑکن سنی اور سر کو منفی انداز میں جنبش دی۔

''ڈاکٹر صاحب کیا.....'' باقر صاحب کچھ کہتے کہتے رک گئے۔

''افسوس!'' ڈاکٹر نے کہا اور قریب پڑا ہوا تولیا خلیفہ صاحب کے منہ پر ڈال دیا۔

ہنستا کھیلتا انسان منٹوں میں رخصت ہوگیا۔

ممتاز حسن سر جھکائے بیٹھے تھے پھر ایک دم بول اٹھے۔ ''واہ خلیفہ صاحب واہ! خوب مہمان بنے۔''

ڈاکٹر باقر بھی خاموش تھے۔ کسی کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ دیوار پر لگا کیلنڈر بتا رہا تھا کہ آج 30 جنوری 1959ء ہے۔ گھڑی پر نظر ڈالی، دن کا سوا ایک ہوچکا تھا۔

خلیفہ صاحب کے بھائی عبدالغنی اور ان کے عزیز حمید غنی کو فون کیا گیا۔ وہ فوراً آگئے۔ ایمبولینس منگوائی گئی۔ تابوت بھی آگیا۔

حکیم صاحب کے ہاتھ پر گھڑی بندھی ہوئی تھی۔ گھڑی اتاری گئی تو ڈھائی بج رہے تھے۔ تابوت ایمبولینس میں رکھا گیا۔ ایمبولینس ائرپورٹ کی طرف دوڑ رہی تھی۔

اسی دن آپ کا جسدِ خاکی بذریعہ ہوائی جہاز لاہور لایا گیا۔

غزل

تھی صبوحی سحر کے منظر میں
مے ملی ہم کو کاسۂ زر میں
یوں تو ہر چیز پر ہے پرتوِ دل
دل ہے لیکن جہانِ دیگر میں
زندگانی ہے آپ پیکرِ ساز
کیوں مقید ہو ایک پیکر میں
کیسی ساغر گداز ہے صہبا
کبھی ٹھہری نہ ایک ساغر میں
دل کے آئینے میں ہے جو صورت
نہیں آئینۂ سکندر میں
تو ٹھہر جا یہیں پہ اے جبریل
نہ لگے آگ تیرے شہپر میں
حشرِ دائم کو جس نے دیکھ لیا
اور کیا دیکھ لے گا محشر میں

''خلیفہ صاحب کی موت عین ان کی خواہش کے مطابق ہوئی'' ڈاکٹر باقر بتا رہے تھے ''وہ کہا کرتے تھے کہ میں نے تو خدا سے سمجھوتا کرلیا ہے کہ اے خدا تو مجھ سے ایڑیاں نہ رگڑوانا۔ بس اتنا حکم دینا کہ حکیم آجا اور میں آجاؤں گا۔ دیکھو وہی ہوا۔ ایک منٹ کے اندر اندر بلاوا آگیا اور خلیفہ صاحب چل دیے۔

دوسرے دن یعنی 31 جنوری 11 بجے کے قریب وارث روڈ سے آپ کا جنازہ اٹھایا گیا اور میانی صاحب کے قبرستان میں سپردِ خاک کردیا گیا۔

آپ کے والد کی وفات اس وقت ہوئی تھی جب خلیفہ صاحب بارہ برس کے تھے۔ یہ احساس شدت سے رہتا تھا کہ والد کے لیے کچھ بھی نہ کرسکے۔ اس لیے آپ نے والد کی قبر کو سنگ مرمر سے بنوایا اور قریب ہی ایک چبوترا بنوایا کہ جو پہلے آئے گا یہاں آجائے گا۔ یہ معلوم نہیں تھا کہ پہلے وہ ہی آئیں گے۔

انہیں والد کے پہلو میں جگہ ملی۔

ان کی موت کسی معمولی آدمی کی موت نہیں تھی۔ جس نے سنا دم بخود رہ گیا۔ یہ نقصان سب کا نقصان تھا۔ ادارۂ ثقافت اسلامی کی ڈاک میں تعزیتی خطوط کا انبار لگ گیا۔

انجمنِ فرہنگ ایران، پاکستان کی طرف سے ان کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

یاد میں جلسہ ہوا جس میں ایران کے علما، فضلا اور شعرا بڑی تعداد میں شریک ہوئے اور اس ادیب اور اسلامی مفکر کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ شعرا نے منظوم نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔ خلیفہ صاحب کے بھتیجے ڈاکٹر سلیم واحد سلیم نے آپ کی جدائی میں نالہ فراق لکھا۔

یہ کہہ رہی ہیں عزیزوں کی اشک بار آنکھیں
کہ اب تلاش کریں کیسے اس مسافر کو
کہ جس کے نغمے وہ بانگِ درا تھے جس کے سبب
کچھ اور آگے بڑھے دشتِ زیست کے رہرو
گیا ہے زیرِ زمیں آج وہ درِ نایاب
حیات جس کی تجلی کو تا ابد ترسے
جو خوشہ چین مضامینِ نو بہ نو تھے تمام
یہ کہہ رہے ہیں نہ کیوں اشک آنکھ سے برسے
صحیفے آپ کے جن کو نشانِ منزل تھے
وہ ان صحیفوں کو اب حرزِ جاں بنالیں گے
مگر وہ لوگ جو خود آگ کے تھے شیدائی
سراغ آپ کا اب کس طرح نکالیں گے
اجل پہ تف ہے کہ ایسے گہر بھی ہوں تہ خاک
کہ جن سے زیست چمک مستعار لیتی ہے
خزاں پہ خاک کہ وہ پھول بھی ہوں نذرِ عدم
کہ جن سے رنگ طرف خود بہار لیتی ہے

سرکاری حلقوں میں بھی اس صدمۂ جانکاہ کی گونج سنائی دے رہی تھی۔ وزیرِ تعلیم جناب حبیب الرحمٰن کا غم نامہ شائع ہوا۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی وفات سے مجھے شدید صدمہ ہوا۔ میرے لیے یہ حادثہ اس لیے زیادہ رنج دہ تھا کہ جس دن خلیفہ صاحب کا انتقال ہوا وہ اسی صبح مجھے ملے تھے۔ ادارۂ ثقافت اسلامیہ کو ترقی دینے کی تجویز پر گفتگو کی تھی۔ آپ مشہور و معروف ماہر تعلیم اور اسلام کے سچے پرستار تھے۔ وہ تمام عمر ملک وملت کی خدمت پوری قابلیت سے انجام دیتے رہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی روح پر اپنی نعمتیں نازل فرمائے۔''

اختر حسین وزیرِ ترقیات واطلاعات تھے۔ انہوں نے ان کی موت پر کہا ''ڈاکٹر خلیفہ صاحب ایک ایسے صاحبِ کمال فلسفی تھے جن کے کارناموں کی قدر میرے دل میں ہے۔ ان کی ناگہانی موت نے قوم کو ایک ممتاز فاضل کی خدمات سے محروم کردیا ہے۔ ان کی رحلت کا احساس اور شدید ہوتا ہے جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ جس کام کا انہوں نے آغاز کیا اس کی تکمیل کے لیے مشکل سے ان کا کوئی جانشین بروئے کار آئے گا۔''

☆☆☆

وہ اپنی کتاب ''تشبیہات رومی'' کی اشاعت کے شدت سے منتظر تھے۔ اس کتاب کو انہوں نے پایۂ تکمیل تک پہنچادیا تھا لیکن اس کی طباعت میں دیر ہوتی جارہی تھی۔ جب وہ کراچی جانے لگے تو انہوں نے ہدایت کی ان کے کراچی آنے سے پہلے یہ کتاب چھپ جائے۔

وہ کراچی سے زندہ واپس نہیں آئے لیکن ان کے دوستوں کو یہ ہدایت یاد تھی۔ ان کی وفات کے ڈیڑھ مہینے بعد یہ کتاب منظرِ عام پر آگئی۔

اس کتاب میں سات ابواب شامل ہیں۔ پہلے باب میں تشبیہ وتمثیل کی فطرت، ماہیت اور تعریف پر بحث کی گئی ہے۔ باقی چھ ابواب میں مختلف موضوعات کے تحت مثنوی مولانا روم کے چھ دفتر زیرِ مطالعہ آئے ہیں۔ ان میں مولانا روم نے تشبیہ وتمثیل اور استعارے کس فنکارانہ قدرت سے تخلیق کیے ہیں۔ یہ تمام باب انہی مباحث سے متعلق ہیں۔

ان کے کاغذات سے ایک انگریزی کتاب کا نامکمل مسودہ بھی ملا جس سے معلوم ہوا کہ وہ آخری ایام میں مذہبِ اسلام پر ایک جامع اور مضبوط کتاب لکھ رہے تھے۔

اس مسودے کے ابتدائی حصے میں بعثت نبویؐ سے پہلے کے حالات تھے بعدازاں مذہبِ اسلام کی بنیادی خصوصیات پر جدید علوم اور جدید حالات ونظریات کی روشنی میں بحث کرتے ہوئے اسلام کو ایک ابدی اور آفاقی دین ثابت کیا گیا تھا۔

کتاب کا بیشتر حصہ لکھا جاچکا تھا کہ موت نے قلم پکڑ لیا۔ تکمیل کی مہلت نہ دی مگر کتاب موجودہ صورت میں بھی بصیرت افروز ہے۔

ماخذات: ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم۔ ممتاز اختر مرزا
ثقافت: جون، جولائی 1960ء
نقوش: (شخصیات نمبر) 1952ء

معذور مسیحا

ریاظ احمد

وہ طبیب نہیں مگر اس کی انگلیاں وقت کی نبض پر ہیں۔ وہ کائنات کے راز کھول رہا ہے۔ کون سی بیماری اس دنیا کے لیے کینسر ثابت ہوگی اور اسے لے ڈوبے گی اسی پر وہ نظریہ پیش کررہا ہے۔ دورِ حاضر کے ایک اہم سائنسدان کی زندگی کا مختصر سا جائزہ۔

اس نے معذوری کو مجبوری بننے نہیں دیا

یہ اکیسویں صدی کے اس شخص کی کہانی ہے جسے اس کے ڈاکٹروں نے کہا کہ تم A L S (AMYOTROBHIC LATERAL SCLEROSIS) میں مبتلا ہو۔ اس کا تلخ مطلب یہ ہے کہ زندگی تم سے بے وفائی کرگئی ہے۔ تم زیادہ سے زیادہ تین سے چار سال تک زندہ رہوگے۔ موت کا یہ حکم نامہ سنتے وقت اس کی عمر صرف اکیس سال تھی۔ ایسی صورت میں کسی کے بھی ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔ وہ مرنے

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے پہلے مرجاتا ہے' ایسی حالت میں دل لگا کر کوئی کام کرنے کے قابل کہاں رہتا ہے؟ موت کا بھیانک تصور اس کے وجود کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ جیسے کسی مجرم کو عدالت سے سزائے موت ہوجائے تو موت کا بھیانک تصور اسے کسی قابل نہیں چھوڑتا۔ وہ اسی دن سے مرنا شروع ہوجاتا ہے۔ صرف اور صرف موت کا ہولناک تصور اس کے اعصاب پر سوار رہتا ہے۔ موت کی سزا سے پہلے ہی اس کی سزا شروع ہوجاتی ہے۔ اس کی نیند اڑ جاتی ہے' بھوک مٹ جاتی ہے' ڈپریشن کے دورے پڑنے لگتے ہیں اور زندگی اس کے لیے حسرت بن جاتی ہے۔

مگر اسٹیفن ہاکنگ نے ڈاکٹروں سے اپنی جان لیوا بیماری کا سن کر ایسا کچھ نہیں سوچا۔ وہ وقتی طور پر پریشان ہوا، اس نے خود کو ایک کمرے میں بند کرلیا اور انتہائی سنجیدگی سے سوچا کہ مجھے ان حالات میں موت کا مقابلہ کیسے کرنا ہے؟ اسے محسوس ہوا کہ اس کی زندگی محض تین چار سال میں سمٹ گئی ہے اور اس نے کیسے ان چار سالوں کا ایک ایک منٹ جینا ہے۔ کیسے اپنے ادھورے خوابوں کو پورا کرنا ہے اور اگر وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے تو پھر وہ موت کو مسکرا کر گلے لگا سکتا ہے۔ یہ سوچ کر وہ کمرے سے باہر نکل آیا، اس نے اپنا سر اونچا کر کے سورج کو دیکھا۔ سورج سے نکلتی کرنوں کے رنگوں کو دیکھ کر وہ مسکرایا۔ کرنوں کے خوشنما رنگ اس کی نیلی آنکھوں سے اتر کر اس کے جسم میں جذب ہوگئے۔

اسٹیفن ہاکنگ دنیا کے عظیم سائنسدان گلیلیو گلیلی (1564ء تا 1642) کی وفات کے سال 8 جنوری 1942 کو پیدا ہوا (یعنی 42 کا عدد مشترک ہے) اسٹیفن جب پیدا ہونے والا تھا ان دنوں اس کی والدہ ایزوبل مختصر وقت کے لیے آکسفورڈ آئی ہوئی تھی۔ ان کا گھر ہائی گیٹ لندن میں تھا جہاں وہ اپنے شوہر فرانک کے ساتھ رہتی تھی۔ ہائی گیٹ لندن کے جنوبی علاقوں کا باقی ماندہ حصہ تھا۔ دوسرا یہ کہ ان دنوں ہائی گیٹ ہر رات جرمن حملوں کا نشانہ بنتا تھا۔ تاہم حکومت کا خیال تھا کہ اگر آکسفورڈ پر حملہ ہوا تو اس کا بھرپور دفاع کیا جائے گا۔ ہٹلر آکسفورڈ کو اپنا مرکز بنانے کا اعلان کرچکا تھا۔ یہ اس کا خواب اور فوجی پروگرام کا حصہ تھا۔ فرانک اور ایزوبل ہاکنگ دونوں متوسط درجے کے خاندان میں شمار ہوتے تھے۔ فرانک ہاکنگ کا باپ ایک کامیاب کسان تھا مگر جنگِ عظیم کی وجہ سے فرانک اپنے باپ دادا کی طرح کامیابی سے کاشت کاری نہ کرسکا۔ ایزوبل کا باپ ڈاکٹر تھا مگر اس کے معاشی حالات اچھے نہ تھے جس کی وجہ سے اس نے بہت مشکل اور اپنے عزیزوں کے مالی تعاون سے یونیورسٹی تک کی تعلیم حاصل کی۔ جب اسٹیفن دو ہفتے کا تھا تو اس کے والدین اسے لندن لے آئے اور جب وہ دو سال کا ہوا تو انہیں گھر سے ہاتھ دھونے پڑے۔ ان کے ایک پڑوسی نے اپنے گھر سے ایک وی ٹو v2 میزائل داغ دیا۔ جس کے نتیجے میں ہاکنگ کا پورا گھر مسمار ہوگیا مگر خوش قسمتی سے اس وقت اسٹیفن فیملی گھر پر موجود نہیں تھی۔ 1952ء میں اسٹیفن سخت امتحانی مقابلے کے بعد سینٹ البانز اسکول میں داخل ہوگیا۔ اس نے ایک ٹرم کی فیس جو بہت زیادہ تھی بڑی مشکل سے ادا کی۔ سینٹ البانز اسکول میں داخلے کی خوشی میں وہ ویسٹ منسٹر اسکول میں داخل نہ ہونے کا غم بھول گیا تھا۔

اسکول کے سُرمئی یونیفارم میں وہ بہت بھونڈا نظر آتا تھا۔ وہ لاغر اور پستہ قد تھا۔ اس کے ہم جماعتوں کا خیال تھا کہ اسٹیفن ہمیشہ بعد میں بات کرتا ہے اور وہ سوچتا بہت ہے۔ یہ عادت اسے اپنے والد سے ورثے میں ملی تھی۔ اس کے ہم جماعت اس کی تقاریر کی نقل اتارتے، اس پر فقرے کستے اور اس کا مذاق اڑاتے۔ وہ اذیت برداشت کر کے خاموش رہتا۔ کچھ لڑکے اس کا بہت احترام بھی کرتے مگر اظہار نہ کرتے۔ اس کی کلاس میں جب تقاریر اور مباحث کا دور شروع ہوا تو اس کے ہم جماعتوں کو اس کی صلاحیتوں کا اندازہ ہونے لگا۔ تاہم کچھ شرارتی لڑکے اب بھی اسے تنگ کرتے۔ اس کے شرارتی ہم جماعت دعوے کے انداز میں کہتے کہ اسٹیفن زندگی میں کچھ بھی نہیں بن سکے گا۔

جب اسٹیفن تھرڈ ایئر میں پہنچا تو وہ اسکول کے اساتذہ کی نظروں میں ایک ذہین بچہ بن چکا تھا۔ تاہم چند لوگ ہی اس کی ذہانت کے معترف ہوئے تھے۔ اسی سال اسکول کے ذہین بچوں نے اپنا ایک گروپ بنایا جس میں اسٹیفن بھی شامل تھا۔ یہ بچے راک اینڈ رول اور دوسرے ماڈرن میوزک کے بجائے بی بی سی سنتے، سنجیدہ ادب پڑھتے اور کلاسیکل میوزک بجاتے۔ ان دنوں اسٹیفن کی نظر میں جو بڑے ہیروز تھے ان میں برٹینڈ رسل کا نام سرفہرست تھا جو دنیا میں بہت بڑا حریت پسند اور ذہین لیڈر جانا جاتا تھا۔

سینٹ البانز اسکول کو اسٹیفن پر بڑا ناز تھا اور

اسٹیفن کے تخلیقی ذہن کے لیے سینٹ البانز اسکول کا ماحول بڑا سازگار تھا۔ اسی زمانے میں ماسٹر فن لے کا بہت شہرہ تھا جو یونیورسٹی میں ایک اعلیٰ استاد سمجھا جاتا تھا۔ وہ ریڈیو کے پروگرام ٹیپ کر کے کلاس 3 میں ان پروگراموں کو سنایا کرتا تھا اور ان پروگراموں سے مدد لیا کرتا تھا۔ وہ جوہری ہتھیاروں سے لے کر برتھ کنٹرول تک ہر معاملے میں ماسٹر سمجھا جاتا تھا۔ نوعمر لڑکے ماسٹر فن لے کے لیکچرز اور سبق بہت پسند کرتے، مصنفین اور سائنس داں بھی ان اسباق سے فائدہ اٹھاتے۔ ماسٹر فن لے کو صحافی بھی بہت پسند کرتے تھے۔ اسٹیفن نے بھی ماسٹر فن لے کی شخصیت سے گہرا اثر لیا تھا۔

سینٹ البانز اسکول سے اسٹیفن نے بہت کچھ حاصل کیا۔ یہاں وہ نوجوان سائنس دان کے طور پر مشہور ہوگیا۔ اس کے گھر والے بھی اسے فخر سے دیکھنے لگے تھے۔ اسٹیفن کا کمرا اس کے گھر کے دوسرے کمروں سے بہت مختلف تھا جس میں ایک عجیب سا جادوئی ماحول تھا۔ اس کمرے میں بچوں کی کتابیں بھی تھیں اور پروفیسروں والی لیبارٹری بھی تھی۔ گھریلو سامان بھی تھا اور ہوائی جہازوں کے ماڈل بھی تھے۔ ایک طرف بجلی کے نظام کا بورڈ بھی تھا۔ جس کے استعمال کے بارے میں صرف اندازہ کیا جاسکتا تھا۔ تاروں کے ٹکڑے، کاغذ، پنسل اور دیگر دھاتیں دیکھ کر لگتا تھا جیسے کوئی نامکمل پروجیکٹ ہو جبکہ اسٹیفن کے گھر والے ان سب باتوں سے مختلف تھے۔ یہ خاندان کتابوں والی فیملی لگتا تھا۔ اس خاندان میں زندگی کا رنگ بھی تھا اور سماجی شعور بھی۔ ان کے اس گھر میں ان کا ایک البم بھی تھا۔ جس میں اس خاندان کی اٹھاسی تصاویر تھیں۔ ایک زمانے میں اس خاندان کی ایک کار بطور ٹیکسی چلتی تھی اس کار کو اسٹیفن کے والدین نے پچاس پونڈز میں خریدا تھا بعد میں انہوں نے بالکل نئی گرین فورڈ کونسل خریدی تھی۔ اس پورے خاندان کو سیاحت کا بہت شوق تھا۔ انہوں نے اس گاڑی کے ساتھ ہندوستان کا سفر بھی کیا۔ اسٹیفن اس سفر میں شامل نہیں تھا۔ اس کا محور اس کی تعلیم تھی۔ 1950ء میں جب اس کے گھر والے واپس آئے تو اس گاڑی کا حلیہ بگڑ چکا تھا۔ اسٹیفن بھی سیر و سیاحت پسند کرتا تھا مگر اس کا دائرہ البانز کے گرد و نواح کی سیر گاہوں تک محدود تھا۔ وہ اپنے کم عمر دوستوں کے ساتھ تیرا کی کرتا، آئس کریم کھاتا اور رقص کرتا۔ اسٹیفن کا باپ کام

کرکٹ اور بیس بال

پروفیسر اسٹیفن ہاکنگ نے بلیک ہولز کے حوالے سے ایک تھیوری پر ایک امریکی سائنس داں پریسکل کے ساتھ شرط لگائی کہ اس کی تھیوری درست ہے مگر پریسکل نے اسٹیفن کی تھیوری کو ناقص ثابت کردیا۔ اسٹیفن شرط ہار گیا اور اس نے اس کا اعتراف کرلیا کہ پریسکل کا موقف درست ہے۔ شرط ہارنے پر اسٹیفن نے پریسکل کو تحفے میں کرکٹ انسائیکلو پیڈیا دیا جس پر پریسکل نے خود کو پکا امریکی ثابت کرنے کے لیے اسٹیفن کو کہا کہ وہ تحفے میں کرکٹ انسائیکلو پیڈیا کے بجائے بیس بال کا انسائیکلو پیڈیا لینا پسند کرے گا کیونکہ امریکا کا کرکٹ نہیں بیس بال کھیل ہے۔

کے سلسلے میں کئی کئی ماہ اپنے گھر سے غیر حاضر رہتا جسے اسٹیفن بہت محسوس کرتا۔ ان حالات میں اس کی ماں پر اس کی اور اس کے بہن بھائیوں کی ذمے داری بڑھ جاتی۔ تاہم یہ بچوں کے لیے ایک اور طرح سے بہتر ہوتا۔ وہ باپ کی عدم موجودگی میں زیادہ ذمے داری کا ثبوت دیتے اور ان کے اعتماد میں اضافہ ہوتا۔

اسٹیفن کے باپ نے بہت ساری کتابیں سنبھال کر رکھی ہوئی تھیں۔ اسے ادب کا شوق تھا۔ وہ ڈائری بھی لکھتا تھا۔ اس نے کئی نامکمل ناول بھی لکھے۔ اس کے علاوہ وہ عورتوں کے نظریات کے حوالے سے بھی لکھتا تھا۔ اس کا یہ مشغلہ اس کی وفات تک جاری رہا۔ اس کی بیوی ایزوبل کا خیال تھا کہ فرانک عورتوں کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتا۔ ایزوبل اپنے بڑے بیٹے کے سیاسی نظریات کو بہت پسند کرتی تھی اور چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا انگلینڈ میں ایک انٹیلکچوئل کے طور پر ابھرے۔ وہ خود بھی 1950ء میں سینٹ البانز لبرل ایسوسی ایشن کی رکن تھی۔

1959ء میں دنیا کے مختلف حصوں میں متعدد سیاسی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ 2 جنوری کو فیدرل کاسترو نے کیوبا میں اقتدار حاصل کرلیا۔ ادھر ہندوستان میں مسز اندرا گاندھی ہندوستان کی پہلی خاتون وزیراعظم بن گئیں جبکہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

دوسری طرف انگلینڈ میں ایک طالب علم جس کا نام اسٹیفن ہاکنگ تھا آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخلہ لینے کے لیے امتحان کی تیاری کررہا تھا۔ آکسفورڈ میں داخلہ آسان نہ تھا۔ اس کے لیے بڑی محنت درکار تھی اس پر یہ کہ اسٹیفن کے والدین اپنے بیٹے سے یہ توقع کررہے تھے کہ وہ اپنی تعلیم کے لیے نہ صرف داخلہ بلکہ اسکالرشپ حاصل کرے۔ اس سے ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ اسٹیفن کے والدین پر اس کی تعلیم کا خرچ برائے نام رہ جاتا۔ دوسرا یہ کہ اسکالرشپ حاصل کرنے والے بچوں کو بہت عزت اور رشک کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ اس طرح اسٹیفن کو صرف داخلہ حاصل نہیں کرنا تھا بلکہ اسکالرشپ حاصل کرنا تھی۔ اسے یہ ثابت کرنا تھا کہ وہ معمولی قابلیت کا بچہ نہیں۔

جب اسٹیفن کا داخلے کے لیے امتحان شروع ہوا تو اس کے کئی انٹرویوز ہوئے۔ ان میں ایک انٹرویو تو ایسا تھا جیسے وہ داخلے کے لیے نہیں ملازمت کے لیے آیا ہو۔ اس انٹرویو میں اس سے اس کے کریکٹر کے بارے میں سوال کیے گئے، اس سے اس کے خواب پوچھے گئے، فزکس کا پریکٹیکل پیپر بھی ایک طویل انٹرویو کی صورت میں لیا گیا۔ ساڑھے بارہ گھنٹے تک اس کا تھیوری ٹیسٹ ہوا۔ یہ سب کچھ تو ہونا تھا کیونکہ وہ آکسفورڈ میں اسکالرشپ کا امیدوار تھا جہاں ایک سے ایک قابل طالب علم قسمت آزمائی کررہا تھا۔ ٹیسٹ کے بعد رزلٹ کا انتظار کرنا تھا۔

اسٹیفن کے ساتھ ایک معاملہ یہ بھی تھا کہ اس کے والدین چاہتے تھے کہ وہ میڈیکل کی تعلیم حاصل کرے تاکہ وہ ایک اچھی جاب حاصل کرسکے مگر اسٹیفن کی میڈیکل میں ذرا دلچسپی نہیں تھی۔ خوش قسمتی سے اسٹیفن نے آکسفورڈ سے اسکالرشپ حاصل کرلی۔ جس پر اسے اور اس کے والدین کو بہت خوشی تھی۔ آکسفورڈ میں اسٹیفن کو اس کی پسند کا مضمون ملا، جسے اس کے والدین نے اس کی خوشی سمجھ کر قبول کرلیا۔ اب اسٹیفن نے اپنی تمام توجہ سائنس کے ساتھ وابستہ کردی۔ وہ نصابی تعلیم کے علاوہ بھی سائنسی تجربات کرتا رہتا تھا۔ سائنسی تجربات میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی سائنسی ایجاد اچانک معرض وجود میں آجاتی ہے حالانکہ سائنس داں کوئی اور تجربہ کررہا ہوتا ہے۔

اسٹیفن کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا پہلے اس کی پوری توجہ میتھ پر تھی بعد میں وہ سائنس میں دلچسپی لینے لگا۔ سائنس میں سے اس نے علم کائنات کو منتخب کرلیا لہٰذا وہ کائنات سے عشق کرنے لگا۔ علم کائنات میں اس کا پہلا استاد اطالوی سائنس دان گلیلیو گلیلی تھا۔ جو اس کی پیدائش سے تین سو سال پہلے مرچکا تھا۔ گلیلیو کا علم کائنات کے حوالے سے بہت بڑا مقام تھا اور آج بھی ہے۔ گلیلیو نے کہا تھا کہ ”اس عظیم کائنات کو فلسفے سے نہیں دیکھا جاسکتا اسے دیکھنے کے لیے دوربین چاہیے، جب آپ کائنات کو دوربین سے دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کی زبان ریاضی ہے اس کی مثلثیں، دائرے اور جیومیٹریکل زاویے اس کی اشکال ہیں۔ جن کے بغیر کسی انسان کے لیے اس کا ایک لفظ بھی سمجھنا ناممکن ہے ان کے بغیر آپ تاریکیوں میں منہ مارتے رہیں گے۔“

اسٹیفن کائنات کو علمی سطح پر سمجھنا چاہتا تھا۔ وہ خلاؤں، ستاروں، کہکشاؤں کو ریاضی کی زبان میں پڑھنا چاہتا تھا۔ کائنات کے مشاہدے کے دوران اس نے کائنات میں سیاہ دھبے دیکھے۔ یہ دھبے درحقیقت ستاروں، کہکشاؤں اور خلاؤں کے درمیان بلیک ہولز تھے۔

1960ء کی ابتدا میں علم ہیئت کے ماہرین نے یہ دریافت کرلیا تھا کہ جب سورج سے تقریباً دوگنی کمیت کا کوئی مرتا ہوا ستارہ اپنی ہی کششِ ثقل سے سکڑتا ہے تو وہ اپنے تمام نیوکلیائی ایندھن پھونک چکا ہوتا ہے لہٰذا اس کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا کہ جس کی مدد سے وہ اپنی ہر لمحے بڑھتی ہوئی کششِ ثقل کو روک سکے نتیجتاً اس ستارے میں قوتِ ثقل بڑھتی ہی چلی جاتی ہے اس طرح وہ ستارہ اپنے آپ میں منہدم ہونے کا سلسلہ جاری رکھتا ہے۔ جوں جوں وہ سکڑتا ہے توں توں اس کی قوتِ ثقل میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ آخرکار وہ ستارہ اس قدر سکڑ جاتا ہے کہ اس کی ساری کی ساری کمیت ”صفر حجم“ (ریاضیاتی نقطے) میں سمٹ آتی ہے جبکہ اس کی قوتِ ثقل اتنی شدید اور مرتکز ہوجاتی ہے کہ کوئی بھی چیز حتیٰ کہ روشنی بھی وہاں سے فرار نہیں ہوسکتی۔ ایسے مردہ ستاروں کو بلیک ہولز (Black Hole) کہا جاتا ہے۔ ان سیاہ دھبوں کو 1969ء میں امریکی سائنسداں جان وھیلر نے بلیک ہولز کا نام دیا۔ اسٹیفن بلیک ہولز کے ارتقا کی تاریخ جانتا تھا۔ وہ بلیک ہولز کے حوالے سے اور زیادہ کام کرنا چاہتا تھا۔ اس نے آکسفورڈ میں اپنا بہتر مقام بنانا شروع کردیا تھا۔ اس کے اساتذہ اور ساتھی طلبا اسے بہت عزت سے دیکھتے تھے۔ اسٹیفن نے اپنی تعلیم کو اپنا عشق بنالیا تھا مگر قدرت نے اسٹیفن کے

بارے میں کچھ اور ہی سوچا ہوا تھا۔

نئے سال کی آمد پر اسٹیفن نے اپنے مکان 14 ہل سائیڈ روڈ پر اپنے قریبی دوستوں کے لیے ایک پارٹی کا اہتمام کیا تھا۔ ان دوستوں میں اسکول کے زمانے کے دوست بھی شامل تھے۔ پارٹی سے چند ماہ پہلے سے ہی اسٹیفن بیمار رہنے لگا تھا۔ تاہم ابھی اس کی بیماری کی تشخیص نہیں ہوئی تھی کہ اسے کیا بیماری ہے۔ نئے سال کی پارٹی میں ایک لڑکی جین وائلڈ بھی شامل تھی جسے سب جینی کہہ رہے تھے۔ جینی اور اسٹیفن کا تعارف ان کے ایک مشترکہ دوست نے کرایا۔ جینی سینٹ البانز میں رہتی تھی اور وہیں سے اس نے پرائمری تعلیم حاصل کی تھی۔ پہلی ملاقات میں ہی اسٹیفن اور جینی نے ایک دوسرے میں ایک خاص دلچسپی محسوس کی تھی۔ وہ پارٹی کے بعد بھی ملنے لگے۔ دوسری طرف اسٹیفن کی بیماری زور پکڑنے لگی۔ 1962ء اسٹیفن کرسمس کی تقریبات منانے کے لیے سینٹ البانز اسکول پہنچا تو پورا علاقہ برف سے ڈھکا ہوا تھا۔ اسے تقریب میں محسوس ہوا کہ اس کے ساتھ کچھ غلط ہورہا ہے۔ اس کے گھر والوں نے اسے ڈاکٹر کو دکھایا۔ ڈاکٹر نے معائنے کے بعد کہا کہ اسے اسپیشلسٹ ڈاکٹر کے پاس جانا ہوگا۔ اسٹیفن کو اسپیشلسٹ ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا۔ اس کے ٹیسٹ ہوئے تو پتا چلا کہ اسے ALS کا عارضہ لاحق ہے۔ اس مرض کو موٹر نیورون بھی کہا جاتا ہے۔ اسٹیفن کو لاحق بیماری اپنی نوعیت میں مہلک اور عجیب وغریب تھی۔ اس بیماری میں انسان رفتہ رفتہ بہت زیادہ لاغر ہوجاتا ہے۔ اس کے اعصاب کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ جس کے کچھ عرصہ بعد ہی مریض کی موت واقع ہوجاتی ہے۔ تاہم حیران کن بات یہ ہے کہ اس مرض میں مریض کا ذہن مکمل طور پر صحت مند رہتا ہے۔ اسٹیفن کے ڈاکٹروں نے بڑے افسوس سے بتایا کہ وہ جان لیوا بیماری کا شکار ہوگیا ہے اور وہ زیادہ سے زیادہ تین چار سال زندہ رہے گا۔ اسٹیفن ابھی اکیس سال کا تھا۔ اسے ابھی پی ایچ ڈی کرنی تھی، شادی کرنی تھی، کائنات کے سراغ جاننے تھے۔ اسے اپنی بیماری کا حوصلہ شکن جھٹکا لگا۔ تاہم اس نے خود کو جلد ہی سنبھال لیا۔ اس کے جلد سنبھلنے میں اس کی دوست جینی کا بڑا حصہ تھا۔ اس نے اپنے اور اسٹیفن کے درمیان اس کی بیماری کو نہیں آنے دیا۔ اب وہ اسٹیفن کے ساتھ رہنے لگی تھی۔ زندگی کے اس دردناک مرحلے پر اسٹیفن کے لیے جینی کا کردار قابلِ

> پروفیسر اسٹیفن ہاکنگ جب معذور ہوگیا اور اسے وہیل چیئر کا سہارا لینا پڑا تب سے ایپل کمپیوٹر اپنا ہر نیا ماڈل اسٹیفن ہاکنگ کو بطور تحفہ پیش کرتی ہے۔ اسٹیفن ہاکنگ اپنی بیماری کی وجہ سے نہ لکھ سکتا ہے اور نہ بول سکتا ہے۔ وہ بولنے اور لکھنے کا کام کمپیوٹر ڈیوائس کی مدد سے کرتا ہے۔ اسٹیفن ہاکنگ کا انگلش لہجہ برٹش ہے مگر کمپیوٹر ڈیوائس چونکہ امریکا کی بنائی ہوئی ہیں اس لیے جب اسٹیفن انگلش بولتا ہے تو اس کا لہجہ برٹش کے بجائے امریکن ہوجاتا ہے۔ جس پر برٹش لہجے پر فخر کرنے والے لوگ ڈھکے چھپے لفظوں میں اس کا اظہار کرتے ہیں کہ ہمیں اسٹیفن کو امریکن لہجے میں سننا پڑتا ہے۔

ستائش اور بے مثال تھا۔ اس نے جینی کو اپنی بیماری کے حوالے سے پوری طرح آگاہ کردیا تھا جبکہ جینی نے اسٹیفن کے ساتھ ان حالات کے باوجود شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ جینی کے کچھ دوستوں نے اسے سمجھانا چاہا کہ وہ سوچ لے، وہ بہت بڑا فیصلہ کرنے جارہی ہے جس پر جینی نے کہا میں اپنی زندگی کے نصب العین کی تلاش میں تھی تاکہ کوئی اچھا اور مثبت راستہ اختیار کرسکوں۔ اب میں اس نتیجے پر پہنچ گئی ہوں کہ یہ راستہ مجھے اسٹیفن کی خدمت اور دیکھ بھال سے حاصل ہوسکتا ہے۔ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور یہ کہ میں نے پہلے ہی طے کرلیا تھا کہ مجھے زندگی گزارنے کے لیے کیا کرنا ہے۔ یہ سب کچھ میں اسی کے مطابق کررہی ہوں اور اسٹیفن کی شدید محبت مجھ سے تقاضا کررہی ہے کہ میں اسے اپنا جیون ساتھی بناؤں۔

جولائی 1965ء میں اسٹیفن اور جینی نے شادی کرلی۔ یہ شادی پوسٹ گریجویٹ کالج کے ٹیرینی ہال میں ہوئی۔ شادی میں جینی اور اسٹیفن کے ماں باپ نے بھی حصہ لیا۔ جینی کا باپ جارج وائلڈ ایک سول سرونٹ تھا، اسے اپنی بیٹی کے ایثار پر فخر تھا۔ شادی کے دن دولہا دلہن نے خوب صورت لباس پہنا ہوا تھا۔ اسٹیفن نے ڈارک رنگ کے سوٹ پر سفید ٹائی لگائی تھی اور ڈارک گلاسز کا چشمہ پہنا تھا۔ اس کے قریب کھڑی جینی اسٹیفن کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

مقابلے میں بہت پیاری لگ رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں خوشنما پھولوں کی ٹوکری تھی جینی نے فیشن کے مطابق دلہن کا سفید لباس پہنا ہوا تھا۔ اس کے لبوں کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں۔ اس کے ہر انداز میں وقار جھلک رہا تھا۔ دونوں بہت پُرامید نظر آرہے تھے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کہہ رہے ہوں کہ مشکلات پر قابو پانا کوئی ان سے سیکھے۔ اپنے حالات کے پیشِ نظر انہوں نے صرف ایک ہفتے کا ہنی مون منایا۔ وہ بھی اندرونِ انگلستان۔ اسٹیفن کے لیے جینی اور اس کی محبت قدرت کا قیمتی انعام تھا۔ جینی نے اس کی زندگی کو ایک رخ دیا بلکہ اس کی زندگی بدل کر رکھ دی۔ سب سے بڑھ یہ کہ اسے زندہ رہنے کا حوصلہ دیا۔ اسے زندگی پر اعتبار کرنا سکھایا اسے عملی طور پر دکھایا کہ جس کا کوئی دوست ہو وہ غریب اور لاچار نہیں ہوتا۔ غریب اور بدقسمت وہ لوگ ہوتے ہیں جن کا کوئی دوست نہ ہو۔ جینی نے اسٹیفن کی زندگی میں رنگ بھر دیے۔ اسٹیفن کو یہ بھی سکھایا کہ زندگی کا طویل یا مختصر ہونا کوئی اہمیت نہیں رکھتا اہمیت اس چیز کی ہے کہ آپ جو زندگی گزار رہے ہیں کیا وہ زندگی ہے؟ ان تمام باتوں سے اسٹیفن کو بے پناہ قوت اور حوصلہ ملا۔ شادی کے فوراً بعد اسٹیفن کو اپنی آمدنی میں اضافہ کرنا تھا۔ اسے فوری طور پر پی ایچ ڈی کرنی تھی اسے علمِ کائنات پر کام کرنا تھا۔ یہ سب کچھ اسے بہت جلد کرنا تھا کیونکہ اس کے پاس وقت بہت کم تھا اور خواب بہت زیادہ۔ وہ اپنے کام میں جٹ گیا جینی کو بھی اپنی تعلیم مکمل کرنا تھی اس نے بھی کالج جانا شروع کر دیا۔ اب وہ دونوں بہتر زندگی کی کوششوں میں مصروف ہو گئے تھے۔ اسٹیفن کی ان کی کوششوں میں ایک رکاوٹ اس کی بیماری بھی تھی۔ اب اسے چلنے پھرنے میں دشواری پیش آنے لگی تھی۔ اس کے لیے کسی چیز کے سہارے کے بغیر چلنا پھرنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ وہ چیزوں کو پکڑ پکڑ کر چلتا اس سے اس کی رفتار بہت سست ہو گئی تھی۔ کئی بار وہ سہارا نہ ملنے پر چلتے ہوئے گر گیا تھا۔

اس کے ڈاکٹر نے اس کے لیے چھڑی کو ناگزیر قرار دیا تھا۔ چھڑی سے اس کا چلنا پھرنا قدرے بہتر ہو گیا تھا مگر بہت سی جگہوں پر چھڑی بھی اس کے لیے کافی نہیں تھی۔ ان سب کے باوجود وہ اپنی مشکلات کا خندہ پیشانی کے ساتھ مقابلہ کرتا اور انہیں اپنی راہ کی رکاوٹ نہ بننے دیتا۔ سفر کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے اسٹیفن نے یونیورسٹی کے قریب گھر لے لیا' جو یونیورسٹی سے لگ بھگ سو گز کے فاصلے پر تھا اس طرح سفر کی مشکلات کے علاوہ اس کا وقت بھی بچنے لگا تھا۔ اس نے یونیورسٹی کو درخواست دی کہ اسے پی ایچ ڈی کرنے کے لیے ٹائم لیمٹ (Time Limit) میں رعایت دی جائے کیونکہ اس کے پاس وقت نہیں ہے اور یہ کہ وہ مرنے سے پہلے پی ایچ ڈی کرنا چاہتا ہے۔ یونیورسٹی نے یونیورسٹی رولز کے خلاف انسانی ہمدردی کی بنیاد پر اسٹیفن کی درخواست منظور کر لی۔ اسٹیفن نے اپنی شب و روز کی بے پناہ محنت... اور ذہانت سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر لی۔ اس کے خواب پورے ہو رہے تھے۔ وہ بہت خوش تھا مگر ساتھ ساتھ اس کی بیماری کی شدت بھی بڑھ رہی تھی' وہ اور زیادہ معذور ہو گیا تھا۔ اس کے لیے زندہ رہنا مشکل سے مشکل تر ہو رہا تھا۔ چھڑی کے بعد اس نے بیساکھیاں لیں اور بیساکھیوں کے بعد اسے مستقل طور پر وہیل چیئر کا سہارا لینا پڑا۔ وہیل چیئر اسے پسند نہیں تھی مگر اس کے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ ان مشکل حالات میں اس کی بیوی جینی نے اس کا بہت ساتھ دیا۔ وہ بہت خلوص اور محبت سے اسٹیفن کی خدمت کرتی۔ اس نے ثابت کیا کہ دنیا صرف خودغرض لوگوں سے بھری ہوئی نہیں ہے بلکہ ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے جو محبت اور ایثار پر پختہ یقین رکھتے ہیں۔

زندگی کے اس سفر میں جینی اور اسٹیفن دو بچوں کے ماں باپ بن چکے تھے۔ جینی اپنی تعلیم اور اسٹیفن کے لیے ہمیشہ مستعد رہتی۔ جینی اور اسٹیفن کے حوصلے اور عزم نے ڈاکٹروں کی پیش گوئی کو غلط ثابت کر دیا تھا مگر اسٹیفن معذور ہو گیا تھا۔ تاہم اس معذوری میں بھی اس کا ذہن مکمل طور پر صحت مند تھا۔ پی ایچ ڈی کرنے کے بعد جلد ہی اسے ایک بہت بڑا اعزاز حاصل ہوا۔ جب اسے کیمبرج یونیورسٹی نے لوکاسٹین پروفیسر کی چیئر کے لیے منتخب کر لیا۔ اس وقت اسٹیفن کی عمر صرف سینتیس سال تھی۔ یہ وہی عظیم چیئر تھی جسے اسٹیفن سے لگ بھگ سو سال پہلے فزکس کے عظیم سائنس داں البرٹ آئن اسٹائن نے حاصل کیا تھا۔ آئن اسٹائن سے پہلے یہ چیئر آئزک نیوٹن کے پاس بھی رہی تھی اور اب یہ چیئر پروفیسر اسٹیفن ہاکنگ کے پاس تھی۔ یہ بہت ہی بڑی کامیابی تھی' بہت ہی بڑا اعزاز تھا۔ اسے گلیلیو گلیلی، نیوٹن اور آئن اسٹائن کے درجے کا سائنس داں تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اس اعزاز کے بعد پوری دنیا

اسٹیفن کو انتہائی عزت و وقار سے دیکھنے لگی تھی۔ اس اعزاز نے اسے ایک معذور اور موت کے منتظر شخص کے بجائے دنیا کا عظیم سائنس داں بنا دیا تھا۔ بیماری کے بعد اگر وہ ڈاکٹروں کی طرف سے سنائی گئی موت کی پیش گوئی سے مایوس ہو جاتا تو آج دنیا اس نابغۂ روزگار ہستی سے محروم ہوتی۔ اس نے مایوسی کا شاندار طریقے سے مقابلہ کیا اور دنیا بھر کے لوگوں کے لیے زندہ و تابندہ مثال قائم کی۔ اس نے ثابت کیا کہ اصل جواں مردی بدترین حالات کے خلاف جدوجہد ہے۔

جس وقت اسٹیفن کو لوکاسٹین پروفیسر کا اعزاز دیا گیا اس وقت اس نے کہا کیا یہ فزکس تھیوری کا اختتام ہے؟ اس نے رائے دینے کے انداز میں کہا کہ ''ایک سائنٹیفک اور بامعنی تھیوری بیان کرنا کائنات کے قوانین کی خصوصی بات ہے۔ اس کے ذریعے ہم بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں اور یہ اس صدی کے اختتام تک ہو سکتا ہے۔'' یہ ایک اچھوتا اور چونکا دینے والا خیال تھا اس پر اس وقت کے علمی حلقوں میں بحث شروع ہو گئی۔ لوکاسٹین پروفیسر کے اعزاز کے بعد اسٹیفن کو ایک بڑی کامیابی اس وقت ملی جب اس نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''وقت کا سفر'' (A Brief History Of Time) مکمل کی۔ اسٹیفن کو اس کتاب کی بھاری بھرکم رائلٹی ملی جس سے اس کی مالی زندگی انتہائی شاندار ہو گئی۔ کتاب کی اشاعت ہوتے ہی اس کتاب کی شہرت پوری دنیا میں پھیل گئی۔ دنیا بھر کی زبانوں میں اس کے تراجم ہونے لگے۔ لوگ اسے نیو آئن اسٹائن کہنے لگے۔ پوری دنیا سے اس پر انعامات و اعزازات کی بارش ہونے لگی۔ اسے ''ماسٹر آف یونیورس'' جیسے القابات سے نوازا جانے لگا۔ یہ کتاب 1991ء کے موسم گرما میں شائع ہوئی' برطانیہ میں یہ کتاب ایک سو پچاس ہفتوں تک Best Seller رہی۔ پوری دنیا میں لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہوئی۔ اسٹیفن کو دنیا بھر سے لیکچرز کے لیے بلایا جانے لگا۔ یہ زمانہ اسٹیفن کی زندگی کے عروج کا وقت تھا۔

''A Brief History Of Time وقت کا سفر'' علم کائنات کی کتاب ہے۔ اس کتاب میں کائنات کو سائنسی فکر کی روشنی میں سمجھنے کی بحث ہے۔ اس کتاب میں اسٹیفن نے کائنات کے حوالے سے گلیلیو گلیلی، آئزک نیوٹن، البرٹ آئن اسٹائن اور پوئنکار جیسے بڑے

پروفیسر اسٹیفن ہاکنگ اور نوبل پرائز

برطانیہ اور دنیا بھر سے اسٹیفن ہاکنگ فرینڈز کا خیال تھا کہ اسٹیفن نوبل پرائز کا حق دار بنتا ہے۔ اسے نوبل پرائز ملنا چاہیے۔ تاہم اس حوالے سے کئی دلچسپ روایات ہیں جس میں سے ایک روایت یہ ہے کہ نوبل پرائز کے بانی الفریڈ نوبل کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ہیئت دانوں سے نفرت کرتا تھا کیونکہ اس کی بیوی ایک ہیئت دان سے لَو افیئر میں بدنام تھی۔ لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ نوبل پرائز کے اجرا کے ایک عرصہ بعد تک کسی ہیئت دان کو نوبل پرائز کا انعام نہیں دیا گیا۔ اسٹیفن کے حوالے سے یہ بھی بہت مشہور ہے کہ اس نے کبھی بھی نوبل پرائز حاصل کرنے کی کوشش نہیں بلکہ نوبل پرائز حاصل کرنے سے احتراز کیا۔

سائنسدانوں کے نظریات کو بیان کیا ہے اور یہ کہ علم کائنات نے کیسے کیسے اور مرحلہ وار ترقی کی ہے۔ اس کتاب میں بہت سے ایسے سوالات اٹھائے گئے ہیں جن کے جوابات کے لیے دنیا صدیوں سے منتظر ہے۔ وہ خلا کی گہرائیوں اور وسعتوں کو بیان کرتا ہے اور اس سوال کا جواب تلاش کرتا ہے کہ کائنات کیسے پیدا ہوئی؟ اور کیسے ختم ہو گی؟ یا کبھی ختم نہیں ہو گی؟ کیا کائنات کی کوئی حد ہے؟ ایک ایسی کائنات میں کیا ہو گا جس کی چار کے بجائے گیارہ ڈائمنشنز ہوں گی؟ ستارے کیسے پیدا ہوتے ہیں اور کیسے مرتے ہیں؟ کیا وقت کبھی الٹا چل سکتا ہے؟ بلیک ہولز کیا ہیں' یہ کیسے بنتے ہیں؟ قوتِ ثقل کیا ہے؟ کائنات کا مقدر کیا ہے؟ اس جیسے سوالات اس کتاب کا موضوع ہیں۔ اس کتاب کا اردو میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے اور انٹرنیٹ پر مفت دستیاب ہے۔ اس کتاب کی اس تھیوری پر کہ وقت کبھی ماضی کی طرف رواں ہو سکتا ہے۔ اس پر ہالی ووڈ نے بیک ٹو دی فیوچر (Back To The Future) کے نام سے فلم بنائی جو بے حد کامیاب رہی، اس فلم کی پوری دنیا میں نمائش ہوئی اور اس نے ریکارڈ بزنس کیا۔ اسٹیفن کی اس تھیوری سے کہ وقت کبھی واپس ماضی کی طرف لوٹ

WWW.PAKSOCIETY.COM

لاہور کے عوام کو انگریز قوم کے ساتھ شدید محبت ہے اور وہ آج بھی انہیں یاد کرتے ہیں۔ میرے لیے یہ بات باعث حیرت ہے کیونکہ انگریزوں نے ڈیڑھ سو برس تک یہاں کے لوگوں کو اپنا غلام بنائے رکھا ہے اور اس دوران ان پر سخت مظالم روا رکھے ہیں لیکن اس کے باوجود لوگ انہیں بہت یاد کرتے ہیں۔ انگریز دور کے بعض خانساموں اور خان بہادروں سے ملاقات ہوئی تو انہیں کہتا سنا کہ انگریز کا جواب نہیں' ایک روز ایک گلی میں سے گزرتے ہوئے میں نے ایک شخص کو دیکھا جو اپنے بچے کو گود میں لیے ہلکارے دے رہا تھا۔ ساتھ ساتھ منہ سے کچھ بولے بھی جاتا تھا۔ میں جاننا چاہتا تھا یہاں کے لوگ اپنے بچوں کو بہلانے کے لیے ان کے ساتھ کس قسم کی گفتگو کرتے ہیں۔ اس نے کہا کہ یہ شخص اپنے بچے کو محبت بھری نظر سے دیکھ رہا ہے اور کہہ رہا ہے ''آہا' میرا بیٹا تو کسی انگریز کا بیٹا لگتا ہے۔''

اقتباس: ''خندِ مکرر'' از عطاء الحق قاسمی

آج سے کوئی ایک صدی پہلے کی بات ہے بمبئی کے ایک پارسی سیٹھ جمشید جی مدن نے کلکتہ میں مدن تھیٹر قائم کر کے بنگال میں فلم سازی کی ابتدا کی تھی۔ انہوں نے 1917ء میں پہلی خاموش فلم ''ستیہ وادی ہریش چندر'' بنائی پھر دھیرن گنگولی ان کے ساتھ شامل ہوئے جنہوں نے رابندر ناتھ ٹیگور سے فنون لطیفہ کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اسی دور میں انگلستان سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے ذہین فلمساز بی این سرکار نے کلکتہ میں پہلا سنیما ''چترا'' تعمیر کروایا اور 1920ء میں ٹالی گنج میں اعلیٰ ساز و سامان سے آراستہ فلم اسٹوڈیو ''نیو تھیٹرز'' قائم کی۔ اور فلمسازی شروع کی تو بنگالی زبان کے نامور ادیبوں ٹیگور' شرت چندر چٹر جی اور بنکم بابو کی بنگلہ کہانیوں اور ناولوں کو پردۂ سیمیں پر پیش کرنے کی ریت ڈالی۔ ''دیوداس'' بھی اسی سلسلے کی ایک فلم ہے جس کے لیے شرت بابو کے ناول کو پہلی بار منتخب کیا گیا اور اس کے مرکزی کردار کے ایل سہگل اور خورشید سے ادا کرائے گئے۔ کولکتہ کی موجودہ فلم انڈسٹری میں آج بھی اس بات کی پیروی کی جارہی ہے اور بنگالی زبان کی مقبول کہانیوں' ناولوں پر مبنی فلمیں بنائی جارہی ہیں۔

سکتا ہے اس وقت کے سائنس دانوں نے اختلاف کیا اور اس موضوع پر مضمون لکھے جس میں ثابت کیا گیا کہ اسٹیفن کا یہ نظریہ غلط ہے۔ یہ مضامین مختلف سائنسی رسالوں میں شائع ہوئے۔ اس نظریے کے مخالفین میں اسٹیفن کا ایک پرانا دوست ڈان پیج بھی شامل تھا۔ ڈان پیج سائنسی نکتے سے سمجھتا تھا کہ وقت کبھی بھی ماضی کی طرف نہیں لوٹ سکتا۔ ان مضامین اور مباحثوں کو اسٹیفن نے بہت غور سے پڑھا اور اپنے نظریات کو از سر نو پرکھا۔ اسے احساس ہوا کہ اس کا موقف درست نہیں ہے' سو اس نے شکاگو جا کر ایک بڑے مباحثے میں اقرار کیا کہ اس کا نظریہ غلط تھا اور اس سے اس معاملے میں غلطی سرزد ہوئی ہے اور یہ بھی کہ اس کے مخالفین کا نظریہ درست ہے کہ وقت کبھی بھی واپس ماضی کی طرف نہیں پلٹ سکے گا۔ مباحثے کے شرکا نے اسٹیفن کے اس اقرار پر تالیاں بجائیں اور اسے خراج تحسین پیش کیا کہ اس نے سچائی کی پزیرائی کی ہے۔ یہ اسٹیفن کا بڑا پن تھا کہ اس نے اپنی غلطی پر اصرار نہیں کیا۔ پروفیسر اسٹیفن ہاکنگ نے زندگی میں اپنے خوابوں سے زیادہ کامیاں حاصل کیں۔ اسے اپنے حوصلے اور عزم کی بدولت بے پناہ شہرت، عزت اور خوب زیادہ دولت ملی۔ اس کے ہاں جینی سے تین بچے رابرٹ ہاکنگ، لوسی ہاکنگ اور ٹموتھی ہاکنگ پیدا ہوئے۔ اس کی کامیاب زندگی میں ایک دکھ بھرا موڑ اس وقت آیا جب اس کے اور جینی کے درمیان غلط فہمیاں پیدا ہونے لگیں۔ وہ جینی جس نے اسے نئی زندگی دی وہ اس سے جدا رہنے لگی۔ دوسری طرف اسٹیفن بھی بے شمار تقریبات، مباحثوں اور لیکچرز میں مصروف رہنے لگا۔ دونوں اپنی غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے وقت نہیں دے پا رہے تھے۔ جینی محسوس کرنے لگی تھی کہ ان کے مابین دوری میں کمی ممکن نہیں ہے۔ اس نے اپنے مشغلوں میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔ جینی اور اسٹیفن کے درمیان خلیج کی خبریں ان کے گھر سے نکل کر لوگوں میں ہونے لگیں۔ ان کی خبروں سے ان کے دوست اور عزیز بہت دکھی ہوئے۔ وہ حیران تھے کہ یہ کیسے ممکن ہے کیونکہ جینی اور اسٹیفن کا تعلق مثالی تھا۔ لوگ ان کے شاندار تعلق کی مثالیں دیتے تھے۔ ان کے درمیان بڑھتی ہوئی دوری کی بھنک اخبارات تک پہنچ گئی۔ اب اخبارات کے رپورٹرز اس ٹوہ میں رہتے تھے مگر ان کے ہاتھ ایسی کوئی بات نہ آئی جس کی بنا پر وہ ان پر کیچڑ اچھال سکیں۔ جینی اور اسٹیفن نے اس

معاملے پر بہت دانشمندی اور احتیاط سے کام لیا۔ جس کی وجہ سے ایسے تمام اخبارات کو مایوسی ہوئی جو چھوٹی سے چھوٹی بات کو اسکینڈل بنا دیتے تھے۔ تاہم جینی اور اسٹیفن کے مشترکہ دوست اس صورتِ حال سے بہت پریشان تھے۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ وہ کیا عوامل ہیں جن کی وجہ سے ان میں دوری پیدا ہوئی اور وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ کسی طرح ...ان دونوں میں مصالحت کروا دیں۔

ایک دن ایک خبر شائع ہوئی کہ اسٹیفن نے جینی کو چھوڑ دیا ہے اور وہ گھر چھوڑ کر علیحدہ فلیٹ میں چلا گیا ہے۔ یہ خبر سچی تھی۔ خبر کی تفصیل میں یہ بھی درج تھا کہ اب اسٹیفن اپنی نرس ایلائن مین کے ساتھ رہ رہا ہے۔ اسٹیفن اور جینی کے دوستوں پر یہ خبر بجلی بن کر گری مگر اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ فیصلہ ہو چکا تھا اور ان کے دوستوں سے مصالحت کروانے میں تاخیر ہو چکی تھی۔ اسٹیفن کی نرس ایلائن مین ایک شادی شدہ عورت تھی۔ اس کے دو بچے تھے۔ اس کا خاوند کمپیوٹر انجینئر تھا۔ اس نے اسٹیفن کی وہیل چیئر پر کمپیوٹر نصب کیا تھا۔ کمپیوٹر کے حوالے سے اس کی اور اس کے شوہر کی اسٹیفن سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ ایک دن وہ اسٹیفن کی خواہش پر اس کی نرس بن گئی تھی۔ وہ پچھلے کئی سالوں سے اسٹیفن کی خدمت کر رہی تھی۔ وہ اسٹیفن کا بہت خیال رکھتی تھی۔ ایک ساتھ رہتے ہوئے ان کی رفاقت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اخبارات نے ایلائن کے حوالے سے اسٹیفن کو نشانہ بنانے کی کوشش کی مگر اس میں انہیں کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوسکی۔ اسٹیفن اور جینی کی رفاقت پچیس سال رہی۔ جینی نے اسٹیفن کے لیے اس وقت مثالی محبت اور ایثار کا مظاہرہ کیا تھا جس وقت اسٹیفن ایک عام سا سائنس کا طالب علم تھا اور خطرناک بیماری کا شکار تھا۔ اس وقت اس کے پاس نہ دولت تھی نہ شہرت۔

بعد میں اسٹیفن نے بھی جینی کے لیے بہت کچھ کیا تھا۔ ان کی علیحدگی کے بعد ان کے دوست بہت دل گرفتہ تھے مگر وہ دو گروپوں میں بٹ گئے۔ ایک گروپ جینی کی محبت اور قربانی کا طرف دار تھا' وہ سمجھتا تھا کہ جینی کا کردار بے نظیر تھا۔ خطاوار اسٹیفن ہے جبکہ دوسرا گروپ اسٹیفن کا مداح تھا' ان کا خیال تھا کہ جینی کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ دونوں گروپس کے نقطہ نظر کی روشنی میں اسٹیفن اور جینی میں سے کسی ایک کو علیحدگی کا ذمے دار قرار نہیں دیا جاسکتا تھا۔

ایک دن کا واقعہ ہے کہ وزیراعظم لیاقت علی خان کے نام ایک درخواست آئی جسے درخواست گزار کے ہم دست کسی دفتر میں بھجوانا تھا۔ وزیراعظم کے سیکریٹری کے پاس پنسل تک نہیں تھی۔ اس وقت ... اتفاق سے دہلی کے منظور الحق صاحب سیکریٹری کے دفتر میں بینچ پر بیٹھے تھے۔ انہوں نے اپنی جیب سے ایک پنسل نکال کر عطا کی۔ اس سے درخواست پر چند جملے لکھے گئے۔ سیکریٹری کی میز سے سمندری ہوا کے زوردار جھکڑ کاغذوں کو ہر سمت اڑایا کرتے تھے جس کو جمع کرنے کے لیے بینچ پر بیٹھے ہوئے لوگ تعاقب کرتے۔ وزیراعظم کے نورِ نظر اکبر میاں جو چھوٹے سے بچے تھے۔ ان کے لیے چند دنوں تک اڑتے ہوئے کاغذوں کو دوڑ دوڑ کر پکڑنا دلچسپ تماشا اور تفریحی شغل تھا۔ ایک دن وہ چند گول پتھروں پر رنگ برنگی کاغذ چڑھا کر لائے اور کاغذوں پر رکھ دیے تاکہ آئندہ وہ اڑ نہ جائیں۔ یہ تھا حکومت پاکستان کے عہدِ طفلی کا پہلا پیپر ویٹ۔

اقتباس: بے تیغ سپاہی از نواب صدیق علی خان

بمبئی کے انگریزی روزنامہ ''ٹائمز آف انڈیا'' میں وزیراعظم لیاقت علی خان نے میری جائداد کی ضبطی کی خبر پڑھ کر مجھے فوراً بلایا اور یہ محض اتفاق تھا کہ ان کی جائداد کی ضبطی کی بھی خبر اسی اخبار میں جلی حرفوں میں نمایاں طور پر شائع کی گئی تھی۔ علیک سلیک کے بعد وہ مجھ سے بغیر کچھ کہے سنے زور سے قہقہہ مار کر ہنسے' میں نے محسوس کیا کہ اس قہقہے میں ایثار' صبر' قناعت اور راضی بہ رضا ہونے کے جذبات مذکور تھے۔ میں اپنی شرط کے ساتھ آٹھ مہینے سے ملک کی اعزازی خدمت کر رہا تھا۔ اب نواب زادہ صاحب کو مجھے چھیڑنے کا موقع ہاتھ آیا' انہوں نے سوالیہ انداز میں فرمایا ''کہیے اب بھی تنخواہ لیں گے یا نہیں؟'' میں نفی میں کیسے جواب دیتا خود ہی فرمایا ''جوائنٹ سیکریٹری کی ماہانہ تنخواہ ساڑھے تین ہزار روپے ماہ بہ ماہ وصول کیجیے۔'' مگر میرے اصرار پر کہ مجھے اور میرے بیوی بچی کو پیٹ بھر روٹی کھانے اور صاف ستھرا کپڑا پہننے کے لیے ساڑھے بارہ سو روپے ماہوار کافی ہوں گے۔ میری اتنی ہی تنخواہ مقرر کی۔

اقتباس: بے تیغ سپاہی از نواب صدیق علی خان

WWW.PAKSOCIETY.COM

پروفیسر اسٹیفن ہاکنگ کو ملنے والے ایوارڈز اور اعزازات کی تفصیل۔

☆1975ء میں ریڈنگٹن میڈل۔
☆1976ء ہنکس میڈل آف دی رائل سوسائٹی۔
☆1979ء البرٹ آئن اسٹائن میڈل
☆1981ء فرینکلن میڈل
☆1982ء آرڈر آف دی برٹش ایمپائر
☆1985ء گولڈ میڈل آف دی رائل آسٹرونومیکل سوسائٹی۔
☆1986ء ممبر آف دی پونٹیفکل اکیڈمی آف سائنس۔
☆1988ء وولف پرائز فزکس۔
☆1989ء کمپینئن آف آرنر۔
☆1999ء جولیس ایڈگر لی لنفیلڈ پرائز دی امریکن فزیکل سوسائٹی۔
☆2003ء مائیکل سن مورلے ایوارڈ آف کیس ویسٹرن ریورس یونیورسٹی۔
☆2006ء کوپلے میڈل آف دی رائل سوسائٹی۔
☆2008ء فونزیکا پرائز آف دی یونیورسٹی آف گوڈی کومپوسٹیلا۔
☆2009ء پریزیڈنشل میڈل آف فریڈم (ہائی سول ایوارڈ آف امریکا)

اس وقت ان کے بچے بڑے ہوگئے تھے اور اپنے والدین کی علیحدگی پر بہت غم زدہ تھے۔ وہ اس واقع کی وجوہات سمجھنے سے قاصر تھے۔ اسٹیفن بھی اس واقعے سے بہت دلگرفتہ تھا مگر وہ لوگوں سے اپنے دکھ کا اظہار نہیں کرتا تھا بلکہ وہ اس کے برعکس مصنوعی طور اپنے دوستوں، طالب علموں کے درمیان خوشی کا اظہار کرتا اور قہقہے لگاتا۔ جیسے اسے کوئی دکھ نہیں ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اسٹیفن کو اپنے بچوں سے بہت محبت تھی تاہم وہ اس چیز کا اظہار ایک محفل میں کر چکا تھا کہ اسے اپنی بیٹی ٹموتھی سے زیادہ محبت ہے۔ وہ اب بھی اس کے ساتھ کھیلتا۔ اس کے ساتھ شطرنج کی بازی میں وہ اس سے دانستہ ہار جاتا۔

ٹموتھی جیت پر بہت خوش ہوتی۔ اسٹیفن کی دوسری بیٹی لوسی ہاکنگ نے بی بی سی ڈاکومینٹری فلم ''ماسٹر آف دی یونیورس'' میں کہا کہ وہ اس بات سے ذرا حسد نہیں کرتی ہے کہ ٹموتھی اس کے باپ کے زیادہ قریب ہے۔ اس کی اپنی شخصیت ہے اس کی اپنی خوبیاں ہیں۔ وہ ضدی اور حاسد ہرگز نہیں اور یہ کہ ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی خواہش کے مطابق کسی سے بھی اپنے تعلقات میں گہرائی پیدا کرے۔ اسٹیفن اور جینی کی مکمل علیحدگی کے بعد جینی سے بہت سے اخبارات نے بھاری معاوضے کے عوض بتانے کو کہا کہ وہ اسٹیفن کے متعلق لوگوں کو بتائے مگر جینی نے صاف انکار کر دیا کہ یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے اور وہ اس ضمن میں کوئی بات نہیں کرے گی۔ تاہم ایک موقع پر اس نے اپنے دوستوں کے اصرار پر اپنی زبان کھولنے پر آمادگی ظاہر کر دی مگر... شرط لگائی کہ اس تقریب میں وہ صحافی آئیں گے جنہیں وہ جانتی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ایک پُروقار تقریب میں اس نے اپنے اور اسٹیفن کے حوالے سے صرف اپنی گزری زندگی کے شاندار واقعات سنائے اور اختلافات کے حوالے سے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ اس نے کہا کہ زندگی اپنے اندر بہ یک وقت مثبت اور منفی پہلو رکھتی ہے مگر اہمیت صرف اچھے پہلوؤں کی ہوتی ہے، منفی پہلو زندگی کی بدصورتی ہوتے ہیں۔ انہیں پوشیدہ رکھنا زیادہ دانائی ہے۔ وہ اسٹیفن کے خلاف نہیں، اسے اس سے اختلاف ہے۔ اسٹیفن سے بھی لوگوں نے اس کے اور جینی کے اختلافات کے حوالے سے سوالات کیے جس پر اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے جینی کی تضحیک ہوتی ہو۔ ایک موقع پر اس نے بہت شاندار بات کی کہ

اس نے ''بریف ہسٹری آف ٹائم'' لکھ کر بہت مشکل اور پیچیدہ سوالات کے جوابات دیے ہیں۔ جو کسی طور آسان نہ تھا لہٰذا اس سے اور سوال نہ کیے جائیں کیونکہ اس نے کسی بھی شخص کے زیادہ سوالات کے جواب اپنی کتاب میں لکھ دیے ہیں۔

قارئین یہ ہے پروفیسر اسٹیفن ہاکنگ جس کی زندگی ہمیں مشکل سے مشکل حالات میں بھی مایوسیوں کے خلاف جنگ پر آمادہ کرتی ہے۔ پروفیسر اسٹیفن ہاکنگ آج بھی زندہ ہیں اور ان کا شاندار کام مرنے کے بعد بھی انہیں زندہ رکھے گا۔

باغی

ابن کبیر

اس نے جس ماحول میں پرورش پائی تھی اس کا اثر ذہن پر چھاپ چھوڑ گیا۔ ماں باپ کے درمیان پھیلی خلیج نے اس کے ذہن و دل میں بغاوت کا مادہ پیدا کیا اور یہ محسوسات اسے دنیا میں مقبول بناتے چلے گئے۔ وہ اپنی آواز سے لوگوں کو باغی بنا رہا تھا۔ اس کے نغمے بغاوت کی آگ ثابت ہو رہے تھے۔ کہیں یہ آگ اونچے ایوانوں تک نہ پہنچ جائے اسی خیال سے حکومت بوکھلا اٹھی تھی۔

یورپ سے درآمد ایک گلوکار کی زندگی کا عکس

وہ اُس کی ہنگامہ خیز زندگی کی آخری رات تھی!

سڑک پر ٹریفک معمول سے کم تھا، اسٹریٹ لائٹس کی روشنی کُہرے میں گم ہو رہی تھی۔ بیش تر دکانوں کے شٹر گر چکے تھے جو اِکا دُکا دکانیں کھلی تھیں، وہاں بھی مکمل خاموشی چھائی تھی۔

کار سے اترتے ہی ہوا کا سرد جھونکا اُس کے وجود سے ٹکرایا۔ اُس نے اپنی بیوی کی جانب دیکھا جو سڑک عبور کر کے تیزی سے اپارٹمنٹ کی جانب بڑھ رہی تھی پھر ٹاور پر

WWW.PAKSOCIETY.COM

نصب گھڑی پر نظر ڈالی جس کا کانٹا گیارہ کے ہندسے کو چھونے کی جستجو میں تھا۔

ابھی وہ اپارٹمنٹ سے چند قدم دُور تھا کہ ایک پُراسرار آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی۔ ''مسٹر لینن!''

حیرت کے زیرِ اثر وہ پلٹا اور منجمد ہوگیا۔

اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک سپاٹ چہرہ تھا۔ ایسا چہرہ جو اجنبی ہونے کے باوجود مانوس تھا۔ ایسا چہرہ، جو وہ پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔

''مگر کہاں؟'' اُس کا ذہن الجھ گیا۔ ''شاید خوابوں میں..... شاید آئینے میں..... یا شاید چند گھنٹوں قبل!''

وہ اِسی سوچ میں غلطاں تھا کہ ایک فائر ہوا..... اور اُس کا کاندھا انگاروں سے بھر گیا۔

اِس سے قبل کہ فٹ پاتھ پر موجود لوگ کچھ سمجھ پاتے، مزید تین گولیاں اُس کے جسم میں اتر چکی تھیں۔

وہ گر گیا، مگر اُس کی نظریں اپنے قاتل پر ٹکی رہیں جو بھاگنے کے بجائے پُرسکون انداز میں اپنی جگہ پر کھڑا تھا۔ اُس نے پسٹل پھینک دیا تھا اور بے تاثر آنکھوں کے ساتھ زخمی کی بیوی کو دیکھ رہا تھا، جو مدد کے لیے پکار رہی تھی۔

سانحے کا سحر ٹوٹا، لیکن غیر یقینی قائم رہی۔ لوگ تیزی سے زخمی کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ایسے میں ایک شخص قاتل کو مخاطب کرتے ہوئے دہاڑا۔ ''کیا تمہیں اندازہ ہے، تم کیا کر بیٹھے ہو؟''

''ہاں!'' سپاٹ چہرے پر تحیر خیز سکون تھا۔ ''میں جان لینن کو قتل کر چکا ہوں!''

جب مین ہٹن پولیس ڈیپارٹمنٹ کے اہل کاروں کی فوج جائے واردات پر پہنچی، ایک غیر یقینی صورتِ حال اُن کی منتظر تھی۔

ٹاور پر نصب گھڑی کا کانٹا گیارہ کا ہندسہ عبور کر چکا تھا۔ ڈکوٹا اپارٹمنٹ کے عین سامنے ایک باغی آخری سانسیں لے رہا تھا اور اُس کا قاتل چند قدموں کی دوری پر ایک معمول کے مانند کھڑا تاریکی میں گھور رہا تھا۔

یہ 8 دسمبر 1980 کی سیاہ رات کا ذکر ہے، جب ایک گمنام شخص نے عہدِ حاضر کے ممتاز اور متنازعہ ترین گلوکار جان لینن کو قتل کر دیا، جس کے نتیجے میں شوبز کی تاریخ کے سب سے بڑے معمے نے جنم لیا۔ ایسا معما، جس کے حل کا اکلوتا امکان... مقتول کی زندگی میں پنہاں تھا!!

☆☆☆

جب جان نے آنکھ کھولی، برطانیہ حالتِ جنگ میں تھا اور اُس کا باپ گھر سے میلوں دُور سمندر کے سینے پر ملکی مفادات کی جنگ لڑ رہا تھا۔

9 اکتوبر 1940 کی صبح لیورپول کے آسمان پر جنگی طیارے چنگھاڑ رہے تھے اور میٹرنٹی اسپتال کے بستر پر دراز جولیا کے چہرے پر نقاہت رقصاں تھی۔

وہ خاصی تھک چکی تھی اور اپنے شوہر الفریڈ لینن کی کمی شدت سے محسوس کر رہی تھی۔ اُس نے نظر اٹھا کر اپنی بڑی بہن میمی کی جانب دیکھا جس نے گھر سے اسپتال تک کا راستہ دوڑتے ہوئے طے کیا تھا اور اب کرسی پر بیٹھی ہانپ رہی تھی۔

جولیا نے سرد آہ بھری اور آنکھیں موند لیں۔ اب وہ ماضی میں تھی۔ اُسے وہ شام یاد تھی، جب ٹروکیڈرو کلب میں اُس کا پندرہ سالہ الفریڈ سے پہلی بار سامنا ہوا تھا۔ اگلی ملاقات سوفٹون پارک میں ہوئی جہاں وہ ایک بینچ پر بیٹھی اپنی سہیلیوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھی۔ ایسے میں سر پر بڑا سا ہیٹ چڑھائے، ہاتھ میں سگریٹ لیے الفریڈ سامنے آن کھڑا ہوا۔ ''ہیلو، میرا نام الفریڈ لینن ہے۔''

چودہ سالہ جولیا کے ہونٹوں پر شرارت کھیل رہی تھی۔ ''مسٹر لینن، ایک بات تو بتاؤ۔ تم زیادہ دلچسپ ہو یا تمہارا یہ ہیٹ؟''

''میں اِس ہیٹ کی بابت تو نہیں جانتا...'' الفریڈ اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ ''لیکن تم بلا کی حسین ہو۔''

''تعریف کا شکریہ مگر کیا آپ اِس قدیم ہیٹ سے جان چھڑا سکتے ہیں پیارے الفریڈ؟''

''جو حکم میرے آقا!'' الفریڈ نے ہیٹ اتار کر پرے پھینک دیا۔

بس یہی ادا جولیا کو بھا گئی۔ اُن کی دوستی ہوگئی جس میں جلد انسیت در آئی اور یہ متوقع تھا، ان کی دلچسپیاں یکساں تھیں۔ دونوں ہی موسیقی اور سنیما کے رسیا تھے، دونوں ہی زندگی سے بھرپور تھے۔

سوفٹون پارک میں ہونے والی اُس ملاقات کے ٹھیک گیارہ برس بعد، اپنے اہلِ خانہ کو مطلع کیے بغیر وہ رشتۂ ازدواج میں بندھ گئے۔

1938 کی اُس حسین صبح وہ کورٹ میں داخل ہوئے، قانونی کارروائی نمٹانے کے بعد ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے باہر آئے، قریبی ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا اور پھر

سینما گھر چلے گئے۔

شام ڈھلے جب جولیا نیو کاسل روڈ پر واقع اپنے گھر میں داخل ہو رہی تھی، اُس کے ہاتھ میں شادی کا سرٹیفکیٹ تھا۔ ''ڈیڈ، اب میں جولیا اسٹینلے سے جولیا لینن ہوگئی ہوں۔''

یہ خبر خاندان پر بجلی بن کر گری۔ خصوصاً بڑی بہن میمی کو شدید صدمہ پہنچا۔ گو کہ وہ جولیا کی باغیانہ طبیعت سے واقف تھی، الفریڈ اور اپنی بہن کے تعلقات کا بھی اُسے علم تھا لیکن وہ اس انتہائی اقدام کی توقع نہیں کر رہی تھی۔

نئے نویلے جوڑے کو ساتھ وقت گزارنے کا موقع نہیں ملا۔ پیشہ ورانہ ذمّے داریوں نے شادی کی اگلی صبح الفریڈ کو برطانوی بحریہ کے ویسٹ انڈیز جانے والے جہاز میں سوار کروا دیا جہاں سے لوٹنے میں اُسے تین ماہ لگے۔

اِس عرصے میں جولیا اپنے ماں باپ کے ہاں رہی جنہیں اس رشتے پر شدید تحفظات تھے لیکن بیٹی کی ضد کے آگے اُنہیں ہتھیار ڈالنے پڑے۔ جب الفریڈ محاذ سے لوٹا، اُس کا استقبال ایک داماد کی حیثیت سے کیا گیا۔ اِس عرصے میں اس نے بحریہ کی ملازمت سے جان چھڑانے کی بھرپور کوششیں کیں لیکن وہ نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئیں۔ جنگِ عظیم دوم نے ملک میں مالیاتی بحران پیدا کر دیا تھا اور اچھی ملازمتوں کا کال تھا۔

پھر ایک صبح... جولیا کو احساس ہوا کہ وہ امید سے ہے۔ وہ ایک خوش گوار لمحہ تھا لیکن مسرت جلد ہی دم توڑ گئی۔ ایک بار پھر حکومت برطانیہ کی جانب سے بلاوا آ گیا، الفریڈ کو جانا پڑا۔

گو کہ وہ وعدہ کر کے گیا تھا کہ جلد از جلد لوٹ آئے گا لیکن جنگ نے واپسی کے راستے مسدود کر دیے۔ تنہائی کے ان دنوں میں الفریڈ کے محبت نامے سہارا تھے۔

''بہت ہی پیارا بچہ ہے۔'' نرس کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ اُسے ماضی سے نکال کر حال میں لے آئے۔

''نام سوچا ہے؟'' نرس پنگوڑے پر جھکی تھی۔

''ہاں۔'' جولیا کی آنکھیں چمکیں۔ ''ہم میاں بیوی اِس کا فیصلہ پہلے ہی کر چکے تھے۔ اِس کا نام جان ونسٹن لینن ہوگا!''

''خوب!'' نرس چہکی۔ ''میری دعا ہے کہ خدا اِس بچے پر اپنی رحمت نازل کرے۔''

☆☆☆

شفقتِ پدری سے محروم جان کا ابتدائی بچپن اپنے ننھیال میں گزرا۔ اِس دوران ایک دو بار الفریڈ کا لیورپول آنا ہوا لیکن اُسے جلد لوٹنا پڑا۔

گو کہ وہ شعور کی دہلیز سے کوسوں دُور تھا لیکن دھیرے دھیرے اُسے چیزیں سمجھ میں آنے لگی تھیں، وہ جانتا تھا کہ جو عورت اُسے ٹوٹ کر چاہتی ہے، وہ اُس کی ماں ہے اور جو عورت ہر شام اُس کے لیے چاکلیٹ اور ٹافیاں لاتی ہے، وہ پیاری آنٹی میمی ہے۔

اگرچہ اس کے ذہن میں الفریڈ سے ہونے والی ملاقاتوں کا کوئی نقش نہیں تھا، تاہم اسے احساس تھا، دیوار پر جس شخص کی تصویر آویزاں ہے، وہ اُس کا باپ ہے۔

اکثر گھر کی چار دیواری میں الفریڈ کا ذکر ہوتا، خصوصاً اُس روز تو کثرت سے یاد کیا جاتا، جب مہینے کی پہلی تاریخ کو ڈاکیا خط اور منی آرڈر تھامے دروازے پر دستک دیتا۔

جولیا ہر خط اُسے پڑھ کر سناتی جن میں کئی جگہ ننھے جان کا ذکر آتا۔ وہ اپنے باپ کے خیالات پوری طرح سمجھ تو نہیں پاتا لیکن ہر بار جب ڈاکیا دروازے پر دستک دیتا، اُسے اپنے وجود میں مسرت کی لہر دوڑتی محسوس ہوتی۔ اور جب بھی آنٹی میمی کہتیں۔ ''جنگ ختم ہوتے ہی تمہارے ڈیڈی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لوٹ آئیں گے۔'' جان خوشی سے چہک اٹھتا۔

اُس معصوم کو اندازہ نہیں تھا کہ باپ کے لوٹنے سے قبل حالات انتہائی ابتر ہو جائیں گے۔

بگاڑ کا آغاز 1943 کے وسط میں ہوا، جب الفریڈ کا ذکر گھر میں گھٹنے لگا اور اپنے بیٹے پر جان چھڑکنے والی جولیا گھر سے باہر رہنے لگی۔ جولیا میں آنے والی تبدیلیوں کا سبب ویلز سے تعلق رکھنے والا ٹیفی نامی ایک خوبرو فوجی افسر تھا۔

اپنی بہن کے رویّے سے نالاں میمی نے جب اسے سمجھانے کی کوشش کی تو اُس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''کیا تم نے الفریڈ کے خطوط نہیں پڑھے؟ اُسی نے تو لکھا تھا کہ میں گھر میں بیٹھے رہنے کے بجائے باہر نکلوں۔ گھوموں پھروں۔ نئے دوست بناؤں۔ اب اگر میری کسی سے دوستی ہوگئی ہے، تو اِس میں میرا کیا قصور پیاری بہن!''

1944 کے موسم سرما میں ابتری اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ منی آرڈرز کی ترسیل کے عمل میں پُراسرار وقفے آنے لگے اور پھر اچانک... یہ سلسلہ منقطع ہوگیا جس کے بعد گھر

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں الفریڈ کا ذکر بھی ختم ہوگیا۔

جنوری 1945 میں جب منی آرڈرز کی آمد کا سلسلہ معطل ہوئے چھے ماہ بیت چکے تھے، اچانک الفریڈ نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

جس شخص کو جان کل تک تصویروں میں دیکھا کرتا تھا، اُسے سامنے دیکھ کر پہچاننے میں خاصی دقت ہوئی، تاہم جب الفریڈ نے اُسے بازوؤں میں بھرا، اُس نے خوشی محسوس کی۔ البتہ جولیا کا معاملہ مختلف تھا، وہ اپنے شوہر کی واپسی سے قطعی خوش نہیں تھی۔ اور اس کا سبب واضح تھا، وہ حاملہ تھی!

الفریڈ پر یہ خبر بجلی بن کر گری۔ دونوں میں طویل تکرار ہوئی، جس کے اختتام پر گھر میں اذیت ناک خاموشی چھا گئی۔ اِس پورے عرصے میں وہ آنٹی میمی کی گود میں دبکا رہا۔

خاصی سوچ بچار کے بعد الفریڈ نے جولیا کو ایک تجویز پیش کی۔ ''میں تمہاری اور اپنے بیٹے کی کفالت کے لیے تیار ہوں۔ اور اُس بچے کی ذمّے داری اٹھانے کے لیے بھی تیار ہوں، جو میرا نہیں!''

''اِس کی ضرورت نہیں ڈیئر۔'' جولیا نے سرد آہ بھری۔ ''کشتیاں نئی منزل کی جانب روانہ ہوچکی ہیں، اب اُس ساحل پر واپسی ممکن نہیں، جہاں تم ہو!''

''کیا یہ تمہارا حتمی فیصلہ ہے؟'' الفریڈ کی آنکھوں میں نمی تھی۔

''ہاں۔'' اُس کا لہجہ بُجھا ہوا تھا۔

اگلی صبح الفریڈ نے اپنے بیٹے کے گال پر بوسہ دیا، سامان اٹھایا اور دروازہ عبور کرگیا۔

گوکہ جان کے لیے وہ ایک اجنبی تھا لیکن اُس کے جانے سے اُس نے دُکھ محسوس کیا۔ ایسا دُکھ، جسے وہ آنے والے برسوں میں اپنے گیتوں کی صورت آواز دینے والا تھا۔

☆☆☆

وہ تنہا تھا، خوف زدہ تھا اور اُس کے معدے میں بھوک رینگ رہی تھی!

اِس کرب ناک کیفیت سے وہ ہر شام گزرتا، اپنی ماں کی عدم توجہی کے باعث، جو بے روزگار تھی، حاملہ تھی اور اپنے محبوب کی بے وفائی کے سبب ذہنی دباؤ کا شکار رہنے لگی تھی۔ اُس کی غفلت کے باعث ننھے جان کو ناشتے میں رات کا بچا ہوا کھانا ٹھکم میں اتارنا پڑتا، میلے کپڑوں میں کئی کئی دن کاٹنے پڑتے۔

ابھی جولیا زچگی سے ایک ماہ دُور تھی کہ الفریڈ نے دروازے پر دستک دی۔ وہ جان کو لینے آیا تھا۔

''جان کا معصوم ذہن کوئی صدمے سہنے کے لیے تیار نہیں۔'' الفریڈ نے اپنی بیوی سے کہا۔ ''بہتر ہے، جب تک بچے کی پیدائش نہیں ہوجاتی، وہ میرے ساتھ رہے۔''

جولیا نے زیادہ بحث نہیں کی، وہ شدید دباؤ میں تھی جس کا بڑا سبب اُس کا خاندان تھا جو نہیں چاہتا تھا کہ وہ ٹیٹی کے ناجائز بچے کی پرورش کرے۔

1945 کے وسط میں جولیا نے ایک بیٹی کو جنم دیا جسے خاموشی سے ایک آئرش جوڑے کے حوالے کردیا گیا۔

''اب تمہیں اپنے بیٹے پر توجہ دینی ہوگی۔'' زچگی کے عمل سے گزرنے کے بعد جولیا کی سماعتوں سے اپنی بہن کے الفاظ ٹکرائے۔ ''جان بڑا ہوگیا ہے، اسے اسکول میں داخل کروانے کے بارے میں سوچو۔''

''ہاں۔'' لہجے میں دُکھ تھا۔ ''مجھے احساس ہے۔''

میمی توقع کررہی تھی کہ اِس سانحے کے بعد جولیا میں تبدیلی آجائے گی لیکن وہ غلط تھی۔ بستر سے اٹھتے ہی وہ پھر باہر کی جانب دوڑ پڑی، جہاں عشق کا ایک اور پُرخطر تجربہ منتظر تھا۔

بوبی ڈکنز نامی ایک بے روزگار آدمی تھا جس نے خوبرو مگر شکستگی کی شکار جولیا کو بہ آسانی دام میں پھنسالیا اور بوریا بستر سمیٹ کر اُس کے گھر آگیا۔

اِس اقدام نے میمی کو آگ بگولا کردیا۔ اُسے شدید قلق تھا کہ جولیا نے اپنے شوہر سے طلاق لیے بغیر ایک اور شخص سے رشتہ استوار کرلیا ہے۔ گوکہ بوبی ڈکنز ایک ہنس مکھ نوجوان تھا لیکن میمی کو وہ ایک آنکھ نہیں بھایا۔ اُسے جان کی بھی فکر تھی جسے اسکول میں داخل کروادیا گیا تھا۔

ایک بار پھر اس نے اپنی بہن کو سمجھانے کی کوشش کی۔ جولیا نے اپنے رویّے میں تبدیلی لانے کا وعدہ کیا لیکن وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہوجائے۔ حالات میں کوئی سُدھار نہیں آیا۔ آخرکار میمی نے یہ مطالبہ کردیا کہ مظلوم جان کی کفالت کی ذمّے داری اُسے سونپ دے۔

''میں جانتی ہوں کہ تمہیں جان سے کتنا پیار ہے۔'' جولیا کے چہرے پر غمگین مسکراہٹ تھی۔ ''لیکن اِس کا مطلب یہ نہیں کہ میرا بیٹا مجھ سے چھین لیا جائے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میمی نے سرد آہ بھری۔ ''پھر مجھے

قانونی راستہ اختیار کرنا ہوگا۔''

اور میمی نے ایسا ہی کیا۔ اُس نے لیورپول پبلک سروس کونسل میں جولیا کے خلاف درخواست دائر کردی، جس میں اُسے مالی و ازدواجی مسائل میں گھری ایک غافل ماں کے طور پر پیش کیا۔

کونسل کی جانب سے شکایت کا فوری نوٹس لیتے ہوئے جولیا کی سخت سرزنش کی گئی۔

جولیا نے نم آنکھوں کے ساتھ اپنے رویّے پر معافی مانگی اور کونسل ممبران کے سامنے عہد کیا کہ اُنہیں آیندہ شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔

عشق کے سحر نے اُسے اپنا عہد نبھانے کا موقع نہیں دیا۔ چند ہی روز بعد میمی نے کونسل کے سامنے ایک اور درخواست پیش کردی۔

فیصلہ اِس بار میمی کے حق میں ہوا۔ جان کو اپنی خالہ کے حوالے کردیا گیا جو اُسے مین لوا یونیو پر واقع اپنے گھر لے گئی۔

بیٹے کو رخصت کرتے وقت جولیا کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ننھا جان بھی صدمے میں تھا۔ باپ سے دُوری کے بعد وہ ماں کی قربت سے بھی محروم ہوگیا تھا لیکن میمی اور اُس کے شوہر جارج کی محبت نے اُسے دُکھ کی برسات میں بھیگنے سے محفوظ رکھا۔ اِس بے اولاد جوڑے کی بھرپور توجہ کے طفیل دھیرے دھیرے اُس کا اعتماد بحال ہونے لگا۔

اِس عرصے میں جولیا باقاعدگی سے ملاقات کے لیے آتی رہی۔ وہ کھلونے اور چاکلیٹ لاتی، گھنٹوں اُس کے ساتھ کھیلتی، گانے گاتی اور پھر آنکھوں میں نمی لیے لوٹ جاتی!

☆☆☆

جولائی 1946 کی اُس خنک صبح جس شکستہ حال شخص نے میمی کے دروازے پر دستک دی، اُس کا وہاں آنا کچھ ایسا غیر متوقع بھی نہیں تھا، لیکن اُس نے جو درخواست کی، اُس نے میمی کو شک کی کھائی میں دھکیل دیا۔

وہ الفریڈ لینن تھا، جو خاصا مضمحل معلوم ہوتا تھا۔ میمی جانتی تھی، جولیا کا عاشق ڈکنز مختلف ذرائع سے اُس پر دباؤ ڈال رہا ہے کہ وہ اپنی بیوی کا طلاق دے دے لیکن الفریڈ اِس کے لیے راضی نہیں۔

''کیا میں اندر آسکتا ہوں؟'' اُس کے لہجے میں ایک باپ کا دُکھ تھا۔

میمی ایک جانب ہوگئی۔ جیسے ہی الفریڈ کی نظر اپنے بیٹے پر پڑی، اُس کے وجود پر چھائی شکستگی چیخنے لگی۔ جان کا چہرہ بھی کِھل اٹھا۔

''میں ایک درخواست لے کر آیا ہوں۔'' الفریڈ کی آواز میں سکون تھا۔ ''آج کل جان کی چھٹیاں ہیں۔ میں اِسے سیر کے لیے بلیک پول لے جانا چاہتا ہوں، اگر آپ اجازت دیں تو؟''

میمی نے ننھے جان کی جانب دیکھا جس کی آنکھوں میں اشتیاق تھا، مسرت تھی۔

''پلیز آنٹی!'' اِن الفاظ نے میمی کو پگھلا دیا۔ اُس نے اجازت دے دی۔

چند منٹوں بعد جان کاندھے پر چھوٹا سا بیگ لٹکائے، اپنے باپ کا ہاتھ تھامے دروازے کی جانب بڑھ رہا تھا۔

میمی کی نظریں اپنے بھانجے پر ٹکی تھیں اور بے چینی اُس کے وجود میں پھنکار رہی تھی۔

دوسری جانب الفریڈ کے ہونٹوں پر شاطر مسکراہٹ تھی۔ وہ اپنے منصوبے میں کامیاب رہا۔ بلیک پول کی سیر تو فقط بہانہ تھی، حقیقت یہ تھی کہ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نیوزی لینڈ منتقل ہونے کا فیصلہ کرچکا تھا۔ اُس نے ٹکٹ بھی بک کروالیے تھے۔

''جولیا، اب تم کبھی اپنے بیٹے کو نہیں دیکھ پاؤ گی!'' یہ کہتے ہوئے وہ ٹیکسی میں سوار ہوگیا۔

میمی اب بھی دروازے پر کھڑی تھی۔

☆☆☆

جونہی جولیا کو یہ خبر ملی کہ الفریڈ جان کو اپنے ساتھ لے گیا ہے، اُس نے کارپر فیلڈ کے علاقے کی جانب دوڑ لگا دی جہاں الفریڈ مقیم تھا، مگر کوشش لاحاصل رہی۔ اُس کے پہنچنے سے سات گھنٹے قبل الفریڈ، جان کے ساتھ بلیک پول جانے والی ٹرین میں سوار ہوچکا تھا۔ اِسی اثنا میں ڈکنز یہ اطلاع لے کر آیا کہ اُس کا شوہر ملک چھوڑنے کا ارادہ کیے بیٹھا ہے۔

''چند روز پہلے میرے ایک دوست نے اُسے ٹریول ایجنسی میں دیکھا تھا۔ اُس نے دو ٹکٹ خریدے ہیں!''

یہ سنتے ہی جولیا سکتے میں آگئی۔ ایک گھنٹے بعد وہ ٹرین میں سوار بلیک پول کی جانب بڑھ رہی تھی۔

الفریڈ جولیا کو اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''تم مجھے جان سے جدا کرنا چاہتے ہو؟'' آنکھوں میں غصہ تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

''اگر تمہیں پتا چل ہی گیا ہے تو ٹھیک ہے۔'' الفریڈ نے کاندھے اچکائے۔ ''ہاں میں اسے تمہاری پہنچ سے دور لے جانا چاہتا ہوں۔ تم اپنے عاشق کے ساتھ خوش رہو۔'' اس نے ڈکنز کی جانب اشارہ کیا جو جولیا کے پیچھے کھڑا تھا۔

میاں بیوی کے درمیان طویل تکرار ہوئی۔ اس دوران پانچ سالہ جان کونے میں کھڑا پلکیں جھپکتا رہا۔ خوف کی لہریں اس کے شعور سے ٹکرا رہی تھیں۔

جب بحث کسی نتیجے پر نہیں پہنچی تو الفریڈ نے ایک عجیب فیصلہ کیا۔

''جان کس کے ساتھ رہنا چاہتا ہے، اس کا فیصلہ وہ خود ہی کرے گا۔'' اُس نے اپنے بیٹے کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''پانچ سالہ بچہ یہ فیصلہ کیسے کر...؟'' یہ ڈکنز کے الفاظ تھے، جسے الفریڈ نے بری طرح جھڑک دیا۔

''تم اپنی بکواس بند کرو۔ بولو جان تم کس کے ساتھ رہنا چاہتے ہو؟'' اس نے اپنے بیٹے کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا اور جان کو یکدم گھٹن کا احساس ہونے لگا۔

''بولو جان جواب دو۔'' وہ اپنے بیٹے کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

''مجھے آپ کے ساتھ رہنا ہے...'' وہ بہ مشکل کہہ پایا۔

الفریڈ کے چہرے پر مسرت پھیل گئی۔ اس نے جولیا کی جانب دیکھا، جس کا چہرے سیاہ پڑ چکا تھا۔

''جان، کیا تم اپنی ماں کے ساتھ نہیں رہنا چاہتے؟'' ڈکنز پھر درمیان میں کود پڑا۔

''مجھے... پاپا کے ساتھ رہنا ہے۔'' تذبذب کے شکار جان نے ہچکی لی اور اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے اندر کچھ ٹوٹ گیا ہو۔

کمرے میں سناٹا تھا۔ شکستہ حال جولیا آنکھوں میں نمی لیے جان کے قریب گئی۔ ''اپنی ماں کو یاد رکھنا، وہ تم سے بہت محبت کرتی ہے۔'' اُس نے اپنے بیٹے کے گال پر بوسہ دیا۔ مڑی اور دروازے کی جانب بڑھنے لگی۔

ٹھیک اُس لمحے جان کو ایک تبدیلی کا احساس ہوا۔

''رک جائیں مما!'' وہ چلایا۔ ''میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔''

جولیا پلٹی، آنکھوں میں غیر یقینی تھی۔ ''تم میرے ساتھ چلو گے بیٹا؟''

''ہاں... میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔'' یہ جان کے الفاظ تھے، جنہوں نے الفریڈ کو آگ بگولا کر دیا۔ وہ آپے سے باہر ہو گیا اور چیخنے چلّانے لگا۔

''چلے جاؤ، تم دونوں یہاں سے۔ دفع ہو جاؤ۔ میں تمہاری شکلیں بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔ جاؤ!''

جولیا نے اپنے بیٹے کو گود میں اٹھا لیا۔ دہلیز عبور کرتے وقت جان نے پلٹ کر دیکھا۔ الفریڈ صوفے پر بیٹھا تھا، اُس نے چہرہ ہاتھوں سے ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ رو رہا تھا۔

اُس اداس شام کے بعد اگلی ملاقات کے لیے باپ بیٹے کو پورے بیس برس انتظار کرنا پڑا!!!

☆☆☆

ایک بار پھر وہ آنٹی میمی کے گھر میں تھا اور اُس کی زندگی کے اگلے چند برس وہیں بیتنے والے تھے۔

میمی ایک شریف النفس عورت تھی۔ اپنی بہن سے یکسر مختلف۔ وہ جان کا ہر طرح خیال رکھتی، اسے کہانیاں سناتی۔ انکل جارج بھی ایک شفیق انسان تھے۔ انہوں نے ہی اُسے ماؤتھ اورگن خرید کر دیا۔

اپنے بیٹے کے ہاتھ میں چمکتا ہوا ماؤتھ اورگن دیکھ کر جولیا نے خوشی سے تالی بجائی۔ وہ یہ ساز بجانا جانتی تھی، چند ہی دنوں میں اُس نے جان کو بھی ماؤتھ اورگن بجانا سکھا دیا۔ موسیقی میں اس کی بڑھتی دلچسپی دیکھتے ہوئے وہ اُس کے لیے ایک بینجو خرید لائی۔

میمی کو یہ بات قطعی پسند نہیں آئی، تاہم وہ چُپ رہی۔

''جان، جولیا کا بیٹا ہے اور ماں کا بیٹے پر حق ہے۔'' یہ بات جارج نے اُس سے کہی تھی اور وہ جانتی تھی کہ یہی سچ ہے۔

جب جان نے گیارہویں برس میں قدم رکھا، آنٹی میمی نے اُسے بلوم فیلڈ روڈ پر مقیم جولیا کے گھر آنے جانے کی اجازت دے دی۔ وہیں اُس کا پہلی بار ایلوس پریسلے سے پالا پڑا اور وہ اُس عظیم گلوکار کے سحر میں مبتلا ہو گیا۔

جب کبھی وہ بلوم فیلڈ روڈ جاتا، ماں سے ایلوس کے گیت سُننے کی فرمائش کرتا۔

جہاں تک تعلیمی سلسلے کا تعلق ہے، اُس کا دل کبھی پڑھائی میں نہیں لگا۔ وہ کمرۂ جماعت کی پچھلی نشستوں پر بیٹھا کرتا، تاکہ اساتذہ کی نظروں میں نہ آئے۔ وہ وہاں بیٹھ کر کاغذ پر کارٹون بناتا رہتا۔ اپنے باغیانہ خیالات کی تسکین کے لیے اساتذہ کی نقلیں اتارتا۔

ان حرکتوں کا متوقع نتیجہ نکلا۔ وہ امتحان میں فیل ہو گیا، تاہم آنٹی میمی کی کوششوں سے اُسے اگلی جماعت میں داخلہ مل گیا۔

اُسی زمانے میں تنہائی کے شکار جان نے ایک دوست اسٹیلے پارکس کو کھوج نکالا، جس نے اُسے نئے تجربات سے رُوبرو ہونے کا موقع فراہم کیا۔

اسٹیلے پارکس رشتے میں اُس کا کزن تھا۔ وہ جان سے سات برس بڑا تھا، لیکن اُن کی خوب نبھتی تھی۔ اسی کے وسیلے جان کی دوستی ایک خوش مزاج نوجوان ہارے سے ہوئی۔

پارکس اور ہارے نے اُسے سنیما کی جادوئی دنیا سے متعارف کروایا، جس نے اُسے اپنے سحر میں لے لیا۔

پھر اُنہوں نے سیاحت کا پروگرام بنایا۔ یہ پہلا موقع تھا، جب شعور کی دہلیز عبور کرنے کے بعد جان نے شہر سے باہر قدم رکھا۔ اور وہ گیا کہاں؟

بلیک پول... وہی علاقہ جہاں اس نے آخری بار اپنے باپ کو دیکھا تھا۔ بلیک پول اپنے تاریخی ٹاورز اور سنیما گھروں کے لیے مشہور تھا۔ وہاں اُنہوں نے خوب فلمیں دیکھیں۔ ایفل ٹاور سے مشابہ 518 فٹ بلند بلیک پول ٹاور کا قریب سے مشاہدہ کیا۔ شہر کی سڑکیں ناپتے ہوئے اُن کا سامنا اپنے عہد کے کئی نامور اداکاروں اور مصوروں سے ہوا۔

بلیک پول کا تجربہ اتنا شان دار رہا کہ اب تینوں باقاعدگی سے سیاحت کی غرض سے بیرونِ شہر جانے لگے۔ بڑے شہروں کے بجائے ان کی ترجیح دیہات ہوتے، جہاں زندگی اصل رنگ میں نظر آتی۔

آوارگی کے اسی زمانے میں جان اور اس کے دوستوں کی ملاقات چند انقلابی نوجوانوں سے ہوئی۔ پارکس اور ہارے نے تو پیرس سے آئے اُن باغیوں کا زیادہ اثر قبول نہیں کیا لیکن اُن کی فکر نے جان کو بہت متاثر کیا۔

اُس نے چند لیکچرز میں بھی شرکت کی، جن کے وسیلے اُسے محنت کشوں کے مسائل سے آگاہی ہوئی اور وہ شدت سے محسوس کرنے لگا کہ استحصالی طبقہ غریبوں کا خون چوس رہا ہے... جمہوری نظام میں ہر شخص کو یکساں وسائل حاصل نہیں۔

اس کے باغیانہ خیالات کو لیورپول کے ماحول نے بھی مہمیز کیا، جہاں محنت کش آئرش کثرت سے آباد تھے۔

کیا آپ
لبوب مقوّی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے۔ اعصابی کمزوری دور کرنے۔ ندامت سے نجات، مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے۔ کستوری، عنبر، زعفران جیسے قیمتی اجزاء سے تیار ہونے والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوّی اعصاب۔ یعنی ایک انتہائی خاص مرکب خدارا۔۔۔ ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوّی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے اور خاص لمحات کو خوشگوار بنانے کیلئے۔ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوّی اعصاب۔ آج ہی صرف ٹیلیفون کر کے بذریعہ ڈاک VP وی پی منگوالیں۔

المسلم دارلحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی طبّی یونانی دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0301-6690383
فون صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک کریں

WWW.PAKSOCIETY.COM

ددھیال کی طرف سے وہ بھی آئرش تھا۔ مروجہ عقائد سے انحراف کی قوت تو ماں سے وراثت میں ملی تھی۔

اُس وقت وہ کیوری بینک ہائی اسکول میں زیرِ تعلیم تھا جہاں 1952 سے 1957 تک وہ اکتسابِ علم کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ اُسی عرصے میں اُس نے طنزیہ اسکیچ اور کارٹونوں پر مبنی ایک میگزین نکالا جس میں روایت پسند اساتذہ اور تعلیم کے فرسودہ طریقوں پر پھبتیاں کسی جاتیں۔

اِس باغیانہ اقدام نے اساتذہ کو اس سے متنفر کر دیا۔ وہ اسے ناکارہ اور احمق خیال کرنے لگے، البتہ جان کو ان کی کوئی پروا نہیں تھی۔

☆☆☆

''تم اسکاٹ لینڈ جا رہے ہو؟'' جان کے لہجے میں دکھ تھا۔

''ہاں!'' پارکس بھی غمگین تھا۔ ''ڈیڈی کا یہی فیصلہ ہے لیکن تم فکر مت کرو، میں اسکول کی چھٹیوں میں لیورپول آتا رہوں گا۔''

پارکس کی دُوری نے اس پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ وہ اداس اور خاموش رہنے لگا۔

شاید اُس کی چُپ کئی دنوں تک قائم رہتی کہ اچانک ایک روز جولیا ہاتھ میں ایک گفٹ پیک لیے داخل ہوئی۔

''جان، تمہاری سالگرہ کا تحفہ۔'' اُس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

جان نے فوراً ڈبا کھولا۔ اس میں ایک خوبصورت، چمکتا ہوا ماؤتھ اورگن تھا۔

''یہ شان دار ہے۔'' وہ چہکا۔

اب وہ تھا اور ماؤتھ اورگن۔ چند ہی روز بعد وہ ایک کلب کا رکن بن گیا جہاں ہر ہفتے ماؤتھ اورگن میں دلچسپی لینے والے نوجوان اکٹھے ہوتے۔

''میں اپنے دوست پارکس کو بھلا بیٹھا ہوں۔'' اِس بات کا احساس جان کو اس روز ہوا، جب اُسے اسکاٹ لینڈ سے ایک خط موصول ہوا۔ خود پر لعنت ملامت کرتا ہوا وہ کاغذ قلم لے کر بیٹھ گیا۔ وہ اپنے دوست کو اس نئے تحفے، اس سرگرمی کے بارے میں بتانا چاہتا تھا جس نے اس کی زندگی بدل دی۔

اسکول کی چھٹیوں میں جب پارکس لیورپول لوٹا، جان بڑی حد تک ماؤتھ اورگن پر گرفت حاصل کر چکا تھا۔ گھر میں ہونے والی ایک تقریب میں اس نے دوستوں، رشتے داروں کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ سب نے اسے داد دی، ماسوائے میمی کے جو اُن دنوں اپنے شوہر کی بیماری کے سبب خاصی افسردہ تھی۔

جارج جگر کے مرض میں مبتلا تھا۔ علاج کے باوجود افاقہ نہیں ہو رہا تھا اور وہ روز بروز کمزور ہوتا جا رہا تھا۔

اپنوں سے عارضی دوری کا کرب تو جان سہہ چکا تھا لیکن کسی اپنے کی مستقل جدائی کا درد کیا ہوتا ہے، اِس کا ادراک اُسے 1955 کی ایک رات ہوا، جب اُس کے پیارے انکل جارج طویل بیماری کے بعد وفات پا گئے۔

اُس روز وہ اتنا رویا کہ میمی کو اپنا دُکھ بھول کر اسے سنبھالنا پڑا۔

''وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔'' اِس قول کی صداقت کا احساس جان کو انکل جارج کے انتقال کے بعد ہوا۔ گو کہ اُس شفیق انسان کا خلا تو پُر نہ ہو سکا لیکن وقت کے ساتھ اُس کا خاندان سنبھل گیا اور زندگی پرانی ڈگر پر آ گئی۔

☆☆☆

''میرا مستقبل درسی کتابیں نہیں، موسیقی ہے!''

جوں جوں وہ بڑا ہوتا جا رہا تھا، یہ خیال راسخ ہوتا گیا۔ اِس کا بیج جولیا نے بویا تھا جسے اپنے بیٹے کی صلاحیتوں پر بھروسا تھا، تاہم میمی کے خیالات مختلف تھے۔

اُس نے کبھی جان پر روک تو نہیں لگائی لیکن ہمیشہ یہی کہا۔ ''تمہیں اپنی تعلیم پر بھی توجہ دینی چاہیے۔''

1956 کے سال نے اس کی زندگی پر انمٹ نقوش چھوڑے کیونکہ اسی برس اس کا دیرینہ سپنا سچ ہوا۔

ایلوس پریسلے کی طرح ایک خوبصورت گٹار اُس کے ہاتھوں میں تھا جس کے لیے جولیا نے پانچ پونڈز ادا کیے تھے۔

''تم اِسے آنٹی میمی کے گھر نہیں لے جا سکتے۔'' جولیا کا حکم سنتے ہی اس کی خوشی ماند پڑنے لگی۔

''مگر کیوں؟ میں اِسے اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں۔'' اُس نے احتجاج کیا۔

''تم جانتے ہو کیوں!'' جولیا نے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میمی کو یہ بات کبھی پسند نہیں آئے گی۔''

''ٹھیک ہے!'' وہ چُپ ہو گیا لیکن دل میں ارادہ کر لیا کہ آنٹی میمی کو جلد منا کر گٹار اپنے ساتھ لے جائے گا۔

آنٹی میمی سے اجازت لینے کے لیے جو طریقہ اس نے اختیار کیا، وہ خاصا دلچسپ تھا۔ وہ یکدم اچھا لڑکا بن گیا۔ پڑھائی میں، کتابوں میں دلچسپی لینے لگا۔ وقت پر اسکول جانے لگا۔

''تم تو اچھے بچے بن گئے ہو!'' ایک روز آنٹی نے اس کا گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

جواباً وہ مسکرا دیا۔ یہ تو وہی جانتا تھا کہ خود کو اچھا ثابت کرنے کے لیے اُسے کتنے پاپڑ بیلنے پڑ رہے ہیں۔

ایک شام جب آنٹی میمی خوش گوار موڈ میں تھیں، ہمت کر کے اس نے اپنا مدعا بیان کر دیا۔ ''میں ایک گٹار خریدنا چاہتا ہوں۔''

میمی نے ایک نظر اس پر ڈالی۔ ''میں جانتی ہوں تمہیں موسیقی میں دلچسپی ہے لیکن یہ وقت پڑھائی کا ہے، گٹار تمہاری توجہ منتشر کر دے گا۔''

''ایسا نہیں ہوگا۔'' اُس نے فوراً کہا۔ ''میری پڑھائی پر اثر نہیں پڑے گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ پلیز، آپ مجھے گٹار خریدنے کی اجازت دے دیں۔ پلیز!''

شفیق عورت کا دل پگھل گیا۔ ''ٹھیک ہے، مگر مجھے تھوڑا وقت دو۔ اچھا گٹار خریدنے کے لیے کچھ بچت کرنی پڑے گی۔''

''اِس کی ضرورت نہیں۔'' وہ چہکا۔ ''ممّا نے وعدہ کیا تھا کہ آپ سے اجازت ملتے ہی وہ مجھے گٹار دلا دیں گی۔ میں ابھی اُن کے پاس جاتا ہوں۔''

اس کے قدم دروازے کی جانب بڑھ رہے تھے کہ اسے میمی کی آواز سنائی دی۔ ''جان...!''

وہ پلٹا۔ آنٹی کی آنکھوں میں سنجیدگی تھی۔ ''میں جانتی ہوں کہ تم پہلے ہی گٹار خرید چکے ہو!''

جان کے چہرے پر حیرت تھی۔ میمی نے بات جاری رکھی۔ ''میں تمہارے شوق کا احترام کرتی ہوں، لیکن یاد رکھنا، موسیقی تمہارا مستقبل نہیں، تمہیں پڑھائی پر توجہ دینی ہوگی!''

''بالکل، میں وعدہ کرتا ہوں۔'' جان چہکا اور دروازے کی جانب دوڑ پڑا۔

☆☆☆

یہ وعدہ وفا نہیں ہوا! وہ ایک ناکام طالب علم تھا۔ ہائی اسکول کے امتحانات میں ناکامی کے باوجود میمی نے کسی نہ کسی طرح اِس کا لیورپول کالج آف آرٹس میں داخلہ کروا دیا لیکن اُس وقت تک جان کا دل تعلیم سے اچاٹ

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہو چکا تھا۔

کالج میں اُسے ایک آزاد منش، لاابالی نوجوان کے طور دیکھا جاتا تھا۔ اساتذہ اُسے سخت ناپسند.... کرتے جس کا بنیادی سبب اُس کی باغیانہ طبیعت، جارحانہ مزاج تھا۔

جان کی الٹی سیدھی حرکتوں سے تنگ آ کر انتظامیہ نے اسے کالج سے خارج کرنے کی بھی دھمکی دی، تاہم اس نے اپنی روش نہیں بدلی۔ دراصل اس کی ہنگامہ پسند طبیعت اب ٹھہراؤ کی آرزومند نہیں تھی۔ وہ خود کو تبدیلی کے حوالے کر چکا تھا اور اکثر کہا کرتا تھا۔ ''میں اس روایت پرستانہ ڈھنگ سے اکتا گیا ہوں!''

کالج میں اُس کے کئی دوست، کئی خیر خواہ تھے جو اسائنمنٹ کی تیاری میں اُس کی مدد کرتے لیکن اُن کا تعاون اسے امتحان میں ناکامی سے نہیں بچا سکا۔ اسے کالج سے باہر کر دیا گیا۔

اِسے کوئی غم نہیں تھا بلکہ افسوس تھا کہ اُس نے کالج آ کر اپنا وقت ضائع کیا، البتہ ایک بات کی خوشی تھی... کالج کے طفیل اِس کی سنتھیا یا ویل سے ملاقات ہوگئی تھی جس کی آنکھوں میں بلا کی کشش تھی۔

یہ دوشیزہ مستقبل میں اس کی شریکِ حیات بننے والی تھی!

☆☆☆

صدمہ... ایسا صدمہ، جس نے زندگی کو بے نور کر دیا، خوشیاں نگل لیں اور سترہ سالہ جان کو دُکھ کی گہری کھائی میں دھکیل دیا۔

15 جولائی 1958 کو وہ ایک ناقابلِ بیان درد کی لپیٹ میں آ گیا۔

وہ چھٹی کا دن تھا۔ جب وہ بیدار ہوا، اسے کچن میں کچھ کھٹ پٹ سنائی دی..... وہ آنکھیں ملتا ہوا کچن میں داخل ہوا، جولیا باہیں کھولے اس کی منتظر تھی۔

''آپ، اتنی صبح؟'' لہجے میں حیرت تھی۔

''بس، آج میرا دل چاہ رہا تھا کہ تم سے ملوں!'' جولیا نے اس کے گال پو بوسہ دیا۔

''منہ ہاتھ دھو لو جان، ناشتے کا وقت ہو گیا ہے۔'' میمی کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

کچھ دیر بعد وہ ناشتے کی میز پر تھا۔ اس روز جولیا بہت اچھے موڈ میں تھی۔ رخصت ہونے سے قبل وہ بڑے ہی جذباتی انداز میں اپنی بہن سے بغل گیر ہوئی۔

''میں تم سے معافی مانگنا چاہتی ہوں میمی!'' اس نے دھیرے سے کہا۔

''کس بات کی معافی؟'' میمی کے لہجے میں حیرت تھی۔

''میں نے تمہیں بہت پریشان کیا۔'' اُس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ ''اور میں تمہاری شکر گزار ہوں کہ تم نے جان کا خیال رکھا۔ میں خود کو اچھی ماں ثابت نہ کر سکی۔''

''تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' میمی نے اپنی بہن کا کاندھا تھپتھپایا۔ ''مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں۔''

''اور آپ کو رونے کی ضرورت نہیں۔ آپ دنیا کی بہترین ماں ہیں۔'' یہ جان کے الفاظ تھے، جنہوں نے جولیا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر دی۔ اُس نے انہیں الوداع کہا اور گھر سے نکل گئی۔

جولیا کے رخصت ہونے کے ٹھیک ڈھائی گھنٹے بعد فون کی گھنٹی بجی، ریسیور جان ہی نے اٹھایا۔

''مسز جارج سے بات ہو سکتی ہے۔'' دوسری طرف سے مردانہ آواز سنائی دی۔

''وہ گھر پر نہیں ہیں، کوئی پیغام؟'' جان نے سوال کیا۔

''وہ...'' دوسری طرف موجود شخص متذبذب معلوم ہوتا تھا۔ ''وہ اُن کی چھوٹی بہن... جولیا لیسٹن ایک کار حادثے میں انتقال کر گئی ہیں، انہیں اطلاع دینی تھی کہ وہ جلد از جلد...''

فون کی دوسری طرف موجود شخص نے کیا کہا، جان نہیں جانتا۔ اُس کا شعور تاریکی میں ڈوب رہا تھا!!

آنے والے دن یاسیت کی لپیٹ میں تھے۔ وہ ٹوٹ چکا تھا، بکھر چکا تھا۔ اُس کی ماں، وہ عورت جس کی متاز زخموں کا مرہم تھی، دنیا سے رخصت ہو چکی تھی اور جان، آنٹی میمی کی موجودگی اور بھرپور توجہ کے باوجود خود کو تنہا، بے یار و مددگار محسوس کر رہا تھا۔

جان اب گھر سے باہر نکلنے سے اجتناب برتنے لگا۔ روشنی بجھائے اپنے کمرے میں پڑا رہتا۔ گہری یاسیت اسے موسیقی کی دنیا سے بھی دور لے گئی۔ وہ سازوں سے اُکتا گیا اور مائک کو نظر انداز کرنے لگا۔

اور تنہائی کے اُن ہی دنوں میں اُس کے خوابوں میں بے سکونی در آئی۔

☆☆☆

وہ اندھیرے کا قیدی تھا!

آنکھوں کے سامنے تاریکی کا دبیز پردہ پڑا تھا اور حبس کے باعث سانس لینا دشوار ہو گیا تھا۔

وہ راستہ تلاش کرنے کے لیے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ زمین ٹٹولنے کی کوشش کی اور خوف سے کانپ اٹھا۔ اس کے پیروں تلے کچھ نہیں تھا... وہ ہوا میں معلق تھا۔

وہ لمحہ دہشت ناک تھا۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں، موت یقینی معلوم ہونے لگی اور تب... اُس کے کانوں سے ایک مانوس، محبت سے لبریز آواز ٹکرائی۔

اُس نے آنکھیں کھولیں۔ چہار سُو تاریکی تھی، پُراسرار آواز قریب آتی جا رہی تھی۔ وہ سن سکتا تھا، یہ ایلوس پریسلے کا ایک گیت تھا۔ اُس نے دھیان سے سُننے کی کوشش کی اور یکدم اچھل پڑا۔

یہ گیت کوئی اور نہیں اُس کی ماں گا رہی تھی۔ وہ بے چین ہو گیا۔ اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔

''ماما آپ کہاں ہیں؟'' پکار تاریکی میں گونجی۔

''آپ کہاں ہیں؟'' وہ پھر چلایا۔

اچانک روشنی کا جھماکا ہوا، ماں کا چہرہ سامنے تھا۔

جان کی آنکھ کھل گئی۔ وہ پسینے سے شرابور تھا۔ اپنی ماں کی موت کے بعد اُس نے تیسری بار یہ خواب دیکھا تھا۔ گزشتہ بار تو وہ اس میں پنہاں پیغام سمجھ نہیں سکا تھا لیکن اِس بار اشارہ مل چکا تھا۔

موسیقی... اُس کی ماں اُسے اپنے زخموں پر موسیقی کا مرہم رکھنے کا پیغام دے رہی تھی۔

سورج طلوع ہونے سے قبل وہ اپنے مستقبل کا فیصلہ کر چکا تھا۔

☆☆☆

وہ ہر خیال ترک کر چکا تھا، مزید پڑھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اور اس کی تمام تر توجہ کا مرکز دنیائے موسیقی تھی۔

اُس شام جان نے خود کو کمرے میں بند کر لیا، اپنے وجود کو سُروں کے سمندر کے حوالے کر دیا تھا۔ یوں زخم بھرنے لگا۔

کچھ دیر بعد ٹیلی فون کا ریسیور اُس کے ہاتھ میں تھا اور وہ پال میکارٹنی کا نمبر ڈائل کر رہا تھا۔

راک اینڈ رول موسیقی کا دلدادہ جان لینن ایلوس پریسلے کا مداح تھا، جس سے متاثر ہو کر اس نے کیوری بینک ہائی اسکول کے زمانے میں ''کیوری مین'' نامی بینڈ کی بنیاد رکھی تھی۔

1957 کے موسم گرما میں اِس بینڈ نے پہلی پرفارمنس دی۔ گو کہ ابتدائی ردِعمل زیادہ حوصلہ افزا نہیں رہا لیکن بینڈ کے ارکان نے ہمت نہیں ہاری اور چھوٹے چھوٹے پروگراموں میں پرفارم کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔

ایسی ہی ایک تقریب میں جان کی ملاقات پال میکارٹنی سے ہوئی جو اس کی طرح موسیقی کا دلدادہ تھا۔ جلد ہی وہ کیوری مین بینڈ کا حصہ بن گیا۔

گو کہ اُن کی گاڑھی چھنتی تھی، تاہم دونوں نوجوانوں کے اہل خانہ کو اُن کا گھلنا ملنا قطعی پسند نہیں تھا۔ کئی بار پال کو آنٹی میمی نے یہ کہتے ہوئے دروازے سے لوٹا دیا ''جان گھر پر نہیں ہے۔''

اور کئی بار جان کو پال کے والد کی آنکھوں میں تنبیہ نظر آئی۔ ''خبردار میرے بیٹے کو کسی الٹے سیدھے چکر میں مت ڈال دینا۔'' البتہ اُس سخت گیر شخص نے اپنے گھر کے پچھلے حصے میں بینڈ کو پریکٹس کرنے کی اجازت دے رکھی تھی۔

جان کی طرح پال کو بھی کم سنی میں اپنی ماں سے جدائی کا کرب سہنا پڑا تھا۔ جب جولیا کے انتقال کے بعد جان یاسیت کے اندھیرے میں ڈوب گیا، پال نے اسے موسیقی کی جانب لانے کی بھرپور کوشش کی، تاہم جان نے اس وقت تک سازوں کو ہاتھ نہیں لگایا، جب تک اُس نے اپنے پُراسرار خواب میں چھپا پیغام نہیں سمجھ لیا۔ جس کے فوراً بعد اس نے پال کو فون کیا۔

''میں تمہاری ہی کال کا منتظر تھا۔'' پال نے دھیرے سے کہا۔ ''میں آ رہا ہوں۔''

کچھ دیر بعد پال اُس کے سامنے تھا۔

''کیوری مین بینڈ کو فعال کرنے کا وقت آن پہنچا ہے۔'' جان کی آنکھوں میں چمک تھی۔ ''ایک باغی بینڈ کی شکل میں!''

''ہاں۔'' پال مسکرایا۔ ''اگرچہ ہمارے اہلِ خانہ کو یقین نہیں، لیکن میں جانتا ہوں... جلد ہم اپنی شناخت بنا لیں گے۔''

اُس وقت دونوں دوستوں کو اندازہ نہیں تھا کہ آنے والے برسوں میں اُن کا معصوم رشتہ دشمنی میں بدل جائے گا۔

☆☆☆

وہ ایک ہیبت ناک پینٹنگ تھی!

WWW.PAKSOCIETY.COM

زخموں سے چُور ایک نوجوان ادھ جلے ورق پر جُھکا تھا۔ وہ قلم، دوات سے محروم تھا... اُس باغی نے خون ہی کو سیاہی بنالیا تھا اور اپنی زخمی انگلی کو قلم!

یہ تصویر جان نے ایک میوزیم میں دیکھی، جس سے اُس میں لکھنے کی جوت جاگی۔

جس روز وہ تخیل کی دنیا سے الفاظ چن کر کاغذ پر منتقل کر رہا تھا، آنٹی میمی کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ اُنہوں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ ایک دن جان قلم تھام لے گا۔

اٹھارہ سالہ نوجوان کی اُس کوشش کا نتیجہ ایک گیت "Hello Little Girl" کی شکل میں سامنے آیا۔ یہ اُس کا تحریر کردہ پہلا گیت تھا اور ٹھیک پانچ برس بعد برطانیہ میں دھوم مچانے والا تھا۔

اُسی زمانے میں چودہ سال جارج ہریسن بطور گٹارسٹ بغاوت پر مائل اس بینڈ کا حصہ بن گیا جس کے انتخاب کے وقت جان اور پال کے درمیان مختصر سی بحث ہوئی۔

وہ پال کے سامنے آڈیشن دے چکا تھا لیکن جان نے اس کی صلاحیتیں پرکھنے کے لیے ایک اور آڈیشن کا تقاضا کر دیا۔ یہ آڈیشن ہریسن نے چلتی ہوئی بس کے عرشے پر دیا۔

''تم واقعی باصلاحیت ہو۔'' جان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

کچھ عرصے بعد اسکاٹ لینڈ سے تعلق رکھنے والے جان کے ایک پرانے دوست اسٹکلف نے بینڈ میں شمولیت اختیار کر لی جس کے بعد جان سنجیدگی سے بینڈ کا نام تبدیل کرنے کے لیے بارے میں سوچنے لگا۔

''اب ہم ہائی اسکول کے طالب علم نہیں رہے، بہتر ہے کہ ہم کیوری مین کے لفظ سے جان چھڑالیں۔'' جان، پال سے مخاطب تھا۔

''خیال اچھا ہے۔'' پال نے تائید کی۔

خاصی سوچ بچار کے بعد دی سلور بیٹلز کا نام منتخب کیا گیا۔ آنے والے برسوں میں یہ نام مختصر ہو کر دی بیٹلز ہو گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے پوری دنیا میں پھیل گیا... لیکن یہ تو مستقبل کا معاملہ تھا، لمحۂ حال میں تو بینڈ اپنی شناخت بنانے کی جستجو میں تھا۔

اُس زمانے میں برطانوی میوزیکل بینڈز باقاعدگی سے مغربی جرمنی کے شہر ہیمبرگ کے دورے کیا کرتے تھے۔ 1960 میں ایسی ہی ایک پیش کش بیٹلز کو بھی ہوئی جسے قبول کرنے میں فقط ایک رکاوٹ تھی۔ آنٹی میمی!

''کیا تم دیوانے ہو گئے ہو۔'' جب جان نے آنٹی میمی کو مطلع کیا، اُن کے لہجے میں ناراضی اتر آئی۔

''اب موسیقی ہی میری زندگی ہے۔'' جان نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

میمی نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ سامنے ایک پُرعزم مگر بگڑا ہوا نوجوان کھڑا تھا، جس نے پھٹی ہوئی جینز کے اوپر ایک سستی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی اور کئی ماہ سے سر کے بال نہیں ترشوائے تھے... وہ ایک باغی معلوم ہوتا تھا۔ ایسا باغی جس کی آنکھوں میں اپنی آنٹی کے لیے محبت تھی۔

''اب تم جوان ہو چکے ہو۔'' میمی نے سرد آہ بھری۔ ''اور اپنی زندگی کا فیصلہ کرنے کے لیے بااختیار ہو۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔''

☆☆☆

جرمنی کے دورے نے بیٹلز کو بہت حوصلہ دیا۔ اُنہوں نے لگاتار تین برس ہیمبرگ کے میوزیکل فیسٹول میں پرفارم کیا۔ اس کامیابی نے اُن کا اعتماد آسمان پر پہنچا دیا۔

اُن دوروں نے اعتماد اور شہرت کے علاوہ جان کو ایک ''تحفہ'' اور دیا۔ وہ نشہ کرنے لگا تھا۔ یہ لت اسے جرمنی ہی میں پڑی۔

1962 میں جان کی ملاقات برین اپسٹن نامی ایک شخص سے ہوئی، جو جدید فیشن اور میوزک بینڈز کی ضروریات کے بارے میں بہ خوبی علم رکھتا تھا۔ جلد ہی برین اس ابھرتے ہوئے بینڈ کا ایونٹ منیجر ہو گیا۔ اُسی نے بیٹلز کے ارکان کو کنسرٹ کے دوران منفرد لباس زیب تن کرنے اور اسٹیج پر انوکھا اندازِ گائیکی اپنانے کی تجویز دی۔

ابتدا میں تو جان نے ان تجاویز پر ناک بھوں چڑھائیں، لیکن جب دیکھا کہ برین کی تجاویز اثر کر رہی ہیں، اُن کی مقبولیت بڑھتی جا رہی ہے اور کچھ پیسے بھی ہاتھ آ رہے ہیں، وہ کہہ اٹھا۔ ''برین اگر تم کہو تو میں جوکر بننے کے لیے بھی تیار ہوں۔ بس ہمیں اچھا معاوضہ ملنا چاہیے۔''

جان، پال، جارج ہریسن اور اسٹکلف بیٹلز کی چھتری تلے تیزی سے شہرت کے مراحل طے کر رہے تھے کہ یکدم بینڈ کو دھچکا لگا۔

اسٹکلف جرمنی کو اپنا مستقل ٹھکانا بنانے کا غیر متوقع فیصلہ کر چکا تھا۔ جان کو اپنے دوست کے اِس فیصلے سے سخت صدمہ پہنچا، لیکن اس نے بحث سے اجتناب برتا۔

خوش قسمتی سے اسٹکلف کے جانے کے بعد اُنہیں رنگو اسٹار کی صورت ایک اچھا ڈرمر مل گیا اور وہ دوبارہ تین سے چار ہو گئے۔

☆☆☆

جوں جوں بیٹلز مقبولیت کا سفر طے کر رہا تھا، جان کی دیوانگی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا، پر اس دیوانگی کا سبب شہرت نہیں، بلکہ محبت کا جذبہ تھا... وہ محبت جو جان لینن خود برو سنتھیا سے کرتا تھا۔

سنتھیا اور جان کی پہلی ملاقات لیورپول کالج آف آرٹس میں ہوئی تھی۔

اِس بگڑے شہزادے نے پہلی ہی نظر میں سنتھیا کو اپنے سحر میں مبتلا کر دیا، تاہم اُس کی مکمل توجہ حاصل کرنے کے لیے اُس دوشیزہ کو کئی ٹوٹکے آزمانے پڑے۔

کوششیں رنگ لائیں۔ بالآخر ایک روز جان نے اُسے رات کے کھانے کی دعوت دے ڈالی، لیکن ریسٹورنٹ میں اس وقت دلچسپ صورتِ حال پیدا ہو گئی، جب سنتھیا نے اُسے بتایا کہ اُس کی منگنی ہو چکی ہے۔

''تو میں کیا کروں؟'' جان نے چمچہ میز پر پٹختے ہوئے کہا۔ ''میں تم سے یہ تو نہیں کہہ رہا کہ مجھ سے شادی کرلو۔''

اس ردِعمل پر سنتھیا حیران رہ گئی۔

''دیکھو ڈیئر...'' جان نے لہجے میں نرمی پیدا کر کے کہا۔ ''اس لمحے ہم ساتھ ہیں۔ کھانا خوش ذائقہ ہے، اس سے لطف اندوز ہو، کل کی کل سوچیں گے!''

سنتھیا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُس شام کے بعد اُن کی ملاقاتوں میں تسلسل آ گیا۔ فاصلے مٹتے گئے اور وہ قریب آ گئے۔

اِس قربت کا نتیجہ جولائی 1962 میں سامنے آیا، جب سنتھیا نے اسے مطلع کیا کہ وہ امید سے ہے۔

''اب ہمارے پاس شادی کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔'' جان نے گہرا سانس لیا۔

اِسی برس اگست کے مہینے میں وہ شادی کے بندھن میں بندھ گئے، جس کے بعد جان یکسر تبدیل ہو گیا۔

جس روز اُن کی شادی ہوئی، اُسی شام ایک کنسرٹ تھا۔ حیرت انگیز طور پر جان نے کنسرٹ ملتوی نہیں کیا۔ شادی سے قبل وہ پروگراموں میں ایک دو روز کا وقفہ لے لیا کرتا تھا لیکن اب وہ یومیہ بنیادوں پر پرفارم کرنے لگا۔

جب بال نے اِس کا سبب دریافت کیا، اُس نے کہا۔

''میں نہیں جانتا، شاید مجھ پر ذمّے داری آن پڑی ہے، اس لیے زیادہ سے زیادہ پیسے بنانے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' پھر مسکرایا۔ ''شاید اس کا سبب یہ ہو کہ میں اس گھر سے دور رہنا چاہتا ہوں، جہاں ایک ایسی عورت مقیم ہے، جس کے ساتھ رہنا خوشی سے زیادہ میری مجبوری بن گئی ہے۔''

اپنے منیجر کی خواہش پر جان نے اپنی شادی خفیہ رکھی کیونکہ شادی کی اطلاع سے جان کے عشق میں مبتلا لڑکیوں میں مایوسی پھیل سکتی تھی۔

☆☆☆

بیٹلز کا... پہلا گیت "Love Me Do" اکتوبر 1962 میں لیورپول کے مقامی ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوا۔ اِس گیت کی تیاری میں بینڈ نے خاصی محنت کی تھی اور محنت بے ثمر نہیں گئی۔ ردِعمل مثبت رہا۔ برٹش میوزک چارٹ میں اس نے 17 ویں پوزیشن حاصل کی۔ اِس کامیابی کے بعد اُنہوں نے اپنے پہلے البم Please Please Me پر کام شروع کر دیا، جو فروری 1963 میں ریلیز ہوا۔

جس روز البم کی ریکارڈنگ تھی، جان بخار میں پھنک رہا تھا، تاہم وہ ریکارڈنگ ملتوی نہیں کر سکتے تھے۔ اُنہوں نے بڑی مشکل سے ایڈوانس ادائیگی کر کے اسٹوڈیو بک کروایا تھا، ریکارڈنگ ملتوی کرنے سے تمام رقم ضائع ہو جاتی۔

جان کو یقین نہیں تھا کہ وہ گا سکے گا لیکن پال نے اس کی بہت حوصلہ افزائی کی۔ ''تم ہمارے لیے ایلوس پریسلے ہو اور ہمیں اپنے ایلوس کی ضرورت ہے۔''

اسٹوڈیو پہنچتے ہی وہ اپنی بیماری بھول گیا، اگلے دس گھنٹے تک لگاتار گاتا رہا۔ چودہ گیتوں پر مشتمل اس البم کے بیش تر گیت جان اور پال ہی نے لکھے تھے۔

برسوں بعد جان نے اعتراف کیا کہ وہ ایک بچگانہ کوشش کی تھی۔ اُس نے کہا۔ ''اس وقت ہمارے الفاظ نیم پختہ اور غیر سنجیدہ تھے۔''

اپریل 1963 میں سنتھیا زچگی کے عمل سے گزری۔ اس نے ایک بیٹے کو جنم دیا جس کا نام جولیان رکھا گیا۔ تاریخ نے خود کو دہرایا... جس طرح جان کی پیدائش کے وقت اس کا باپ الفریڈ گھر سے میلوں دور تھا، اسی طرح جولیان کی پیدائش کے وقت اُس کا باپ گھر سے بہت دور

WWW.PAKSOCIETY.COM

ایک کنسرٹ میں پرفارم کر رہا تھا... اور اُسے گھر لوٹنے میں مزید تین دن لگے۔

☆☆☆

بیٹلز کی مقبولیت تیزی سے پھیل رہی تھی۔ برطانیہ اور گردونواح کی ریاستوں میں بغاوت پر مائل اِس بینڈ کا چرچا تھا۔ جان کے چند انٹرویوز بھی اخبارات کی زینت بن چکے تھے جن میں اس نے روایت پسندی پر گہری چوٹ کرتے ہوئے تہذیبی و مذہبی اقدار پر شدید تنقید کی تھی۔

جب اُس کے مینیجر نے اِس طرزِ فکر پر اعتراض کیا، اس نے واضح الفاظ میں کہا۔ ''برین، یہی میرے نظریات، میری فکر ہے۔ میں اسی کے سہارے زندہ ہوں۔ جو میں آج کہہ رہا ہوں، کل بھی یہی کہا کرتا تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس وقت کوئی سننے والا نہیں تھا اور آج میری بات سننے والے لاکھوں میں ہیں۔''

برین کے برعکس پال نے جان کے خیالات پر زیادہ اعتراض نہیں کیا۔ وہ اس کے مزاج سے واقف تھا اور پھر یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ بینڈ میں جان ہی کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اگرچہ پال بھی ایک عمدہ گیت نگار اور گلوکار تھا لیکن جان کو دونوں ہی شعبوں میں اُس پر برتری حاصل تھی۔ اور اُس کی پُرقوت آواز اور متنازعہ خیالات کے طفیل بیٹلز کے مداحوں کی تعداد اگلے چند برسوں میں کروڑوں تک پہنچنے والی تھی۔

جان کے ترقی پسند نظریات کی سب سے واضح جھلک رائل ورائٹی شو میں نظر آئی جس میں شاہی خاندان کے کئی اعلیٰ عہدے دار مدعو تھے۔ اُس تقریب میں ایک گیت کے آغاز سے قبل جان نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''میں آپ سے درخواست کرتا ہوں، جو لوگ سستے ٹکٹ خرید کر یہاں آئے ہیں، وہ تالیاں بجائیں، طبقۂ امراء اپنے زیورات جھنجھنائے۔''

اس بیان کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ کئی افراد نے اسے شاہی خاندان کی توہین قرار دیا لیکن جان کو اس کی پروا نہیں تھی۔

برطانیہ میں دھوم مچانے کے بعد بیٹلز نے امریکا کا رخ کیا جہاں فروری 1964 میں مشہورِ زمانہ ٹی وی پروگرام The Ed Sullivan Show میں اپنے فن کا جادو جگا کر انہوں نے ایک نسل کو اپنا دیوانہ بنالیا۔

امریکا کے کامیاب دورے کے بعد ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ دنیا کے گوشے گوشے میں بیٹلز کا نام گونجنے لگا۔ انہوں نے کئی یورپی ممالک کے دورے کیے۔ اُن کے البم نے فروخت کے نئے ریکارڈز قائم کیے۔ اور یوں دھیرے دھیرے مغربی موسیقی کے دائرے میں موجود تمام چراغ اُن کے سامنے بجھنے لگے۔

جان کی شہرت دیکھتے ہوئے پبلشرز بھی میدان میں آگئے، اُنہوں نے اسے دو کتابیں لکھنے کے لیے راضی کر لیا جس کا ٹھیک ٹھاک معاوضہ دیا گیا۔

1964 میں نظموں، افسانوں اور فن پاروں پر مشتمل پہلی کتاب In His Own Write شائع ہوئی۔ اگلے برس A Spaniard in the Works منظرِ عام پر آئی۔

گو کہ جان پر شاہی خاندان کی توہین کا الزام تھا لیکن ملکۂ برطانیہ نے کسی تعصب کو دل میں جگہ نہیں دی۔ 1965 میں بیٹلز کو آرڈر آف دی برٹش ایمپائر سے نوازا گیا۔

☆☆☆

''ہمارے کنسرٹ میں بہت شور ہوتا ہے، میری آواز حاضرین تک نہیں پہنچ پاتی۔'' جان کے لہجے میں دُکھ تھا۔

''مگر ہم مداحوں کے ردِعمل پر کوئی شرط عائد نہیں کر سکتے۔'' پال کے چہرے پر حیرت تھی۔

''لیکن میری خواہش ہے کہ وہ شور مچانے سے اجتناب برتیں۔''

''اس بات کو چھوڑو، یہ بتاؤ تم نے اپنا وزن کیوں بڑھا لیا ہے۔ کیا ایلوس پریسلے کی تقلید کا ارادہ ہے۔'' پال نے بات بدلی۔

''تم ایسا کہہ سکتے ہو۔'' جان مسکرایا۔ ''دراصل میں تبدیلی کا، کسی انوکھے تجربے کا خواہش مند ہوں۔''

انوکھے تجربے کی خواہش جلد پوری ہوگئی، لیکن اس کی لپیٹ میں وہ تنہا نہیں آیا... بیٹلز کے دیگر ارکان کو بھی اس سے گزرنا پڑا۔

یہ انوکھا واقعہ نیویارک کے کنگز ریسٹورنٹ میں ہونے والی ایک دعوت میں رونما ہوا، جہاں میزبان نے بڑی خاموشی سے اُن کی کافی میں ایک نشہ آور دوا ملا دی۔ جب وہ رخصت ہونے کو تھے میزبان نے انکشاف کیا۔ ''جلد ہی اُن کی دنیا گھومنے والی ہے۔ بہتر ہے کہ یہیں رک جاؤ، ورنہ انجانے سفر پر نکل جاؤ گے۔''

''چلو اچھا ہے، انجان سفر مجھے تجسس سے بھر دیتا

ہے۔'' جان نے آنکھ ماری۔

جب وہ لفٹ میں تھے، انجان سفر شروع ہوگیا... دوا خون میں شامل ہو چکی تھی اور ان کے دماغوں کو یہ خوفناک پیغام پہنچا رہی تھی کہ لفٹ میں آگ لگ گئی ہے۔ اس احساس سے وہ چاروں بوکھلا گئے اور شور مچانے لگے۔ اس رات ریسٹورنٹ کی انتظامیہ نے بمشکل اُنہیں کار میں سفر کر کے گھر روانہ کیا۔

اِس تجربے سے گزرنے کے چند ہفتے بعد پھر کچھ انوکھا کرنے کی خواہش میں عقیدہ پرستی سے بیزار جان نے ایک انتہائی متنازعہ بیان داغ دیا۔

مارچ 1966 میں لندن کے مشہور اخبار ایوننگ اسٹینڈرڈ کو خصوصی انٹرویو دیتے ہوئے اس نے کہا۔ ''عیسائیت جلد سمٹ جائے گی، غائب ہو جائے گی۔''

یہی نہیں، وہ یہ بھی کہہ بیٹھا کہ وہ آج مسیحی مبلغوں سے زیادہ مقبول اور پسندیدہ ہیں۔ ''بیٹلز زیادہ مشہور ہے۔ میرا یقین کریں، راک اینڈ رول موسیقی کا خاتمہ، عیسائیت کے خاتمے کے بعد ہی ہوگا۔''

اِس اشتعال انگیز بیان پر ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ مظاہرے شروع ہوئے۔ مشتعل افراد نے سرِعام بیٹلز کے ریکارڈز نذرِ آتش کیے۔ متعدد ریڈیو اسٹیشنوں نے ان کے گیت نشر کرنے سے انکار کر دیا۔ ویٹی کن نے بھی جان کی بھرپور مذمت کی۔ حالات اتنے بگڑ گئے کہ بیٹلز نے کئی کنسرٹ ملتوی کر دیے۔ غیر ملکی دوروں کا سلسلہ روک دیا۔ اب بیٹلز فقط اسٹوڈیو تک محدود تھا۔

''صورتِ حال بگڑ چکی ہے دوست۔'' چاروں طرف سے ہونے والی تنقید سے مجبور ہو کر پال نے اسے سمجھایا۔ ''ہمیں معافی مانگنی پڑے گی۔''

جان اپنے دوست کی بات سمجھ گیا۔ اس نے ایک پریس کانفرنس کی اور اپنے بیان پر معذرت کر لی۔

گو کہ اس معذرت کو ویٹی کن نے قبول کر لیا لیکن آنے والے دنوں میں پریس نے بیٹلز، خصوصاً جان کے بیانات و اقدامات کا تنقیدی جائزہ جاری رکھا۔

جان کو یقین تھا کہ ایوننگ اسٹینڈرڈ میں شائع ہونے والا اُس کا انٹرویو جلد وقت کی دھول میں گم ہو جائے گا، لوگ اسے بھول جائیں گے۔ اور ایسا ہوا بھی... وقت کے ساتھ ساتھ یہ واقعہ لوگوں کی یادداشت سے محو ہو گیا، تاہم امریکی ریاست ٹیکساس میں مقیم ایک دس سالہ بچہ اُسے بھولنے کے لیے تیار نہیں تھا، قطعی نہیں!

اُس بچے کی قسمت بڑے ہی عجیب ڈھنگ سے جان سے جڑی ہوئی تھی!

☆☆☆

آئینے میں ایک اجنبی تھا، جس کے چہرے پر پُراسرار مسکراہٹ تھی۔ اگلے ہی لمحے اس کے ہاتھ میں پسٹل چمک رہا تھا اور پھر.. اس نے فائر کر دیا۔

جان سر پکڑے بیٹھا تھا۔ اس کا تخیل کسی اور دنیا میں تھا اور اسے عجیب و غریب چیزیں نظر آ رہی تھیں۔

دراصل وہ نشے کا عادی ہو گیا تھا جس کی وجہ سے نہ صرف اس کے بینڈ کے ارکان بلکہ اس کی بیوی بھی شدید ذہنی انتشار کا شکار تھی۔

گو کہ کل کی طرح آج بھی بیٹلز کے نام کا ڈنکا بج رہا تھا لیکن اب جان کے کانوں میں سرگوشیاں ہونے لگی تھیں۔

''بیٹلز چھوڑ دو... بیٹلز کو چھوڑ دو!''

اس نے ان پُراسرار سرگرشیوں کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی لیکن اُنہوں نے پیچھا نہیں چھوڑا۔

اسی زمانے میں بیٹلز کا گیت "Strawberry Fields Forever" ریلیز ہوا جس نے برطانیہ اور امریکا میں تہلکا مچا دیا۔ اس گیت کے فوراً بعد بیٹلز کا اگلا البم Sgt. Pepper's Lonely Hearts Club Band مارکیٹ میں آیا جو سپر ہٹ ثابت ہوا۔

جب وہ البم کی کامیابی کا جشن منا رہے تھے، ان کی ملاقات معروف ہندوستانی گرو، مہیش یوگی سے ہوئی، جس کے مراقبے کی تکنیک کو مغرب میں تیزی سے قبول کیا جا رہا تھا۔ الجھاؤ کے شکار جان کو سنبھلنے کا ایک امکان نظر آنے لگا۔

''ہمیں ویلز میں ہونے والے مہیش یوگی کے سیمینار میں شرکت کرنی چاہیے۔'' یہ جان کی تجویز تھی جس کی بینڈ نے توسیع کی۔

اُنہیں قطعی اندازہ نہیں تھا کہ ویلز میں ایک حادثہ اُن کا منتظر ہے۔

سیمینار کے دوران اچانک بیٹلز کے مینیجر برین کی طبیعت بگڑ گئی۔ اُسے اسپتال میں داخل کروا دیا گیا جہاں ڈاکٹروں کی سرتوڑ کوشش کے باوجود اُس کی حالت میں بہتری نہیں آئی اور وہ بڑے ہی ڈرامائی انداز میں زندگی کی بازی ہار گیا۔

اِس سانحے کے بعد حالات بگڑنے لگے!

WWW.PAKSOCIETY.COM

جان گا سکتا تھا، نغمے لکھ سکتا تھا، گٹار بجا سکتا تھا لیکن انتظامی معاملات کا اُسے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ برین کی موت کے بعد یہ معاملات پال نے سنبھال لیے۔

یہ بیٹلز کے زوال کا نقطۂ آغاز تھا۔

اس سانحے سے ابھرنے کے بعد اُنہوں نے ایک بار پھر مہیش یوگی سے رابطہ کیا اور ہندوستان میں قائم اُس کے آشرم کا دورہ کیا۔

ہندوستان سے لوٹنے کے بعد بیٹلز نے ایک ٹیلی فلم Magical Mystery Tour تیار کی جس کی تشکیل میں پال نے کلیدی کردار ادا کیا۔ توقع کے برعکس فلم بری طرح ناکام ہوئی۔

☆☆☆

''کیا ایک معروف، جاذبِ نظر، شادی شدہ آدمی کسی ایسی عورت کے عشق میں مبتلا ہوسکتا ہے جو کم رُو ہو، گمنام ہو؟''

جاپانی آرٹسٹ یوکو اونو سے ملاقات سے قبل اگر کوئی جان سے یہ سوال کرتا، اُس کا جواب نفی میں ہوتا لیکن 1966 کے اواخر میں لندن کی ایک آرٹ گیلری میں ہونے والی ملاقات کے بعد اُس کے خیالات بدلنے لگے۔

اُس شام گیلری میں یوکو اونو کے فن پارے نمائش کے لیے پیش کیے جانے تھے۔ یہ فن پارے ہتھوڑے اور کیل کی مدد سے بنائے جانے والے نقش ونگار پر مشتمل تھے۔

جان گیلری کے مالک ڈنبر کے ساتھ کھڑا تھا جب سامنے نصب لکڑی کے فن پارے کو دیکھ کر اس کے دل میں خواہش جاگی، وہ بھی ہتھوڑا اٹھائے اور کیل کی مدد سے چند سوراخ کردے۔

وہ ضرب لگانے ہی کو تھا کہ اُسے اپنے پیچھے ایک آواز سنائی دی۔ ''یہ آپ کیا کررہے ہیں؟''

وہ مڑا۔ سامنے ایک عام سی عورت کھڑی تھی جس کے خدوخال میں نسوانیت کے عناصر کی واضح کمی تھی۔ وہ اونو تھی۔ ایک ایسی عورت، جو چند ماہ بعد اُس کی جیون ساتھی بننے والی تھی۔

''ارے اونو شاید آپ پہچانی نہیں۔ یہ جان لینن ہیں۔'' گیلری کے مالک نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ ''شاید وہ یہ فن پارہ خریدنے میں دلچسپی رکھتے ہوں۔''

جاپان کی سرزمین سے تعلق رکھنے والی اونو، بیٹلز اور جان کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی تھی۔ ''اگر آپ اِس لکڑی کے ٹکڑے میں سوراخ کرنے کے خواہش مند ہیں تو آپ کو اِس کی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔''

جان نے قہقہہ لگایا۔ گزشتہ دس برسوں میں یہ پہلا موقع تھا جب اُسے اِس طرز پر مخاطب کیا گیا۔

''شکریہ۔'' اس نے ہتھوڑا ایک جانب رکھ دیا۔ ''تمہاری وجہ سے بڑے عرصے بعد مجھے یہ احساس ہوا کہ میں ایک عام انسان ہوں۔''

اِس دلچسپ مکالمے کے بعد کئی دنوں تک اُن کا سامنا نہیں ہوا۔ پھر ایک شام اسے ایک فون کال موصول ہوئی۔

وہ اونو ہی تھی۔ اگلے چند روز میں اُن کی کئی ملاقاتیں ہوئیں اور حیرت انگیز طور پر... وہ اس کی زلف کا اسیر ہوگیا۔

اِس نئے معاشقے کا بنیادی سبب سنتھیا اور جان کے درمیان بڑھتے فاصلے تھے۔ نشے کی لت نے جان کو یکسر بدل دیا تھا۔ اُس نے سنتھیا سے قطع تعلق کرلیا، تقریبات میں بھی اُسے ساتھ لے جانے سے اجتناب برتنے لگا۔ اس رویّے کی وجہ سے سنتھیا خاصی دلبرداشتہ تھی۔

مایوسی کے ان ہی دنوں میں اس نے یونان کی سیر کا پروگرام بنایا۔ توقع کے عین مطابق جان نے ساتھ جانے سے انکار کردیا۔ مجبوراً سنتھیا اپنے بیٹے جولیان کے ساتھ یونان چلی گئی اور اُس کے پیچھے جان اور اونو کا عشق عروج پر پہنچ گیا۔

مئی 1968 کی ایک حسین شام، جب سنتھیا گھر سے دُور تھی، جان نے اونو کو کھانے پر مدعو کیا۔ کھانے کے بعد وہ گھنٹوں باتیں کرتے رہے۔ وہ رات اونو نے جان کے اپارٹمنٹ میں گزاری۔ اور اس رات... تمام فاصلے مٹ گئے۔

دوسری صبح جب جان کے اپارٹمنٹ کی ڈور بیل بجی، دروازہ اونو ہی نے کھولا۔ سامنے گھر کی مالکن سنتھیا کھڑی تھی۔

اس واقعے کے بعد جان اور سنتھیا کے اختلافات عروج پر پہنچ گئے۔ کچھ ہی عرصے بعد یہ اطلاع آئی کہ اونو حاملہ ہوگئی ہے۔ یہ خبر تابوت کی آخری کیل ثابت ہوئی۔ نومبر 1968 میں جان اور سنتھیا کی راہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہوگئیں۔

اِس معاملے نے سب سے زیادہ بیٹلز کو متاثر کیا!!

☆☆☆

جان اور اونو ایک دوسرے کے عشق میں ڈوبے تھے

لیکن برطانوی پریس اپنے راک اسٹار کے پہلو میں ایک کم رُو جاپانی عورت کو دیکھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اُس کی بابت انتہائی ذاتی نوعیت کے مضامین لکھے گئے جن پر جان نے شدید ردِعمل ظاہر کیا اور اخبارات کو دھمکی دی کہ اگر انہوں نے اپنی روش نہیں بدلی تو بیٹلز ان کا بائیکاٹ کردے گا۔

یہ بیان بیٹلز اور جان کے درمیان وجہِ نزاع بن گیا۔ پال نے واضح الفاظ میں کہا۔ ''تمہیں اپنے ازدواجی مسائل کو بینڈ سے دور رکھنا چاہیے۔''

یہ بات جان کو ناگوار گزری لیکن وہ چپ رہا۔ لیکن جب یہی بات پال نے ایک اخباری نمائندے کے سامنے کہہ دی، وہ آگ بگولا ہوگیا۔

اُس روز پہلی بار دونوں دوستوں کا جھگڑا ہوا۔

☆☆☆

مارچ 1969 میں جان اور اونو کی شادی ہوگئی، جس کے بعد بیٹلز کا خاتمہ واضح نظر آنے لگا کیونکہ جان پر اپنی بیوی کے نظریات کا اثر بڑھتا جارہا تھا جو ویت نام جنگ کے خلاف سراپا احتجاج بنی ہوئی تھی اور جان ہر محاذ پر اُس کا ساتھ دینے کا عہد کرچکا تھا۔

اِس باغی گلوکار نے برطانیہ میں ہونے والے سامراج مخالف مظاہروں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جنگ ویت نام کے خلاف بھرپور آواز اٹھائی۔ آنے والے دنوں میں جان اور اونو خواتین کے حقوق اور نسلی تعصبات کے لیے ہونے والے مظاہروں میں بھی خاصے سرگرم نظر آئے۔

بیٹلز کی دلچسپی سیاسی سرگرمیوں سے زیادہ موسیقی میں تھی۔ سو اُنہوں نے جان کے بیانات واقدامات سے خود کو کلی طور پر لاتعلق رکھا۔

بیٹلز نے Apple Corps کے نام سے ایک کمپنی کی بنیاد رکھی تھی جو سراسر گھاٹے کا سودا ثابت ہوئی۔ اِس ناکامی کے لیے پال نے دبے الفاظ میں جان کو قصوروار ٹھہرایا جو ان دنوں اسٹوڈیو میں گیت ریکارڈ کروانے سے زیادہ سڑکوں پر احتجاج کرنے میں دلچسپی رکھتا تھا۔

جب دوستوں نے اُسے باز رکھنے کی کوشش کی، اس نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔ ''میں نہ صرف احتجاجی مظاہروں میں حصہ لوں گا بلکہ تقریر اور تحریر کے ذریعے بھی امریکا کو مطعون کرنے کا سلسلہ جاری رکھوں گا۔''

اور اس نے ایسا ہی کیا۔ ان سرگرمیوں کے طفیل وہ نوجوانوں کا ہیرو بن گیا۔ اس نے امریکا کے استحصالی اقدامات کی مذمت کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ برطانیہ کے سامراج نواز اقدامات کی بھی کھل کر مذمت کی۔ جو بالآخر اس نہج پر پہنچ گئی کہ اس نے آرڈر آف دی برٹش ایمپائر جیسا اعزاز لوٹا دیا۔

بیٹلز نے اِس اقدام کی شدید مذمت کی۔

''یہ مشتر کہ ایوارڈ تھا، تم اسے یوں واپس کرنے کا حق نہیں رکھتے۔'' یہ پال کے الفاظ تھے۔

جواب میں جان نے فقط اتنا کہا۔ ''وہ ایک بے معنی شے تھی جو اپنے انجام کو پہنچ گئی۔''

اونو کا سحر جان کی شخصیت تک محدود نہیں رہا، جلد ہی جان کی گائیکی پر بھی وہ اثر انداز ہونے لگی۔ وہ مشترکہ البم ریلیز کرنے لگے جو قابلِ اعتراض ٹھہرائے جانے والے اپنے البم کور کی وجہ سے متنازعہ ٹھہرے۔

اونو بیٹلز کے معاملات میں بھی مداخلت کرنے لگی تھی۔ جب بیٹلز کا ویت نام جنگ کے خلاف تیار کیا جانے والا مشہور زمانہ گیت "Give Peace a Chance" ریلیز ہوا، سامعین نے اُس میں اونو کے نظریات کا اثر واضح محسوس کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہی یہ گیت امن پسندوں کا نعرہ بن گیا۔ اس سے اونو کو مزید شہ ملی اور وہ بینڈ کے معاملات میں کھل کر بولنے لگی۔

ناقدین کہنے لگے تھے، اونو نے جان کو دیوانہ بنا دیا ہے اور وہ درست تھے۔ گو کہ جان ابتدا ہی سے ترقی پسند نظریات کا حامل تھا لیکن اونو کا ساتھ ملنے کے بعد اُس کے رویّے میں شدت آگئی۔

جان کے مداح اس وقت تو حیران ہی رہ گئے جب اس نے اپنے نام میں ''اونو'' کا اضافہ کرنے کا اعلان کردیا اور ''جان اونو لینن'' کے نام سے پکارے جانے پر اصرار کرنے لگا۔

جب ایک دوست نے اِس فیصلے کا سبب دریافت کیا، اس نے کہا۔ ''یہ میری محبت اور ایک مرد کی حیثیت سے عورت کے احترام کا عملی مظاہرہ ہے!''

☆☆☆

یہ لمحوں کا معاملہ تھا!

چند پلوں قبل وہ مسکرا رہا تھا، مطمئن ومسرور تھا لیکن اب گہرا صدمہ اُسے گھیرے ہوئے تھا، حواس تاریکی میں گم ہورہے تھے۔

آنکھ بند ہونے سے قبل اس نے اپنی بیوی کی جانب

WWW.PAKSOCIETY.COM

دیکھا جو زخمی تھی۔ اس نے اپنی محبوبہ کو پکارنے کی کوشش کی لیکن آواز منجمد ہوگئی اور شعور اندھیرے میں اتر گیا!!

''جان لینن، ٹریفک حادثے میں شدید زخمی!''

1969 کے موسم سرما میں اسکاٹ لینڈ کے ایک ہائی وے پر رونما ہونے والے اس حادثے سے جان کے مداحوں کو شدید دھچکا پہنچا۔ انہوں نے اس کی صحت یابی کے لیے خصوصی دعائیں کیں، تقریبات منعقد کیں۔ صحت یاب ہونے کے بعد جان نے مداحوں کا شکریہ ضرور ادا کیا لیکن اپنی بیوی اونو کا شکریہ ادا کرنے کے بعد۔

اُس نے کہا تھا۔ ''میں اونو کی صحت کے حوالے سے فکرمند تھا، تاہم اس نے اپنی فکر چھوڑ کر میرا خیال رکھا، جس کے لیے میں ممنون ہوں!''

اس حادثے کے بعد جان تو ہم پرست ہوگیا۔ اُس کے ذہن میں یہ خیال بیٹھ گیا کہ اونو کسی حادثے کا شکار ہوسکتی تھی۔ اس شک سے نکلنے کے لیے اس نے ایک عجیب فیصلہ کیا۔

''ڈیئر، اب تم ہمیشہ میری نظروں کے سامنے رہو گی... ہم ایک ساتھ سفر کریں گے، ہمیشہ ایک ساتھ رہیں گے اور... تم اسٹوڈیو میں بھی میرے ساتھ ہی جایا کرو گی۔''

اونو کو اس پر بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا، تاہم ان اداروں اور افراد کو یہ بات خاصی ناگوار گزری جو اپنی تقریبات میں فقط جان کو مدعو کرتے اور اونو اُس کے ساتھ بندھی چلی آتی۔

ان دونوں بیٹلز کا البم Abbey Road زیر تکمیل تھا، تاہم وہ خبروں کا موضوع نہیں بنا، اخبارات کو تو اس جہازی سائز بستر میں دلچسپی تھی، جو اس البم کی ریکارڈنگ کے دوران اسٹوڈیو میں لگایا گیا تھا جس پر اونو آرام کیا کرتی۔

اِس جہازی سائز بستر کی خبریں اخبارات سے غائب ہوتے ہی بیٹلز کے باہمی تنازعات کی مسالے دار اسٹوری میڈیا کی زینت بن گئی۔ ''جان اور پال کے اختلافات شدید، بیٹلز کی شکست وریخت یقینی!''

''مسائل سے نکلنے کا ایک ہی حل ہے... میں اس بینڈ سے الگ ہوجاؤں۔'' جان کا لہجہ سپاٹ تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ رٹا رٹایا سبق پڑھ رہا ہو۔

بیٹلز کے دیگر ارکان تو خاموش رہے لیکن پال چپ نہیں رہا۔

''اوہ... یعنی دنیا بھر میں دھوم مچانے والا بیٹلز اپنے اختتام کو پہنچ چکا ہے۔ تمہارے جانے کے بعد تو بینڈ ختم ہوجائے گا، نہیں؟'' اُس کا لہجہ سرد تھا۔

''شاید۔'' جان کا چہرہ بے تاثر رہا۔ ''Abbey Road ہمارا آخری البم ہوگا۔''

مشیروں کے مشورے پر بیٹلز کے ارکان نے عہد کیا کہ وہ بینڈ کے خاتمے کا اعلان کسی مناسب وقت پر، ایک مشترکہ پریس کانفرنس میں کریں گے۔

جان تو خاموش رہا لیکن پال نے وعدے کا پاس رکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اُس نے ایک اخباری بیان داغ دیا۔ ''میں بیٹلز سے الگ ہو چکا ہوں۔ میرا سولو البم جلد مارکیٹ میں آنے والا ہے۔''

جب رپورٹر نے سوال کیا۔ ''اب بیٹلز کا کیا مستقبل ہے؟'' اُس نے استہزائیہ لہجے میں جواب دیا۔ ''بیٹلز کا تو اب خدا ہی حافظ ہے۔ بہتر ہے، یہ سوال آپ اُن لوگوں سے پوچھیں، جنہوں نے بینڈ میں ایک آمر کی صورت اختیار کرلی ہے۔''

''کیا بینڈ کے خاتمے کا سبب جان لینن کے انقلابی نظریات ہیں؟'' ایک اور سوال۔

''میرا دوست جان ایک باغی کی زندگی گزارنا چاہتا ہے۔'' پال نے کاندھے اچکائے۔ ''میری دعا ہے کہ اس کا انجام باغیوں سے مختلف ہو کیونکہ ہمارے ہاں باغیوں کو قبول نہیں کیا جاتا، انہیں قتل کیا جاتا ہے۔''

چند روز بعد جان نے بھی ایک سخت بیان جاری کر دیا۔ ''بیٹلز کے خاتمے کی بڑی وجہ پال کی من مانیاں تھیں جس سے ہم تنگ آچکے تھے۔''

''آخر پال چاہتا کیا تھا؟'' شاطر رپورٹر نے پھڑکتی ہوئی سرخی حاصل کرنے کے لیے اُسے کریدا۔

''اسے فقط اپنا مفاد عزیز تھا، بس!'' جان کے یہ الفاظ اگلے روز اخبارات کے صفحات میں جلی حروف میں شائع ہوئے۔

کل کے گہرے دوست اب پکے دشمن بن چکے تھے۔

☆☆☆

''بینڈ کے ٹوٹنے کا صدمہ کہیں جان کو نہ توڑ دے۔'' یہی سوچ کر اونو نے اپنے شوہر کو برطانیہ چھوڑ کر مستقل بنیادوں پر نیویارک منتقل ہونے کا مشورہ دیا۔

یہ خیال جان کے دل کو لگا۔ 1971 میں وہ بوریا بستر

سمیٹ کر امریکا آگیا۔ امریکا... وہ ملک جہاں اُس کا قاتل مقیم تھا۔

چونکہ وہ استحصال کے خلاف تھا اِسی لیے استحصالی کارندے، خصوصاً ایف بی آئی نے اُس کے خلاف کمر کس لی۔ اس زمانے میں وہ گرین کارڈ کے حصول کے لیے کوشاں تھا، مگر تمام قانونی تقاضے پورے کرنے اور اپنی بین الاقوامی شہرت کے باوجود اسے رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔

یہ خبر بھی گردش میں تھی کہ اُس کے خلاف ایک خفیہ فائل تیار کی جارہی ہے اور وہ امریکی حکومت کی ناپسندیدہ افراد کی فہرست میں سب سے اوپر ہے۔

اِس منفی رویے کے خلاف احتجاج کا جان کے پاس ایک ہی پلیٹ فارم تھا، موسیقی!

انقلابی نظریات کا حامل جان ایک طویل عرصے سے بینڈ سے علیحدگی اختیار کرنا چاہ رہا تھا، اِسی عرصے میں اونو سے ملاقات ہوئی، جو دیوانگی کی جانب مائل تھی۔ یوں جان کو اپنی دیوانگی کا ساتھی مل گیا۔ اب وہ آزاد تھا، اپنی آواز کو ہتھیار بنانے کا سپنا سچ کرسکتا تھا، اور اس نے ایسا ہی کیا۔

انہوں نے پلاسٹک اونو بینڈ کی بنیاد رکھی جس کے تحت ریلیز ہونے والے البمز خاصے پسند کیے گئے۔ البتہ... نیویارک سے میلوں دور ٹیکساس میں بیٹھے ایک نوجوان کو اِس بینڈ کے احتجاجی گیتوں نے غصے اور نفرت سے بھر دیا اور اس کے ذہن میں ایک خوفناک منصوبہ پنپنے لگا۔

☆☆☆

جان کا مشہور زمانہ گیت ''محنت کش طبقے کا ہیرو'' نیویارک میں قیام کے زمانے میں منظرِ عام پر آیا جس نے اسے مظلوموں کی آواز بنا دیا۔ اگلے برس منفرد البم "Imagine" مارکیٹ میں آیا، جسے جمود توڑنے کی ایک پُرقوت کوشش کے طور پر دیکھا گیا۔ اُس البم میں غصے اور احتجاج کی آمیزش واضح محسوس ہوتی تھی۔

اگلے البم "Some time in Newyork" میں جب وہ زیادہ باغیانہ اور بلند آہنگ نظر آیا تو ناقدین کو حیرت نہیں ہوئی۔ وہ اسی کی توقع کررہے تھے۔ اس البم پر سیاسی رنگ غالب تھا۔ اُس نے جیلوں میں ہونے والے پُرتشدد واقعات، نسلی اور جنسی تعلقات، شمالی آئرلینڈ میں ہونے والے فرقہ ورانہ فسادات میں برطانیہ کے منفی کردار کے علاوہ گرین کارڈ کے حصول میں درپیش مشکلات کو بھی اپنے گیتوں میں سمو دیا۔

توقع کے عین مطابق رجعت پسند امریکی ناقدین نے اس البم پر سخت ردِعمل ظاہر کیا، البتہ سامعین نے اسے سراہا۔

اِسی امریکا مخالف البم کی ریلیز کے بعد جان کے ذہن میں یہ خیال جڑ پکڑنے لگا کہ اُس کا تعاقب ہورہا ہے اور اس کی فون کالز ریکارڈ کی جارہی ہیں۔

''وہ میرے کمیونسٹ نظریات سے خوف زدہ ہیں۔'' وہ اکثر اونو سے کہا کرتا تھا۔

وہ صنفی امتیاز کے بھی خلاف تھا۔ اس نے ایک انٹرویو میں کہا۔ ''جس طرح امریکا میں سیاہ فام باشندوں کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جاتا ہے، اسی طرح دنیا بھر میں عورتوں کے ساتھ ظلم ہورہا ہے، انہیں دوسرے درجے کا شہری تصور کیا جاتا ہے۔''

یہ تصورات، احتجاجی آہنگ میں اُس کے مشہور زمانہ نغمے "Woman is the nigger of the World" کی صورت سامنے آئے۔ یہ گیت اتنا متنازعہ ٹھہرا کہ ریڈیو اسٹیشنوں نے اسے براڈ کاسٹ کرنے سے انکار کردیا۔

جان کو اندازہ تھا کہ ریڈیو اسٹیشنوں کا یہ اقدام امریکی حکومت کی بزدلانہ پالیسیوں کا نتیجہ ہے لیکن وہ ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں تھا، اس نے کوششیں جاری رکھیں اور بالآخر ایک ٹیلی ویژن شو میں اِسے پیش کرنے میں کامیاب رہا۔

ردِعمل کی بابت زیادہ سوچ بچار کی ضرورت نہیں۔ سامعین نے اسے سراہا، ناقدین نے تنقید کی۔

☆☆☆

''کیا کوئی طاقت مجھے اونو سے الگ کرسکتی ہے؟'' جان نے خود سے سوال کیا۔

اس وقت وہ نیویارک کی 105 بینک اسٹریٹ پر واقع اپنے فلیٹ کی کھڑکی میں کھڑا تھا۔ نظریں سڑک سے گزرتی گاڑیوں پر ٹکی تھیں لیکن ذہن کہیں اور تھا۔

جب اونو نے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک اٹھا۔ پلٹ کے اپنی بیوی کی جانب دیکھا جس کے ہاتھ میں کافی کا مگ تھا اور آنکھوں میں اندیشے۔

اونو نے کپ اسے تھمایا اور خاموشی سے کچن کی جانب چلی گئی۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ اس کے شوہر پر آسیب سوار ہے... محبت کا آسیب، جس کا سبب چینی نژاد امریکی دوشیزہ مے

WWW.PAKSOCIETY.COM

پانگ تھی۔

مے پانگ سے جان اور اونو کی پہلی ملاقات 1969 میں نیویارک میں ہوئی تھی۔

جلد ہی وہ اُن دونوں کی پرسنل اسسٹنٹ بن گئی۔ جب مے پانگ کو اس حیثیت میں کام کرتے تین برس بیت گئے، اونو کو یکدم اس احساس نے آن گھیرا کہ جان اس نوخیز حسینہ کی محبت میں گرفتار ہو چکا ہے۔

روایتی بیویوں کی طرح جان پر روک لگانے کے بجائے اس نے مے پانگ سے ملاقات کرنے کا فیصلہ کیا اور اس ملاقات میں اُس نے 22 سالہ مے کو ایک ایسا مشورہ دیا جس کی وہ قطعی توقع نہیں کر رہی تھی۔

''وہ تمہیں بہت پسند کرتا ہے۔'' یہ اونو کے الفاظ تھے۔ ''میرا مشورہ ہے کہ تم دونوں کچھ عرصے ایک ساتھ، ایک ہی چھت تلے رہو تاکہ خود کو بہتر انداز میں سمجھ سکو۔''

''اور تم...؟'' مے کے لہجے میں حیرت تھی۔

''اگر وہ تم سے محبت کرتا ہے تو جلد یا بدیر مجھے چھوڑ دے گا۔ بہتر ہے ہم جھگڑنے کے بجائے مناسب طریقہ استعمال کریں۔''

مے پانگ نے، جو جان کے سحر میں مبتلا تھی فوراً ہاں کر دی۔

دلچسپ امر یہ ہے کہ اونو پر جان چھڑکنے والے جان لینن نے یہ پیشکش قبول کرنے میں ایک لمحے کا بھی تامل نہیں کیا۔

اونو چلی گئی اور اس بگڑے ہوئے گلوکار نے اپنی نئی محبوبہ مے کا ہاتھ تھام لیا۔ اگلے اٹھارہ ہفتے وہ کیلیفورنیا میں رہے۔

مے کی رفاقت نے جان پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ وہ بدلنے لگا۔ اپنی نئی محبوبہ کے مشورے پر اس نے اپنے بیٹے جولیان سے دوبارہ رابطہ استوار کیا جس سے وہ گزشتہ دو برسوں سے نہیں ملا تھا۔ باپ بیٹے کے اس رابطے نے جلد ہی خوشگوار رشتے کی شکل اختیار کر لی۔ اس معاملے میں جان کی پہلی بیوی نے روک نہیں لگائی۔ آخر جولیان، جان لینن ہی کا تو بیٹا تھا۔

آنے والے دنوں میں اس نے بیٹلز کے ارکان سے بھی رابطہ کیا اور پرانے گلے شکوے بھلا کر اچھے دوستوں کی طرح رہنے کا اعلان کر دیا۔

کچھ عرصے بعد جان اور مے دوبارہ نیویارک منتقل ہو گئے، جہاں مے کے مشورے پر اپارٹمنٹ کا ایک کمرہ جولیان کے لیے مختص کر دیا گیا تاکہ جب بھی وہ آئے، وہاں ٹھہر سکے۔

برطانوی پریس ان تبدیلیوں پر خوش تھا۔ ایک مشہور فلم جرنلسٹ نے اپنے مضمون میں لکھا۔ ''اونو کے جادو سے نکلنے کے بعد اب جان میں سدھار آنے لگا ہے!''

اور یہ سچ ہی تھا۔ وہ پھر پرانے دوستوں سے ملنے لگا۔ گو کہ اس کے نظریات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی لیکن اب اس میں برداشت کا مادہ بڑھتا جا رہا تھا۔

''کیوں نہ ہم اپارٹمنٹ سے نکل کر ایک کشادہ گھر خرید لیں!'' مے پانگ کی اس تجویز پر جان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ کشادگی ہی کا تو وہ خواہش مند تھا۔

اس عرصے میں اونو نے اس سے تین چار بار رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن جان نے ہر بار اس کا فون سننے سے انکار کر دیا۔ جنوری 1975 تک اُن کا رابطہ منقطع رہا لیکن پھر... اونو کی ایک چال نے ملاقات کا امکان پیدا کر دیا۔

اس شام اُسے اونو کا پیغام موصول ہوا۔

''میں نے سگریٹ نوشی ترک کرنے کا ایک کلیہ ڈھونڈ نکالا ہے۔ اگر تم ملنے کے لیے رضامند ہو تو میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔''

''میں اس طریقۂ علاج کو آزمانا چاہوں گا۔'' یہ جان کے الفاظ تھے۔ وہ اونو سے ملنے کے لیے تیار تھا۔

مے پانگ جانتی تھی کہ یہ چال ہے، تاہم اس نے جان کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار نہیں کیا۔

ایک خوشگوار شام، نیویارک کے ایک ریسٹورنٹ میں جان اور اونو کی ملاقات ہوئی جس کے نتیجے میں ایک پُراسرار صورتِ حال نے جنم لیا۔

جانے سے قبل جان نے مے سے وعدہ کیا تھا کہ وہ جلد لوٹ آئے گا۔ ''ہم رات کا کھانا ساتھ کھائیں گے!'' رخصت ہوتے ہوئے جان نے کہا تھا... تاہم وہ واپس نہیں آیا۔ وہ رات مے نے کانٹوں پر گزاری۔ اگلے روز اُس نے اونو کو فون کیا۔

''جان گھر نہیں لوٹا... کیا وہ تمہارے ساتھ ہے؟'' اس نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔

''اس کا مطلب ہے کہ وہ واقعی غائب ہو چکا ہے۔'' اونو کا لہجہ سرد تھا۔

''کیا مطلب؟'' مے کے دل میں شک کا سانپ

پھنکارا۔

''تم یقین نہیں کرو گی۔'' اونو نے ڈرامائی آواز میں کہا۔ ''کل شام وہ میرے ساتھ عملِ تنویم کے سیشن میں گیا تھا۔ تم تو جانتی ہو، میں ذہنی سکون کے لیے باقاعدگی سے ماہرینِ نفسیات سے استفادہ کرتی ہوں۔ تاہم جب میں کلینک سے باہر آئی، وہ مجھے نظر نہیں آیا۔ میں نے ڈاکٹر سے معلوم کیا، اس نے بتایا کہ وہ تو کافی دیر پہلے وہاں سے نکل گیا تھا۔ نہ جانے اب وہ کہاں ہو۔''

''مگر...'' مے کی بات درمیان میں رہ گئی۔ لائن کٹ گئی تھی۔

دو روز مضطرب رہنے کے بعد مے کی اچانک جان سے ملاقات ہو گئی۔ ایسی ملاقات جس نے اسے مزید الجھا دیا۔

اُس دوپہر وہ ایک ڈینٹسٹ کے کلینک میں بیٹھی تھی جس سے اُس نے اور جان نے چند روز قبل چیک اپ کے لیے وقت لیا تھا۔

اچانک بوکھلایا ہوا جان ویٹنگ روم میں داخل ہوا اور ساتھ والی کرسی پر آ بیٹھا۔ وہ متذبذب اور بکھرا ہوا تھا۔

اس دوپہر جان مے کے کسی سوال کا جواب نہیں دے پایا۔ گو کہ وہ ساتھ گھر لوٹے تھے، لیکن مے جانتی تھی، جان کا فقط جسم اُس کے ساتھ ہے، اس کی روح، اس کا ذہن کہیں اور ہے۔

اونو کا جادو چل چکا تھا۔

اگلے ہی روز اُس نے مے پر واضح کر دیا کہ اس کے اور اونو کے تعلقات بحال ہو چکے ہیں اور وہ آنے والی زندگی اونو ہی کے ساتھ گزارنا چاہتا ہے۔

مے کو اس بات سے شدید صدمہ پہنچا۔ اس نے جان کو سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن یہ لاحاصل ثابت ہوئی۔

چند روز بعد اونو جان کے پہلو میں تھی، مے پانگ اس کی سابق محبوبہ بن چکی تھی اور آنے والے برسوں اسی حیثیت سے یاد کی جانے والی تھی۔

☆☆☆

اُن کی آنکھوں میں مستقبل کے سپنے تھے، نئے منصوبے تھے.. اونو امید سے تھی۔

ایک جانب جہاں وہ مسرور تھے، وہیں اندیشے بھی ان کے ساتھ قدم ملا کر چلتے۔ دراصل ماضی میں تین بار اونو حمل ضائع ہونے کے کرب سے گزر چکی تھی۔ اس کے دل میں خوف بیٹھ گیا تھا کہ ماں بننا اس کے نصیب میں نہیں، تاہم جان کی ہمت افزائی نے اُسے ایک بار پھر اپنا سپنا پورا کرنے کا حوصلہ دیا، البتہ اس نے شرط عائد کر دی کہ بچے کی پیدائش کے بعد جان سب کچھ تج کر خود کو اُس کی پرورش کے لیے وقف کر دے گا۔

حیرت انگیز طور پر موسیقی کے دلدادہ جان نے یہ کڑی شرط قبول کر لی۔

گو کہ اُن برسوں میں جان کی بسیار نوشی کے چرچے ہر طرف ہونے لگے تھے، تاہم تخلیقی عمل میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں ہوئی تھی۔ اس کے گیت تواتر سے مارکیٹ میں آ رہے تھے مگر اونو کے حاملہ ہونے کے بعد جان کی موسیقی میں دلچسپی گھٹنے لگی۔ ہاں، اس نے امریکی حکومت کے خلاف جنگ جاری رکھی جو اسے گرین کارڈ جاری کرنے میں پس و پیش سے کام لے رہی تھی جس کی وجہ سے وہ شدید دباؤ اور غصے میں تھا۔

البتہ اپنی 35 ویں سالگرہ والے روز یہ تناؤ، یہ غصہ بڑی حد تک کم ہو گیا... جب اونو نے ایک خوبصورت بچے کو جنم دیا جس کا نام شان رکھا گیا۔

9 اکتوبر 1975 کے روز دوسری بار باپ بننے والے جان نے اعلان کر دیا کہ وہ موسیقی سے کنارہ کش ہو رہا ہے۔

''میرا اکلوتا مقصد اپنے بیٹے کی پرورش ہے۔ اس کے سوا مجھے کسی شے کی پروا نہیں!''

ناقدین کا خیال تھا کہ وہ جلد موسیقی کی جانب لوٹ آئے گا، لیکن جان نے انہیں غلط ثابت کر دیا۔ وہ پورے پانچ برس مائک سے دور رہا۔ اِن برسوں میں اس کی کلی توجہ کا مرکز شان تھا۔

☆☆☆

اُس کے پیچھے کوئی تھا... کوئی ایسا جو اسے نقصان پہنچانا چاہتا تھا!

اس نے مڑ کر دیکھا، اس امید پر کہ کوئی مانوس اجنبی اُس پر نظر رکھے ہوئے ہے، جو اُس کے ملتے ہی نظریں چُرا لے گا، خود کو لاتعلق ظاہر کرنے کی ناکام کوشش کرے گا، تاہم... وہاں کوئی نہیں تھا۔ کوئی بھی نہیں!

یہ اُن دنوں کی بات ہے، جب جان کی کوئی رات بے خواب نہیں گزرتی۔ ہر شب وہ عجیب و غریب سپنے دیکھتا، تاہم جب بیدار ہوتا تو اُنہیں تخیل کی کارستانی کہہ کر نظر انداز کر دیتا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

1976 میں امریکی حکومت سے طویل لڑائی کے بعد اُسے گرین کارڈ مل گیا، تاہم اس دوران ایف بی آئی اہل کار مسلسل اُس کی نگرانی کرتے رہے۔ اس کی ٹیلی فون کالز ریکارڈ کی جاتی رہیں۔ جب کبھی وہ گھر سے نکلتا، اُس کا تعاقب ہوتا۔

اس اذیت سے تنگ آکر اس نے ایک پریس کانفرنس کرنے کا فیصلہ کیا جس میں کھل کر سامراجی ہتھکنڈوں پر روشنی ڈالی اور حکومت پر تنقید کی۔

"مجھے جو اذیت دی جارہی ہے، اس کا اکلوتا سبب میرے سیاسی نظریات ہیں۔ یہ شرم کی بات ہے کہ خود کو انسانی حقوق کی علم بردار کہنے والی حکومت میرے خیالات کو دبانا چاہتی ہے!"

"کیا آپ اپنی زندگی کے حوالے سے اندیشوں کا شکار ہیں مسٹر لینن؟" ایک خاتون صحافی نے سوال کیا۔

"محترمہ..." جان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ "میں فقط اتنا کہنا چاہوں گا، اگر مجھے کچھ ہوگیا تو وہ اتفاقی یا حادثاتی نہیں ہوگا۔"

اس پریس کانفرنس نے بین الاقوامی توجہ حاصل کی۔ جان کے مداح اُس کی حمایت میں سڑکوں پر نکل آئے۔ دنیا کے نامور ادیبوں، موسیقاروں اور فن کاروں نے بھی جان کی نگرانی کے عمل کو مکروہ قرار دیتے ہوئے اسے فی الفور بند کرنے کا مطالبہ کردیا۔

اِس پریس کانفرنس کے بعد جان گوشہ نشین ہوگیا۔ اس نے گھر سے باہر نکلنا ترک کردیا، البتہ میڈیا سے قطع تعلق نہیں کیا، یہی سبب ہے کہ اس کے سیاسی خیالات اور تلخ بیانات اخبارات کی زینت بنتے رہے۔

1980 کا سال جان کے چاہنے والوں کے لیے خوشخبری لے کر آیا، اس نے گوشہ نشینی ترک کردی اور کمر کس کر دوبارہ موسیقی کے میدان میں کود پڑا۔ لوگوں سے گھلنے ملنے لگا، اسٹوڈیو جانے لگا۔

پانچ برس کے وقفے کے بعد جب اُس کی آواز ریڈیو پر سنائی دی، یہ خیال دم توڑ گیا کہ اس کی صلاحیتوں کو زنگ لگ گیا ہے۔ وہ تاحال توانا تھا۔

جلد ہی اس کے تحریر کردہ اور گائے ہوئے مزید گانے ریڈیو سے نشر ہوئے، جنہوں نے ریکارڈ مقبولیت حاصل کی۔

ایک بار پھر وہ توجہ کا مرکز بن گیا۔ اب وہ دورے کر رہا تھا، نئے لوگوں سے مل رہا تھا، انٹرویوز دے رہا تھا۔ اس عمل کے دوران اسے ایک واضح تبدیلی کا احساس ہوا تھا۔ "اب کوئی میرا تعاقب نہیں کر رہا۔" وہ خود سے کہا کرتا۔ "کرب ناک خوابوں کا سلسلہ اپنے اختتام کو پہنچ چکا ہے۔"

اِس احساس نے اسے بشاشت سے بھر دیا جس کا اظہار اس نے اپنے ایک انٹرویو میں بھی کیا۔ "شاید ایف بی آئی اہل کار میرا پیچھا کرتے کرتے اُوب گئے ہیں۔ وہ مایوس ہوگئے ہیں۔"

"تو کیا آپ یقین رکھتے ہیں کہ اب آپ پر نظر نہیں رکھی جارہی؟" رپورٹر نے سوال کیا۔

"مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے!" چالیس سالہ جان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

وہ غلط تھا... تعاقب کا سلسلہ جاری تھا... نظر رکھنے والے اب بھی موجود تھے... جن کے شاطر ذہن 8 دسمبر 1980 کی سیاہ رات کے منتظر تھے!!

☆☆☆

8 دسمبر کی دوپہر، بالائی مین ہٹن میں واقع ڈکوٹا اپارٹمنٹ کی سیڑھیاں چڑھتے وقت اینا لیبوٹز خاصی پُرجوش تھی۔

وہ ایک پروفیشنل فوٹوگرافر تھی۔ تعلق مشہور میگزین رولنگ اسٹون سے تھا اور دو ہفتے قبل ایڈیٹر کی جانب سے اُسے ایک خاص اسائنمنٹ سونپا گیا تھا۔

"تیاری پکڑ لو اینا، تمہیں اپنے عہد کے مشہور اور متنازعہ ترین شخص جان لینن کا میگزین کور کے لیے فوٹو شوٹ کرنا ہے۔"

جان سے وقت لینے میں اسے زیادہ دقت پیش نہیں آئی۔

"8 دسمبر کی تاریخ ٹھیک رہے گی۔ تم دوپہر دو بجے میرے اپارٹمنٹ چلی آؤ!" جان نے یہ کہہ کر فون رکھ دیا۔

وہ خوشی خوشی وقت مقرر پر جان کے اپارٹمنٹ پہنچ گئی جہاں اُسے ایک غیر متوقع صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم اونو کے ساتھ میری تصاویر اپنے ٹائٹل پر شائع کرو۔"

یہ سنتے ہی اینا سناٹے میں آگئی۔ اُس نے ایک نظر اونو کو دیکھا جو اِس معاملے سے لاتعلق کافی بنانے میں مگن تھی۔

میگزین فقط جان کی تصاویر شائع کرنے میں دلچسپی رکھتا تھا، لیکن اینا کو ادراک تھا کہ جان اپنی بیوی کے معاملے میں کتنا حساس ہے۔ اُس نے خاموشی توڑی۔ "ضرور مسٹر جان۔ دنیا کے مقبول ترین جوڑے کی تصاویر شائع کرنا ہمارے لیے ایک اعزاز ہوگا۔"

"زبردست!" جان نے تالی بجائی۔ "بتاؤ ہمیں کیا کرنا ہوگا؟"

اگلے ایک گھنٹے تک اپارٹمنٹ میں فلیش چمکتا رہا۔ اینا نے مختلف زاویوں سے اس جوڑے کے رومان کو کیمرے میں محفوظ کیا۔ چند تصاویر تو انتہائی ہیجان انگیز تھیں۔

ساڑھے تین بجے جب اینا زینے سے اتر رہی تھی، اُس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ جان لینن کا آخری فوٹو شوٹ ثابت ہوگا۔

☆☆☆

اینا کو گئے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ آر کے او ریڈیو نیٹ ورک کے نمائندے ڈیوڈ شلن نے جان کے دروازے پر دستک دی۔

کچھ دیر بعد وہ اور جان آمنے سامنے بیٹھے گفتگو کر رہے تھے۔

انٹرویو جلد ہی ختم ہوگیا۔ جب ڈیوڈ رخصت ہوا، گھڑی کے کانٹے پانچ کے ہندسے کی جانب بڑھ رہے تھے۔

"ڈیئر، ہمیں ریکارڈنگ کے لیے پلانٹ اسٹوڈیو جانا ہے۔" جان کی سماعتوں سے اپنی بیوی کی آواز ٹکرائی۔ "جلد تیار ہو جاؤ۔"

"میں تیار ہوں!" جان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

لگ بھگ پانچ بجے وہ اونو کے ساتھ اپارٹمنٹ سے نیچے اترا جہاں درجنوں مداح اس کے منتظر تھے جنہوں نے آٹوگراف لینے کے لیے اُسے گھیر لیا۔

جان اپنے مداحوں کی قدر کرتا تھا۔ وہ رک کر آٹو گراف دینے لگا۔

ایسے میں آنکھوں پر عینک چڑھائے، کچھ فاصلے پر کھڑا ایک صحت مند شخص آہستگی سے ہجوم کی جانب بڑھنے لگا۔ چند لمحوں بعد وہ جان کے پہلو میں کھڑا تھا۔

جان نے اُس کی طرف دیکھا۔ نہ جانے کیوں... اسے اُس شخص کا چہرہ جانا پہچانا لگا۔

اجنبی نے خاموشی سے جان کے نئے البم Double Fantasy کا کور اس کی جانب بڑھا دیا اور جان نے اس پر دستخط کردیے۔

"اور کوئی حکم نوجوان؟" تذبذب کے شکار جان نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"شکریہ!" اس نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

ٹھیک اُس لمحے کیمرے کا فلیش چمکا، جان اور آٹو گراف لینے والا ایک فریم میں قید ہوگئے۔

اُس شخص کا نام ڈیوڈ چیپ مین تھا۔ 8 دسمبر کی شام تک وہ ایک گمنام شخص تھا، اُسے کوئی نہیں جانتا تھا لیکن... اگلے دن کا سورج طلوع ہونے سے پہلے وہ دنیا بھر کی توجہ کا مرکز بن گیا، کیونکہ رات گیارہ بجے، ٹھیک اُسی مقام پر جہاں اُس نے جان لینن سے آٹوگراف لیا تھا، چیپ مین نے اُسے قتل کردیا۔

حیران کن امر یہ ہے کہ اس نے بھاگنے کے بجائے بڑے اطمینان سے پولیس کا انتظار کیا۔ اس عرصے میں وہ J. D. Salinger کا تحریر کردہ ناول The Catcher in the Rye پڑھتا رہا۔

☆☆☆

جان لینن کو کیوں قتل کیا گیا؟ ڈیوڈ چیپ مین کون تھا؟ اس سازش کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا؟

تیس سال گزر گئے لیکن اِن سوالات پر تاحال اسرار کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ گرفتاری کے بعد پولیس اہل کاروں اور ماہرینِ نفسیات نے چیپ مین سے تفصیلی گفتگو کی جس کے نتیجے میں ایک عجیب رپورٹ سامنے آئی۔ پولیس کے مطابق "گولی چلاتے وقت چیپ مین کے اندر غصے یا انتقام جیسا کوئی جذبہ نہیں تھا۔ اس کے دماغ میں مکمل سناٹا تھا اور وہ اپنے اقدام کے اسباب سے لاعلم تھا!"

جان کے مداحوں نے اِس رپورٹ کو یہ کہتے ہوئے رد کردیا کہ "یہ تفتیش کو غلط رخ دینے کی کوشش ہے!"

مقدمے کے دوران حکومت کی جانب سے فراہم کردہ وکیل چیپ مین کو ذہنی مریض ثابت کرنے کی کوشش کررہا تھا لیکن قاتل نے اُس وقت اپنے وکیل کو حیرت میں ڈال دیا، جب اُس نے تقاضا کیا کہ وہ ذہنی مریض کی حیثیت سے نہیں بلکہ اقبالی مجرم کی حیثیت سے اُس کا مقدمہ لڑے۔

اُس نے کہا تھا۔ "میں ایک آواز کے حکم پر یہ موقف

WWW.PAKSOCIETY.COM

اختیار کر رہا ہوں جو مجھے جیل کی کوٹھری میں سنائی دیتی ہے۔''
''وہ کس کی آواز ہے؟'' وکیل نے سوال کیا۔
''خدا کی!'' چیپ مین پُرسکون تھا۔

عدالت میں جرم ثابت ہو گیا۔ جج نے اُسے بیس برس کی قید سنا دی۔

جیل جانے کے کچھ عرصے بعد ایک برطانوی رپورٹر نے چیپ مین سے تفصیلی انٹرویو کیا جس میں اُس نے انکشاف کیا:

''میں نہیں جانتا کہ میں نے یہ سب کیوں کیا۔ بس جب وہ میرے قریب سے گزرا، مجھے ایک سرگوشی سنائی دی، کر ڈالو، ابھی کر ڈالو! جلد ہی اِس سرگوشی نے حکم کی شکل اختیار کر لی۔ مجھے نہیں یاد کہ میں نے کب پسٹل نکالا، کب فائر داغ دیا!''

قتل کے پُراسرار اسباب نے کئی محققین کو اِس کیس پر کام کرنے کی تحریک دی جس میں سے ایک برطانوی قانون دان اور صحافی فونٹین بریسلر بھی تھا جس نے اس گتھی کو سلجھانے کی دس برس کوشش کی اور اپنی تحقیق کے نتائج "Who Killed John Lennon?" نامی کتاب میں پیش کیے۔

بریسلر کا دعویٰ تھا کہ چیپ مین کا برین واش کر کے عمل تنویم کے ذریعے اُس کے ذہن پر قابو پا لیا گیا تھا۔ اس نے لکھا۔ ''اسے ہدف پورا کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ دراصل وہ حقیقی مجرموں کا معمول تھا، وہ مجرم جو جان لینن کو قتل کرنا چاہتے تھے۔''

بریسلر نے یہ تھیوری پیش کرنے کے بعد الزام عائد کیا کہ حقیقی قاتلوں کا تعلق امریکی انتظامیہ سے تھا اور صدر کے قریبی حلقے اس قتل میں ملوث تھے۔ ''جان کا قتل ایک باغی کو ٹھکانے لگانے کی سامراجی سازش تھی۔''

بریسلر کی اِس متنازعہ کتاب کی اشاعت کے بعد چند امریکا نواز حلقوں کی جانب سے یہ خیال دہرایا جانے لگا کہ چیپ مین نے فقط مشہور ہونے کے لیے یہ قدم اٹھایا تھا۔

اِس خیال کے حامی ہزاروں تھے لیکن امریکی سراغ رساں آرتھر او کونز کا نظریہ اس سے یکسر مختلف تھا۔ آرتھر ہی وہ شخص تھا، جس نے جان کے قاتل سے تفتیش کی تھی۔ اس نے ایک امریکی اخبار کو تفصیلی انٹرویو دیتے ہوئے کہا۔ ''قاتل ابتدا ہی سے پریس سے کترا رہا ہے۔ اگر وہ شہرت کا خواہش مند ہوتا تو تواتر سے انٹرویو دیتا۔ میرے خیال میں بریسلر کا خیال دُرست ہے۔ قتل والی رات وہ واقعی ایک معمول جیسا نظر آ رہا تھا!''

اُن ہی دنوں جان لینن سے متعلق ایف بی آئی کی تیار کردہ تین سو صفحات پر مشتمل فائل اور اس کے مندرجات منظرِ عام پر آ گئے، جس میں جان کو ایک گلوکار کے بجائے ایک شدت پسند کے روپ میں پیش کیا گیا تھا، جس کے سیاسی نظریات کا زہر کروڑوں نوجوانوں میں منتقل ہو رہا تھا۔ اس فائل سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ اس کی باقاعدگی سے نگرانی ہو رہی تھی۔

کچھ ہی عرصے بعد ایک سنسنی خیز اسٹوری اخبارات کی زینت بنی:

''امریکی حکومت نے بین الاقوامی دباؤ کے باعث جان کو گرین کارڈ جاری کیا تھا۔ حقیقتاً وہ اُسے ملک بدر کرنا چاہتی تھی اور اِس ضمن میں اس پر مسلسل دباؤ ڈالا جا رہا تھا۔''

اِس اسٹوری اور ایف بی آئی کی فائل سے یہ واضح ہو گیا کہ جان کا دشمن کون تھا۔

''چیپ مین ایک مذہبی جنونی ہے، جو جان کے مذہب دشمن نظریات سے بیزار تھا!'' ایک بڑا طبقہ اِس خیال کا حامی رہا۔ گرفتاری کے بعد چیپ مین کی جانب سے دیے جانے والے چند بیانات اِس نظریے کی تصدیق کرتے تھے۔ مثلاً اُس نے بتایا۔ ''عیسائیت کے خلاف جان لینن کے بیان نے مجھے آگ بگولا کر دیا تھا!''

البتہ سنجیدہ تجزیہ نگاروں نے یہ کہتے ہوئے اِس خیال کو رد کر دیا۔ ''چیپ مین کے بیانات اور 8 دسمبر کے اقدام میں بہت فرق ہے۔ اس کے ماضی میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا، جب اس کے انتہا پسندانہ نظریات نے تشدد کی شکل اختیار کی ہو۔''

جان کا قاتل اِس وقت امریکی جیل میں ہے۔ ان برسوں میں وہ اخبارات اور ٹی وی چینلز کو متعدد انٹرویوز دے چکا ہے، تاہم ان انٹرویوز نے قتل کی گتھی سلجھانے میں کوئی مدد نہیں کی۔

جان لینن کا قتل آج بھی معمّا ہے۔ البتہ پال کے الفاظ سے اُس کے محرکات پر کچھ روشنی ضرور پڑتی ہے، جس نے بیٹلز کے خاتمے کے وقت کہا تھا:

''جان ایک باغی ہے، ہمارے ہاں باغیوں کو قبول نہیں کیا جاتا، اُنہیں قتل کیا جاتا ہے!!''

آذری کا دیس

عبدالغفار راجپوت

سو فیصد مسلمانوں کا دیس جہاں احترامِ انسانیت اب تک باقی ہے۔ سہولت اتنی کہ جو یہاں آجائے وہ جانے کا نام نہ لے۔ اسٹیشن چمکتے ہوئے اور ریل ہوا کی رفتار سے چلتی ہے۔ ذرا سا کسی کو اعتراض ہو تو وہ میٹرو سے اتر کر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر سڑک پر پہنچ جاتا ہے وہاں خوبصورت بسیں منتظر رہتی ہیں۔

ایک مسلم ملک کا مختصر سا تعارف

آذربائیجان ایک اسلامی جمہوری خودمختار ریاست ہے جہاں پر بادشاہت کا نظام رائج ہے۔ 1991ء میں جب سوویت یونین کا خاتمہ ہوا تھا تو 11 کے قریب ریاستیں آزاد ہوئیں جن میں سے ایک آذربائیجان بھی ہے جو کہ مکمل مسلمان ملک ہے۔ یہ تیل، گیس اور بے شمار معدنی وسائل سے مالامال ہے۔ آذربائیجان کا دارالحکومت باکو ہے جو کہ سب سے بڑا شہر ہے۔ یہ دنیا کا سب سے زیادہ تیل پیدا کرنے والا شہر بھی کہلاتا ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

صدیوں سے آباد اس شہر کی آبادی 45 لاکھ سے متجاوز ہے جبکہ آذربائیجان کی کل آبادی 90 لاکھ ہے' یعنی آذربائیجان کی آدھی سے زائد آبادی باکو شہر میں رہتی ہے۔ یہاں کے عوام ملنسار' بااخلاق اور زبردست مہمان نواز ہیں۔ یہاں جو ایک بار آجائے پھر اس کا جلدی واپس جانے کو دل نہیں کرتا۔ آذربائیجان کے مشرق میں روس' مغرب میں ایران' شمال میں سمندر اور ترکمانستان اور جنوب کی طرف جارجیا اور ترکی واقع ہیں۔ درمیان میں آرمینیا کی سرحد ہے جو کہ آذربائیجان کا حریف ملک ہے اور برسابرس سے ان کے درمیان محاذ آرائی جاری ہے۔ آرمینیا ایک عیسائی ملک ہے اور انہوں نے زبردستی آذربائیجان کے ایک خطے کاراباغ پر غاصبانہ قبضہ کیا ہوا ہے۔ آذربائیجان کے ہمسایہ ممالک ترکمانستان' جارجیا' ترکی اور ایران کے ساتھ بہتر تعلقات ہیں۔ روس کے ساتھ زیادہ بہتر نہیں جبکہ آرمینیا کے ساتھ محاذ آرائی ہے۔ آذربائیجان میں ..... بلڈنگ' پلازے' اوور ہیڈ برج' پل' سڑکیں اور تعمیراتی کام بڑی تیزی کے ساتھ ہورہا ہے اور آنے والے چند سالوں میں آذربائیجان ایک ترقی یافتہ اور آئیڈیل ملک کے روپ میں دنیا کے سامنے آئے گا۔

آذربائیجان کے پاکستان کے ساتھ سفارتی' دفاعی' خارجی تعلقات بے حد مثالی ہیں اور پاکستانیوں کی یہاں بہت قدر کی جاتی ہے جو کہ قابل قدر اور باعث صد افتخار ہے۔ اس کے برعکس باقی دنیا میں پاکستانیوں کو مشکوک نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ پاکستانی مصنوعات گارمنٹس' پھل' سبزیاں وغیرہ کی یہاں بڑی مانگ ہے اور ان کی یہاں بہت بڑی منڈی ہے۔

یہاں کے عوام کا رہن سہن تقریباً مشرقی ہے کیونکہ یہ ایشیا کا حصہ ہے' البتہ لباس یورپین' رنگین اسٹائل کا ہے۔ آپس میں لوگ ایک دوسرے کو دعائیں بہت دیتے ہیں' گالی گلوچ نہایت کم ہے۔ آذربائیجان میں 8 ماہ شدید سردی پڑتی ہے۔ جنوری فروری میں خوب برف پڑتی ہے۔ بعض اوقات مارچ اپریل تک بھی برف باری ہوتی ہے۔ گرمی یہاں پر صرف 3 ماہ جون جولائی اور اگست میں پڑتی ہے۔ درجہ حرارت 40 تک ہوتا ہے اور تب عوام ساحلِ سمند پر چلے جاتے ہیں اور دھوپ کے مزے لیتے ہیں۔ آذربائیجان میں کاریں ٹیکسیاں بہت ہیں' رکشا' موٹر سائیکل یہاں پر نہیں ہیں جبکہ سائیکلیں بہت کم ہیں۔

آذربائیجان کے خوبصورت علاقوں میں باکو کے علا[وہ] اسماعیل' آگ سو' قابلہ' شیکی' کا کھ زا کا تلا' یارا کان' شمع خیر' گنجا قبا اور رائیون ہیں۔ جہاں پر گرمیوں میں بیرون [اور] اندرونِ ملک سے کثیر تعداد میں سیاح آتے ہیں۔ یہاں کے قدرتی مناظر' برف باری' جھیلیں بہت دلفریب ہیں جو سیاحوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ زیتون کے باغات یہاں بکثرت ہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ زیتون کا ملک ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ زیتون جنتی پھل ہے اور اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اس کی قسم کھائی ہے۔ اس کے علاوہ یہاں پر پھل بھی [کثیر] تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ اخروٹ' انجیر' انار' بادام' انگور' چیری' شہتوت' سیب' جاپانی پھل کے باغات بہت ہیں۔ دیہی علاقوں میں لوگوں کا ذریعہ معاش مویشی پالنا ہے۔ بکریاں' گائے بھینیس بکثرت پالی جاتی ہیں۔ زرعی زمینوں میں گندم' چاۓ مکئی اور دیگر فصلیں کاشت کی جاتی ہیں۔ یہاں کی زمین بہت زرخیز ہے اور کاشتکاری خوب ہوتی ہے۔ آذربائیجان میں انڈسٹریز بہت کم ہیں اس لیے زیادہ تر مال باہر سے درآمد کیا جاتا ہے۔ وہاں مسلمانوں خاص طور پر پاکستانیوں کی بہت قدر کی جاتی ہے۔ جو غیر ملکی یہاں کاروباری طور پر سیٹل ہوتے ہیں ان کو قانون کے تحت یہاں شادی کرنی پڑتی ہے۔ پھر یہاں کی امیگریشن ان کو گاہے بگاہے ایک ایک سال کے ویزے دیتی ہے۔ 3 یا 5 سال کے بعد ان کو یہاں کی نیشنلٹی مل جاتی ہے۔ یہاں پر شادیاں ہال میں ہوتی ہیں۔ محلے' روڈ' پلاٹ میں نہیں اور فوتگی کا پروگرام محلہ یا روڈ پر ہوتا ہے۔ یہ الگ علامت ہوتی ہے۔ قبرستان میں ہر مرنے والے کے کتبہ پر اس کا فوٹو پرنٹ ہوتا ہے۔ آذربائیجان میں مسلکی طور پر بڑا اکثریت شیعہ کی ہے۔ فقہ مالکی' فقہ شافعی کی آبادی دوسرے نمبر پر ہے صرف 2 فیصد۔ یہاں پر مسلکی گروہ بندی اور بدامنی نہیں ہے اور کوئی لسانی تفریق بھی نہیں ہے جس کی وجہ سے امن و امان کا دور دورہ ہے۔ بجلی گیس پانی کی ہر وقت دستیابی ہے۔ ارزاں نرخوں پر ٹرانسپورٹ کی وسیع سہولتیں ہیں۔ باکو شہر میں اندرونِ شہر چلنے والی بس 20 کاپی کرایہ لیتی ہیں جبکہ اندرونِ شہر انڈر گراؤنڈ میٹرو ریل 15 کاپی لیتی ہے جو کہ نہایت تیز رفتار اور زبردست ہے۔ باکو کے شہریوں کی اکثریت میٹرو سے سفر کرنا پسند کرتی ہے کیونکہ یہ بہت تیز رفتار اور باسہولت ہے۔ یہاں کی ریلوے اندرونِ ملک ہر شہر جانے کے لیے استعمال ہوتی ہے لیکن آپ اس کو دنیا کی سست ترین ٹرین کہہ سکتے ہیں کیونکہ وہ 350 کلومیٹر کا فاصلہ 12 گھنٹے میں طے کرتی ہے۔ بہرحال سسٹم اچھا ہے اور اس کی بہتری کے لیے کام ہورہا ہے اور آئندہ چند برسوں میں بہتری ہوجائے گی۔ اندرونِ شہر بس میں سفر کے دوران خواتین' بچوں اور بوڑھوں کو یہاں پر نہایت احترام دیا جاتا ہے۔ بڑی بس ہو یا میٹرو ریل' خواتین' بچوں اور بزرگوں کو سیٹ خالی کر کے جگہ دی جاتی ہے اور لوگ خود کھڑے ہوجاتے ہیں۔ یہ ایک مثالی عمل ہے جس کی جتنی تحسین کی جائے کم ہے۔ احترامِ انسانیت ان لوگوں میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے جو کہ ہمارے معاشرے میں ناپید ہوتا جارہا ہے۔ کھانے میں عموماً یہ لوگ پانی بہت کم استعمال کرتے ہیں بلکہ نہ ہونے کے برابر کرتے ہیں۔ اس کی جگہ چائے جس کو ہم قہوہ کہتے ہیں استعمال ہوتی ہے۔ یہاں کے مشروب قہوہ' جوس لسی کولا بیئر ہیں۔

یہاں کے معاشرے میں اچھائیوں کے ساتھ ساتھ برائیاں بھی ہیں' بچے سے لے کر بوڑھے تک بے تحاشا سگریٹ نوشی کرتے ہیں پھر بیئر کا استعمال بھی بکثرت ہوتا ہے۔ یہ ساری برائیاں 77 سالہ روسی اقتدار کا تحفہ ہیں جو کہ آہستہ آہستہ ختم ہورہی ہیں۔ مساجد یہاں پر کم ہیں جن کی تعداد میں آہستہ آہستہ اضافہ ہورہا ہے۔ اسلامی ماحول اور لٹریچر یہاں پر فروغ پارہا ہے۔ روسی اقتدار کے دوران ان چیزوں پر پابندی تھی یہاں تک کہ مساجد میں اذان دینے پر بھی پابندی تھی مگر آزادی کے بعد اب یہاں مکمل اسلامی ماحول ہے۔

آذربائیجان کا بانی حیدر علی تھا' جو اَب فوت ہوچکا ہے۔ ان کے فرزند الہام علی اب یہاں کے صدر ہیں۔ آذربائیجان کی کرنسی کا نام منات ہے اور سکوں کو کاپی کہتے ہیں۔ یہاں کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ روزمرہ استعمال کی اشیا کنٹرول ریٹ پر ملتی ہیں' آئے دن چیزوں کی قیمت میں کمی بیشی یہاں نہیں ہوتی' سالوں بعد کوئی فرق پڑتا ہے ورنہ نہیں۔

آذربائیجان کی مرکزی زبان آذری ہے اور روسی دوسری بڑی زبان ہے۔ روسی زبان اب بھی تمام آزاد شدہ ریاستوں میں لکھی' بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ انگلش اور دیگر زبانوں سے یہ لوگ ابھی نابلد ہیں اور باہر سے جانے والوں کو وہاں زبان کا مسئلہ درپیش رہتا ہے۔ بہرحال آذری ایک میٹھی اور پیاری زبان ہے جس میں فارسی' روسی' اردو' ازبک اور دیگر قدیم زبانوں کے الفاظ شامل ہیں۔

درشن چھوٹے

میجر مائیکل ووڈ فال کی اوپر چڑھی ہوئی تاؤدار مونچھیں اس کی شخصیت کو بہت بارعب بناتی تھیں۔ اس پر اس کا قیمتی عمدہ لباس' ملٹری کراس اور اس کا شاندار شکاری کتا۔ اس کی امارت کی نشانیاں تھیں۔ اس کے رکھ رکھاؤ کی بنا پر لندن کی بہت سی خواتین اور دوشیزائیں اس پر مرتی تھیں۔ باربرا اسیوی لینڈ بھی انہی دوشیزاؤں میں شامل تھی۔ وہ خاصی پرکشش تھی۔ میجر اس پر مہربان ہوگیا۔ باربرا اب ہروقت اس کے ساتھ رہتی۔ میجر اس کا تعارف اپنی پرائیویٹ سیکریٹری کی حیثیت سے کراتا۔ یہ دونوں رات کو اعلیٰ کلبوں میں جاتے اور دن کے وقت کار میں دیہی علاقوں کی سیر کو نکل جاتے۔

اس رفاقت نے آخر اپنا رنگ دکھایا۔ میجر نے باربرا سے شادی کی خواہش ظاہر کی۔ باربرا کی دلی مراد بر آئی۔ میجر مائیکل ووڈ فال زیورات کی خریداری کے لیے باربرا کو لندن میں ایک جیولر کی دکان پر لے گیا۔ انہوں نے 6800 پاؤنڈز مالیت کے زیورات خریدے۔ میجر نے رقم کی ادائیگی کے لیے جیولر کو چیک دے دیا۔ اگلے روز بینک نے چیک کیش کرنے سے انکار کردیا۔ میجر تو فرار ہوگیا تھا۔ بے چاری باربرا مصیبت میں گرفتار ہوگئی۔

پولیس میجر مائیکل ووڈ فال کے تعاقب میں لگ گئی۔ پولیس اس کو تھمپسن چارلی کے نام سے جانتی تھی۔ پولیس نے آخر اس کو ایک آئرش کاؤنٹی سے گرفتار کرلیا جہاں وہ ایک خاندان کے ساتھ پے انگ گیسٹ کی حیثیت سے ٹھہرا ہوا تھا۔ لندن کی اولڈ بیلی عدالت میں مقدمہ چلا۔ 35 سالہ تھمپسن چارلی نے نہایت عیش و عشرت کی زندگی گزاری تھی لیکن دوسروں کی دولت پر۔ اس عرصے میں اس نے برطانیہ کے سیکڑوں افراد کو جن میں زیادہ تعداد عورتوں کی تھی' الو بنا کر ان سے ہزاروں پاؤنڈز کی رقم وصول کی تھی۔ تھمپسن چارلی ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوا۔ اس نے اپنی ایک تہائی زندگی جیل میں گزاری۔ وہ صرف نو ماہ فوج میں رہا اور بے عزتی کے ساتھ فوج سے نکالا گیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

یہاں کے لوگوں کے رنگ سفید گورے ہیں اس طرح یہ لوگ دل کے بھی صاف شفاف ہیں۔ آذربائیجان کے ہر شہر کے چوراہوں، پارکوں میں اس وطن کے نامور اکابرین، دانشوروں، شاعروں اور لیڈروں کے مجسمے نصب ہیں۔ یہاں نئے سال کو بڑے جوش وخروش سے منایا جاتا ہے۔ آتش بازی ہوتی ہے، پارک، محلے سجاتے ہیں اور رات 12 بجتے ہی یورپ کی طرح یہاں بھی بھرپور آتش بازی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے اور اس دن کو بائی رامیز کا نام دیا جاتا ہے جس کو عید کہتے ہیں اور اس سے بڑھ کر نوروز بائی رامیز جوکہ ..... 19-20-21 مارچ کو منایا جاتا ہے۔ اس پر پورے ملک میں جوش وخروش ہوتا ہے۔ ملک بھر میں 10 سے 12 دن تک تمام سرکاری ادارے بند رہتے ہیں اور یہ دن یہاں عید کے دن تصور کیے جاتے ہیں۔ خواتین کے عالمی دن 8 مارچ کو بائی رامیز یعنی عورتوں کی عید کے نام پر بھرپور طریقے سے منایا جاتا ہے۔ مرد خواتین کو تحفے تحائف دیتے ہیں۔ ویسے بھی اس ملک میں ایک دوسرے کو تحفے دینے کا رواج بہت زیادہ ہے جوکہ خوش آیند اور محبت بڑھانے کا ذریعہ ہے۔

آذربائی جان کی خوراک بھی مختلف ہے۔ یہاں کی تندوری روٹی حجم میں کافی موٹی ہوتی ہے۔ یہاں روٹی بازار سے ملتی ہے، گھر پر صرف سالن پکتا ہے اور روٹی بازار سے لانے کا رواج ہے۔ دوسری لاوش یعنی چپاتی ہوتی ہے۔ کھانے یہاں کے کافی اچھے ہیں، کالی مرچ کا استعمال ہوتا ہے اور وہ بھی بہت کم۔ یہاں پر اچار سرکہ کا ہوتا ہے جوکہ نہایت لذیذ ہوتا ہے اس طرح پھلوں کے مربہ جات بھی بہت عام اور سستے ہیں۔ یہاں چائے کا استعمال زیادہ ہے اور پانی کا استعمال نہ ہونے کے برابر ہے۔ آذربائیجان میں حلال جانوروں کا گوشت گائے، بھیڑ کا ملتا ہے۔ دیسی بکری اونٹ اور دیگر جانور یہاں دستیاب نہیں۔ بھینس بھی یہاں بہت کم ہے۔ دور دراز کے دیہاتی علاقوں میں منشیات کا استعمال بہت کم ہے۔ خطرناک نشہ یعنی چرس افیم وغیرہ کو یہاں بالکل پسند نہیں کیا جاتا۔ بیئر اور سگریٹ بھی پسندیدہ نشہ ہے۔ جرائم کی شرح اس ملک میں انتہائی کم ہے مگر پولیس کی تعداد آبادی کے تناسب سے بہت زیادہ ہے۔ یعنی ہر ہزار افراد پر مشتمل آبادی پر ایک تھانہ لازمی ہے۔ پولیس کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے یہاں جرائم کنٹرول میں ہیں پھر یہاں کی پولیس بھی بہت ایکٹو ہے۔

آذربائیجان کا سب سے بڑا خریداری مرکز باکو میں صدرک اور بینا ہے جہاں پر سب سے بڑی ہول سیل مارکیٹ قائم ہے۔ ہزاروں دکانوں پر مشتمل اس بازار میں ہر چیز ارزاں نرخوں پر دستیاب ہے۔ باکو شہر کے ارمی نیور میٹرو سے یہ بازار صرف 20 منٹ کی مسافت پر ہے اور یہاں سے درجنوں بسیں سارا دن چلتی رہتی ہیں۔ یہاں ضروریاتِ زندگی کا ہر سامان ہول سیل ریٹ پر دستیاب ہے۔ ترکی، چین، ایران، پاکستان، روس، تاجکستان، جارجستان، ازبکستان ودیگر ممالک کی ہر ورائٹی یہاں پر کھلے عام دستیاب ہے۔ باکو شہر دنیا کی قدیم ترین آبادیوں میں سے ایک ہے۔ اس کا ثبوت اس کے پرانے محلے ہیں۔ باکو شہر میں اچارے شہر یعنی شہر کی چابی، قلعہ اپنی مثال آپ ہے۔ کئی صدی سے یہ قلعہ شان سے سر اٹھائے کھڑا ہے۔ جہاں پر تاریخی نوادرات، مجسمے بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ مشہور داستان لیلیٰ مجنوں کا لکھنے والا ادیب و شاعر نظامی گنجوی کا تعلق بھی آذربائیجان سے تھا اور وہ ملک کے دوسرے بڑے شہر گنجے سے تعلق رکھتے تھے، نظامی انہی کے نام سے منسوب ہے۔ میٹرو نظامی میں تمام اداروں کے دفاتر موجود ہیں۔

باکو آذربائیجان کا مرکز بھی ہے اور دل بھی۔ اس شہر میں یونیورسٹیاں، کالجز، اکیڈمیاں بہت زیادہ ہیں۔ شرحِ خواندگی بہتر اور معیارِ تعلیم مناسب ہے۔ اسکولز، کالجز، یونیورسٹیز میں پہلے تعلیم روزی آزری میں دی جاتی تھی اب انگلش زبان بھی طلبہ کو سکھائی جارہی ہے۔ روس کے اقتدار میں یہاں انگلش اور ڈالر پر پابندی تھی مگر اب عام ہے۔ باکو کا ساحل سمندر دنیا کے خوبصورت ساحلوں میں سے ایک ہے جہاں پر خوشنما پارک، نایاب اقسام کے پودے، خوبصورت فوارے، رنگین لائٹیں، بوٹ ٹرین، ہوٹل، شیشے کی بلڈنگ والے ہوٹلز، کشتیاں اور جہاز ہیں۔ یورپین اور ایشین ماحول میں کئی چیزیں ایڈوانس ہیں۔ شہر بھر میں پارک کافی تعداد میں موجود ہیں جہاں گرمیوں میں کافی رش ہوتا ہے۔ مساجد کم ہونے کے سبب جمعہ اور عیدین کی نمازوں میں جگہ مشکل سے ملتی ہے۔ مساجد کی طرف حکومتی توجہ کم ہے۔ آذربائیجان کے مختلف شہروں میں پرانی جامع مساجد بہت تاریخی اہمیت کی حامل ہیں۔ شیکی، کا کوزا کا، تلہ قبا، شمع خیل، لنکران، اگامش قابلہ میں کئی تاریخی مساجد موجود ہیں۔

آذربائی جان کا قومی لباس شرٹ پینٹ کوٹ ہے۔ بھیڑ کی اون سے بنی ہوئی ٹوپی یہاں کا قومی ورثہ ہے جوکہ بہت خوبصورت اور گرم ہوتی ہے اور بڑی عمر کے افراد اس کو شوق سے استعمال کرتے ہیں۔ اس کو ہر سرکاری ادارے کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے جیسا کہ آرمی اور پولیس کے لیے لازمی ہے۔ سردیوں میں بلیک کلر کے شوز اور بلیک کلر کے لیدر کے کوٹ پسند کیے جاتے ہیں اور ان کا پسندیدہ کلر سردیوں میں کالا ہے جو سفید جسم پر خوبصورت بھی لگتا ہے۔

باکو شہر انٹرنیشنل شہر ہے جہاں دیگر سہولتوں کے ساتھ ساتھ انڈر گراؤنڈ ریل، میٹرو باکی کے نام سے چلتی ہے۔ اس کے دو سیکشن ہیں۔ پہلا سیکشن آزادلک پراسکیٹی میٹرو سے حازی اسلانو دتک ہے جس کے ٹوٹل 17 اسٹیشن ہیں۔ دوسرا سیکشن رام سیکر متی سے اچار شہر ہے۔ میٹرو ٹرین الیکٹرک ہے اور 150 کلومیٹر فی گھنٹے کی رفتار سے چلتی ہے۔ ہر اسٹیشن پر 10 سیکنڈ کے لیے رکتی ہے اسی 10 سیکنڈ میں عوام چڑھتے اترتے ہیں۔ رش بے پناہ ہوتا ہے اور لوگ زیادہ تر میٹرو کو ہی ترجیح دیتے ہیں جس کا کرایہ کارڈ کے ذریعے چارج کرنے سے وصول کیا جاتا ہے۔ جوکہ 15 کاپی 1 آدمی کا ہے، ٹرین کے اندر ٹی وی بھی چلتے ہیں اور ساتھ میں آنے والے اسٹیشن کی اناؤنسمنٹ بھی ہوتی ہے۔ یہ ٹرین یہاں کے عوام کے لیے تحفہ سے کم نہیں۔ زبردست سہولت ہے۔ اس طرح کی سہولتوں کی پاکستان میں اشد ضرورت ہے لیکن کیا کیا جائے ہمارے اربابِ اقتدار کو اپنے دوروں اور کاموں سے فرصت ہوگی تو عوام کو یہ سہولتیں نصیب ہوں گی۔ میٹرو ٹرین صرف باکو شہر میں چلتی ہے باقی کہیں نہیں اور یہ روس کے وقت کی تعمیر شدہ ہے۔ میٹرو اسٹیشن پر زبردست سکیورٹی کے حفاظتی انتظامات ہوتے ہیں۔ جدید کیمرے، پولیس اور میٹرو عملہ ہر دم مستعد ہوتا ہے کسی بھی ناخوشگوار واقعے سے بچنے کے لیے۔ ہر میٹرو کے اوپر بسوں کا اڈا موجود ہے۔ شہر کے اندر چلنے والی بسوں کی تعداد ہزاروں میں ہے ایک نمبر کی 30 کے قریب بسیں چلتی ہیں اور ہر بس کے مختلف روٹس ہیں اس طرح بسیں ہزاروں میں ہیں۔ یہاں پر بس کو آپریٹ صرف ڈرائیور ہی کرتا ہے وہ بس کو روکتا ہے اور چلاتا ہے سواری اتارنا اور چڑھانا اور کرایہ وصول کرنا بھی اس کی ذمے داری ہوتی ہے۔ یہاں زبردست ڈسپلن ہے اور ہر شخص کرایہ دے کر اترتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ پوری قوم کے فرد 15 سال کے بچے سے لے کر بوڑھوں تک سگریٹ پیتے ہیں مگر بس، ٹرین، میٹرو میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ سگریٹ پی لیں۔ ان جگہوں پر سگریٹ نوشی ممنوع

ممنوعہ
کمزور رشتوں کی دھول میں ممنوعہ حدوں کو پار کرنے والوں کے درمیان پھیلی ایک فکر انگیز داستان ..... محی الدین نواب کے قلم سے آخری صفحات کی سوغات

فاتح
جب نحوست کے باوجود صلاح الدین ایوبی صلیبی جنگوں کا ہیرو بنا تو بالآخر اس کے باپ کو توہم پرستی کے نظریے کے خلاف سوچنا پڑا... ڈاکٹر ساجد امجد کی عرق ریزی

کشکول
لمحہ بہ لمحہ دلوں کی دھڑکن تیز کرتی ایک سنسنی خیز داستان ..... انوار صدیقی کا سحر انگیز بیان

مسافر
کبھی قربتوں میں تشنگی، کبھی طویل مسافتوں کی تکان ..... عجیب رتوں، بے ثمر رتجگوں کا دلگداز احوال ..... ناصر ملک کے قلم کی روانی

انوکھا ملاپ
انسان کی ترجیحات، ضرورتوں اور خواہشوں کے درمیان پلنے والے فرق کو نمایاں کرتی ایک پرفکر تحریر ..... طاہر جاوید مغل کا دلربا انداز

ان کے علاوہ
حضرت یحییٰ علیہ السلام کی روداد حیات میرزا امجد بیگ کی جوہر شناسی محفل شعر و سخن اور آپ کے خط

مزید
کاشف زبیر، ناہید سلطانہ اختر، ڈاکٹر عبدالرب بھٹی تنویر ریاض اور ثمر عباس کی پرکشش کہانیاں

WWW.PAKSOCIETY.COM

تشریف لائیں

دسویں صدی عیسوی کا ایک دعوت نامہ دیکھیے ...... یہ دعوت نامہ اسماعیل بن عباد نے اپنے ایک دوست کو لکھا تھا۔ ''ہماری رفاقت میں سب احباب موجود ہیں، صرف آپ کی کمی ہے۔ گل نرگس بہ چشم وا اور گل لالہ بہ عارضِ روشن آپ کے منتظر ہیں۔ نیبو اور نارنگی کے درخت اپنے پھولوں کی خوشبو ہر طرف بکھیر رہے ہیں، پھول ہنس رہے ہیں۔ کلیاں مہک رہی ہیں۔ ضیافت کے سجے ہوئے کمرے کے دروازے آپ کے لیے کھلے ہیں اور نقیب آپ کی آمد کا اعلان کرنے کے لیے مستعدی سے ایستادہ ہے۔ آپ کی آمد پر ہم سمجھیں گے گویا ہم جنت میں پہنچ گئے۔ ہم آپ کو اپنے سچے موتیوں کے ہار میں مرکزی دانہ بنا کر پروئیں گے۔''

(احیائے اسلام ...... از۔ خدا بخش)

ہے اور اونچی آواز میں بات کرنا بھی منع ہے، معیوب تصور کیا جاتا ہے۔

میں ایک دن کسی کام سے باکو کے بڑے تجارتی مرکز صدرک سے بس میں بیٹھا تھا کہ ایک بھکارن عورت راستے سے بس میں سوار ہوئی، جیسا کہ بھکاریوں کی عادت ہوتی ہے دعائیں دینا اور اپنی مجبوریاں بیان کر کے بھیک مانگنا۔ لوگوں نے حسبِ توفیق خیرات دی۔ وہ راستے میں ایک اسٹاپ پر اتر گئی۔ اترتے ہی اس نے اپنا نیا موبائل فون نکال کر گفتگو شروع کر دی، میں حیران ہوا کہ جو کہہ رہی تھی کہ میرے پاس ایک کاپی بھی نہیں اور آٹا بھی نہیں، بچے بیمار ہیں۔ اب نئے موبائل فون پر گفتگو کر رہی تھی۔

آذربائیجانیوں میں ایک عادت اچھی ہے وہ یہ کہ آپ کو روڈ کراس کرنا ہے تو ہر گاڑی والا گاڑی روک کر آپ کو راستہ دے گا، وہ دور ہی سے پیدل گزرنے والے کو دیکھ کر اشارہ کرے گا کہ آپ گزر جائیں۔ اصل میں یہ احترامِ انسانیت ہے جو وہاں کے معاشرے میں رائج ہے۔ وہاں اندرونِ شہر چلنے والی بسوں کے دروازے کھولنے اور بند کرنے کا سسٹم ڈرائیور کے پاس ہوتا ہے۔ ایک دفعہ میں کسی کام سے نظامی جا رہا تھا کہ آئینو سلطانہ کے نزدیک ایک سواری نے اترنا چاہا بغیر کرایہ دیے تو ڈرائیور نے دروازہ نہ کھولا۔ معلوم ہوا کہ اس کا روز کا معمول تھا کہ وہ دروازہ کھلوا کر بغیر کرایہ دیے رفو چکر ہو جاتا تھا اور ڈرائیور شیشے سے اس کی یہ حرکت دیکھتا تھا آخر اس نے کرایہ دیا تو دروازہ کھلا اور وہ اترا مگر اس طرح کے بہت کم واقعات ہوتے ہیں۔

آذربائیجان کا اسٹینڈرڈ ٹائم پاکستان سے ایک گھنٹا پیچھے ہے۔ یعنی یہاں دن کے بارہ ہوں تو وہاں دن کے گیارہ ہوں گے۔ لیکن گرمیوں میں ایک گھنٹا ٹائم کے آگے ہونے سے پاکستان کے برابر ہو جاتا ہے۔ آذربائیجان میں 27 مارچ کو موسم گرما کا وقت ایک گھنٹا آگے کر دیا جاتا ہے اور یکم نومبر کو ایک گھنٹا پیچھے کر دیتے ہیں اور تمام لوگ اس کی پابندی کرتے ہیں۔

آذربائیجان کا قومی کھیل فٹ بال ہے۔ کبڈی اور جوڈو بھی یہاں بڑے پیمانے پر کھیلا جاتا ہے اور زبردست مقابلے ہوتے ہیں۔ کرکٹ سے یہ لوگ ناواقف ہیں نہ کھیلتے ہیں اور نہ دیکھتے ہیں۔ البتہ شطرنج یہاں بہت کھیلا جاتا ہے اور بڑی تعداد میں لوگ چائے کے ساتھ شطرنج کھیلنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔

روس کے اقتدار کے زمانے میں یہاں انڈسٹری کافی تعداد میں تھی مگر روس جاتے وقت 80 فی صد انڈسٹری تباہ کر گیا اس لیے انڈسٹری بہت کم ہے۔ شادی بیاہ میں ناچ گانے کو اہمیت حاصل ہے۔ مرد و خواتین کو ناچ گانے کی بڑی مہارت ہے اور دونوں ناچتے ہیں۔ یہاں پر سونے کے زیورات کم پہنے جاتے ہیں۔ چاندی زیادہ استعمال کی جاتی ہے۔ عورتوں کے علاوہ مرد بھی چاندی کی انگوٹھی، چین، کول باغ، یعنی بازو میں زنجیر باندھنے کے عادی ہیں۔ پرفیوم کا استعمال پوری قوم بہت زیادہ کرتی ہے اور گھروں کی صفائی پر خاص توجہ دیتی ہے۔

آذربائیجان میں ہندوستانی فلمیں اور گانے ڈبنگ کر کے بہت شوق سے دیکھے جاتے ہیں۔ روسی اور بالی وڈ کی فلمیں بھی دیکھتے ہیں۔ وہاں پر فلم انڈسٹری اور ڈراما نہ ہونے کے برابر ہیں۔ لڑکیاں شاہ رخ خان کے پرستار ہیں۔ مزید یہ کہ آذربائیجان کے دارالحکومت باکو میں سمندر کے درمیان میں دنیا کی سب سے بلند عمارت (204 منزلہ) تیزی سے تعمیر ہو رہی ہے جو اس وقت یونائیٹڈ عرب امارات دبئی میں قائم 170 منزلہ برج خلیفہ کو مات دے جائے گی۔

جہدِ زندگی

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

زندگی کا اصل جہد مسلسل میں پنہا ہے۔ وہ بھی یہی ثابت کر رہی تھی۔ جنگل کے دشوار ماحول میں بھی اس نے آسانیاں تلاش کر لی تھی۔

ایک دوشیزہ کی دلچسپ روداد

مجھے سخت اذیت اس وقت محسوس ہوئی جب معلوم ہوا کہ ہم اب مزید افریقا میں نہیں رہ سکتے۔ ہمیں اسے چھوڑ کر جانا ہوگا۔ اپنے وطن کو چھوڑتے ہوئے انسان کو ایسی ہی تکلیف ہوتی ہے جیسے کسی گہری جڑوں والے درخت کو زمین سے اکھاڑ دیا جائے۔ افریقا کے دیوتاؤں نے ہمیں پنجارو کا یہ فارم چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ مسلسل گرمی اور ریت کی یلغار نے قحط کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی اور بارش برسنا بھول گئی تھی۔ نتیجے میں کسان جو بیج لگاتے، وہ نمو پائے بغیر رہ جاتے۔ چارے کی کمی سے جانور لاغر ہونے لگے اور گرانڈل کا پہیہ رک گیا۔ ایک روز پاپا نے فیصلہ کن لہجے میں مجھ سے کہا۔

''بیرل، اب گزارہ ممکن نہیں رہا۔ ہمیں یہاں سے کہیں اور جانا ہوگا۔''

''مگر کہاں پاپا!''

''شاید پیرو...... وہاں میرے کچھ جاننے والے ہیں۔ انہوں نے مجھے وہاں آباد ہونے کی پیشکش کی ہے۔ وہاں گھوڑوں کی تربیت کا کاروبار بہت نفع بخش ہے۔ یہاں تو ان کی خوراک ہی پوری نہیں پڑتی۔

پھر پاپا نے فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے فارم کے لیے گاہک تلاش کرنا شروع کر دیے اور اپنے بچے کھچے جانور بھی فروخت کرنے لگے۔ پاپا چاہتے تھے کہ میں بھی ان کے ساتھ

WWW.PAKSOCIETY.COM

چلوں مگر فیصلہ میرا ہوتا۔ اب میں بچی نہیں بلکہ سترہ سال اور کچھ مہینے کی ایک نوجوان لڑکی تھی۔ میرا دل نہیں مانا کہ میں افریقا چھوڑ کر ایک اجنبی سرزمین کی طرف چلی جاؤں۔ پاپا آرام سے جاسکتے تھے۔ وہ افریقا کے باشندے نہیں تھے لیکن میں یہیں پیدا ہوئی تھی اور میری جڑیں بھی یہیں تھیں۔

''پاپا! میں یہیں رہوں گی۔'' میں نے انہیں اپنا فیصلہ سنایا۔

''خوب!'' وہ بولے ''تم کروگی کیا.....؟''

پاپا نے مجھے بچپن سے گھوڑوں کو سنبھالنے، انہیں تربیت دینے اور انہیں خوراک دینا سکھایا تھا۔ میں اب اس کام کو بہ طور پروفیشنل کرنا چاہتی تھی۔

''خوب!'' میرا فیصلہ سن کر پاپا نے کہا ''تم یہ کام کرسکتی ہو لیکن ابھی تمہیں بہت کچھ سیکھنا ہوگا۔ کیا تم اس مقصد کے لیے انگلش جوکی کلب کے رولز کے تحت لائسنس حاصل کرسکو گی؟''

''میں حاصل کرلوں گی۔'' میں نے پورے اعتماد سے کہا۔

''تب پھر تم سولو چلی جاؤ۔ وہاں گھوڑے پالنے کے لیے بہترین انتظامات ہیں۔ گھوڑے ہیں، اصطبل ہیں۔ ان کے ڈاکٹر ہیں اور سب سے بڑھ کر وہ لوگ ہیں جو تمہیں تربیت کے لیے گھوڑے دیں گے۔ شروع میں صرف چند لوگ ہی گھوڑے دیں گے، اس کے بعد یہ تمہاری صلاحیت اور محنت پر ہے کہ تم ان میں کتنا اضافہ کرسکتی ہو۔''

☆☆☆

پاپا کی پیش گوئی کے عین مطابق مجھے ابتدا میں صرف پانچ گھوڑے ملے، جو کچھ عرصے بعد بڑھ کر آٹھ ہوگئے۔ مجھے ان کی تربیت کے بدلے میں صرف رہنے کی جگہ اور تین وقت کا کھانا مل رہا تھا مگر افسوس کی بات یہ تھی کہ سوائے چند ایک کے باقی تمام گھوڑے بوڑھے اور ڈل تھے اور ان کی تربیت صرف روپیا اور وقت برباد کرنے والی بات تھی۔ کچھ عرصے بعد مجھے ٹریننگ لائسنس مل گیا اور جوکی کلب کے دروازے میرے لیے کھل گئے۔ ان ہی دنوں مجھے ''وائز چائلڈ'' نامی ایک گھوڑی دی گئی۔ اتفاق سے یہ گھوڑی ہمارے فارم میں پیدا ہوئی تھی اور یہ نجیب الطرفین گھوڑی تھی۔ یعنی اس کے ماں اور باپ دونوں ریس چیمپئن رہ چکے تھے۔

نیروبی کے ریس کورس میں ''عقل مند بچی'' کا مالک ایرک گوچ میرے ساتھ موجود تھا۔ آج اس کی گھوڑی پہلی بار کسی ریس میں حصہ لے رہی تھی۔ میں اس کی کامیابی پر خاصی حد تک پُریقین تھی مگر ایرک نے سوال کرکر کے میرا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ وہ ہر منٹ بعد پوچھتا۔

''ہمارے جیتنے کے چانسز کتنے ہیں؟'' میں جواب دیتے دیتے تنگ آچکی تھی۔ جس وقت اس نے وائز چائلڈ کو میرے حوالے کیا تھا تو میں کلب کی واحد لڑکی اور سب سے کم عمر رکن تھی۔ ایرک صرف اس لیے مجھے کام دینے پر مجبور ہوا تھا کہ کسی اور ٹرینر نے گھوڑی کو تربیت دینے سے انکار کردیا تھا۔ ایرک نروس رہنے والا مختصر جسامت کا شخص تھا۔ اسے جانوروں اور خاص طور سے گھوڑوں سے عشق تھا۔ اپنی طرف سے تو وہ ناکامی کا یقین کرچکا تھا اور یہ بات اس کے سوالوں سے ظاہر بھی ہوگئی تھی۔ میں نے اسے تسلی دی کہ ''اس ریس میں ہمارا کوئی مقابل نہیں ہے۔ ہماری جیت یقینی ہے۔''

یہ کہہ کر میں نے دل میں ایسا ہی ہونے کی دعا مانگی۔

ریس میں کئی اچھے گھوڑے شریک تھے، ان میں اس ریس کا ریکارڈ ہولڈر لینگر بھی تھا مگر گزشتہ کچھ عرصے سے اس کی کارکردگی خاصی خراب تھی اور وہ اب تواتر سے ریس ہار رہا تھا اور لگ رہا تھا کہ جلد ہی وہ ریس کورس سے بے دخل ہوجائے گا۔ دوسرا قابلِ ذکر گھوڑا راک تھا اور درحقیقت وہی وائز چائلڈ کا سب سے بڑا حریف تھا۔ اس کا سیاہ اور فولاد جیسا جسم خوب چمک رہا تھا۔ اس نے پہلے حریفانہ اور پھر حریصانہ نظروں سے وائز چائلڈ کو دیکھا جو بے نیازی سے میری دی ہوئی چاکلیٹ چبا رہی تھی۔ اچھی بات یہ تھی کہ وہ پوری طرح پُرسکون تھی اور ریس کورس کا ماحول اور پہلی بار ریس میں حصہ لینے کا اس کے اعصاب پر کوئی اثر نہیں دکھائی دے رہا تھا بلکہ وہ ریس میں حصہ لینے کے لیے کچھ بے تاب ہی دکھائی دے رہی تھی۔

بارہ ہفتے پہلے جب ایرک اسے میرے پاس لے کر آیا اور فرمائش کی کہ میں اس کی ٹانگوں کو مضبوط بنادوں تو میرا موڈ آف ہوگیا۔

''میرے پاس ایسا کوئی طریقہ نہیں ہے جس سے صرف تین مہینے میں یہ ریس کے لیے تیار ہوجائے.....'' میں نے تلخ لہجے میں کہا ''بہرحال..... میں اپنی سی پوری کوشش کروں گی۔''

ایرک جو مجھے دیکھ کر ہی بدحواس ہوگیا تھا۔ میرا لہجہ سن کر وہ بے حد نروس ہوگیا ''اوکے..... اوکے! کوئی تمہیں مجبور نہیں کررہا ہے۔''

پہلے راک بھی تربیت کے لیے میرے پاس آیا تھا مگر جب اس کے مالک نے صرف اٹھارہ سالہ لڑکی کو دیکھا تو الٹے قدموں اپنے گھوڑے کو واپس لے گیا۔ وہ اس کی

ابتدائی سست روی سے پریشان تھا اگر اس کی یہ خامی دور کردی جاتی تو وہ ریس آسانی سے جیت جاتا۔ کئی ٹرینرز نے کوشش کی مگر کوئی اسے ریس کی ابتدا سے تیز دوڑنے پر آمادہ نہ کرسکا۔ اس کے مقابلے میں وائز چائلڈ نوآموز مگر برق رفتار تھی۔ اصل مسئلہ اس کی پچھلی ٹانگوں کی کمزوری تھی۔ آخری چکروں میں وہ رفتار برقرار نہیں رکھ پاتی تھی اور میں نے اسی خامی کو دور کرنے کے لیے اپنا تمام تر تجربہ اس پر لگادیا تھا۔ میں کسی حد تک مطمئن تھی مگر ایرک بہ دستور مشکوک تھا۔ دوسری طرف وہ ہر حال میں ریس بھی جیتنا چاہتا تھا جبکہ میرے خیال میں دوسری تیسری پوزیشن بھی غنیمت تھی۔ ایک گھوڑی کو اس کے سوا اور کیا چاہیے جبکہ وہ پہلی بار ریس میں دوڑ رہی تھی۔

''مجھے خوف ہے۔'' ایرک نے اعتراف کرنے کے انداز میں کہا ''راک یہ ریس جیتنے کے لیے فیورٹ ہے اور کوئی اسے نہیں روک سکتا' لعنت ہو۔ کیا تم وائز چائلڈ کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں؟''

بھلا کوئی مجھ سے بہتر وائز چائلڈ کو جان سکتا تھا؟ وہ میرے ہاتھوں پیدا ہوئی اور میں نے ہی اس کی پرورش کی تھی۔ اس کی رگوں میں گزشتہ بیس نسل سے فاتح گھوڑوں کا خون دوڑ رہا تھا اور اگر اس میں کمزور ٹانگوں کا پیدائشی نقص نہ ہوتا تو وہ بلاشبہ چیمپئن تھی۔ اس کی ٹانگوں کے ٹنڈن سخت تھے اور ان میں مطلوبہ نرمی نہیں تھی۔ میں نے سخت ترین ورزشیں کراکے اس خامی کو کسی حد تک دور کردیا تھا۔ اس کے خوبصورت جسم میں توانائی کا ایک خزانہ تھا اور سب سے بڑھ کر اس کے دل میں مقابلے کی آگ تھی۔ پچھلے بارہ ہفتوں میں، میں اسے کہیں بہتر طور پر جان گئی تھی اور مجھے یقین تھا کہ وہ جیتنے کی پوری کوشش کرے گی۔ ایرک کے تذبذب کو دیکھ کر میں نے معاوضے میں اس سے اس کی انعامی رقم کا نصف مانگا تو وہ فوراً تیار ہوگیا کیونکہ اس کے لیے تو نصف بھی بہت تھا مگر اسے جیتنے کا یقین ہی نہیں تھا اور اب وہ راک کو دیکھ دیکھ کر دہل رہا تھا اور شاید دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کررہا تھا کہ میں نے اس سے رقم کے بجائے انعامی رقم میں حصہ مانگ لیا تھا۔ اثنائے راہ گھوڑے اصطبل سے لائے جانے لگے۔

میں نے جوکی کو ہدایات دیں۔

''دو تین راؤنڈ تک اسے تیز دوڑانے کی کوشش نہ کرنا۔ جب تک یہ وارم اپ نہ ہوجائے۔ راؤنڈ کے دوران میں اس کی سانس پر توجہ دینا اور اگر سست پڑنے لگے تو ایڑ استعمال کرنا۔ یہ تیز ہوجائے گی لیکن اگر یہ پھر بھی تیز نہ ہو تو یہ تقدیر کی بات ہوگی۔ اس میں تمہاری کوئی غلطی نہیں ہوگی۔''

جوکی گھوڑوں کو وارم اپ کرانے کے لیے انہیں ذرا اِدھر اُدھر کررہے تھے۔ ایرک نے میرا شانہ چھو کر کہا۔

''اگر وائز چائلڈ جیت گئی تو میں اسے ڈھیروں چاکلیٹ کھلاؤں گا۔'' اس کا انداز منت مانگنے والا تھا۔

''سنو بیرل! اگر یہ ہار گئی تو میرا سب کچھ ختم ہوجائے گا۔ میں اپنے قرضے ادا نہیں کرسکوں گا۔ اپنا گروی رکھا ہوا مکان بھی نہیں چھڑا سکوں گا لیکن اگر یہ جیت گئی تو ہم چھوٹے موٹے دولت مند بن جائیں گے لیکن..... یہ راک.....'' اس کا لہجہ رو دینے والا تھا ''خدا اسے غارت کرے۔''

ایرک اور میں گرانڈ اسٹینڈ کے ایک باکس میں جا بیٹھے۔ ایک گھوڑے کے مالک اور ٹرینر کی حیثیت سے ہمیں یہ حق حاصل تھا۔ گھوڑے کٹہرے میں آچکے تھے۔ ریس شروع ہونے والی تھی۔ لوگوں کا ہجوم ہمہ تن منتظر تھا۔ ہر طرف ایک سکوت سا طاری تھا۔ میں جو اب تک پُرسکون تھی، نروس سی ہونے لگی۔ ایرک نے میری کیفیت تاڑ لی۔

''پُرسکون رہو بیرل! تم تو لرز رہی ہو۔''

میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور جب میں نے دوبارہ گراؤنڈ کی طرف دیکھا تو گھوڑے دوڑ چکے تھے۔ یکدم جیسے سارا ماحول تبدیل ہوکر رہ گیا۔ لوگوں کا شور وغل اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے قیامت کا ہنگامہ ہونے لگا۔ گھوڑے طوفانی رفتار سے ریس کورس کی طرف بڑھ رہے تھے اور ان کی ٹاپوں سے اتنی گرد اُڑ رہی تھی کہ فی الوقت یہ دیکھنا ناممکن تھا کہ کون سا گھوڑا کس پوزیشن پر ہے۔ کچھ دیر بعد گرد کم ہوئی، راک تیسرے نمبر پر تھا۔ اس سے آگے ایک سُرمئی گھوڑا تھا مگر وائز چائلڈ..... نظر نہیں آرہی تھی۔

معاً ایرک چیخا ''دیکھو..... وائز پہلے نمبر پر ہے۔''

گھوڑے چکر کاٹ کر میدان کے دوسری سمت جارہے تھے۔ جیسے ہی وہ نظروں کے متوازی ہوئے، میں نے دوربین لگا کر دیکھا۔ واقعی وہ پہلے نمبر پر تھی۔ اس کے بعد والا سُرمئی گھوڑا بلیک اسٹیلین اس سے کم از کم چار گز پیچھے تھا۔ وہ ہمواری اور ردھم کے ساتھ دوڑ رہی تھی۔ ایرک جو امید و ناامیدی کے مابین ڈول رہا تھا معاً کھڑے ہوکر دہاڑنے لگا۔

''کم آن وائز، کم آن بے بی، کم آن! تیز..... اور..... تیز!''

''اتنا چیخو مت، احمق!'' میں زیرلب بولی۔ شور اتنا زیادہ تھا کہ اس کی آواز چار گز دور کھڑا شخص نہیں سن سکتا تھا پھر چار سو گز دور دوڑتی ہوئی وائز کیسے سن لیتی۔ اس کا جوکی بڑی

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوشیاری سے اسے تھکائے بغیر اس سبقت کو برقرار رکھے ہوئے تھا۔ اس سے پیچھے راک بڑی جاں فشانی سے دوڑ رہا تھا مگر وائز کی بات ہی اور تھی۔ اس کی رفتاروں میں ایسی بے نیازی تھی جیسے اس کی پشت پر کوئی وزن ہی نہ ہو۔ اس کا نکلا ہوا سرا بھی ساکت تھا۔ صرف پیر اور سر کے بال متحرک تھے۔ پہلے چکر میں وہ ہوا کے نرم جھونکے کی طرح ہمارے سامنے سے گزر گئی۔ میں نے فاتحانہ نظروں سے اپنے ساتھیوں کو دیکھا جو راک کے جیتنے کی پیش گوئی کر چکے تھے۔

راک ایک بہترین نسل کا گھوڑا تھا۔ ایسے گھوڑوں کے پٹھے ذرا دیر سے گرم ہوتے ہیں اور یہ ابتدا کی نسبت اختتام پر زیادہ بہتر کارکردگی دکھاتے ہیں۔ اس کا جوکی بھی پرانا گھاگ تھا اور وہ گھوڑوں کی رگ رگ سے واقف تھا۔ بلیک اسٹیلین خاصا پیچھے رہ گیا تھا اور اس کی جگہ فلی نامی گھوڑا دوسرے نمبر پر آ گیا تھا۔ راک نے تیسری پوزیشن برقرار رکھی تھی اور وہ فلی سے تین گز دور تھا۔ جبکہ وائز اور اس کے درمیان فاصلہ سات گز سے کم نہیں تھا۔ معاً راک نے سر جھکایا اور فلی کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کا جوکی فتح کے لیے اپنے بہترین گُر آزما رہا تھا۔ اب صرف دو چکر باقی تھے اور وائز چائلڈ..... کے لیے اہم ترین مرحلہ شروع ہو گیا تھا۔ اگرچہ وہ بہ دستور سبک رفتاری سے لمبے لمبے قدم اٹھاتی جا رہی تھی مگر میں جانتی تھی کہ کچھ دیر بعد اس کی توانائی جواب دینے لگے گی۔

اچانک ریس کورس راک کے نعروں سے گونجنے لگا۔

''کم آن راک..... تیز..... اور تیز..... راک دوڑو..... دوڑو..... راک!''

بھانت بھانت کی آوازیں گونجنے لگیں۔ راک اپنی بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس کا اور فلی کا فاصلہ اب بہت کم رہ گیا تھا پھر اور کم اور پھر دونوں گھوڑے برابر دوڑنے لگے۔ پھر راک آگے نکل گیا اور فلی پیچھے رہ گیا۔ یوں وائز چائلڈ اور اس کے درمیان کوئی گھوڑا باقی نہیں رہا تھا۔ ہر طرف سے راک..... راک کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں جنہوں نے ایک نغمے کی شکل اختیار کر لی تھی۔ میری دوربین وائز پر مرکوز تھی۔ کوئی اس کی عالی ہمتی کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ کوئی اس کی ٹانگوں کی تھکن محسوس نہیں کر رہا تھا، کوئی اس کے لیے صدا بلند نہیں کر رہا تھا۔

اتنے بڑے ریس کورس میں کوئی اس کا حامی نہ تھا۔ وہ اب طاقت سے نہیں دل سے دوڑ رہی تھی۔ اسے اپنی ذمے داری کا احساس تھا۔ اسے ہمارے خوابوں کا احساس تھا۔ اس کی سانسیں ناہموار ہو رہی تھیں مگر وہ دوڑ رہی تھی۔ میرا دل روا تھا، خدا کے لیے اسے دوڑنے دو۔ اسے جیتنے دو۔'' میں نے خاموش اپیل کی۔

''ایرک!'' میں نے چلا کر کہا اور مڑ کر دیکھا تو وہ غائب تھا۔ نہ جانے کب وہ لوگوں کو پھلانگتا ہوا نیچے باڑھ کے قریب جا کھڑا ہوا تھا۔ میں نے اٹھنا چاہا مگر جیسے میری جان نکل چکی تھی۔ میں بے بسی سے کرسی پر بیٹھی ریس دیکھتی رہ گئی۔ راک اور وائز کے درمیان فاصلہ کم ہو رہا تھا۔ یہ آخری چکر تھا۔ راک جس رفتار سے بڑھ رہا تھا، لگتا تھا کہ جلد ہی وائز کو پیچھے چھوڑ جائے گا۔ میں نے خود کو یاد دلایا کہ محض اس ایک ریس سے زندگی اور موت کا فیصلہ نہیں، کل بھی ریس ہو گی اور آنے والے دنوں میں بھی۔ وائز آج نہ جیت سکی تو کل جیت جائے گی ورنہ آنے والے دنوں میں۔ اتنا بھی جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر ایک عجیب سا غبار میرے ذہن پر مسلط ہو رہا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں کسی سنیما میں بیٹھی یہ سارا منظر دیکھ رہی ہوں۔ رگ وپے میں عجیب سی تھکن سرایت کرتی جا رہی تھی جیسے وائز چائلڈ کی جگہ میں خود ریس میں دوڑ رہی ہوں۔

راک اور قریب آ گیا تھا۔ وائز کی ٹانگیں جیسے بوجھل ہو گئی تھیں۔ وہ تھکی جا رہی تھی اور اس کے قدم ہر گزرتے لمحے کے ساتھ سست پڑتے جا رہے تھے۔ اس کی بھری ہوئی سانسیں دور سے صاف نظر آ رہی تھیں۔ جیت اس سے چند قدم کے فاصلے پر تھی مگر راک بھی قریب تھا۔ اب تماشائیوں میں سے کچھ آوازیں وائز کے لیے بھی بلند ہو رہی تھیں۔ معاً میں نے اسے تیز ہوتے دیکھا۔ وہ آخری کوشش کر رہی تھی ''ونگ لائن'' قریب آ رہی تھی۔ یہ لمحہ اتنا جذباتی تھا کہ مجھ سے دیکھا نہیں گیا۔ میں منہ چھپا کر بیٹھ گئی۔ معاً آخری مرتبہ شور بلند ہوا اور پھر خاموشی چھا گئی۔ جسے تالیوں کی بے تحاشا گونج نے توڑ کر رکھ دیا۔ بدحواس اور مسرت سے بے قابو ہوتا ایرک مجھ سے آن لپٹا۔ اس نے چلا کر کہا۔

''بیرل! ہم جیت گئے۔ ہم امیر ہو گئے۔ اوہ مائی بے بی..... مائی بے بی.....!'' وہ نیچے کی طرف لپکا۔ میں اس کے پیچھے تھی۔ ہم جاتے ہی وائز سے لپٹ گئے۔ ہم رو رہے تھے اور اسے پیار کر رہے تھے۔ اس نے ناقابلِ یقین کارنامہ انجام دے کر میری لاج رکھ لی تھی۔ اس نے چیمپئن لینگر کا ریکارڈ بھی توڑ دیا تھا۔ تماشائی اس کے اردگرد جمع تھے اور انہوں نے جوکی اور اس پر نوٹوں کی بارش کر دی تھی۔ اس شام جوکی کلب میں ہم نے ایک زبردست جشن منایا جس میں سارے جوکی موجود تھے۔ انہوں نے فراخ دلی سے مجھے

مبارک باد دی۔ ہر شخص وائز کی تعریف کر رہا تھا اور میں اس مقولے کی سچائی پر غور کر رہی تھی کہ کامیابی سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہوتی۔

☆☆☆

میں مولو جانے والی سڑک پر اس سفید فام شخص کو دیکھ کر رک گئی جو حیران و پریشان سا ایک خاموش گاڑی کے قریب کھڑا تھا۔ وہ بار بار کار کا دھرا کھما کر اس کے بند انجن کو چلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جوکس سے مس سے نہیں ہو رہا تھا۔ وہ پکی عمر کا دلکش شخص تھا۔ میں اس کی مدد کے لیے رک گئی اور مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ کب ہماری بات چیت بے تکلفی کی حد میں داخل ہو گئی۔ وہ مجھے بیرل اور میں اسے ٹام کہہ کر پکارنے لگی۔ کار کی مرمت سے فارغ ہو کر میں نے اسے گھر آنے کی دعوت دی جو اس نے قبول کر لی۔ چائے پر پاپا کی اس سے ملاقات ہوئی، وہ اس سے متاثر ہوئے اور بار بار اس کا ہاتھ تھام لیتے۔

ٹام بلیک نے بتایا۔ اس کا ایک چھوٹا سا فارم تھا اور وہ اسے بیچ کر حاصل شدہ رقم سے ایک طیارہ خریدنا چاہتا تھا۔ وہ جنگِ عظیم اول میں حصہ لے چکا تھا۔ اسے طیاروں سے عشق تھا اور ہواؤں میں اڑنا اس کا نصب العین تھا۔

ٹام نے کچھ ہی ملاقاتوں میں مجھے طیاروں کے بارے میں اتنا زیادہ بتا دیا کہ میں طیارہ اڑائے بغیر ہی خود کو پائلٹ محسوس کرنے لگی۔ چوتھی ملاقات میں ٹام نے مجھے آسمانوں کی سیر کرائی۔ یہ اس کا موتھ طیارہ تھا۔ یہ تجربہ اتنا تحیر خیز تھا کہ یک لخت مجھے زندگی پرواز کے بغیر ادھوری لگنے لگی۔ میں نے ٹام سے التجا کی کہ وہ مجھے بھی جہاز اڑانا سکھائے تو وہ فوراً تیار ہو گیا۔ ان دنوں میں مشہور داستان الف لیلیٰ پڑھ رہی تھی جس میں بغداد کے رنگین شب و روز بیان کیے گئے تھے مگر طیارہ اڑانا مجھے کہیں زیادہ دلچسپ لگا۔ ہر صبح سورج نکلنے سے پہلے ہم نیروبی کے ایسروڈروم ائرفیلڈ سے اپنی پرواز کا آغاز کرتے۔ پہاڑوں اور جنگلوں پر پرواز کرتے اور پھر واپس آ جاتے۔ مکینکر اور مشینری سے کوئی دلچسپی نہ ہونے کے باوجود میں نے صرف تین مہینے میں جہاز اڑانا سیکھ لیا۔ ٹام میری صلاحیت سے مطمئن تھا، اس نے مجھے صرف پرواز نہیں سکھائی بلکہ طیارے اور پرواز کے بہت سارے اصول بھی سکھائے۔

ان ہی دنوں ٹام مشرقی افریقا میں اپنی نوعیت کی پہلی نجی فضائی کمپنی ولسن ائرویز سے منسلک ہو گیا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ افریقا کے اندرونی علاقوں تک پہنچنے کے لیے نئے راستے

کھجلی کی دوا ایڈز پر قابو پانے میں معاون

امریکی محققین کی رپورٹ کے مطابق ایک سستی دوا جسے کافی عرصے سے کھجلی کے علاج کے لیے استعمال کیا جا رہا تھا، اب ایڈز کے وائرس کو قابو کرنے میں بھی مدد دے گی۔ انہوں نے پتا لگایا ہے کہ ایسیکلور (Acyclovir) ایچ آئی وی کے خلاف کام کرے گی لیکن صرف ان خلیوں پر کام کرے گی جو کھجلی سے متاثرہ ہوں گے۔ یہ تحقیق سائنسی رسالے ''سیل ہوسٹ اینڈ مائیکروب'' میں شائع ہوئی ہے اور اس تحقیق میں یہ بھی بتایا ہے کہ ایسیکلور لینے والے لوگوں میں ایچ آئی وی کی سطح کم ہوتی ہے۔ بہرحال دوہری تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ ایسیکلور لینے سے انفیکشن کے ساتھ ساتھ ایڈز کا وائرس ختم نہیں ہوتا۔ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف چائلڈ ہیلتھ اینڈ ہیومن ڈیولپمنٹ کے ڈاکٹر لیونڈ مارگولیس جو اس تحقیق کے سربراہ ہیں کا کہنا تھا کہ کھجلی کا وائرس خود سے اس دوا کو تبدیل کرتا ہے جو ایچ آئی وی کے خلاف کام کر سکتا ہے۔ اگر آپ کھجلی کی سطح دبائیں گے تو ایچ آئی وی کی سطح بھی کم ہو گی۔ وہ اس بات کی امید کر رہے ہیں کہ ان کی ٹیم ایسیکلور کو ایڈز کے خلاف بہتر طور پر استعمال کرے گی اور شاید ایک نئی دوا بنائے جیسا کہ ''مائیکرو بائے سائڈ'' جو اس بیماری کو ختم کر سکے۔ ڈاکٹر ہیونے الیگزینڈر نے کہا کہ اس تحقیق نے ایڈز کے خلاف تحقیق کے نئے راستے کھولے ہیں۔ ڈاکٹر مارگولیس نے کہا کہ ایسیکلور وہ پہلی دوا ہے جس کو جانوروں یا پودوں سے لیے گئے اجزا سے نہیں بنایا گیا ہے۔ یہ مکمل طور پر ایک محفوظ دوا ہے اور یہ تب تک کام نہیں کرتی ہے جب تک اس کا کھجلی کے وائرس سے ٹکراؤ نہ ہو۔''

اقتباس: سائنسی خبرنامہ، از رانا محمد شاہد
مرسلہ سلمیٰ افتخار لاہور

WWW.PAKSOCIETY.COM

تلاش کررہا تھا۔

طیارہ لے کر کسی اجنبی جگہ جانا پُرخطر کام ہے لیکن ٹام جوش وخروش سے اس میں لگا تھا۔ اس دوران میں اگر اسے فوری لینڈنگ کرنا پڑتی تو اسے پہلے کوئی جگہ تلاش کرنی پڑتی۔ اکثر وہ کئی کئی ہزار میل تک پرواز کرتا رہتا، اکثر ایسا ہوتا کہ اسے واپسی میں دیر ہوجاتی اور رات آجاتی یا پھر طیارہ طوفان میں گھر جاتا۔ اس کے پاس ریڈیو یا رہنمائی کے دوسرے آلات بھی نہیں تھے۔ وسطی افریقا میں نہ تو بجلی تھی، نہ سڑکیں اور نہ ریل کی پٹریاں۔ وہاں زمینی نشانیاں یکساں تھیں اور وہاں جانے والے پائلٹ محض کمپاس پر بھروسا کرتے تھے۔ یہ ٹام کی ہمت تھی جو تنِ تنہا طیارہ لے کر وہاں جاتا تھا اور پھر واپس بھی آجاتا۔

''کسی دن تمہارا فیول ختم ہوجائے گا اور بووانا کے آدم خور تمہیں بھون کر کھا جائیں گے۔'' میں اس سے کہتی۔

جواب میں وہ قہقہہ لگاتا ''اگر میں خود بھوکا نہ ہوا، کبھی کبھی تو اتنی دیر لگ جاتی ہے کہ جب میں واپس آتا ہوں تو بھوک سے قریب المرگ ہوتا ہوں۔''

اٹھارویں مہینے میں مجھے بی کلاس پائلٹ لائسنس مل گیا۔ یہ برٹش لائسنس تھا۔ یعنی اب میں اکیلے پرواز کرسکتی تھی۔ اس وقت میرے ہزار گھنٹے مکمل ہوچکے تھے۔ میں نے اپنی جمع پونجی سے ایک ایوان طیارہ خرید لیا اور اس پر اتنی مشق کی کہ چند مہینوں بعد میں تین ہزار گھنٹے کی پرواز مکمل کرچکی تھی۔ خاتون ہونے کی حیثیت سے یہ میرے لیے ایک اعزاز کی بات تھی۔ جلد ہی مجھے ایک بہتر موقع مل گیا۔

ایسٹ افریقی ائرویز نے مجھے اپنی ڈاک لانے لے جانے کی پیشکش کی جو میں نے قبول کرلی پھر ساتھ ہی میں نے مسافر بھی لے جانے شروع کردیے۔ ان دنوں یہ بہت نفع بخش دھندا تھا۔ میں نے کوشش کرکے آٹھ سیٹوں والا بڑا ایو پرڈ موتھ طیارہ خرید لیا۔ میں مسافروں سے فی میل ایک شیلنگ وصول کرتی تھی اور افریقا میں میلوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ جلد ہی ان دو طیاروں سے میری آمدنی ساٹھ پاؤنڈز سے بھی تجاوز کرگئی جو بے حد معقول تھی۔

ساتھ ہی میں نے ایک اور کام شروع کردیا اور یہ تھا ہاتھیوں کا شکار کرانا۔ میں یورپ اور امریکا سے آنے والے شکاری حضرات کو افریقا کی اندرونی سفاریوں تک لے جاتی اور پھر ان کے شکار کے لیے ہاتھی تلاش کرتی، یوں میں نے بے حساب کمایا۔ ٹام کو یہ چیز سخت ناپسند تھی، اس نے کئی بار مجھے اس معاملے سے دور ہٹنے کے لیے کہا۔ بہرحال یہ ایک خطرناک کام تھا۔ وہ افریقا کے اندرونی خطرات سے مجھ سے کہیں زیادہ واقف تھا۔ خاص طور سے وہاں پر اٹھنے والے اچانک طوفانوں اور خوفناک مکھی سی سی فلائی کے بارے میں جانتا تھا۔ اس مکھی کے کاٹنے سے سونے کی بیماری ہوجاتی ہے' وہاں کے مچھر زرد بخار کی بیماری پیدا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ وہاں قاتل گھاس کے میدان بھی تھے جن میں پھنسنے والوں کو پھر موت ہی آکر رہائی دلاتی تھی۔ جبکہ جنگلیوں اور درندوں کا خطرہ اس کے علاوہ تھا۔ ٹام مجھے ننھی بچی سمجھ کر اکثر نصیحتیں کرتا رہتا تھا جن پر کبھی میں عمل کرتی اور کبھی نظرانداز کرجاتی تھی۔ اگرچہ مجھے خود بھی احساس تھا کہ میں خطرناک کام کررہی تھی مگر میں اپنی مہم جو طبیعت سے مجبور تھی۔

افریقا حادثوں اور خطروں کا گھر ہے اور یہاں زندہ رہنے کے لیے جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ نہیں معلوم کب کہیں آفت اچانک ہی آن پڑے اور افریقا میں آفتوں کی کیا کمی ہے۔ یہاں کا موسم، یہاں کے جنگل، یہاں کے جانور۔ حتیٰ کہ کیڑے مکوڑے بھی کچھ کم خوفناک نہیں ہیں۔ ایک بار ہمارے پنجارو کے فارم پر گوشت خوری آنو چیونٹیوں نے حملہ کیا اور چند گھنٹوں کے اندر ایک تنومند گھوڑے کو چٹ کرکے محض ڈھانچا چھوڑ دیا۔ آخرکار میں نے ٹام کی نصیحت قبول کرلی اور ہاتھی کا شکار کرانے سے دستبردار ہونے والی ہی تھی کہ مجھے ایک عدد ٹیلی گرام موصول ہوا۔

''برائے ..... بیرل! بابو ماکنڈو' کل صبح سات بجے' ماکولا رپورٹ، بڑے بل ہاتھی۔ اسٹاپ بابو ماکنڈو میں امریکی سیاح، بہترین معاوضہ اسٹاپ۔ منجانب بلکس۔''

بلکس، بلکی یا بارون ون بلکسن۔ یہ سب ایک ہی شخص کے نام تھے۔ عرف عام میں اسے افریقا کا بہترین شکاری کہا جاتا تھا۔

سفاری کے علاقے میں بہترین سفید فام شکاری مانا جاتا تھا۔ اس کا نشانہ اور دلیری دونوں بے مثال تھے۔ وہ آمنے سامنے کھڑے ہوکر ہاتھی کی دونوں آنکھوں کے درمیان گولی مارتا تھا۔ وہ شام ہوتے ہی خود کو وہسکی اور بوربن میں ڈبونے کی کوشش کرتا تھا۔ میری پرانی آرزو تھی کہ اس کے ساتھ کسی مہم میں شریک ہوں اور یہ ٹیلی گرام پاکر میری آرزو تکمیل کے قریب تھی۔ میں نے خود کو یاد دلایا کہ میں ٹام کی بات مان کر شکار کی تلاش کے کام کو چھوڑ چکی ہوں۔

''مگر ٹام کو کیا پتا چلے گا۔ وہ تو لندن میں بیٹھا ہے اور بس یہ آخری مہم ہوگی، اس کے بعد کام ختم.....''

شوق اور افتادِ طبع نے ضمیر کو سمجھا بجھا کر راضی کرلیا۔

مجھے ہاتھیوں کا شکار شروع سے ہی نہایت واہیات لگتا تھا۔ اگر اس کے دانتوں کو نظرانداز کردیا جائے تو ہاتھی اوسط ذہانت کا اور نہایت شریف جانور ہے جس کے شکار کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ اس بے چارے جانور کو شکار بھی کیا جاتا ہے اور اس کی کردار کشی بھی کی جاتی ہے' مثلاً ہاتھی نہایت خطرناک جانور ہے اور یہ ہمیشہ انسان پر حملہ کرتا ہے۔ حالانکہ ایک نارمل ہاتھی شاذونادر ہی انسان پر حملہ کرتا ہے مگر جب بھی حملہ کرتا ہے تو نہایت خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ اس کے باوجود یہ حملے سے آخری لمحے تک کتراتا اور ڈرادھمکا کر کام نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے خاص ہتھیار اس کی سونڈ، دانت اور بھاری بھرکم پاؤں ہیں۔ جب ایک دیوہیکل ہاتھی غیظ وغضب کے عالم میں حملہ کرتا ہے تو اچھے خاصے مضبوط دل جانور بھی دہل کر رہ جاتے ہیں۔ اس صدی میں محض اس کے خوبصورت دانتوں کے لیے لاکھوں ہاتھیوں کو فنا کے گھاٹ اتار دیا اور اب یہ جانور معدومی کے خطرے سے دوچار ہے۔ افسوس کہ انسان دنیا کو کیسی خوبصورت چیزوں سے محروم کرتا جارہا ہے۔

مگر اس وقت ہاتھی کی بقا سے زیادہ اہم چیز میرے لیے مہم جوئی تھی۔ میں اگلی صبح وہاں پہنچ گئی جہاں بلکس اور اس کے معاونوں نے کیمپ بنا رکھا تھا۔ یہ تین بڑے خیموں اور متعدد چھوٹے خیموں پر مشتمل تھا۔ بڑے خیمے بلکس، امریکی شکاری ونسٹن گسٹ اور میرے لیے تھے۔ ماکنڈو سفاری کے بالکل وسط میں واقع تھا۔ یہاں گھنے جنگلات کے ساتھ جھاڑیوں اور گھاس سے بھرے میدان بھی تھے۔ وہاں بادباب نامی درخت کثرت سے تھے جن کا ٹھنڈا سایہ ہمیں افریقا کے غضب ناک سورج کے قہر سے بچائے ہوئے تھا۔

افریقا آنے والے شوقیہ شکاری سب سے پہلے بلکس کو بک کرانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے لیے وہ منہ مانگا معاوضہ دینے کو تیار ہوتے ہیں۔ بلکس نے یہ مقام بڑی محنت سے ہاتھیوں کے پیچھے دوڑتے ہوئے حاصل کیا تھا اور کئی بار ایسا بھی ہوا تھا کہ ہاتھی اس کے پیچھے دوڑے۔ بہرحال وہ ایک اچھا آدمی تھا، اس نے اپنے پیشے سے ہٹ کر کبھی جانور مارنے کی کوشش نہیں کی چاہے اس کی جان ہی کیوں نہ خطرے میں ہو۔ ایسے ہی ایک واقعے کی میں چشم دید گواہ بنی۔ بلکہ میں خود بھی اس واقعے کی ایک فریق تھی۔ ماکنڈو پہنچنے کے صرف نصف گھنٹے بعد میں اور بلکس ایک بار پھر فضا میں تھے۔ اس کے آدمیوں نے گھاس اور جھاڑیاں صاف کرکے ایک عمدہ رن وے تیار کرلیا تھا جس پر طیارہ اتارتے ہوئے کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ ہمارا مقصد یہ تھا

بکنگھم پیلس محل ملکہ برطانیہ کی سرکاری رہائش گاہ ہے۔ یہ ایک پرانے طرز کی تین چار منزلہ عمارت ہے۔ سال میں دو تین ماہ کے لیے جب ملکہ کی رہائش اس محل میں نہیں ہوتی تو اس کا کچھ حصہ سیاحوں کے لیے کھول دیا جاتا ہے۔ ہمیں گارڈز کی تبدیلی کی تقریب ''بلائنڈ'' دیکھنے کا موقع بہرحال مل گیا۔ ریچھ کے بالوں سے بنی ہوئی اونچی ٹوپیاں پہنے ہوئے گارڈز اس پروقار تقریب میں حصہ لے رہے تھے۔ تقریب کا اختتام ہی تھا کہ اچانک تماشائیوں میں سے ایک صاحب نیچے گر گئے۔ نیچے گرے ہوئے صاحب کے جسم پر تشنج کے جھٹکے بھی لگ رہے تھے اور ان کے منہ سے جھاگ بھی نکل رہا تھا' بظاہر انہیں مرگی کا دورہ پڑا تھا۔ مرزا نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ہجوم کو چیرتے ہوئے گرے ہوئے شخص تک پہنچے اور یکایک اپنے پاؤں سے جوتا اتار کر اس کی ناک کے نیچے رکھ دیا۔ مرزا کی اس حرکت پر وہاں موجود افراد کی حیرت سے چیخیں نکل گئیں۔ ابھی میں موصوف کو اٹھا ہی رہا تھا کہ پانچ چھ پولیس والے ہمارے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہوگئے۔ کہیں سے ایمبولینس آئی اور مریض کو لے کر چلتی بنی پولیس والے مرزا کو لے کر ایک طرف چلے۔ تھانہ تھوڑی ہی دور تھا جہاں ہمیں لے جایا گیا۔ وہاں مرزا اور میرے متعلق پوری معلومات حاصل کرنے کے بعد پوچھا گیا۔ ''ہاں جناب! یہ آپ مریض کو جوتا کیوں کھلا رہے تھے؟'' پولیس افسر نے مرزا کی طرف دیکھتے ہوئے انگریزی میں سوال کیا۔ ''آپ کی اس سے کیا دشمنی تھی؟'' مرزا نے احمقوں کی طرح مجھے دیکھا میں نے فوراً مترجم کے فرائض سنبھال لیے۔ ''جوتا کھلا رہا تھا؟ نہیں جناب' آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں تو اسے جوتا سنگھا رہا تھا تاکہ جلد ہوش میں آجائے۔'' مرزا نے جواب دیا تو آفیسر نے پوچھا۔ ''اچھا تو آپ جوتا سنگھا رہے تھے' کیا آپ کے جوتے میں مرگی کے مریضوں کے لیے کوئی دوا وغیرہ لگی ہوئی ہے جسے سونگھ کر وہ ہوش میں آجائیں؟'' مرزا مسمسی سی شکل بنا کر بولے ''ہمارے یہاں مشہور ہے کہ اگر مرگی کے دورے والے کو جوتا یا گوبر سنگھایا جائے تو وہ فوراً ہوش میں آجاتا ہے۔ میں یہاں سیر کے لیے آیا ہوں' میری یہاں کسی سے کیا دشمنی؟''

اسی قسم کے کافی سوالات اور احمقانہ جوابات کے بعد پولیس افسر نے میری سفارش اور اس تنبیہ کے بعد مرزا کو چھوڑا کہ وہ یہاں صرف سیر کریں گے اور اس طرح آئندہ کبھی کسی کو جوتا ''دکھانے یا سنگھانے'' کی کوشش نہیں کریں گے۔

اقتباس: لندن اور شریر مرزا از پروفیسر ڈاکٹر محمد وسیع اللہ خان

WWW.PAKSOCIETY.COM

کہ اگر ممکن ہو تو اس رات ونسٹن کی آمد سے قبل ہی شکار کے لیے موزوں کچھ ہاتھی تلاش کر لیے جائیں۔ اگر ہماری قسمت غیر معمولی طور پر اچھی ہوئی تو ہم دو یا تین دن میں کیمپ سے پچاس میل کے اندر ہاتھی تلاش کرنے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔

یہ علاقہ کیمپ سے پیدل مسافت پر تھا۔ ہاتھی کے شکار میں یہ قطعی تعجب کی بات نہیں ہوتی کہ ایک شکاری مہینے بھر ایک ہی ہاتھی کے پیچھے سرگرداں رہا ہو۔ ہوائی جہاز سے تلاش نے اس کام کو کسی قدر آسان بنا دیا تھا لیکن اس روز ہم کیمپ سے چالیس میل دور تک کسی ہاتھی کی جھلک نہ دیکھ سکے۔ اس کا مطلب تھا کہ اگر ہاتھی ملے بھی تو شکاریوں کو ان تک جانے کے لیے ایک طویل فاصلہ طے کرنا ہوگا ورنہ یہ تو ممکن نہیں تھا کہ ہاتھی رضا کارانہ طور پر حاضر ہو کر سرِ تسلیم خم کر دیتے کہ جو مزاج یار میں آئے۔ پھر افریقا میں سفر کرنے کا مطلب ہوتا ہے مصیبتوں اور آفتوں میں سفر کرنا۔ جھاڑیوں میں رینگتے، گھنے جنگلوں سے گزرتے، حشرات، مچھروں، بچھوؤں، سانپوں اور ٹیٹی مکھی سے نبرد آزما ہوتے جب کئی روز کے بعد شکاری ہاتھیوں والے علاقے میں پہنچتے تو معلوم ہوتا کہ وہ کہیں اور تشریف لے جا چکے ہیں۔ اس وقت شوقیہ حضرات کی حالت دیکھنے والی ہوتی تھی۔ درحقیقت ہاتھیوں کا شکار ایک مشکل، غیر آرام دہ اور مہنگا کھیل ہے جو صرف دولت مند مہم جو ہی کھیل سکتے ہیں۔

مگر میں اور بلکس بے خبر تھے کہ خوش خبری ہماری بغل میں موجود ہے۔ اگلے روز صبح میں نے کیمپ سے صرف تین میل جنوب میں چار شاندار ہاتھیوں کو چرتے ہوئے پایا۔ ان میں تین جوان ہاتھی اور ایک ان کا بچہ تھا۔ میرے شکار کے سابق تجربے میں ہاتھی کبھی کیمپ کے اتنے نزدیک نہیں ملے۔ خبر سنتے ہی بلکس اور اس کے معاون چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ ان میں تجربے کار ماکولا بھی شامل تھا۔ جنگلوں میں راستہ تلاش کرنے اور شکاری پارٹی کی رہنمائی اس کے ذمے تھی۔ وہ شروع سے بلکس کے ساتھ تھا اور آخر تک اس کے ساتھ رہا۔ میں اب تک جن افریقیوں سے ملی تھی، وہ ان میں سب سے ذہین شخص تھا۔ ایک بار اس نے مجھ سے کہا۔

"مس، یہ گورے اتنی دور سے خطرات خریدنے آتے ہیں اور ہم افریقیوں کو مفت مل جاتے ہیں۔ ہم ان کے لیے ہاتھی تلاش کرتے ہیں اور یہ اسے مار ڈالتے ہیں۔ پھر ہمیں زندہ رہنے کے لیے اور ہاتھی تلاش کرنا پڑتے ہیں۔"

ہم پیدل ہاتھیوں کی طرف روانہ ہوئے۔ بلکس شکاری سب سے آگے اپنی واکنگ اسٹک سے راستہ بناتا چل رہا تھا۔ اس کے عقب میں ماکولا تھا اور اس کے پیچھے میں تھی۔ کبھی کبھی ماکولا کسی بلند درخت پر چڑھ کر درست راستہ دیکھتا اور پھر اشارے سے ہمیں اس سے آگاہ کرتا۔ ہم احتیاط اور خاموشی سے سفر کر رہے تھے تاکہ ہاتھیوں کو ہماری آمد کا پتا نہ چل جائے۔ اس کے باوجود بھی دو بڑے ہاتھی اچانک ہی ہمارے سامنے آ گئے۔ وہ دونوں جھاڑیوں کے درمیان زمین پر اُگی دوسرمئی چٹانیں لگ رہے تھے۔ بلکس نے انگلیوں کے اشارے سے کہا کہ میں ہوا کا رخ دیکھوں۔ اگر ہوا ہماری طرف سے ہاتھیوں کی طرف جائے تو انہیں ہماری بُو مل جائے گی مگر ہوا دوسرے رخ سے چل رہی تھی۔ یہ ہاتھی بڑے تھے اور ہم سے سو گز دور تھے۔

معاً بلکس زمین پر لیٹ گیا اور اشارے سے مجھے بھی ایسا ہی کرنے کو کہا۔ ہم رینگتے ہوئے ہاتھیوں کے قریب جانے لگے، ہم مطمئن تھے کہ ہاتھی ہماری موجودگی سے بے خبر تھے مگر یہ اطمینان اس وقت دور ہو گیا جب اچانک ایک ہاتھی نے سونڈ اٹھا کر فضا کو سونگھا پھر اس نے اپنا رخ ہماری طرف کر لیا۔ واضح طور پر اسے ہماری بُو مل گئی تھی۔ اس کے دیو ہیکل کان یوں پھڑ پھڑانے لگے جیسے ہمارے دلوں کی دھڑکن سننے کی کوشش کر رہا ہو۔ اب بلکس بالکل زمین سے چپک گیا اور اس نے مجھے بھی ایسا ہی کرنے کو کہا۔ اس حالت میں ہم آگے رینگنے لگے۔ ہاتھی تقریباً اندھا ہوتا ہے اور یہ سو گز دور سے درخت اور جانور میں امتیاز نہیں کر سکتا مگر اس کے سونگھنے اور سننے کی حس بے مثال ہوتی ہے۔ بُو سونگھ کر یہ بہت دور سے ہی دشمن کا پتا چلا لیتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اتنے فاصلے سے وہ ہمیں دیکھ نہیں سکتا تھا مگر ہماری بُو اسے مل سکتی تھی۔ معاً اس نے ایک طویل آواز نکالی جو تیس سیکنڈ تک جاری رہی۔ زمین پر بالکل لیٹ کر رینگنا مشکل اور تکلیف دہ کام ہوتا ہے۔ میری ناک زمین سے صرف انچ بھر اونچی تھی۔ متعدد اقسام کے کیڑے مکوڑے اس میں گھسنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہاں تو وہ ناکام رہے لیکن میں لباس میں گھسنے سے انہیں کیسے روکتی۔ ان میں سی سی آنوئے چیونٹیاں بھی تھیں جو انسانی گوشت کی شیدائی ہوتی ہیں۔ رینگتے ہوئے خوف اور تکلیف سے میری حالت غیر ہو رہی تھی، اگر ہاتھیوں کا خطرہ نہ ہوتا تو میں بلکس اور اس کی ہدایت پر لعنت بھیج کر کب کا اٹھ چکی ہوتی۔

اس طرح ہم سو گز تک رینگتے رہے۔ کیڑوں نے کاٹ کاٹ کر میرے پورے جسم میں آگ لگا دی مگر مجھے اطمینان

تھا کہ ہم ہاتھیوں سے دور جا رہے تھے۔ اور کچھ دیر بعد اس مصیبت سے نجات مل جائے گی۔ بلکس کے جوتے میری آنکھوں کے عین سامنے تھے اور ایک دفعہ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو بھونچکا رہ گئی۔ ہاتھی ہم سے محض دس گز کے فاصلے پر موجود تھے۔ میرا دل رو دینے والا تھا۔ میں سمجھ رہی تھی کہ وہ مجھے ہاتھیوں سے دور لے جا رہا تھا مگر وہ تو مجھے ان کے گویا دانتوں اور بھاری بھاری ستونوں جیسے پیروں تلے لے آیا تھا۔ بے شک ہاتھی کی نظر کمزور ہوتی ہے لیکن اب اتنی بھی کمزور نہیں ہوتی کہ وہ صرف دس قدم دور کھڑے انسانوں کو نہ دیکھ سکے۔

معاً بلکس آہستگی سے اٹھ کھڑا ہوا اور میں بھی دل ہی دل میں اسے صلواتیں سناتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں بھاگنے کے لیے بالکل تیار تھی جبکہ بلکس ایسے سکون سے کھڑا تھا جیسے چڑیا گھر میں ہاتھی دیکھنے آیا ہے۔ اٹھ کر اس نے سستی سے اپنی رائفل بلند کی۔

"لومس بیرل! عین نوجوانی میں فوت ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ۔" میں نے خود سے کہا "ابھی یہ شخص دھائیں سے گولی چلا کر ایک ہاتھی کو مارے گا اور دوسرا فوراً ہی ہماری چٹنی بنا دے گا۔"

میں نے فرار کے مواقع کا جائزہ لیا۔ ہاتھی کو رفتار کے معاملے میں شکست دینا ممکن نہیں ہے لیکن اسے آسانی سے ڈاج دیا جا سکتا ہے۔ خوش قسمتی سے اردگرد کھلا میدان تھا۔ اب میں منتظر تھی کہ کب بلکس گولی چلائے اور میں دوڑ لگا دوں لیکن بلکس نے گولی نہیں چلائی۔ البتہ ایک ہاتھی کی ہم پر نگاہ پڑ گئی اور اس نے دل دہلا دینے والی چنگھاڑ ماری۔ بلکس اب بھی خاموش کھڑا تھا جیسے پتھر کا ہو گیا ہو اور پھر جیسے ہی ہاتھی نے حرکت کی، میں نے چیخ ماری' یہ ایک بھرپور اور پوری دل جمعی سے ماری گئی چیخ تھی جس پر بلکس نے مجھے خون آشام نظروں سے دیکھا۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے۔

بہرحال میری چیخ پر ہاتھی یوں اچھلے جیسے ان کے پیروں تلے بم پھٹ گیا ہو پھر دونوں بگٹٹ مخالف سمت میں بھاگے۔ بلکس بدستور ساکت تھا۔ اس نے اس وقت بھی حرکت نہیں کی، جب ایک ہاتھی پلٹ کر واپس ہماری طرف آنے لگا۔ میں نے دل ہی دل میں آہ بھر کر بلکس سے گولی چلانے یا بھاگ نکلنے کی اپیل کی مگر ظاہر ہے وہ میرے دل کی آواز نہیں سن سکتا تھا۔ ہاتھی کو اپنی طرف آتے دیکھ کر میں نے خود کو لعنت ملامت کی کہ کیوں نہ ٹام کی بات مان کر سکون سے گھر بیٹھتی۔ اور ایڈونچر کے شوق میں یہاں دوڑی آئی۔ ہاتھی ہم سے کچھ دور آ کر رک گیا۔ اس نے ایک اور چنگھاڑ ماری اور محتاط قدموں سے ہماری طرف بڑھا۔ اس نے یوں ہمارا معائنہ کیا کہ جیسے اسے شک ہو کہ ہم کوئی جاندار چیز ہیں بھی یا نہیں۔ بلکس تو خیر ساکت کھڑا ہی تھا، میں نے بھی خود کو لکڑی کے تختے کی طرح اکڑا لیا تھا۔

اس نے مشکوک انداز میں ہمارے گرد چکر لگایا۔ سونڈ اٹھا کر ہمیں سونگھا۔ وہ اتنے قریب کھڑا تھا کہ اس کا سرخ سرخ منہ اور اس میں سے جھانکتے دانت مجھے صاف نظر آ رہے تھے۔ بلاشبہ ہاتھی کے منہ کے اندر دیکھنا کم ہی ہوتا ہے لیکن اس وقت مسئلہ بلکس اور میری زندگی بچانے کا تھا۔ اس نے ہمارے گرد چکر لگایا اور اتنے قریب آ گیا کہ میں نے اپنے طور پر آخری بار ماما اور پاپا کو یاد کر لیا مگر جیسے وہ آندھی کی طرح آیا تھا ویسے ہی واپس لوٹ گیا۔ میں نے گہری سانس لے کر جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ بلکس نے رائفل نیچے کی اور مسکرا کر مجھے دیکھا۔ اس وقت اس کی یہ مسکراہٹ مجھے زہر لگی۔ حرکت میں آتے ہی سب سے پہلے میں نے ان منحوس کیڑوں مکوڑوں کو اپنے لباس سے بے دخل کیا جو کاٹ کاٹ کر مجھے سُجائے دے رہے تھے۔ میں نے بلکس سے بات کیے بغیر کیمپ کا رخ کیا۔ شام کو میرا موڈ کسی قدر بہتر ہو گیا تھا۔ ہم خیموں کے سامنے کینوس کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے چائے نوش کر رہے تھے تو میں نے بلکس سے دریافت کیا۔

"تم نے ہاتھی پر گولی کیوں نہیں چلائی؟ کیا تم انتظار کر رہے تھے کہ وہ پہلے میری چٹنی بنائے اور پھر تم اسے تاتل قرار دے کر گولی مارو گے؟"

وہ مدبرانہ انداز میں مسکرایا "مائی ڈیئر بیرل، میں ہاتھی کو گولی نہیں مار سکتا تھا۔ اس نے ہم پر حملہ نہیں کیا تھا اگر حملہ کرتا بھی تب بھی میں اسے گولی نہیں مارتا، اگر میں اسے شوٹ کر دیتا تو بے چارہ ونسٹن کسے شکار کرتا جس کے لیے وہ آٹھ ہزار میل دور سے یہاں آیا ہے۔"

میں جل کر رہ گئی۔ وہاں ہاتھی نہ جانے کس نیکی کی بنا پر ہمیں بخش گئے تھے اور اس شخص کو شکار کھلانے کی پڑی تھی۔ میں نے عہد کر لیا کہ آئندہ اس شخص کے ساتھ شکار پر ہرگز ہرگز نہیں جاؤں گی۔ چاہے مجھے افریقا کے سارے خزانوں کی پیش کش ہی کیوں نہ کی جائے؟

WWW.PAKSOCIETY.COM

قسط: 209

فلمی ایلبم

علی سفیان آفاقی کی یادداشتیں

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!
آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

ایسے نادرِ روزگار خال خال ہی نظر آتے ہیں جو نصف صدی سے علم و ادب، صحافت و فلم کے میدان میں سرگرم عمل ہوں اور اپنے روزاول کی طرح تازہ دم بھی۔ اُن کے ذہن رسا کی پرواز میں کوئی کمی واقع ہو، نہ اُن کا قلم کبھی تھکن کا شکار نظر آئے۔ آفاقی صاحب ہمارے ایسے ہی جواں فکر و بلند حوصلہ بزرگ ہیں۔ وہ جس شعبے سے بھی وابستہ رہے، اپنی نمایاں حیثیت کے نشان اُس کی پیشانی پر ثبت کردیے۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستگی کے دوران میں انہیں اپنے عہد کی ہر قابل ذکر شخصیت سے ملنے اور اس کے بارے میں آگاہی کا موقع بھی ملا۔ دید شنید اور میل ملاقات کا یہ سلسلہ خاصا طولانی اور بہت زیادہ قابل رشک ہے۔ آیئے ہم بھی اُن کے وسیلے سے اپنے زمانے کی نامور شخصیات سے ملاقات کریں اور اُس عہد کا نظارہ کریں جو آج خواب معلوم ہوتا ہے۔

ادب و صحافت سے فلمی دنیا تک دراز ایک داستاں درداستاں سرگزشت

لاہور کی کیا بات ہے۔ جس نے ایک بار بھی لاہور کی ہوا کھائی وہ اس کا گرویدہ ہوگیا۔ پھر لاہور کو بھول نہ سکا۔ لاہور کے مداحوں اور عشاق کی تعداد بے شمار ہے جو دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں اور لاہور کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ جن لوگوں کو لاہور میں رہنے کا موقع ملا وہ تو آج بھی لاہور کا ذکر آنے پر ٹھنڈی آہیں بھرتے ہیں۔ کسی نے سچ

ہی کہا ہے ”جس نے لاہور نہیں دیکھا، سمجھو کہ وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔“

ہم خود کو ان خوش قسمت لوگوں میں شمار کرتے ہیں جو ”پیدا“ ہو چکے ہیں کیونکہ ہم نے نہ صرف لاہور دیکھا بلکہ زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ لاہور ہی میں گزارہ۔ لاہور میں خدا جانے کیا کشش ہے کہ لاہور کو بھلا دینا کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ ہمارا یہ عالم ہے کہ جب بھی ملک سے باہر گئے چند روز کے بعد لاہور کی یاد آنے لگی۔ روم، لندن، پیرس، ایمسٹرڈیم، برلن، واشنگٹن جیسے شہروں میں رہ کر بھی لاہور کو یاد کرتے رہے اور جب لوٹ کر آئے تو یوں لگا جیسے ماں کی محبت بھری آغوش میں آگئے ہیں۔

ایک لطیفہ مشہور ہے کہ ایک صاحب کو جنت میں دیکھا جو فردوس کی تمام نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کے باوجود جنت کے ایک کونے میں بیٹھے آہیں بھر رہے تھے اور تصویرِ الم بنے ہوئے تھے۔ ان سے پوچھا کہ بھائی صاحب، آپ جنت میں آگئے ہیں جس کی ہر انسان آرزو کرتا ہے مگر یہاں

WWW.PAKSOCIETY.COM

بھی خوش نظر نہیں آتے۔ اور اس قدر غمگین نظر آرہے ہیں؟

انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بولے ''کیا بتاؤں بھائی صاحب، لاہور یاد آرہا ہے۔''

کسی زمانے میں ایک ہی لاہور ہوا کرتا تھا جسے آج کل ''پرانا لاہور'' کہتے ہیں۔ لاہور اب ہر طرف میل ہا میل تک پھیل گیا ہے یہاں تک کہ کسی زمانے میں جو علاقے لاہور کے باہر سمجھے جاتے تھے اب وہ لاہور کا حصہ بن چکے ہیں، جدید لاہور بھی ایک خوبصورت اور قابلِ دید شہر ہے لیکن دراصل لاہور وہی ہے جسے اب پرانا لاہور کہا جاتا ہے۔ ہماری حکومتوں اور حکمراں کی نااہلی کی وجہ سے پرانے لاہور کا ایک بڑا حصہ بہت بوسیدہ ہو چکا ہے۔ سڑکوں اور عمارتوں کی مرمت اور دیکھ بھال کا کوئی بندوبست نہیں ہے۔ ہمارے حکمرانوں کی بے خبری اور بے حسی پر رونا آتا ہے جو قدیم ورثے کو سنبھال کر اس کی دیکھ بھال کرنے کی ضرورت اور اہمیت کے بارے میں سوچتے ہی نہیں۔ دنیا کے دوسرے ملکوں میں شہروں کے پرانے علاقوں کو بہت اچھی حالت میں رکھا گیا ہے۔ یہ انتہائی صاف ستھرے اور خوبصورت علاقے ہیں جہاں پہنچ کر آپ اس ملک کی پرانی تاریخی روایات کو دیکھتے اور قدیم ماحول سے آشنا ہوتے ہیں، مگر ہمارے ہاں معاملہ برعکس ہے۔ پرانے تاریخی شہروں کے پرانے علاقے بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکے ہیں۔ صفائی کا نام ونشان تک نہیں ہے۔ قدیم تاریخی عمارتیں مخدوش حالت میں نظر آتی ہیں۔ وہ یادگاریں جو ہمارے لیے باعث فخر اور بیرونی سیاحوں کے لئے قابلِ دید ہونی چاہئیں شکستگی کا شکار ہیں۔ یہاں تک کہ شالیمار باغ، شاہی قلعہ، جہانگیر اور نور جہاں کا مقبرہ تک اپنی حالتِ زار پر نوحہ خواں نظر آتا ہے۔ لاہور کے چپے چپے پر تاریخی عمارتیں تھیں جو کہ اب ملبے کا ڈھیر بن چکی ہیں۔ اپنی قدیم تہذیب اور روایات کے بارے میں ایسی بے حسی کی دنیا میں کہیں اور مثال نہیں ملتی۔ ممکنہ آثارِ قدیمہ بھی موجود ہے جو ہر سال کروڑوں کا بجٹ کھا جاتا ہے لیکن یہ اپنے فرائض سے غافل ہے۔ ان سے پوچھنے والا بھی کوئی نہیں ہے کیونکہ ہمارے یہاں جواب طلبی اور احتساب کا دستور ہی نہیں ہے۔

پرانے لاہور کے جو حصے باقی ہیں وہ بھی دیکھنے کے قابل ہیں۔ یہ وہ مقامات ہیں جہاں لاہور کی پرانی تہذیب اور روایات سانس لیتی نظر آتی ہیں۔ یہ شہر برصغیر کے قدیم ترین شہروں میں شمار کیا جاتا ہے جس کی تاریخی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لیکن کیا جا رہا ہے۔ بدعنوان، مفاد پرست اور نااہل اہلکاروں نے دنیا کے اس قدیم تاریخی شہر کو اس کے حال پر چھوڑ دیا ہے اور خود حلوا مانڈا کھانے میں مصروف ہیں۔

پرانے لاہور کے بارے میں مختلف حضرات نے بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ معروف افسانہ نگار اے حمید نے زندگی کے آخری ایام کا بہت بڑا حصہ لاہور کے بارے میں لکھنے میں صرف کیا۔ اس سے پہلے وہ امرتسر کی یادیں تازہ کیا کرتے تھے۔ امرتسر کے بعد انہوں نے لاہور کو اپنی تمام تر توجہ کا مرکز بنا لیا تھا۔ بدقسمتی سے لاہور کا یہ نوحہ گر بھی دنیا سے رخصت ہو گیا اور اپنے ساتھ ہی پرانے لاہور کی یادوں کو بھی سمیٹ کر لے گیا لیکن اس کے باوجود پرانے لاہور اور اس کے ماحول، شخصیات اور طرزِ زندگی کے بارے میں وہ معلومات کا ایک ذخیرہ چھوڑ گئے ہیں۔

اے حمید تو ایک تاریخ نویس تھے لیکن ان کے علاوہ کچھ اور لوگوں نے بھی پرانے لاہور کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے جو معلوماتی ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہے۔ ایسے ہی لوگوں میں ڈاکٹر خالد مسعود قریشی بھی شامل ہیں جو ماضی کے لاہور کے گن گاتے نظر آتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جب کبھی ان گزرے ہوئے دنوں کو یاد کرتا ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے خوابوں کی دنیا میں آ گیا ہوں۔ انہوں نے ایک بار اے حمید مرحوم کو ایک خط میں پرانے لاہور کے بارے میں اپنی یادیں تازہ کی ہیں۔ ان کی باتیں سن کر یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ قائد اعظمؒ نے پاکستان بنا کر اس خطے کے مسلمانوں پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔ اگر پاکستان نہ بنتا تو یہاں کے مسلمان آج بھی ہندو، سکھ کے غلام ہوتے اور خوشحالی سے محروم رہتے۔ آیئے، ان کی زبانی لاہور کی باتیں سنیے۔

ان کا بیان ہے کہ انارکلی بازار میں قیامِ پاکستان سے پہلے مسلمانوں کی بہت کم دکانیں تھیں۔ یہاں جوتوں کی ایک دکان کرنال شاپ تھی۔ یہ انارکلی میں ان چند دکانوں میں سے ایک تھی جو مسلمانوں کی ملکیت تھی۔ یہ دکان دو حصوں پر مشتمل تھی۔ دکان کے اگلے حصے میں ایک پاٹ دار آواز والے بارعب شخصیت کے مالک بیٹھا کرتے تھے۔ وہ بلند آواز میں ملازم کو مردگاہکوں کے لیے جوتے لانے کو کہا کرتے تھے۔ ملازم گاہک کے آگے جوتوں کے ڈبوں کا ڈھیر لگا دیتا تھا اس لیے گاہک کو اپنی پسند کا جوتا خریدنے میں

کوئی مشکل پیش نہیں آتی تھی۔ مستورات کے لیے حصہ الگ تھا۔ وہاں ایک بڑی عمر کا ملازم خواتین کی ضروریات پوری کرنے کے لیے موجود ہوتا تھا۔ کرنال شاپ کے باہر دکان کے تھڑے پر کالے رنگ کا لکڑی کا بنا ہوا ایک بہت بڑا بوٹ رکھا ہوا تھا۔ یہ بچوں کی دلچسپی کا مرکز تھا۔ وہ سوچا کرتے تھے کہ یہ بہت بڑا جوتا کس شخص کے پاؤں میں فٹ آ سکتا ہے۔

مسعود قریشی صاحب نے لکھا ہے کہ انہوں نے قیام پاکستان کے بعد اردو کے مشہور شاعر جگر مرادآبادی کو کرنال شاپ کے مالک کے ساتھ بیٹھا ہوا اکثر دیکھا تھا۔

مسعود قریشی صاحب کے اس خط پر تبصرہ کرتے ہوئے اے حمید نے لکھا ہے کہ میرے مشاہدے اور یادداشت کے مطابق قیام پاکستان سے پہلے اس جگہ بھلّہ شوکینی تھی۔ دکان کے مالک کا نام لالہ دھنی رام بھلّہ تھا۔ دکان ان ہی سے منسوب تھی۔ اس زمانے میں ہندو چمڑے کا کاروبار کرنے کو عیب سمجھتے تھے یہاں تک کہ جوتا پہن کر اس کے تسمے باندھنے کے بعد ہاتھ دھویا کرتے تھے۔ اس وجہ سے انارکلی میں کسی ہندو کا جوتوں کی دکان کھولنا ایک نئی بات تھی۔ لیکن ڈاکٹر مسعود قریشی نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ انہوں نے جگر مرادآبادی کو کرنال شاپ میں (قیامِ پاکستان کے بعد) دیکھا ہوگا۔ اس زمانے میں کرنال شاپ میں فرصت کے اوقات میں محفل جما کرتی تھی۔ کرنال شاپ کے مالک وحید صاحب خود بھی بڑے خوش شکل نوجوان تھے۔ اس محفل میں عظیم مرتضیٰ بھی آیا کرتے تھے۔ وہ سیکریٹریٹ میں ملازم تھے۔ وہ دبلے پتلے اور نازک اندام تھے۔ چائے کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ میں اکثر ان کی دکان پر چائے پینے کے لیے جایا کرتا تھا۔ شیخ عبدالشکور جو لاہور کی ایک مشہور ہستی تھے وہ بھی اس محفل میں باقاعدگی سے آنے والوں میں تھے۔ وہ انتہائی وضع دار اور لاہور کی قدیم ثقافت کی زندہ علامت تھے۔ وہ اکثر شلوار اور اچکن میں ملبوس رہتے تھے، وہ بڑی شائستگی سے بات کرتے تھے۔ جگر مرادآبادی جب بھی لاہور آتے تھے ایک روڈ پر ''نقوش'' کے دفتر سے اٹھ کر کرنال شاپ آیا کرتے تھے۔

مسعود قریشی کے مطابق وہ دھنی رام روڈ پر مشہور کلارنٹ نواز یا سرسونی رہتے تھے۔ میں نے ایک شادی میں انہیں دولہا کے گھر میں مہمانوں کے درمیان میں بیٹھ کر کلارنٹ کی دھنیں بکھیرتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ کالی شیروانی اور جناح کیپ میں ملبوس تھے اور کوئی کلاسیکی دُھن بجا رہے

یہ بے نیازی

جب ساغر صدیقی نے صدر ایوب کا قصیدہ لکھا۔ ''کیا ہے صبر ہم نے ہمیں ایوب ملا'' تو صدر ایوب خان نے آپ کے ساتھ ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ جب سیکورٹی آفیسر ساغر کو ساتھ لانے کے لیے ان کے ہاں پہنچے تو انہوں نے ساتھ چلنے سے صاف انکار کر دیا اور بے نیازی سے سگریٹ کی خالی ڈبیا پر اک شعر لکھ کر صدر ایوب کو بھیج دیا۔

''ہم سمجھتے ہیں ذوقِ سلطانی
یہ کھلونوں سے بہل جاتا ہے''

اقتباس: لاہور میں دفن خزانے
تلاش: اختر صبا بتوں

تھے اور لوگ جھوم جھوم کر انہیں داد دے رہے تھے۔

موسیقی اور موسیقاروں کا تذکرہ شروع ہو گیا ہے تو اے حمید نے ریڈیو پاکستان کے زمانے کے کچھ واقعات بھی لکھے ہیں جو آج کی نسل کے لیے دلچسپی اور معلومات پر مبنی ہیں، انہوں نے ایک بار ریڈیو پاکستان میں دو نامور موسیقار بھائیوں سلامت علی خان، نزاکت علی خان کو غلام فرید کی کافی گاتے ہوئے سنا تھا۔

وہ ان دونوں کی بھرپور جوانی کا زمانہ تھا، وہ بہت پُرسوز اور دردبھری آواز میں گا رہے تھے جس کی وجہ سے سننے والوں پر وجد کی کیفیت طاری تھی۔ ایک بار اے حمید اسٹیٹ بینک آف پاکستان میں ریڈیو سے ملنے والا ایک چیک کیش کرانے گئے تو انہوں نے ایک آدمی کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ بڑے غلام علی خان کے منجھلے بھائی خان صاحب برکت علی خان تھے۔ انہیں ٹھمری اور غزل گانے کا بے تاج بادشاہ کہا جاتا تھا۔ ان کا نقشہ اے حمید نے ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

''سیاہ گھنگرالے بالوں میں سفیدی کی لہریں آنی شروع ہو گئی تھیں۔ بوسکی کا کرتہ پہنا ہوا تھا جس میں کئی شکن پڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے سرخ تہ بند باندھ رکھا تھا۔ ایک ہاتھ سے تہبند کو ذرا سا اوپر اٹھا رکھا تھا۔ پاؤں میں کلکتہ کے سیاہ سلیپر پہنے ہوئے تھے۔ ایک پاؤں میں چاندی کا کڑا تھا۔ بوسکی کے کُرتے میں کئی جگہوں پر پان کے سرخ داغ صاف نظر آ رہے تھے۔ آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔ صاف لگتا

WWW.PAKSOCIETY.COM

آزادی سے قبل لاہور کی گلیاں

تھا کہ ابھی سو کر اٹھے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں ریڈیو کا چیک تھا۔ میں نے انہیں پہچان لیا اور احتراماً اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے آگے بڑھ کر سلام کیا۔ خان صاحب نے مسکرا کر میرا حال پوچھا، کہنے لگے ''ریڈیو کے چیک کے لیے آنا پڑتا ہے۔ تانگہ باہر کھڑا ہے، یہاں دیر تو نہیں لگے گی؟''

میں نے کہا۔ ''خان صاحب چیک آپ مجھے دے دیجئے۔ آپ بینچ پر تشریف رکھیں۔''

شاید چیک 25 روپے کا تھا۔

اے حمید اپنا پندرہ روپے کا چیک کیش کرانے کے لیے اسٹیٹ بینک گئے تھے، لیکن ان واقعات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بڑے بڑے معروف لکھنے والوں اور نامور گانے والوں کو کتنا کم معاوضہ دیا جاتا تھا اور اس حقیر رقم کو حاصل کرنے کے لیے ان قابلِ قدر لوگوں کو بہ ذات خود اسٹیٹ بینک جا کر دھکے کھانے پڑتے تھے کیونکہ ریڈیو سے جاری ہونے والا چیک صرف اسٹیٹ بینک ہی سے کیش کیا جاسکتا تھا۔

انہوں نے بڑے غلام علی خان کے بارے میں بھی لکھا ہے، ان کے علاوہ اس وقت کے دیگر بڑے، نامور گائیکوں اور موسیقاروں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

''شاہی محلے میں نوگزے کے مزار کے سامنے بڑے غلام علی خان صاحب کا مکان تھا۔ مکان کے دروازے کے بائیں جانب کمہار کی دکان تھی۔ دکان کے ساتھ ہی ایک تنگ زینہ اوپر جاتا تھا۔ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد ایک بیٹھک تھی جہاں بڑے غلام علی خان اور نزاکت علی خان کی رہائش تھی۔ بڑے غلام علی خان کے بعد ان کے چھوٹے بھائی برکت علی خان تھے۔ ان کے سب سے چھوٹے بھائی مبارک علی خان تھے۔ مبارک علی اور بڑے غلام علی خان بڑے مہمان نواز تھے۔ جب بھی ہم جاتے تھے وہ بڑی خندہ پیشانی سے ملتے تھے، سب سے پہلے لڑکے کو بلا کر ہمارے لیے چائے، پان اور سگریٹ منگواتے تھے۔

مبارک علی خان بڑے گورے چٹے اور خوبصورت تھے۔ ہمارے بچپن میں کلکتہ میں ایک پنجابی فلم ''سوہنی مہینوال'' بنی تھی جس میں ہیرو کا کردار مبارک علی خان صاحب نے کیا تھا۔

ایک بار میں، سلیم شاہد اور انور بلال، خان صاحب سے ملنے ان کی بیٹھک پر گئے۔ آسمان پر بادل چھائے تھے۔ سلیم شاہد نے کہہ دیا ''خان صاحب آج تو ہم ملہار کی استھائی ضرور سنیں گے تاکہ بارش شروع ہو جائے۔''

خان صاحب مبارک علی خان مسکرائے اور کہنے لگے۔ ''جن کے ملہار گانے سے بارش ہونے لگتی تھی وہ بڑے عبادت گزار اور پرہیزگار لوگ تھے، ہم ان بزرگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں میرے ملہار گانے سے دھوپ نہ نکل آئے۔ پھر بھی میں آپ کو ملہار ضرور سناؤں گا، ذرا طبلے والا آجائے۔ اس بے چارے کی بہن بڑی بیمار ہے، اسے ٹی بی ہے۔''

کچھ دیر بعد طبلے والا بھی آگیا۔

''تمہاری بہن کا کیا حال ہے؟''

''ٹی بی اندر ہی اندر اسے کھا گئی ہے۔ بس چارپائی پر اس کا ایکسرے ہی پڑا ہے۔''

اس کے بعد ہم نے مناسب نہ سمجھا کہ خان صاحب سے گانا سنا جائے۔

مبارک علی خان جتنے خوش شکل تھے اتنے ہی خوش لباس بھی تھے۔ گانے کی محفلوں میں کبھی کبھی تھری پیس سوٹ پہن کر بھی چلے جاتے تھے۔ ان کے جسم پر لباس پورا ہی سجتا تھا۔

پاک ٹی ہاؤس میں دن بھر اور رات گئے تک ادیبوں، صحافیوں اور شاعروں کا مجمع رہتا تھا۔ گوالمنڈی سے پاک ٹی ہاؤس جاتے ہوئے موڑ پر ایک کھوکھا تھا۔ دراصل یہ ایک کاؤنٹر تھا۔ کاؤنٹر کے پیچھے گہرے سانولے رنگ کا ایک مضبوط جسم والا ادھیڑ عمر آدمی کھڑا گاہکوں کو چائے بنا کر

آزادی سے قبل مال روڈ کی ایک دکان

کرتا تھا۔ انہیں سب حاجی صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔ پہلی نظر میں وہ مکرانی یا سوڈانی لگتا تھا۔ بڑے بڑے نامور شاعر، اور ادیب اس کاؤنٹر کے سامنے کھڑے چائے پیتے نظر آتے تھے۔ ایک اور چائے کی دکان پر مالک نے ہوٹل کے باہر لکھ کر لگا رکھا تھا۔ ''برائے مہربانی سگریٹ چائے کے کپ میں نہ بجھائیں ورنہ ہم آپ کو ایش ٹرے میں چائے دینے پر مجبور ہوں گے۔''

چائے کو انگریزوں نے ہندوستان میں عام کرنے کے لیے مفت چائے پلا پلا کر چائے کا عادی بنا دیا تھا۔ شروع شروع میں لوگوں کو چائے کا عادی بنانے کے لیے چائے کمپنی والوں نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ اندرون شہر کے خاص خاص گھروں میں سہ پہر چار بجے کے قریب کمپنی کی دو فارن عورتیں آتیں۔ آگ جلا کر چولہا گرم کرتیں۔ اپنی چائے کمپنی کی پتی اپنے تھیلے سے باہر نکال کر چینک میں چائے گرم کرتیں اور چائے پلانے کے بعد دوسرے گھر کی راہ لیتیں۔ یہ خدمت وہ چائے کمپنی کی طرف سے بلا معاوضہ سرانجام دیا کرتی تھیں۔ چائے کمپنی والوں کی طرف سے اشتہار چھپا کرتا تھا کہ ''چائے گرمیوں میں ٹھنڈک پہنچاتی ہے'' ایک اور اشتہار سے دکھایا گیا تھا کہ ایک دیہاتی آدمی مسکراتے ہوئے چائے پی رہا ہے، نیچے یہ شعر درج ہوتا تھا

یہ ستاتی ہے ہم کو گرمی نہ سردی
ہمیں چائے پینے سے آتی ہے چستی

اے حمید کا یہ مشاہدہ بہت درست ہے۔ آج ملک میں شہروں کے علاوہ دیہات میں بھی چائے پینے کا رواج ہو گیا ہے۔ پنجاب کے دیہاتیوں کو دودھ، لسی کی عادت چھڑوا کر چائے کا عادی بنا دیا گیا ہے۔ ہر گھر، دفتر اور دکان میں صبح سے رات تک چائے نوشی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ چائے ہماری زندگی کا ایک لازمی حصہ بن چکی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب لوگ چائے کے نام پر کانوں کو ہاتھ لگاتے تھے۔ اب اس کے بغیر رہ نہیں سکتے۔ صبح ناشتے سے پہلے چائے، ناشتے میں چائے، اس کے بعد سارے دن چائے کا دور چلتا ہے۔ ہر آنے جانے والے مہمان کی چائے سے خاطر کرنا معاشرتی زندگی کا ایک حصہ بن چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں 2011 میں پونے چار ارب کی چائے درآمد کی گئی اور اس طرح قیمتی زرمبادلہ ضائع کیا گیا۔ انگریزوں نے ہمیں جہاں بہت کچھ سکھایا ہے وہیں چائے نوشی اور سگریٹ نوشی کا عادی بھی بنا دیا ہے۔ جن دنوں پاکستان میں ٹی وی نہیں تھا تو ریڈیو سے گیت کی شکل میں یہ گانا نشر ہوتا تھا جو چھوٹے بڑے سب لوگوں کو یاد ہو گیا تھا۔

''چائے پیجئے،
کون سی جناب؟
لپٹن پیجئے
لپٹن ہی تو ہے۔

ایک زمانے میں چائے کی چند ہی کمپنیاں اور برانڈ تھے لیکن اب دنیا بھر کی چائے بازار میں دستیاب ہے۔ سری لنکا کی چائے، کینیا کی چائے، انڈیا کی چائے۔ انگریزوں کی چائے، ہر قسم کی چائے بازاروں میں موجود ہے۔ یہ صحت بھی خراب کرتی ہے اور پیسہ بھی، مگر اب یہ حال ہو گیا ہے کہ

''چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی''

آج یورپ اور امریکا والے منشیات کے خلاف شور مچا رہے ہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ چائے اور دوسرے نشے دنیا بھر میں پھیلانے کے لیے زور اور زبردستی کے علاوہ جنگیں بھی لڑی گئی ہیں۔ چائے اور سگریٹ پر عرب میں تو پابندیاں لگ گئی ہیں مگر دوسرے ملکوں میں اربوں ڈالر کی چائے ایکسپورٹ کی جاتی ہے۔ ہیروئن اور دوسرے نشے جن کی مشرقی ملکوں میں کاشت کی جاتی ہے۔ امریکا ان پر بندش لگانے پر اصرار کرتا ہے لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ ہیروئن اور دوسری منشیات یورپ اور امریکا میں بے حد مہنگے داموں

WWW.PAKSOCIETY.COM

فروخت ہوتی ہیں۔ انہیں استعمال کرنے والوں پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جاتی حالانکہ یورپ اور امریکا میں چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا آدمی نشہ کرتا ہے یا کرتا رہا ہے اور اس کا اعلان فخریہ کرتا ہے۔ بڑے بڑے فن کار اور گلوکار نشے کی وجہ سے جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں اور آئے دن مشہور شخصیات کے بارے میں منشیات سے نجات حاصل کرنے والے اسپتالوں میں علاج کرانے کی خبریں معمول بن چکی ہیں۔

یہ واقعات اور یادیں اے حمید کی یادداشتوں سے لی گئی ہیں جنہیں مرحوم لکھتے ہوئے دل نہیں مانتا اور قلم مرحوم لکھنے سے انکار کر دیتا ہے۔ ہمارے جتنے بھی پیارے دوست دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں انہیں بھی ''مرحوم'' لکھنے کا دل میں حوصلہ نہیں۔ ہمارے لیے تو وہ اپنی یادوں کے حوالے سے زندہ ہیں، اس کے علاوہ ادیب، شاعر اور موسیقی کے شعبوں میں انہوں نے جو لافانی خدمات سرانجام دی ہیں ان کی بنا پر وہ اپنی تحریروں اور کارنامے کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

ہم نے پہلے بھی اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ جب کوئی لمبی عمر پاتا ہے تو اس کو دوستوں، عزیزوں اور اکثر بہن بھائیوں کی وفات کے صدمے سہنے پڑتے ہیں۔ ان کی یادیں جو حافظے میں ہمیشہ کے لیے نقش ہو گئی ہیں انہیں بھول جانا کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ جو زندہ رہتا ہے وہ ہر ایک کے ساتھ تھوڑا تھوڑا مرتا رہتا ہے۔ حافظے کے اختیار میں نہیں ہے ان یادوں کو بھول جانا۔ اسی لیے تو کسی دکھی دل شاعر نے کہا ہے۔

''یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا''

مگر یہ بھی کسی انسان کے بس میں نہیں ہے۔

دیر تک زندہ رہنا مزید غم سہنے کے مترادف ہے۔ ایک تو یہ بات ناقابلِ فہم ہے کہ ایک سال عمر بڑھ جانے پر سب لوگ خوشی کس بات کی مناتے ہیں؟ سالگرہ منانے کا دستور ہم نے انگریزوں سے سیکھا ہے۔ اب تو ہر امیر غریب استطاعت کے مطابق سالگرہ مناتا ہے۔ بوڑھے اور بچے بھی سالگرہ منانے پر اصرار کرتے ہیں۔ پچھلے دنوں ہماری سالگرہ تھی۔ ہم 22 اگست 1933ء میں پیدا ہوئے تھے مگر ہم نے اپنی عمر کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔ اگر اللہ کی رحمت سے آپ سارے کام بہ دستور کئے جا رہے ہیں تو پھر عمر کے سالوں کا حساب لگانے کا کیا فائدہ۔ ہم نے خود بھی کئی بار اپنی عمر کا حساب لگانے کی کوشش کی مگر ہر بار کوئی گڑبڑ ہو گئی۔ یہاں تک کہ ایک دوست نے فون کر کے کہا کہ بزرگوار، جیتے رہو۔ اب تم بھی بزرگوں کی صف میں شامل ہو گئے ہو کیونکہ 79 برس کے ہو گئے۔ یہ سنتے ہی ہم پر یکایک بزرگی طاری ہو گئی۔ اس کے بعد جس نے بھی ہمیں سالگرہ کی مبارک باد دی ہم نے ان کو ڈانٹ دیا۔ ڈانٹنا بھی بزرگوں کا حق ہوتا ہے۔ یہ راز بہت عرصہ قبل ایک شاعر نے جان لیا تھا جس نے کہا تھا

''نادان گھڑیال یہ دیتا ہے منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی ایک اور گھٹا دی''

آپ سب کے لیے بھی یہ مشورہ ہے کہ سالگرہ کی مبارک باد دینے والوں کی چکنی چپڑی باتوں میں نہ آئیں اور مبارک دینے والے کی حوصلہ شکنی کریں جو عمر کا ایک اور سال کم ہونے پر خوشیاں منانا چاہتا ہے۔

یہ تذکرہ تو خوامخواہ نکل آیا۔ ذکر ہو رہا تھا پرانے لاہور کا۔

پرانے لاہور کے بارے میں ہم اکثر تذکرہ کرتے رہے ہیں۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہماری نئی نسل اپنی پرانی روایات اور اقدار کو یاد رکھے۔ اس وقت تو یہ حال ہے کہ جو لوگ پچیس تیس سال پہلے پرانا لاہور چھوڑ کر شہر کے جدید حصوں میں منتقل ہو گئے تھے اب تو خود ان کے بچوں کو یہ علم نہیں ہے کہ وہ کیا ماحول تھا جس میں ان کی کئی پیڑھیوں نے بہت آرام اور سکون کی زندگی گزاری تھی۔

یہ تو آپ کو معلوم ہو گا کہ قدیم زمانے میں لاہور شہر میں داخل ہونے کے لیے بارہ دروازے تھے۔ اب ان میں سے کئی گم ہو چکے ہیں۔ ان دروازوں کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا مگر ابھی کچھ دروازے موجود ہیں اگرچہ بے شمار عمارتوں کی تعمیر کی وجہ سے یہ دروازے نظر نہیں آتے لیکن کچھ آثار باقی ہیں جو دروازے اس وقت بھی پرانی تہذیب کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں ان میں قابلِ ذکر یہ ہیں۔

موچی گیٹ، لاہوری گیٹ، اکبری گیٹ، بھاٹی گیٹ، مستی گیٹ، شاہ عالمی گیٹ، ٹکسالی گیٹ، لوہاری گیٹ، لاہوری گیٹ کو اس کے ساتھ نہ ملایئے، یہ اپنی جگہ ایک علیحدہ گیٹ ہے۔ ان میں سے اکثر اب بہت بڑے وسیع کاروباری مرکز بن چکے ہیں مگر ان..... کی پرانی

کہنہ مشق مصنفہ
رفعت سراج
کا منفرد اور اچھوتا ناول
امانت
انسانی فطرت کے
تضادات...جذبات کی
شدت...صبر و تحمل
اور احتیاط کے ساتھ
شر کے لق و دق صحرا میں
پھیلتے سمٹتے
کرداروں کی ولولہ
انگیز معاشرتی
جدوجہد کی کہانی
محبتوں، عداوتوں اور رنجشوں
میں خیانت برتنے والے امانت
داروں کا دل گداز ماجرا
بہت جلد ماہنامہ پاکیزہ میں پیش کیا جا رہا ہے

WWW.PAKSOCIETY.COM

قطع قائم ہے۔ وہی گلی کوچے، تنگ اور بل کھاتی ہوئی گلیاں۔ رہائشی علاقوں میں وہی پرانا ماحول جس کی وجہ سے لاہور پر بغداد کا گمان گزرتا ہے۔ کراچی کے بہت سے پرانے علاقے بھی موجود ہیں ان دو شہروں کے علاوہ پشاور، راولپنڈی کے پرانے علاقے بھی پرانی تہذیبی قدروں کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ ان کا تذکرہ بھی سنیے گا۔ فی الحال لاہور کے بھاٹی گیٹ کے بارے میں سنیے۔

بھاٹی گیٹ کو کسی زمانے میں لاہور کا چلیسی کہا جاتا تھا۔ چلیسی لندن کا وہ علاقہ ہے جہاں ایک زمانے میں نادر روزگار لوگ رہا کرتے تھے۔ شاعر، ادیب، دانشوروں، مصوروں کے حوالے سے یہ دنیا بھر میں مشہور تھا۔ انگریز ترقی کرنے کے باوجود اپنے پرانے ورثوں کو بہت سنبھال کر اور سجا سنوار کر رکھتے ہیں اور ان پر آج بھی فخر کرتے ہیں۔ مشہور لوگوں کی رہائش گاہوں اور جن ریستورانوں میں وہ بیٹھا کرتے تھے یا بیٹھ کر گپ شپ کیا کرتے تھے وہ آج بھی اپنی اصلی حالت میں محفوظ ہیں۔ ہمارے حکمرانوں اور بیوروکریٹس کی تاریخی یادگاریں بہت خستہ اور قابلِ رحم حالت میں ہیں۔ یورپ اور دوسرے اسلامی ملکوں میں ہم جہاں بھی گئے وہاں کے مقامی حضرات نے شہر کے پرانے حصے دیکھنے کو ضروری قرار دیا۔ ترکی کے شہر انا طولیہ میں وقت کم تھا اس لیے پرانا شہر دیکھنے کا ارادہ نہیں کیا مگر ٹیکسی ڈرائیور کا اصرار تھا شہر کے قدیم حصے ضرور دیکھیں۔ اس نے تو یہ پیشکش بھی کر دی تھی کہ ان علاقوں کی سیر کا آپ سے ٹیکسی کا کرایہ وصول نہیں کیا جائے گا۔ وجہ یہ ہے کہ ہر ملک اور قوم کے افراد نہ صرف اپنے قدیم ورثے کو سنبھال کر رکھتے ہیں بلکہ اس پر فخر بھی کرتے ہیں۔ ترکی کے ہر شہر میں یہی بندوبست کیا گیا ہے۔ مصر، ایران، عراق، شام کے شہروں میں بھی یہی صورتِ حال ہے۔ ان علاقوں میں پرانے زمانے کے پتھروں کی سڑکیں اور گلیاں ہیں۔ ہر عمارت کو بہت اچھی حالت میں رکھا گیا ہے۔

آیئے، آپ کو لاہور کے ''چلیسی'' یعنی بھاٹی گیٹ کی جھلکیاں دکھاتے ہیں۔ بھاٹی گیٹ کو کسی زمانے میں لاہور کا دماغ اور نامی گرامی لوگوں کی رہائش گاہ کہا جاتا تھا۔ یہ شاعروں، ادیبوں، موسیقاروں، گلوکاروں، کھلاڑیوں، فلم کے نامور لوگوں کا مرکز تھا۔ آپ نام گنتے جایئے۔ معلوم ہوگا کہ ایسی شخصیات کو اپنے دامن میں جگہ دینے کا شرف لاہور کے کسی اور علاقے کو حاصل نہیں ہے۔ کیسے کیسے لوگ یہاں رہے ہیں اور اس علاقے نے زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق کیسے کیسے نامور لوگوں کی میزبانی کی ہے ان کی ایک طویل فہرست ہے۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ لاہور میں فلمی صنعت کا آغاز کرنے والے اور بعد میں کلکتہ اور ممبئی میں فلم ساز و ہدایت کار کی حیثیت سے شہرت پانے والے اے، آر، کاردار اور ان کے خاندان کا یہ مسکن تھا۔ اے آر کاردار وہ شخصیت ہیں جنہوں نے خاموش فلموں کے زمانے میں فلم سازی اور ہدایت کاری کا آغاز کیا تھا اور ہندوستان بھر میں ماہتاب بن کر چمکے، بولتی فلموں کا دور آیا تو اے آر کاردار (عبدالرشید کاردار) اس کے بانیوں میں شمار کیے جاتے ہیں، لاہور میں ٹین کی چار دیواری کے اندر، دریائے راوی کے کنارے پہلا فلم اسٹوڈیو بنانے کا اعزاز بھی اے آر کاردار ہی کو حاصل ہے۔ اس اسٹوڈیو کی چار دیواری ٹین کی چادریں جوڑ کر بنائی گئی تھی۔ اس کی چھت نہیں تھی تاکہ سورج کی روشنی سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اس وقت تک فلموں کی شوٹنگ کے لیے آرٹسٹ دستیاب نہیں تھے۔ ایم اسماعیل، اجمل اور دوسرے کئی فنکار بھاٹی گیٹ کے روح خیز خطے کی ہی پیداوار ہیں۔ کاردار نے لاہور کے کئی گمنام لوگوں کو نامور اداکار بنا دیا جن میں ایک ہیرالال بھی ہیں جنہیں آج زمانہ بھول گیا ہے۔ آغاز میں اے آر کاردار نے ہیرالال کو ہیرو کا کردار سونپا۔ اس کے بعد وہ انڈین فلموں کے مشہور ولن کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔

ایک اور مصنف و ہدایت کار ایم صادق بھی بھاٹی گیٹ کے تھے۔ انہوں نے فلمی زندگی کا آغاز اے آر کاردار کے معاون کی حیثیت سے کیا تھا، اس کے بعد وہ انڈین فلم انڈسٹری میں بہت بڑے ہدایت کار بن گئے تھے۔ ہندوستانی فلموں کے خوبرو اور معروف ہیرو گل حمید کو بھی اے آر کاردار ہی نے ہیرو بنا کر پیش کیا تو سارا ہندوستان ان کا پرستار ہو گیا۔ گل حمید کا تعلق صوبہ سرحد سے تھا۔ اس زمانے کے نوجوانوں کی طرح قسمت آزمانے بمبئی گئے تو کاردار نے انہیں تراش خراش کر ایک تابناک ہیرا بنا دیا تھا۔ اداکار و ہدایت کار پورب راہا بھی بھاٹی گیٹ کے رہنے والے تھے۔ معروف شاعر منور نقوی بھی ابتدائی ایام میں بھاٹی میں رہا کرتے تھے۔ اداکار ایم اسماعیل کے علاوہ ایک اداکار اسماعیل گوڈا کا تعلق بھی بھاٹی گیٹ سے ہی تھا۔ اے آر کاردار نے پنجابی زبان میں پہلی بار فلم ''مرزا صاحبان'' بنائی تھی۔

بہت ہنرمند اور بے پناہ صلاحیتوں کے مالک تھے۔

بمبئی میں انہوں نے اداکارہ بہار اختر سے شادی کر لی تھی۔ اس کے بعد بہار اختر نے کسی فلم میں کام نہیں کیا۔ ہدایت کار محبوب ان کے ہم زلف تھے۔ انہوں نے بہار اختر کی بہن سردار اختر سے شادی کی تھی۔ سردار اختر اس دور کی حسین اور بہترین اداکارہ تھیں مگر محبوب خان سے شادی کرنے کے بعد انہوں نے بھی کیمرے سے پردہ پوشی کر لی تھی۔

اوروں کا کیا ذکر۔ شاعرِ مشرق اور اردو کے فلسفی اور اسلامی قدروں کو اجاگر کرنے والے علامہ اقبال بھی بھاٹی گیٹ میں ہی رہا کرتے تھے۔

مشہور ڈراما نویس آغا حشر کا قیام بھی یہاں رہا ہے۔ حضرت داتا گنج بخش کا مزار بھی بھاٹی کے نزدیک ہی ہے۔ سر عبدالقادر نے اردو کا بے مثال ماہنامہ ''مخزن'' بھاٹی گیٹ سے ہی نکالا تھا۔

بھاٹی گیٹ اس زمانے میں سرسبز اور بارونق علاقہ تھا۔ دور دور تک باغات تھے۔ باغ کے نزدیک ہی ایک نہر تھی۔ عالمی شہرت یافتہ پہلوان گاما پہلوان اور ان کے نامور بھائی رستم زماں امام بخش پہلوان بھی بھاٹی میں رہا کرتے تھے، گاما... کی وجہ سے دوسرے کئی پہلوانوں نے بھی بھاٹی گیٹ کا رخ کر لیا تھا، پاکستان کے مایہ ناز موسیقار خورشید انور کا تعلق بھی بھاٹی گیٹ سے تھا۔ مشہور گلوکار نبی بخش ظہور بھی بھاٹی گیٹ کے تھے۔ گلوکار محمد رفیع جنہوں نے انڈیا جا کر اپنی گلوکاری کا سکہ جمایا اور بہت نام پیدا کیا ان کا تعلق بھی بھاٹی گیٹ سے ہی تھا۔ اردو کے بہت بڑے ادیب مرزا ادیب بھی یہیں کے رہنے والے تھے۔

بھاٹی گیٹ نے بڑے بڑے کھلاڑی بھی پیدا کیے ہیں۔ پاکستان کرکٹ ٹیم کے پہلے کیپٹن حفیظ کاردار بھی یہیں کے رہنے والے تھے جن کا شمار دنیا کے بہترین کپتانوں اور کرکٹ کے آل راؤنڈر کھلاڑیوں میں کیا جاتا ہے۔ اور بھی بہت سے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی ہستیاں بھاٹی گیٹ سے ہی تعلق رکھتی ہیں۔

بھاٹی گیٹ کا بیرونی علاقہ آج کل شور و غل اور کھانے پینے کی مختلف دکانوں کی وجہ سے ایک میدانِ جنگ کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ مگر بھاٹی گیٹ کے اندر داخل ہوتے ہی لاہور کا قدیم روایتی ماحول آپ کا استقبال کرتا ہے۔ عمارتیں، سڑکیں اور گلیاں جوں کی توں موجود ہیں۔ جھروکوں اور

خوبرو اداکارہ نیلو

منقش دروازوں والے مکانات، پُراسرار ماحول اور پرانے زمانے کے بزرگ دکانوں اور مکانوں کے تھڑوں پر بیٹھے گپ شپ کرتے یا شطرنج کھیلتے نظر آتے ہیں اور پرانے بھاٹی گیٹ کے واقعات نوجوانوں کو سناتے اور اس زمانے اور ان لوگوں کو یاد کر کے آہیں بھرتے ہیں۔ ان کے لباس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ تہبند، کُرتے، شلوار، اس پر کوٹ اور سر پر پرانی وضع کا کلاہ یا صافہ ان کی پہچان ہے۔ بھاٹی گیٹ میں تانگے چلتے ہیں۔ انواع و اقسام کے کھانوں کے لیے بھی بھاٹی گیٹ آج بھی مشہور ہے۔ پرانے لذیذ کھانوں کے لیے دور دور سے لوگ یہاں آتے ہیں۔ وہ ہستیاں جو اس علاقے کا طرۂ امتیاز تھیں ایک ایک کر کے پرانے لاہور سے نئی آبادیوں میں منتقل ہو گئے۔ اب بھاٹی گیٹ ان شخصیات سے خالی ہو چکا ہے مگر بھاٹی گیٹ کا پرانا ماحول آج بھی یہاں آنے والوں کا استقبال کرتا ہے اور ان ہستیوں کی یادیں تازہ کرتا ہے جنہوں نے اس خطہ زمین کو اپنی موجودگی کا شرف بخشا تھا۔

☆☆☆

غالب نے کہا تھا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
ہمارے ملک کے حالات کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ
کوئی عریانی سی عریانی ہے

WWW.PAKSOCIETY.COM

شہر کو دیکھ کے یورپ یاد آیا

آپ سب سے اور مرزا غالب کی روح سے معافی کا طلب گار ہوں کہ دوسرے مصرعے میں وزن قائم نہ رہ سکا لیکن بہرحال اپنا مطلب بیان کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

یادش بخیر، جب ہم نے پہلی بار صحافت چھوڑ کر فلمی صنعت سے وابستہ ہونے کا فیصلہ کیا تو ہمارے خاندان میں ہلچل سی پیدا ہوگئی۔ چھوٹا بڑا ہر فرد ہمیں سمجھانے لگا کہ خبردار، فلمی دنیا کا رخ نہ کرنا۔ یہ تو گندگی کا ڈھیر اور گناہوں کی بستی ہے۔ لیکن جب ہم اپنے ارادے سے باز نہ آئے تو سب نے صبر کرلیا اور کہا کہ جہنم میں جاؤ، ہماری بلا سے، خود ہی بھگتو گے۔

یہ 1958ء کا ذکر ہے۔ اس وقت پاکستان میں فلمی صنعت نے پیر پھیلانے شروع کردیے تھے۔ صحافی کی حیثیت سے ہم نے فلمی دنیا کا جو منظر دیکھا تھا اس کے پیش نظر فلمی لوگوں کے بارے میں عام لوگوں کا تاثر سراسر غلط اور غلط فہمی پر مبنی نظر آتا تھا۔ اس زمانے میں فلمی صنعت میں اعلیٰ تعلیم یافتہ، خاندانی اور انتہائی شائستہ لوگ ہمیں نظر آئے جو فلم سازی کے ہنر کو جاننے کے علاوہ دوسرے علوم میں بھی دسترس رکھتے تھے۔ اسی فلمی صنعت میں ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے قرآن پاک کی تفسیریں لکھیں۔ مذہب کے بارے میں ان کی معلومات بہت وسیع تھیں۔ عام تصور کے برعکس فلم کے لوگ حالاتِ حاضرہ، سیاست، ادب اور فنونِ لطیفہ کے علاوہ مذہب سے بھی لگاؤ رکھتے تھے۔ ڈبلیو زیڈ احمد کی مذہبی معلومات کسی عالم سے کم نہ تھیں۔

مذہب کے بارے میں گفتگو ہوتی تو وہ بڑے بڑے عالموں کو اپنے دلائل سے لاجواب کردیتے تھے۔ پانچوں وقت کی نماز اور قرآن کی تلاوت ان کا روزمرہ کا معمول تھا۔

ایک دن ان کے گھر گئے تو معلوم ہوا کہ صاحب قاری صاحب سے پڑھ رہے ہیں۔ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو ایک باریش قاری صاحب احمد صاحب کو قرآن کی تعلیم دے رہے تھے۔ اس وقت احمد صاحب کی عمر پچاس سال سے زائد تھی۔

قاری صاحب رخصت ہوئے تو علیک سلیک کے بعد ہم نے پوچھا کہ احمد صاحب آپ کو اچانک قاری بننے کی کیا سوجھی؟

کہنے لگے۔ ”آفاقی صاحب قرات سے قرآن پڑھنے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔“

فلمی صنعت کا یہ ماحول تھا جب ہم نے اس سے باقاعدہ وابستگی اختیار کی تھی۔ فلمی ماحول نہایت شائستہ اور مہذب تھا۔ فلم اسٹوڈیو جاکر اور فلمی محفلوں میں شرکت کرکے دل خوش ہوجاتا تھا اور بہت کچھ سیکھنے کو ملتا تھا۔

یہ قصہ تو درمیان میں نکل آیا۔ اصل موضوع وہ ماحول اور طرزِ زندگی تھا جو فلمی دنیا میں نظر آیا تھا۔ اس زمانے میں ممتاز اور صفِ اول کی اداکارائیں عریانی سے پرہیز کرتی تھیں۔ میڈیم نور جہاں نے ایک دو فلموں کے سوائے کبھی عریاں یا نیم عریاں لباس نہیں پہنا۔ فلم اشارا گئی تو سرتاپا ایک مشرقی نواب زادی نظر آتی تھیں۔ بغیر آستین تو کبھی آدھی آستین کا لباس بھی انہوں نے زیبِ تن نہیں کیا۔ شمیم آرا، زیبا بیگم، دیبا بیگم، نیر سلطانہ، کبھی کسی فلم میں نیم عریاں لباس پہنے نظر نہیں آئیں۔ صبیحہ خانم اور مسرت نذیر نے بھی (کسی فلمی کردار کی ضرورت نبھانے کے علاوہ) کبھی عریانی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ البتہ نیلو بیگم اور رانی بیگم نے بعض فلموں میں کردار کی نوعیت کے پیشِ نظر فیشن ایبل ملبوسات استعمال کیے لیکن عام حالات میں وہ بھی اس سے گریز کرتی تھیں۔ اس کے باوجود ان دونوں پر نکتہ چینی ہوا کرتی تھی، مثلاً ”بنجارن“ میں نیلو نے وقت کے فیشن کے اعتبار سے سائز اور بلاؤز استعمال کیے تو ایک طوفان کھڑا ہوگیا۔ پاکستان کی قومی اسمبلی کے اجلاس میں بھی اس لباس پر سوال اٹھایا گیا۔ حالانکہ وہ ایسا لباس تھا جو اس وقت کی روشن خیال اور اونچے طبقے کی خواتین عام طور پر استعمال کرتی تھیں۔

آسیہ، نغمہ اور دوسری ہیروئین بھی عریانی سے گریز کرتی تھیں۔ پنجابی فلموں میں کرتہ اور لاچا ضرور استعمال کیا جاتا تھا۔ ان فلموں کے رقص بھی بے باکی کے زمرے میں شمار ہوتے تھے۔ پنجابی فلموں کی مقبول اداکارہ انجمن نے ہمیشہ فلموں میں بند گلے کے کُرتے پہنے۔

اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ پہلے بھی بیان کیا جاچکا ہے۔

ایک پنجابی فلم کے فلم ساز نے ایک منظر کے لیے بہت قیمتی لباس تیار کرایا جس میں سونے کے بٹن لگے ہوئے تھے۔ اس لباس میں انجمن کو دیکھ کر فلم ساز کو ایک نئی بات سوجھی، انہوں نے اپنے ہدایت کار سے کہا کہ تم انجمن سے بات کرو، اگر وہ کُرتے کا اوپر والا بٹن کھولنے پر آمادہ ہوجائیں تو میں انہیں دس ہزار روپے دوں گا۔

ہدایت کار نے انجمن کو بہ مشکل رضامند کیا۔ کُرتے کا اوپر والا بٹن کھولنے سے انجمن کی گردن اور اس کے نیچے کا ایک حصہ چاندنی کی طرح چمکتا ہوا نظر آیا تو فلم ساز کو بہت اچھا لگا۔ انہیں احساس ہوا کہ بالائی بٹن کھولنے سے ہیروئن کی دلکشی اور کشش میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ انہیں دور کی سوجھی اور انہوں نے اپنے ہدایت کار سے کہا کہ اگر انجمن بیگم کُرتے کا ایک اور بٹن کھولیں گی تو میں سونے کے یہ بٹن تحفے میں انہیں پیش کردوں گا۔

ہدایت کار نے انجمن سے بات کی تو وہ رضامند نہیں ہوئیں۔ ہدایت کار نے انہیں راضی کرنے کی بہت کوشش کی اور کہا کہ وہ بہ ذات خود میک اپ روم میں جاکر دوسرا بٹن کھول کر دیکھیں تو انہیں معلوم ہوگا کہ اس میں عریانی بالکل نہیں ہے۔ البتہ دلکشی میں اضافہ ہوگیا ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ انجمن رضامند ہوگئیں اور سونے کے خوبصورت بٹن اور دس ہزار روپے انہوں نے چند لمحوں میں حاصل کرلیے۔

یہ واقعہ بیان کرنے سے یہ مقصود نہیں ہے کہ اس زمانے کی ہیروئنوں کی پارسائی پاکیزگی اور پردہ نشینی کے گن گائے جائیں۔ ایسا کچھ نہیں تھا۔ کیونکہ یہ پاکستان کی فلمی تاریخ میں انجمن پہلی ہیروئن تھیں جو فلم کی شوٹنگ ختم کرنے کے بعد بازارِ حسن میں ایک کوٹھے پر محفل سجاتی تھیں اور دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹتی تھیں۔ جب بہت زیادہ نکتہ چینی ہوتی تو انہوں نے بازارِ حسن کے ٹھکانے کو ترک کردیا اور گلبرگ میں اپنی کوٹھی میں محفل آرائی شروع کردی۔ لیکن یہ بات واضح ہے کہ اس زمانے میں عریانی کے حوالے سے فلم والوں نے اپنا ایک ضابطہ خود ہی بنا رکھا تھا۔ جس پر سختی سے عمل کیا جاتا تھا۔

برصغیر کے اسٹیج ڈرامے اور فلم کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ اس زمانے میں شریف گھرانے کی لڑکیوں کو فلموں میں اداکاری کرنے کی اجازت نہیں ملتی تھی جس کی وجہ سے تھیٹر کے ابتدائی دور میں نوعمر اور خوش شکل لڑکے ہیروئن کا کردار ادا کیا کرتے تھے۔ معروف ہدایت کار ایس ایم یوسف بھی ڈراموں میں زنانہ کردار ادا کرتے رہے ہیں۔

جب تھیٹر کو مزید فروغ اور مقبولیت حاصل ہوئی تو ڈراموں کے لیے خواتین کی موجودگی ضروری سمجھی گئی۔ شریف گھرانے کی تعلیم یافتہ لڑکیوں کے تھیٹر میں کام کرنے

نامور ہدایت کار ریاض شاہد

کا تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا اس لیے ”بازارِ حسن“ میں ہیروئن کی تلاش کی گئی۔ آپ دیکھیں گے کہ تھیٹر کے دورِ عروج میں اور اس کے بعد فلموں کے آغاز میں بھی ہیروئنیں وقت کی معروف طوائفیں ہوتی تھیں۔ اس زمانے کی طوائفوں پر آج کی طوائفوں کا قیاس نہ کیجیے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب طوائفوں کے کوٹھے درسگاہیں تھیں۔ شرفاء اپنے بیٹوں کو تہذیب، اخلاق اور ادبی ذوق سے آراستہ کرنے کے لیے طوائفوں کے پاس بھیجا کرتے تھے۔ مختار بیگم، بجن بائی، سلوچنا، گوہر بائی، جدن بائی، بہو بیگم وغیرہ اسی دور کی یادگاریں سمجھی جاتی ہیں۔

ہندوستان میں جب فلمی صنعت کو فروغ حاصل ہوا اور انتہائی مہذب اور تعلیم یافتہ افراد نے فلمی صنعت کی باگ ڈور سنبھالی تو اچھے خاندانوں کی اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیوں نے بھی فلمی صنعت میں داخل ہونے کو معیوب نہ سمجھا۔ اس ماحول کو پیدا کرنے میں بنگال کا بہت بڑا ہاتھ ہے جہاں نیو تھیٹرز جیسے اداروں نے شریف گھرانوں کے پڑھے لکھے لڑکوں اور لڑکیوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ اس اعتبار سے بنگال خصوصاً نیو تھیٹرز کو ہمیشہ ایک نمایاں اور ممتاز حیثیت حاصل رہے گی۔

نیو تھیٹرز کے تجربے سے سبق حاصل کرکے بمبئی اور لاہور کی فلمی صنعتوں میں بھی تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ بمبئی ٹاکیز ایک ایسا ادارہ تھا جس نے بمبئی کے مارواڑی اور گجراتی ان پڑھ سیٹھوں سے فلمی صنعت کو نجات دلائی۔ کلکتہ اور بمبئی کے بعد برصغیر کے تیسرے فلمی مرکز لاہور میں بھی اعلیٰ خاندان کے پڑھے لکھے طبقے نے فلمی صنعت سے وابستگی اختیار کی۔ اس طرح فلمی صنعت میں ایک بہت بڑا انقلاب برپا ہوگیا۔ بمبئی ٹاکیز کی روحِ رواں نہ صرف فلمی صنعت

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے تمام اصولوں سے واقف تھیں بلکہ خود بھی اداکاری کا مظاہرہ کرتی تھیں۔ انہیں قدرت نے اداکارانہ صلاحیتوں کے حامل افراد کو پرکھنے والی نظر دی تھی۔ اشوک کمار، موتی لال، دلیپ کمار جیسے عظیم اداکاروں کی تلاش اور انہیں فلمی دنیا سے متعارف کرانے میں دیوی کا نمایاں ہاتھ رہا ہے۔ ان کا شمار ایسے افراد میں ہوتا ہے جنہوں نے برصغیر کی فلمی صنعت کا نقشہ تبدیل کرنے میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ کلکتہ اور بمبئی میں فلمی صنعت کے قیام اور فروغ میں بھی تعلیم یافتہ لوگوں ہی کا نمایاں حصہ رہا ہے۔ جن لوگوں نے کلکتہ اور بمبئی میں فلمی صنعت کی داغ بیل ڈالی وہ تعلیم یافتہ، ذہین اور باصلاحیت لوگ تھے۔ انہوں نے ابتدائی فلموں کی تکمیل کے لیے غیر ملکی ہنرمندوں کی خدمات حاصل کیں جنہوں نے مقامی لوگوں کو تربیت دے کر مستقبل کو تابناک بنانے کے لیے تیار کیا۔

پاکستان کی فلمی صنعت پر بمبئی کا بہت اثر رہا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد نہ صرف پاکستانی علاقوں سے تعلق رکھنے والے افراد نے لاہور کا رخ کیا بلکہ اپنے ساتھ تجربہ اور ہنرمندی بھی لے کر آئے جس کی وجہ سے پاکستان کی فلمی صنعت کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونے میں بہت مدد ملی۔

پاکستان میں فلمی صنعت نے تیزی سے ترقی نہیں کی لیکن بھارتی فلموں کی درآمد پر پابندی عائد کرنے کے بعد اس کو پھلنے پھولنے کے بہت اچھے مواقع حاصل ہوئے۔ ابتدا میں پاکستان میں بھی فلمی ہیروئنوں اور گلوکاراؤں کی تلاش میں فلم ساز اور ہدایت کار شہروں شہروں کے بازارِ حسن کی خاک چھان کر وہاں سے نگینے لے کر آتے تھے۔ تعلیم یافتہ اور مہذب طبقے کی آمد کے بعد فلمی ماحول بھی بدرجہ بہتر ہوگیا اور شریف گھرانوں کی لڑکیوں نے بھی فلمی دنیا میں قدم رکھنے کو عار نہ سمجھا۔ صبیحہ خانم، دیبا بیگم، نیر سلطانہ، نیلو بیگم، صابرہ سلطانہ، جمیلہ رزاق، سنگیتا، کویتا، وغیرہ اس کی نمایاں مثال ہیں۔ اسی طرح گلوکاراؤں میں نیرہ نور، رونا لیلیٰ، زبیدہ خانم کے نام مثال کے طور پر پیش کیے جاسکتے ہیں۔

یہ تمام تفصیل بیان کرنے کا مقصد فلموں کی تاریخ بیان کرنا نہیں تھا۔ تاہم برسرِ مطلب، ہمارے ہاں شوبز انس میں بڑھتی ہوئی عریانی، بے باکی اور اس کا موازنہ اس سے پہلے کے دور سے کرنا مقصود ہے۔

پاکستان کی فلمی صنعت بے انتہا عروج کے بعد جس طرح زوال اور پستی سے دوچار ہوئی یہ ایک علیحدہ اور انتہائی دردناک داستان ہے۔ مختصر یہ کہ فلمی صنعت رفتہ رفتہ ختم ہوگئی۔ لاہور جو فلموں کا سب سے بڑا مرکز تھا ویران ہوگیا۔ نجی ٹیلی ویژن کا دور آیا تو لاہور کی جگہ کراچی نے مرکز کی حیثیت حاصل کرلی۔ سہولتوں، مالی فوائد اور کام کی فراوانی کی وجہ سے ٹیلی ویژن ڈراموں اور پروگراموں کا مرکز کراچی بن گیا اور جس کی وجہ سے لاہور کے فن کاروں اور ہنرمندوں نے بھی کراچی کا رخ کرنا شروع کردیا۔ رفتہ رفتہ کراچی ہی شوبزنس کا مرکز بن گیا۔ ایک زمانہ تھا جب کراچی اور مشرقی پاکستان کے فن کار اور ہنرمند بہتر مستقبل کی تلاش میں لاہور کا رخ کرتے تھے جہاں انہیں شہرت، مقبولیت اور عزت کے ساتھ دولت بھی مل جاتی تھی۔ اب وقت کا پہیہ الٹا گھوم گیا ہے۔ لاہور کی جگہ کراچی نے لے لی ہے۔ فلمی صنعت کا تو تیا پانچہ ہوگیا، اب ٹی وی کا زمانہ ہے۔ اور ٹیلی ویژن کی سرگرمیوں کا مرکز کراچی بن چکا ہے۔

کسی زمانے میں پاکستان میں صرف ایک ٹی وی چینل (پی ٹی وی) ہوتا تھا۔ اس کی داغ بیل اسلم اظہر نے ڈالی تھی۔ حکومت کے دباؤ اور بیوروکریسی کی پابندیوں کے اس زمانے کا ٹی وی آزاد تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پی ٹی وی کا ابتدائی زمانہ سنہری دور کہلاتا ہے۔ اسلم اظہر نے ٹی وی کے لیے ہدایت کاروں، لکھنے والوں اور اداکاروں کی ایک ٹیم بنالی تھی۔ سرکار کو یہ آزاد اور خودمختار پی ٹی وی گوارا نہ ہوا اور کچھ عرصے بعد پی ٹی وی کو ''بحق سرکار'' ضبط کرکے حکومتی مصلحتوں اور پابندیوں میں جکڑ دیا گیا۔ یہ ایک آزاد، خودمختار اور اعلیٰ درجے کے واحد ٹی وی چینل کے لیے ''سزا'' کی حیثیت رکھتا تھا۔ جب تک اسلم اظہر کے زمانے کے تربیت یافتہ لوگ پی ٹی وی میں رہے اس کا تھوڑا بہت معیار قائم رہا۔ ''غلامی'' کی زنجیروں میں جکڑے جانے کے بعد پی ٹی وی کا حلیہ ہی بگڑ کر رہ گیا۔ جس چینل کے پروگرام دیکھنے کے لیے سڑکیں ویران ہوجاتی تھیں اس کا وجود اور عدم وجود برابر ہوکر رہ گیا۔

پی ٹی وی کے سرکاری اثر میں آنے کے بعد پیدا ہونے والی خرابیاں اپنی جگہ لیکن یہ حقیقت ہے کہ پی ٹی وی نے کو عریانی اور فحاشی سے ہمیشہ پاک رکھا گیا، حکومت نے پی ٹی وی کے لیے ایک ضابطہ اخلاق مرتب کردیا تھا جس کے تحت مندرجہ ذیل پابندیوں کا خیال رکھنا لازمی تھا۔

1۔ ٹی وی کیونکہ فیملی چینل ہے اور گھر کا ہر فرد

ایک ساتھ بیٹھ کر ٹی وی پروگرام دیکھتا ہے اس لیے ٹی وی اسکرین پر ایسے مناظر نہ دکھائے جائیں جو اکٹھے بیٹھ کر سارے گھر والے نہ دیکھ سکیں، لہٰذا۔

2۔ ٹی وی پر عشق و عاشقی کا سبق نہ سکھایا جائے۔ نوجوان لڑکے اور لڑکی کو اکٹھے گھومتے، سیر و تفریح اور اظہارِ محبت کرتے ہوئے نہ دکھایا جائے۔

3۔ عریانی اور فحش، ذومعنی مکالموں سے پرہیز کیا جائے۔

4۔ ٹی وی اسکرین پر شراب نوشی تو ایک طرف سگریٹ نوشی کے مناظر بھی نہ دکھائے جائیں۔

5۔ رومانی مناظر میں لڑکے اور لڑکی کے درمیان میں مناسب فاصلہ رکھا جائے۔

6۔ شادی شدہ مرد یا عورت کو کسی اور سے محبت کی پینگیں بڑھاتے ہوئے نہ دکھایا جائے۔

7۔ شادی شدہ زندگی کے مناظر میں بھی قربت نہ دکھائی جائے اور مناظر میں اخلاق اور مشرقی تہذیب کا خیال رکھا جائے۔

8۔ لڑکیوں کو ایسے انداز میں نہ دکھایا جائے جس سے جذبات برانگیختہ ہوں اور نئی نسل میں بے باکی، بداخلاقی اور بے جا آزادی کی خواہش پیدا ہو۔

9۔ ڈراموں کے موضوعات میں اخلاق و آداب اور تہذیب کو پیشِ نظر رکھا جائے۔ ایسے موضوعات اسکرین پر نہ پیش کیے جائیں جو عام طور پر شریف گھرانوں میں معیوب سمجھے جاتے ہیں۔

10۔ خواتین کو ایسے انداز میں نہ دکھایا جائے جن سے نوجوانوں کے جذبات میں ہلچل پیدا ہو۔

11۔ مغربی طرزِ زندگی سے پرہیز کیا جائے اور مشرقی روایات کی پابندی کی جائے وغیرہ۔

یہ وہ بنیادی شرائط تھیں جن کی پابندی کرنا لازم تھا۔ لیکن پرائیویٹ چینلز کی بھرمار اور ایک دوسرے سے مقابلے میں سبقت لے جانے کی دوڑ میں ٹی وی اسکرین ان پابندیوں سے آزاد ہوگیا۔ حکومت کی بے نیازی اور متعلقہ محکموں کی غفلت، بددیانتی یا نااہلی کے باعث دیکھتے ہی دیکھتے ٹی وی ان پابندیوں سے آزاد ہوگیا۔ بھارتی فلموں، ڈراموں اور براہِ راست دکھائے جانے والے پروگراموں نے رہی سہی کسر بھی پوری کردی۔ پہلے تو لباس میں تبدیلیاں دیکھنے میں آئیں، اس کے بعد موضوعات اور ڈراموں کے مناظر کے ساتھ ساتھ ڈراموں کی تھیم بھی مادر پدر آزاد ہوگئی۔ اس وقت پاکستان کے ٹی وی چینلز بھارتی فلمیں، ڈرامے اور براہِ راست پروگرام بے روک ٹوک دکھا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ یومِ آزادی کے موسیقی کے پروگراموں میں بھی بھارتی گلوکاروں اور اداکاروں کے گائے ہوئے گانے پیش کیے جاتے ہیں۔

فلم ساز ''موضوعات'' کی پابندیوں سے اور خواتین اداکارائیں لباس کی قید سے آزاد ہوچکی ہیں۔ جینز اور مغربی انداز کے بلاؤز یا قمیص (بھارت کی دیکھا دیکھی) اور آزادانہ ماحول دیکھ کر یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ ہم پاکستانی ڈراما دیکھ رہے ہیں۔ روپے سے تو ٹی وی اداکارائیں پہلے ہی آزاد ہوچکی ہیں مگر اب بلا آستین کی قمیص، ننگی پنڈلیوں کی نمائش کرنے والی پتلونیں اور بے انتہا کھلے گلے کا بالائی لباس ہمارے ٹی وی ڈراموں میں پیش کیا جارہا ہے۔ عشق و محبت کے سوا کوئی اور موضوع باقی نہیں رہا۔ لڑکا اور لڑکی مغرب کی طرح آزادانہ باغوں، ہوٹلوں، ریستورانوں اور درسگاہوں میں گھومتے نظر آتے ہیں۔ لڑکیاں بہ ذاتِ خود لڑکوں سے اظہارِ محبت کرتی ہیں اور اپنی پسند کی شادی کے لیے والدین پر دباؤ ڈالتی ہیں۔ ''ماما، (یا پاپا) میں یہ شادی نہیں کروں گی چونکہ مجھے فلاں لڑکے سے محبت ہے۔ ہم ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔'' اس قسم کے مکالمے والدین کے ساتھ بولنے کا رواج عام ہوگیا ہے۔

ڈراموں کے موضوعات پر بھی کوئی قدغن نہیں ہے۔ شادی شدہ مرد یا عورت کا کسی دوسرے سے محبت کرنا یا تعلقات استوار کرنا قابلِ اعتراض نہیں سمجھا جاتا۔ اکثر ڈراموں میں یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ الف کی بیوی بے کے شوہر سے اور الف کا شوہر بے کی بیوی سے ملاقاتیں کررہا ہے۔ شوہر کے علم میں آجانے کے بعد بھی نہ تو بیوی دوسرے مرد سے ملنے سے باز آتی ہے اور نہ ہی شوہر کی غیرت جوش میں آتی ہے۔ یہ بے حیائی اور بے غیرتی نوجوان نسل کی رگوں میں زہریلے خون کی طرح پھیلتی جارہی ہے۔ اونچے طبقے میں تو آزادی کی یہ وبا پہلے ہی عام تھی مگر اب متوسط طبقے کی لڑکیاں بھی اسی رنگ میں رنگی ہوئی نظر آتی ہیں۔ گھریلو اور ازدواجی جھگڑوں کی وجہ سے طلاقوں کی تعداد میں بہت تیزی سے اضافہ ہوگیا ہے۔ شرم و حیا اور شوہر یا بیوی سے بے وفائی ہمارے معاشرے میں بھی عام ہوتی جارہی ہے۔ یورپ، امریکا اور بھارت کے ماحول

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے متاثر ہوکر اب روشن خیال اور تعلیم یافتہ خواتین میں ''تنہا'' رہنے کا رجحان بڑھتا جارہا ہے۔ سنگل پیرنٹ یعنی صرف عورت کا تنہا یا اپنے بچے کے ساتھ رہنا قابلِ تعریف کہا جاتا ہے اور میڈیا ایسی خواتین کی تعریف میں قصیدے پڑھتا ہوا نظر آتا ہے۔

اگر عشق و عاشقی کا سبق سیکھنا ہو تو نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے آج کل ٹی وی ایک بہترین اور موثر ترین درس گاہ ہے۔ مردوں سے برابری بلکہ مردوں کی پابندیوں سے آزادی کو ''ترقی'' کا نام دیا جاتا ہے۔ اس غلیظ، غیر صحت مند ماحول میں لڑکے اور لڑکی کا ہم آغوش ہونا، لپٹنا چمٹنا اور اظہارِ محبت کرنا معمول بن چکا ہے۔ ڈراموں میں گانوں اور رقص کا ایک نیا عنصر داخل ہو چلا ہے۔ فلموں کی طرح اب ڈراموں میں بھی ہیرو ہیروئن کا ناچنا گانا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ بھارتی فلموں اور ڈراموں کے گہرے اثرات کی وجہ سے شادی بیاہ کے موقع پر دولھا دلہن اور نوجوانوں کے ناچنے کے علاوہ خاندان کے بزرگوں کا ناچنا بھی برا نہیں سمجھا جاتا۔ ڈرامے چونکہ گھروں میں خاندان والے مل کر اور ساتھ بیٹھ کر دیکھتے ہیں اس لیے معاشرے پر بھی یہ چیزیں اثر انداز ہو رہی ہیں۔ خاندانوں میں چھوٹے بڑے کا لحاظ ختم ہو چکا ہے۔ ڈراموں میں لڑکیوں کا ''یار'' کہنا روز مرہ کا دستور بن چکا ہے۔ بعض ڈراموں میں تو بیٹا اپنی بیوی کے علاوہ ماں باپ کو بھی بلا تکلیف ''یار'' کہہ کر مخاطب کرتا ہے اور ماں باپ بھی بیٹے، بہو اور بیٹی کو ''یار'' کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔

''یار'' کا لفظ شرفا میں استعمال نہیں کیا جاتا تھا البتہ نوجوان لڑکے ایک دوسرے کو بے تکلفی میں کبھی یار کہہ دیا کرتے تھے لیکن کسی لڑکی یا عورت کی زبان سے ''یار'' کہنے کو انتہائی بدتہذیبی اور بے حیائی تصور کیا جاتا تھا لیکن ہمارے ٹی وی ڈراموں کی مہربانی سے اب چھوٹے معصوم بچے بھی (لڑکا اور لڑکی سمیت) ایک دوسرے کو ''یار'' کہہ کر مخاطب کرتے ہیں اور ان کے بڑے انہیں ٹوکتے بھی نہیں چونکہ وہ خود بھی اپنی بات چیت میں اس لفظ کا آزادانہ استعمال کرتے ہیں۔ شرم و حیا کا کوئی تصور اب باقی نہیں رہا ہے۔ ہمارے ڈرامے دیکھ کر بعض اوقات تو یہ جاننا مشکل ہوتا ہے کہ یہ انڈین ہے یا پاکستانی؟ پاکستان بنانے کا ایک سبب یہ دلیل بھی تھی کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کا رہن سہن، رسم و رواج، لباس، بول چال اور طرزِ زندگی بالکل مختلف ہے لیکن ہمارے ڈراموں نے امتیاز کی یہ دیواریں بھی گرادی ہیں۔ اگر پاکستان اور بھارت کے معاشرتی رواج یکساں ہوں تو پھر مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ ملک بنانے کی کیا ضرورت تھی؟ قائداعظم، علامہ اقبال اور ہمارے بزرگوں کی روحیں یہ سب کچھ دیکھ کر کس قدر اذیت میں مبتلا ہوں گی کیا ہم نے دولت کمانے کے لالچ میں کبھی یہ سوچا ہے؟

فلمیں تو اب ناپید ہو چکی ہیں اس لیے گھروں اور خاندانوں میں واحد سستی تفریح ٹی وی ڈرامے ہی رہ گئے ہیں۔ شب و روز اس قسم کے ڈرامے دیکھ کر اب تو کوئی اس پر اعتراض بھی نہیں کرتا۔ گویا ہم نے اس طرزِ زندگی کو نہ صرف قبول کرلیا ہے بلکہ اپنا بھی لیا ہے، ہمارے شہروں کے باغوں اور ریستورانوں میں نوجوان لڑکے لڑکیوں کا آزادانہ میل جول اور راتوں کو گھومتے پھرنا حقیقی زندگی میں بھی رچ بس گیا ہے۔ ہمارے بچوں کی زبانوں پر اب بھارتی اداکاروں کے نام اور بگڑی ہوئی زبان سن کر کسی کو حیرت نہیں ہوتی۔

افسوس ''کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا''۔

ٹی وی ڈراموں کی مادر پدر آزادی نے سابقہ تمام پابندیوں کو بے دردی سے قدموں تلے روند ڈالا ہے۔ اب ہمیں اپنے ڈراموں میں سگریٹ نوشی تو کیا شراب نوشی کے مناظر بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ شراب پی کر لڑکیوں کو ہوس کا نشانہ بنانے کے مناظر بھی عام ہو چکے ہیں۔

ہماری حکومت اور متعلقہ محکمے خاموشی سے یہ سب کچھ دیکھ رہے ہیں اور اس قومی تباہی و بربادی سے بالکل بے نیاز اور بے تعلق ہیں یا پھر وہ خود بھی یہی چاہتے ہیں؟

اس طویل داستانِ الم کو بیان کرنے کا مقصد دراصل یہ ہے کہ کسی زمانے میں ٹی وی والوں کا ماحول اور اخلاق کا معیار بہت بلند تھا۔ عام طور پر اچھے خاندانوں کی مہذب اور تعلیم یافتہ لڑکیاں ہی ٹیلی ویژن کا رخ کیا کرتی تھیں۔ آج بھی کم و بیش وہی صورتِ حال ہے۔ پرائیویٹ چینلز کے ڈراموں اور دوسرے پروگراموں میں حصہ لینے والی کم بیش تمام لڑکیاں تعلیم یافتہ اور اچھے خاندانوں کی ہیں۔ ٹاک شوز اور نیوز کاسٹرز میں بھی تعلیم یافتہ لڑکیاں ہی چھائی ہوئی ہیں۔ پرائیویٹ چینلز والوں نے ایک نیا رواج یہ اپنایا ہے کہ ہر قسم کے پروگراموں میں فلموں کے فن کار یا ٹی وی کی خواتین ہی نظر آتی ہیں۔ یہاں تک کہ رمضان المبارک کے

پروگرام پیش کرنے والوں میں بھی ٹی وی کے اداکار اور اداکارائیں پیش پیش نظر آئے۔ کس قدر مضحکہ خیز بات ہے کہ حقیقی اور عملی زندگی میں جو فن کار دین اور مذہب سے کوسوں دور ہیں وہ مذہبی پروگراموں کی میزبانی کررہے ہیں۔ وہ وقت دور نہیں ہے جب پیشہ ور اور تجربہ کار صحافیوں کی جگہ ٹی وی چینلز پر ہر جگہ ٹی وی کے فن کار ہی نظر آئیں گے۔

ٹی وی کی وجہ سے بے حیائی، مغرب پرستی اور بھارت نوازی جتنی تیزی سے پھیل رہی ہے اور ہماری فن کارائیں اور دیگر پروگرام پیش کرنے والی لڑکیاں مذہب، مشرقی تہذیب اور اقدار سے جس تیزی سے چھٹکارا حاصل کررہی ہیں اور عریانی اور بے حیائی کو اپنا رہی ہیں اس کے پیشِ نظر یہ تصور ہی بے انتہا روح فرسا ہے کہ ہماری آنے والی نسلیں ان ہی ماؤں کی گود میں کھیلیں گی اور ان ہی کے نقشِ قدم پر چلیں گی۔ مائیں اولاد کے لیے اولین تربیت گاہیں ہوتی ہیں۔ آج کی یہ مائیں کل اپنے بچوں کو کیا سکھائیں گی اور کس ڈگر پر ڈالیں گی۔

رونا تو اس بات کا ہے کہ فلمی صنعت کو اپنانے والی طوائفیں بھی اخلاق اور تہذیب کا نمونہ پیش کرتی تھیں مگر آج شریف اور تعلیم یافتہ گھرانوں کی لڑکیوں نے انہیں بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ خاندانی شرافت اور تعلیم کو الوداع کہہ دیا گیا ہے۔ ہماری معاشرت کو کھوکھلا کردیا ہے، اور ہم سب خاموش تماشائی ہیں۔ اللہ رحم کرے۔

☆☆☆

لاہور اپنے لذیذ اور چٹ پٹے کھانوں کے لیے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ لاہوری کھانے پینے کے شوقین ہیں اسی لیے لاہور میں انواع و اقسام کے کھانے دستیاب ہیں۔ باہر سے آنے والے یورپین سیاح بھی اگر ایک بار لاہور کے کھانے کھالیں تو زندگی بھر اس کا ذائقہ بھول نہیں سکتے۔ شاید لاہور والوں کے ہاتھوں میں ایسا ذائقہ ہے کہ وہ جو بھی کھانا بناتے ہیں وہ لذیذ اور ذائقے سے بھرپور ہوتا ہے۔ آج کل تو تکے کباب، سیخ کباب، کڑھائی اور اس قسم کے کھانے سارے شہر میں کھانے کو مل جاتے ہیں لیکن ان سب کا آغاز پرانے لاہور سے ہی ہوا تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد جب ہم لاہور آئے تو اس زمانے میں سیخ کباب وغیرہ گوالمنڈی میں ہی ملتے تھے اور دور دور سے لوگ ان سے لطف اندوز ہونے کے لیے گوالمنڈی جاتے تھے وگرنہ اس قسم کے کھانے پرانے لاہور ہی میں کھانے کو ملتے تھے اور شوقین وہیں جاکر ان کے ذائقے سے مزہ لیتے تھے۔ ایبٹ روڈ پر بھی تکے کباب، چانپوں اور مخصوص کبابوں کی چند دکانیں تھیں۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ پرانے لاہور کے مشہور و معروف کھانے سارے لاہور میں پھیل گئے اور اب تو لاہور کے فیشن ایبل اور جدید علاقوں کے ریستورانوں میں بھی یہ بہت اہتمام سے پیش کیے جاتے ہیں اور ماڈرن لوگ بھی ان کے ذائقے سے واقف ہو چکے ہیں۔

1951-52ء جن دنوں ہم ہفت روزہ ''چٹان'' میں آغا شورش کی زیرِ ہدایت کام کرتے تھے۔ سردی کی شام تھی اور لاہور میں کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ ہم گوالمنڈی کے سیخ کباب کی تعریف کررہے تھے کہ اچانک آغا صاحب بولے ''مولانا، آیئے آج ہم آپ کو چونا منڈی کے کباب کھلاتے ہیں۔ تم کن کھانوں کی بات کرتے ہو، لاہور کے روایتی کھانوں کے بارے میں تم کچھ نہیں جانتے۔ آؤ آج تمہیں چونا منڈی کے سیخ کباب کھلاتے ہیں'' سب فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ حسبِ معمول آغا صاحب کے دفتر کے باہر قدم رکھتے ہی تانگے والے رک گئے۔ ''آغا صاحب کہاں جانا ہے۔ تانگا حاضر ہے''

آغا صاحب اپنی عادت کے مطابق آگے بیٹھ گئے اور ہم تینوں تانگے کی پچھلی سیٹ پر براجمان ہوگئے۔ میکلوڈ روڈ کے بعد تانگے والے نے پرانے لاہور کا رخ کیا۔ اس وقت تک ہم پرانے لاہور کے راستوں سے واقف نہیں تھے۔

ہم نے پہلی بار پرانے لاہور کی سڑکیں، گلیاں اور پرانی وضع کے مکانات دیکھے اور ان سے بہت متاثر ہوئے۔ پرانے لاہور کے ماحول اور نقش و نگار میں اس وقت تک تبدیلیاں رونما نہیں ہوئی تھیں۔ پرانے روایتی لاہور کے شب و روز اس وقت تک بدلے نہیں تھے، نہ ہی پرانے لاہور کو چھوڑ کر صاحبِ حیثیت لوگوں نے شہر کے نئے علاقوں کا رخ کیا تھا۔ ہر سڑک اور چوک ہلکی سی دھند میں لپٹا ہوا، مصور کا شاہکار معلوم ہوتا تھا۔ تانگا یکساں رفتار سے چلا جارہا تھا۔ تانگے میں بیٹھے ہوئے لوگ باتوں میں مصروف تھے۔ آغا صاحب اپنے مخصوص انداز میں گردن کو ایک طرف خم دیے ہوئے کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

کئی سڑکوں اور تنگ گلیوں سے گزر کر تانگا ایک جگہ رک گیا۔ پرانے لاہور کی اکثر سڑکیں اور گلیاں پتھروں سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

بنی ہوئی تھیں۔ کچھ عرصے بعد جب ہم یورپ گئے تو وہاں پیرس، لندن اور روم میں بھی ایسی ہی پتھریلی سڑکیں دیکھنے کو ملیں جن کا ایک علیحدہ حسن ہوتا ہے۔ یہ پتھروں سے بنی ہوئی سڑکیں تارکول سے بنی ہوئی سڑکوں سے زیادہ مضبوط ہوتی ہیں۔

"آغا جی۔" تانگے والے نے آغا صاحب کو مخاطب کیا تو وہ چونک کر خیالوں کی دنیا سے باہر نکل آئے۔ یہ ایک تنگ سی سڑک تھی۔ سامنے سیخ کباب والی دکان نظر آرہی تھی۔ یہاں ایک بات اور واضح کردیں کہ آغا صاحب ہمیشہ تانگے کے اگلے حصے میں بیٹھتے تھے تانگا بان ان کے ساتھ بیٹھنے کے بجائے اگلے پائیدان پر بیٹھ کر تانگا چلاتا تھا۔ یہ آغا صاحب کی محبت اور احترام میں کیا جاتا تھا۔

تانگے سے اترے تو آغا صاحب نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور جتنے بھی پیسے مٹھی میں آئے وہ تانگے والے کو دے کر دکان کی طرف چل پڑے۔ دکان کا مالک دور ہی سے بولا "آغا صاحب، اندر آجایئے۔ بڑے دن بعد آئے ہیں۔"

مختصر سی دکان تھی جس میں چند کرسیاں اور ایک میز پڑی ہوئی تھی، اس زمانے میں کھانے کی دکانوں میں اس قسم کا بندوبست نظر آتا تھا۔

دکان کے مالک نے بہ ذات خود کرسیاں آراستہ کیں۔ میز کو کپڑے سے صاف کیا اور پھر پوچھا۔ "حکم کیجیے آغا جی۔"

آغا صاحب نے کہا۔ "بٹ صاحب، پانچ درجن کباب اور دہی۔"

"ابھی لیجیے۔" کہہ کر دکاندار رخصت ہوگیا۔

ہم نے حیران سے زیادہ پریشان ہوکر کہا۔ "شورش صاحب، پانچ درجن کباب کون کھائے گا؟"

مسکرا کر بولے۔ "مولانا، آپ فکر نہ کیجیے، کباب کھایئے۔"

کچھ دیر بعد خوشبو سے مہکتے ہوئے گرما گرم کباب ایک بڑی سی تھالی میں ہمارے سامنے رکھ دیے گئے۔ ساتھ میں چند گرما گرم نان بھی تھے۔ نان اور کباب کی خوشبو سے اچانک ہم بھوک سے بے تاب ہوگئے۔

"لیجیے مولانا۔ بسم اللہ کیجیے۔"

کباب پتلے پتلے تھے۔ کباب منہ میں رکھتے ہی گھل گیا اور ہم اس کی لذت سے سرشار ہوگئے۔ پھر ایسے کباب واقعی کبھی نہیں کھائے۔ نہ اس سے پہلے نہ اس کے بعد۔ تھوڑی دیر میں ایک مٹی کے بڑے سے پیالے میں دہی بھی آگیا۔ چمچے سے دہی کو چکھا تو طبیعت باغ باغ ہوگئی۔ کچھ ہی دیر میں طباق خالی ہوگیا۔ ہم چاروں پانچ درجن کباب کھا گئے تھے، نان کو کسی نے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔

کھانے کی جتنی بھی مشہور دکانیں تھیں وہ پرانی لاہور ہی میں تھیں۔ نان کباب، نہاری، بریانی، ہریسہ، مٹھائی، دہی، پیڑے، لسی، زردہ پلاؤ، فیرنی، تکے کباب، پان، قوام اور زردے والا جس کے کھاتے ہی وہ منہ میں حل جاتا تھا اور سارا کمرا قوام کی خوشبو سے مہک جاتا تھا۔ دور دور سے لوگ بسم اللہ کی دکان پر پان کھانے کے لیے آتے تھے۔ یہاں پھول والوں کی دکانیں بھی تھیں۔ اس زمانے میں لاہور میں گلفروشی کا رواج نہیں ہوا تھا۔ صرف اندرونِ شہر کے علاقوں میں تازہ گلاب اور گیندے کے پھول، موتیے کے گجرے اور پھولوں کے ہار فروخت کیے جاتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد مال روڈ پر ریگل سنیما کے عقبی دروازے اور حاجی کریم بخش کی دکان کے سامنے ایک گل فروش کی دکان تھی۔ ہر طرح کے موسم میں پھول یہاں مل جاتے تھے۔ جاڑوں میں نرگس کے پھولوں کی خوشبو ہر گزرنے والے کو اپنی طرف کھینچ لیتی تھی۔

اندرونِ شہر مسجد وزیر خان سے لے کر چونا منڈی تک کھانوں کی دکانیں تھیں جو سارے شہر میں مشہور تھیں۔ چونا منڈی کے خلیفہ کے کباب بہت مشہور تھے۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ آغا شورش کے ساتھ ہم نے چونا منڈی میں جو کباب کھائے تھے وہ خلیفہ کی دکان تھی۔ خلیفہ کے کباب اہلِ ذوق میں بہت مقبول تھے۔ بتایا گیا ہے کہ علامہ اقبال بھی خلیفہ کی دکان پر کھانے جایا کرتے تھے۔ پطرس بخاری جب بھی لاہور آتے تھے تو خلیفہ کی دکان پر کباب کھانے کے لیے ضرور جایا کرتے تھے، مُلّا حسین حلوائی کی دکان کے پیڑوں کی لسی بہت مشہور تھی۔ اس کی دکان کا دہی بھی بہت مشہور تھا۔ موچی دروازے کے باہر پھول والوں کی دکانوں پر ہمیشہ ہجوم نظر آتا تھا شادی بیاہ جن گھرانوں میں ہوتا تھا ان ہی دکانوں سے پھول اور ہار وغیرہ خریدا کرتے تھے۔ چوک برف خانہ کے نزدیک ایک دکان ایسی تھی جس پر عورت بھی بیٹھی نظر آتی تھی۔ یہ بسم اللہ کی دکان کہلاتی تھی۔ مشہور و معروف ادیب اور شاعر یہاں پان کھانے کے لیے آتے تھے۔ شاہی محلے کے پان بھی بہت مشہور تھے۔

بسم اللہ کے پانوں میں لکھنؤ کا قوام اور زردہ ڈالا جاتا تھا۔

لوہاری گیٹ کے اندر سے اور گجر پلا کی بہت شہرت تھی۔ چوک مسجد وزیر خان کی دکان کی حلوا پوری، قتلمہ مشہور تھے۔ اس دکان کے حلوے بھی ذائقے کی وجہ سے بہت مشہور تھے جن پر بادام اور پستے بھی ڈالے جاتے تھے جن کی وجہ سے مزہ دوبالا ہوجاتا تھا۔ موچی گیٹ کے اندر ایک حلوائی کی دکان تھی۔ یہاں کی باداموں والی برفی بہت مشہور تھی۔ شادی بیاہ کے موقعے پر یہاں سے برفی منگائی جاتی تھی۔ یہ بہت پرانی دکان تھی جو قیامِ پاکستان سے پچاس ساٹھ سال پہلے بھی مشہور تھی، موتی بازار میں ایک دکان کی دہی کی لسی بہت مشہور تھی۔ اندرون موچی دروازے عمر خان کا تندور بہت مشہور تھا۔ اس دکان کے نان بہت مشہور تھے، اس دکان سے نان خرید کر دوسرے شہروں کو لے جاتے تھے مگر وقت گزرنے کے باوجود ان کی تازگی اور لطف میں کمی نہیں ہوتی تھی، ہیرا منڈی کی نہاری اور سری پائے کی دکانیں بھی بہت مشہور تھیں۔ بھاٹی دروازے کے باہر مچھلی فروشوں کی دکانوں کی مچھلی بہت پسند کی جاتی تھی اور سارے شہر کے لوگ یہاں مچھلی کھانے کے لیے آیا کرتے تھے۔

سری پائے اور نہاری کا ہمیں کبھی شوق نہیں رہا۔ لیکن لاہور کے اور تمام کھانوں کا مزہ چکھ چکے ہیں۔ اندرونِ شہر آمد و رفت بہت مشکل تھی اس لیے ہم نے مال روڈ اور میکلوڈ روڈ پر مزے دار کھانوں کی دکانیں تلاش کرلی تھیں۔ ریگل سنیما کے گیٹ کے ساتھ ایک دکان کا قورمہ اور ٹکیاں بے حد لذیذ تھیں۔ یہاں خالص گھی میں قورمہ پکایا جاتا تھا۔ قورمے کی ایک پلیٹ سوا روپے کی اور آدھی پلیٹ دس آنے میں ملتی تھی۔ اس دکان کے اندر بیٹھنے کی بھی تھوڑی سی گنجائش تھی جہاں کرسیاں اور میزیں پڑی ہوئی تھیں۔

دکان کے سامنے والے حصے میں قورمے کے بڑے بڑے دیگچے رکھے ہوئے تھے، جب دیگچے کا ڈھکنا اٹھایا جاتا تو قورمے اور اصلی گھی کی مہک ہر طرف پھیل جاتی تھی۔ قورمے کے ساتھ یہاں بڑے سائز کی پتلی چپاتیاں بھی ملتی تھیں جو کسی اور ریستوران میں کبھی نہیں دیکھیں۔ جس زمانے میں ہم روزنامہ "آفاق" میں کام کرتے تھے دوپہر کے وقت لنچ کھانے اس دکان پر چلے جاتے تھے یا کسی کو بھیج کر دفتر ہی میں منگوا لیتے تھے۔ ایک پلیٹ قورمے اور چار چپاتیاں کھانے میں چند اور ساتھی بھی شریک ہوجاتے تھے۔

اگر ہم اکیلے دکان پر جاتے تو آدھی پلیٹ بہت کافی ہوتی تھی۔ دس آنے کی قورمے کی پلیٹ، دو آنے کی دو چپاتیاں کھانے کے بعد ایک آنے کی چائے کی پیالی پی کر اللہ کا شکر ادا کرتے تھے۔ اس طرح چائے سمیت کُل تیرہ آنے میں ہوجاتا تھا۔ اس دکان میں چھوٹے سائز کی شامی کباب جیسی ٹکیاں بھی ملتی تھیں۔ قیمے والی اور آلو والی۔ یہ لذیذ ٹکیاں کچھ لوگ قورمے کے ساتھ یا اس کے بغیر چپاتی کے ساتھ کھاتے تھے۔

ٹکیوں سے یاد آیا کہ میکلوڈ روڈ پر کیپٹل سنیما کے گیٹ کے ساتھ کباب کی ایک دکان تھی جس پر آلو اور گوشت کی ٹکیاں ملتی تھیں۔ ہم چند دوست گوشت کی ٹکیوں کو مکھن کی ایک ٹکیا میں تلوا کر نان سے کھاتے۔ اس کا لطف ہی کچھ اور تھا۔ ایک ٹکیا دو آنے کی اور مکھن کی ٹکیا دو آنے کی ہوتی تھی۔ نان کی قیمت آٹھ آنے تھی۔

میکلوڈ روڈ پر آغا جی اے گل اور باری ملک کے دفاتر کے درمیان ایک کھلی جگہ میں لکڑی کے تخت پر ایک دکان تھی۔ یہاں صرف چنے کی دال اور سادہ چاول ملتے تھے۔ یہ دال اور چاول اتنے لذیذ تھے کہ ہم جب بھی لکشمی چوک جاتے تھے خورشید قادری اور اعجاز کے دفتر میں بیٹھ کر دال چاول کی فرمائش ضرور کرتے تھے۔ یہ دال چاول والا دو بڑی بڑی دیگیں لے کر بیٹھا کرتا تھا۔

ایک دیگ میں چاول اور دوسری دیگ میں دال ہوتی تھی۔ یہ دیگیں ختم ہونے کے بعد دو نئی دیگیں آجاتی تھیں۔ دال چاول کی ایک پلیٹ آٹھ آنے کی تھی۔ یہ پلیٹ ہم اکیلے ختم نہیں کرسکتے تھے۔ دال چاول والے کی صبح سے شام تک چاول کی دس اور دال کی دس دیگیں ختم ہوجاتی تھیں۔ دور دور سے صاحبِ حیثیت لوگ کار بھیج کر یہ دال چاول منگایا کرتے تھے۔

میکلوڈ روڈ پر "چٹان" کے دفتر کے نزدیک پلاؤ اور زردے والے کی ایک دکان تھی۔ ایک پلیٹ پلاؤ آٹھ آنے میں اور زردے کی ایک پلیٹ بھی آٹھ آنے کی تھی۔ دکان پر ہمیں ہمارے فلم ساز دوست شوکت شیخ لے کر گئے تھے۔ ان کی بیگم بھی کار میں ہمارے ساتھ تھیں۔ شوکت شیخ نے ایک پلیٹ پلاؤ کا آرڈر دیا۔ یہ اتنی بڑی پلیٹ تھی کہ ہم لوگوں نے دو اور خالی پلیٹیں منگا کر یہ پلاؤ ختم کیا۔ اس کے بعد زردے کی پلیٹ منگائی گئی۔ ہم سب یہ دو پلیٹ کھا کر سیر ہوگئے۔ بے حد لذیذ پلاؤ اور زردہ تھا۔ اسی دکان کے نزدیک آئس

WWW.PAKSOCIETY.COM

کریم کی ایک دکان تھی جس کا نام اسٹوڈنٹس کارنر تھا، یہاں کی آئس کریم بے حد لذیذ تھی۔ دو آنے کی آئس کریم سے دل بھر جاتا تھا۔

☆☆☆

ریاض شاہد کو آج کی نسل بھول بیٹھی ہے کیونکہ پاکستان کے پرانے فلمی شاہکار انہوں نے دیکھے ہی نہیں، مگر پرانی نسل ریاض شاہد کا نام سن کر اس کے کارنامے بیان کرنے لگتی ہے۔ اس کی یادگار فلمیں گنوانے لگتی ہے۔ بھروسا، شہید، فرنگی، خاموش رہو، کلرک، زرقا، اور بے شمار فلموں کے مکالمے اور اسکرین پلے ریاض شاہد نے لکھے تھے۔ وہ بہ ظاہر ایک بے نیاز انسان تھا مگر اس کو عزتِ نفس بہت عزیز تھی۔ اس نے جب اپنے فن کا لوہا منوالیا تو ہدایت کار اس کے آگے پیچھے پھرتے تھے۔ ریاض شاہد نے فلمی مصنف کی حیثیت سے کہانی نویسوں کی عزت میں اور معاوضوں میں اضافہ کرایا۔ اس نے خود اپنی تحریروں کے لیے منہ مانگی رقم وصول کی۔ اس طرح دوسرے لکھنے والے بھی خوشحال ہوگئے۔ وہ ہدایت کاروں کو سامنے بٹھا کر ان سے ڈکٹیشن لکھواتا تھا۔ اس سے پہلے کہانی نویس ہدایت کاروں کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے نظر آتے تھے۔ فلم نویسی کے پیشے کو پاکستان میں عزت دلانے والا ریاض شاہد ہی تھا۔

وہ دیکھنے میں ایک بے فکر، بے نیاز اور ہنسنے ہنسانے والا شخص نظر آتا تھا مگر وہ ذہنی طور پر کھویا کھویا اور خیالوں میں ڈوبا رہتا تھا۔ بعض لوگ بچپن سے ہی اپنے ناخن دانتوں سے کاٹنے کے عادی ہوتے ہیں۔ ریاض شاہد جب بے چینی سے اپنے ناخن کاٹتا نظر آئے تو پتا چل جاتا تھا کہ وہ پریشان ہے یا کسی سوچ میں گم ہے۔

ایک دن ہم نے کہا۔ ''تم اپنے ناخن تو کھا چکے ہو اب کیا کرو گے؟''

بولا۔ ''ابھی انگلیاں باقی ہیں۔''

ریاض شاہد کی ہر فلم ساز اور ہدایت کار سے دوستی ہوجاتی تھی اس لیے جب کوئی فلم ساز یا ہدایت کار اس کو پکڑ کر لے جاتا تو وہ دوسرے کام چھوڑ کر اس کے کام میں مصروف ہوجاتا۔ دوسرے ہدایت کار اس کو ڈھونڈتے رہ جاتے، وجہ یہ تھی کہ وہ کسی کو انکار نہیں کرسکتا تھا۔ اس معاملے میں وہ اداکار اسلم پرویز کی طرح تھا۔ اپنی تعریف سن کر وہ شرما جاتا تھا۔ وہ گورا چٹا خوب صورت آدمی تھا اس لیے بے تکلف دوست اس کو ''چٹا'' کہہ کر بلاتے تھے۔ ہدایت کاروں میں اس نے خلیل قیصر اور حسن طارق کے ساتھ بہت کام کیا۔ دوستی بھی بہت گہری تھی مگر خلیل قیصر عین جوانی میں کسی کے خنجر کا نشانہ بن گیا تو وہ بے کل رہنے لگا، کچھ عرصے بعد وہ خود بھی دنیا سے چلا گیا۔ حسن طارق اس کے کئی عرصے بعد تک جیا اور پھر ایک دن دنیا سے چلا گیا۔ یہ تینوں جوان موت مرے اور فلمی دنیا کو بے آسرا کرگئے۔ ریاض شاہد کا مزاج شروع سے ہی ڈرامائی تھا۔ اسے ہر چیز میں ڈراما پیدا کرنے کا شوق تھا۔ اس کا کہانیاں اور مکالمے لکھنے کا انداز، بات کرنے کا انداز، زندگی گزارنے کا انداز سبھی میں ڈرامائی عنصر موجود تھا۔ خود اس کی زندگی بھی ڈرامائی واقعات اور حوادث کا نمونہ تھی۔ ایک شخص جس نے قدیم لاہور کے گلی کوچوں میں جنم لیا ہو، جس کے آس پاس ہنگاموں، لڑائی جھگڑوں اور بات بات پر جواں مردی کا ثبوت دینے والوں کا ہجوم ہو اس نے اپنے لیے ایک مصنف کا کردار کیسے چن لیا۔ لکھنے پڑھنے اور تخلیق کرنے کا شوق ریاض شاہد نے ورثے میں نہیں پایا تھا۔ یہ خداداد تھا۔ وہ اپنے بھائیوں بلکہ پورے خاندان میں پہلا صاحبِ قلم تھا۔ ریاض شاہد کی پیروی میں اس کے بھائیوں نے بھی بعد میں آرٹ اور کلچر کی طرف توجہ دی اور اس میدان میں نمایاں کام بھی کیے۔ غالباً یہ ریاض شاہد کی صحبت اور اس ماحول کا اثر تھا جو ریاض شاہد نے اپنے اردگرد پیدا کرلیا تھا۔

پہلے تو ریاض شاہد نے اپنی خاندانی روایات کے برعکس کہانیاں لکھنے اور صحافت کا پیشہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا عروج اور ترقی بھی ڈرامائی تھی۔ اس نے بہت تیزی سے صحافت کی منزلیں طے کیں، کہانیاں لکھیں، ناول تحریر کیا، پھر فلموں کا رخ کیا تو دوسروں سے مختلف طرز کی کہانیاں اور مکالمے لکھے، فلموں کی ہدایات دیں، فلمیں بنائیں، یہ سب کچھ اس نے ابتدائی عمر ہی میں کرلیا تھا۔ شعبے میں اس کی کارکردگی ممتاز اور نمایاں تھی۔ اس نے اچانک اور بالکل ڈرامائی انداز میں شادی کی، کسی کے وہم گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ یکا یک شادی کرلے گا اور وہ بھی ایک اداکارہ سے۔ ایکٹنگ کا پیشہ اختیار کرنے والوں کو ہمیشہ مذاق ہی اڑاتا رہا تھا۔ مگر جب اس نے ایک دم ایک ایکٹریس نیلو کو شریکِ حیات بنانے کا فیصلہ کیا تو یہ بھی ایک ڈرامائی موڑ تھا۔ اس کی بیماری بھی آناً فاناً سامنے آئی اور اس سے پہلے کہ لوگ اس کی شدت اور سنگینی کا اندازہ لگا سکیں

دنیا سے رخصت ہوگیا۔ گویا اس کی زندگی کا انجام بھی غیر معمولی اور ڈرامائی تھا۔ ایک ہنر مند اور لکھنے والے تخلیق کار کی موت کا اس قدر شدت سے ماتم نہیں کیا جاتا جتنا ریاض شاہد کا سوگ منایا گیا۔ جنازے کے جلوس میں اس قدر ہجوم تھا کہ سڑکیں بند ہوگئیں۔ ریاض شاہد کی روح یہ آخری ڈرامائی منظر دیکھ کر یقیناً مسرور ہورہی ہوگی۔

اس کی بیماری زیادہ طویل نہیں تھی مگر وہ موضوعِ گفتگو اور خبروں کا ذریعہ بن گئی تھی۔ ریاض شاہد جیسے شخص کا انجام بھی ڈرامائی ہی ہونا چاہیے تھا۔ یہ نہیں کہ اسے اپنی بیماری کی اہمیت کا اندازہ نہیں تھا مگر وہ ڈراما باز اپنے دوستوں اور جاننے والوں کو یہی یقین دلاتا رہا کہ اس کی بیماری معمولی نوعیت کی ہے۔ اپنے اس خیال کی تصدیق کرنے کے لیے وہ اچانک اسپتال کے کمرے سے غائب ہوجاتا۔ ایک دن ہم اس کی مزاج پرسی کے لیے اسپتال گئے تو وہ کمرے سے غائب تھا۔ پتا چلا کہ وہ اکثر غائب ہوجاتا ہے۔ اپنے گھر چلا جاتا ہے یا پھر مختلف زیرِ تکمیل فلموں کے مکالمے اور اسکرین پلے لکھنے میں مصروف ہوجاتا ہے۔ مجھے دوسری بار اسپتال میں ملنے پر اس نے بتایا تھا کہ اس کی بیماری کوئی خاص نہیں ہے۔ وہ صرف اس بہانے فلم سازوں سے چھپ کر آرام کررہا ہے۔ جب تک اس کی بیماری نے انتہائی شدت اور نازک صورت اختیار نہیں کی تھی ریاض شاہد کا یہی رویہ تھا۔ اس قدر جان لیوا اور اعصاب شکن بیماری میں مبتلا ہونے کے باوجود وہ لکھنے پڑھنے کا کام کیوں کررہا تھا؟ کیا یہ اس کی معاشی ضرورت تھی؟ کیا وہ اپنے بچوں اور بیوی کے مستقبل کی جانب سے فکر مند ہوگیا تھا؟ ایک تخلیق کار کی ان مجبوریوں سے معاشرے کی بے اعتنائی اور بے حسی کا بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ریاض شاہد ایک غیور اور خوددار آدمی تھا۔ اس نے زندگی میں کبھی کسی کا احسان نہیں لیا تھا۔ جب اس کے علاج کے لیے اسے ملک سے باہر بھیجنے کے لیے فلم سازوں اور بڑے بڑے اداکاروں نے اسے اپنے خرچ پر لندن روانہ کرنا چاہا تو ریاض شاہد نے مختلف حیلوں بہانوں سے اس میں تاخیر پیدا کرنی شروع کردی۔ شاید وہ کسی کا ممنونِ احسان نہیں ہونا چاہتا تھا۔ کسی دوسرے کا احسان اٹھانے کے مقابلے میں اس نے بہ ذاتِ خود دنیا سے اٹھ جانے کو ترجیح دی تھی۔

ریاض شاہد کس قدر لاابالی اور بے نیاز شخص تھا اس کا اندازہ لگانے کے لیے دو واقعات کافی ہیں۔ ریاض شاہد کی ایک فلم کامیاب ہوئی اور تھوڑا سا پیسا ہاتھ میں آیا تو ریاض نے بیوی بچوں کے سر چھپانے کے لیے گھر حاصل کرنے کی طرف توجہ دی۔ اس نے گلبرگ میں ایک چار کنال کی کوٹھی پسند کی۔ یہ انشورنس کمپنی کے ایک بڑے افسر کی ملکیت تھی۔ پراپرٹی ڈیلر کے ذریعے بات چیت ہوئی اور ایک رقم طے ہوگئی۔ بجائے بہانہ کرنے کے ریاض شاہد دوسرے دن ان کے پاس گیا۔ اس کے پاس ایک پیکٹ تھا جو اس نے مالک کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ اور کہا ''اس میں اسّی ہزار روپے ہیں۔ باقی میں آپ کو بعد میں دے دوں گا۔''

''مگر رجسٹری وغیرہ.....؟'' انہوں نے کہا۔

''وہ بھی ہوجائے گی مگر باقی رقم کی ادائیگی کے بعد۔''

ان صاحب نے مجھے بتایا۔ ''وہ عجیب شخص تھا۔ اس نے مجھ سے دوسری بات کی، نہ اسّی ہزار روپے کی رسید مانگی۔ بس کافی کی ایک پیالی پی اور پیکٹ چھوڑ کر چلا گیا۔ اب میں نے اس کا انتظار شروع کردیا۔ ایک دن، دو دن، ہفتہ، دو ہفتے گزر گئے۔ مگر ریاض شاہد کی صورت نظر نہیں آئی۔ میں نے فون پر رابطہ کرنا چاہا تو بھی وہ نہ ملا۔ میں حیران تھا کہ آخر یہ شخص چاہتا کیا ہے؟ نہ لکھت پڑھت، نہ کاغذ، نہ رسید۔ نہ کوئی پیغام۔ نہ باقی پیسوں کی ادائیگی کا انتظام، میں تھک ہار کر بیٹھ گیا۔ اس کوٹھی کے لیے اور بھی اچھی آفرز آرہی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں؟ مگر میں ریاض شاہد کا مداح بھی تھا۔ اس لیے اس کا انتظار کرتا رہا۔ کافی عرصے کے بعد ایک دن وہ اچانک دفتر میں نمودار ہوا۔ علیک سلیک کے بعد ایک اور پیکٹ میری میز پر رکھ دیا۔

''لیجیے اپنی بقایا رقم۔'' اس نے کرسی پر بیٹھ کر کہا۔

''مگر آپ کہاں غائب ہوگئے تھے؟''

''بس ذرا مصروف تھا۔ آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لیے بھی جانا پڑ گیا۔ اب مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''یہ کوٹھی کی چابیاں سنبھالیے۔ رجسٹری وغیرہ کے کاغذات تیار کرانے ہوں گے۔'' وہ کافی پی کر اور چابیاں سنبھال کر رخصت ہوگیا۔ کچھ دن بعد مجھے پتا چلا کہ اس نے اس کوٹھی میں رہنا شروع کردیا ہے۔ کسی قسم کے کاغذات یا رجسٹری کے بغیر۔ شاید خود اپنی ذات کی مانند اسے دوسروں پر بھی اعتماد تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

ان ہی انشورنس افسر نے ایک اور واقعہ بھی سنایا۔ ہوا یہ کہ بعد میں ان سے ریاض شاہد کی دوستی ہوگئی۔ انہوں نے اسے زندگی کی انشورنس کرانے پر آمادہ کرنا شروع کردیا۔ ریاض شاہد نے ایک بھاری رقم کی انشورنس پالیسی خرید تو لی مگر دو قسطیں ادا کرنے کے بعد حسبِ عادت لاپتا ہوگیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ''میں نے بہت تلاش کیا قسطیں ادا کرنے کے لیے مشورے دیے مگر وہ وعدہ کرتا رہا اور ٹالتا رہا۔ یہاں تک کہ پالیسی لیپس ہوگئی۔ پھر اچانک ریاض شاہد کی بیماری کا چرچا ہونے لگا۔ میں اس سے ملنے کے لیے اسپتال گیا۔ اس کی حالت خاصی خراب اور تشویشناک تھی مگر وہ حسبِ معمول اپنی باتوں کا جادو جگا رہا تھا۔ میں نے موقع پاکر اسے بتایا کہ اگر وہ دس ہزار روپے یکمشت پالیسی کی قسطوں کے طور پر جمع کرادے تو میں اس پالیسی کو ''زندہ'' کرادوں گا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے پاس روپیہ نہیں ہے۔ جو تھوڑا بہت تھا وہ بیماری پر لگ رہا ہے۔ اس بیماری میں مبتلا شخص کا زیادہ عرصے تک زندہ رہنا بھی ممکن نہیں ہے۔ اس لیے میری خواہش اور کوشش یہ تھی کہ اس کی پالیسی تازہ ہوجائے تاکہ بعد میں اس کے بعد بیوی بچوں کو انشورنس کی رقم مل جائے۔ وہ مجھ سے وعدے کرتا رہا اور ٹالتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک دن دنیا سے رخصت ہوگیا۔ میں آج بھی سوچتا ہوں کہ کیا وہ اتنی معمولی رقم کہیں سے حاصل نہیں کرسکتا تھا؟''

ہم نے کہا۔ ''کیوں نہیں؟ وہ کسی بھی دوست، ہمدرد یا مداح سے دس ہزار روپے لے سکتا تھا۔ مگر شاید اس کی خودداری نے گوارا نہیں کیا کہ وہ کسی کا احسان اٹھائے اور اپنے بیوی بچوں کو کسی کا زیرِ بار چھوڑ کر جائے۔''

ریاض شاہد کی تحریر کا ایک مخصوص انداز تھا۔ ڈراما اور ٹریجڈی لکھنے پر اسے عبور حاصل تھا۔ اسے ہنسنے ہنسانے والے ہلکے پھلکے موضوع پسند نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے کوئی رومانی کہانی نہیں لکھی نہ اس قسم کی فلم بنائی۔ وہ زندگی کے ٹھوس اور تلخ تجربات کو اپنی کہانیوں اور فلموں کا موضوع بنایا کرتا تھا۔ اس کی تمام کامیاب اور مشہور فلمیں ڈرامائی اور سیریس تھیں۔ اس کی فلموں میں اول تو رومان اور کامیڈی کی گنجائش ہی نہیں ہوا کرتی تھی اور اگر فلمی ضرورت کے لیے ایسا کرنا بھی پڑتا تو وہ ایسے مناظر کے ساتھ انصاف نہیں کرسکتا تھا۔ جب ریاض شاہد نے کہانی اور مکالمہ نویس کے طور پر عروج حاصل کرلیا اس وقت بھی فلم سازوں کو اس بات کا احساس تھا۔ وہ فلمی صنعت میں ڈراما نگاری کے لیے مشہور تھا اور رومانی یا کامیڈی تحریروں کو ہم سے منسوب کیا جاتا تھا۔ چنانچہ کئی فلم ساز ان دنوں ہمارے پاس یہ تجویز بھی لائے کہ فلم کے ڈرامائی حصے وہ ریاض شاہد سے لکھوالیں گے۔ رومانٹک اور کامیڈی مناظر کے لیے وہ میری خدمات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ بہت ممکن ہے کہ یہ تجویز وہ ریاض شاہد کے کہنے پر ہی پیش کرتے ہوں مگر ایسا اتفاق کبھی نہیں ہوا۔ حادثے کے طور پر ریاض شاہد کی بعض فلموں کے چند مناظر مجھے ضرور لکھنے پڑے۔ مگر پھر ایک قابلِ ذکر بات یہ ہوئی کہ ریاض شاہد کے مخصوص اور پسندیدہ ہدایت کاروں نے میرے ساتھ مل کر کام شروع کردیا۔ میں نے خلیل قیصر اور حسن طارق کی فلمیں لکھیں تو ریاض شاہد کو بہت ملال ہوا۔ باہمی ملاقات میں تو اس نے اظہار نہیں کیا مگر مجھے پتا چلا کہ دوستوں کی محفلوں میں وہ میرے خلاف غصے اور ناپسندیدگی کا اظہار کرتا ہے۔

پھر ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ کراچی میں ''نگار ایوارڈ'' کی تقریب کے موقعے پر جب دعوتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو ایک ڈنر میں غیر ملکی سفارت کار بھی شریک ہوئے۔ اس زمانے میں فلم والوں کی تقاریب اور محفلوں میں بڑے بڑے تاجر، صنعت کار اور سفارت کار بھی شریک ہونا ایک اعزاز سمجھا کرتے تھے اور وہ ایسی محفلوں کے انتظار میں رہتے تھے۔ اقبال شہزاد (مرحوم) کے بنگلے پر ڈنر میں کراچی کے بہت سے ممتاز لوگ، قابلِ ذکر خاندان اور غیر ملکی سفارت کار موجود تھے۔ اقبال شہزاد صاحب نے ایوارڈ حاصل کرنے والوں سے مہمانوں کا تعارف کرانے کا فریضہ مجھے سونپا۔

اس سال ایوارڈ کے لیے ریاض شاہد کے ساتھ ہمارا نام بھی نامزد کیا گیا تھا مگر ایوارڈ ریاض شاہد کے حصے میں آیا۔ موسیقی کے لیے رشید عطرے مرحوم کو ایوارڈ ملا۔ بھارتی سفارت کاروں کو پاکستانی فلموں اور فلمی شخصیتوں سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ اس دلچسپی کے پیشِ نظر میں نے بھارتی سفارت کاروں کا خاص طور پر پاکستان کی فلمی شخصیات سے تعارف کرایا۔ خلیل قیصر، حسن طارق، رشید عطرے، سنتوش کمار، خورشید انور، کیسے کیسے لوگ وہاں موجود تھے۔ رشید عطرے، خلیل قیصر اور ریاض شاہد ایک ہی میز پر یکجا تھے۔ ان کے پاس گئے تو میں نے انہیں متعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''یہ ریاض شاہد ہیں، پاکستانی فلموں کے سب سے

بڑے رائٹر اور مکالمہ نویس، ان کے پائے کا لکھنے والا آپ کی انڈسٹری میں بھی مشکل ہی سے ملتا ہے۔''

مہمان نے کہا۔ ''آپ نے ٹھیک کہا۔ میں نے بھی ان کی لکھی ہوئی فلمیں دیکھی ہیں۔''

رات کافی گزر گئی تھی مگر بہت سے مہمان محفل سے جانے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ ہم کو نیند آنے لگی تھی۔ ہم اقبال شہزاد ہی کے بنگلے میں ٹھہرے ہوئے تھے موقع پاکر کھسک گئے اور کمرے میں جاکر سو گئے۔ بہت رات گئے کسی نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھولا تو سامنے ریاض شاہد کھڑا تھا۔

''کیا بات ہے، خیریت تو ہے؟'' ہم نے پریشان ہوکر پوچھا۔

''ابھی پتا چل جائے گا، تم باہر تو آؤ۔'' ریاض شاہد نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کمرے سے باہر کھینچ لیا اور گلے لگا کر کہا۔ ''آفاقی، اگر آج کے بعد کوئی تم سے کہے کہ ریاض شاہد نے تمہیں برا کہا ہے تو اس کے منہ پر تھپڑ مار دینا۔''

''مگر بات کیا ہے؟''

''تم نے آج میرا دل جیت لیا ہے۔ ایسے دل کھول کر بھی کوئی اپنے حریف کی تعریف کرتا ہے۔''

''مگر تم میرے حریف تو نہیں ہو!''

''کیوں نہیں ہیں۔ کام کے معاملے میں ہم دونوں حریف ہیں۔ مگر اس کے علاوہ دوست بھی ہیں اور دوست رہیں گے۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا۔''

اس کے بعد ہم نے کبھی کسی کی زبان سے نہیں سنا کہ ریاض شاہد نے ہمارے بارے میں خراب ریمارکس پاس کیے ہیں۔

ریاض شاہد کو کبھی کسی نے روتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ مگر جب خلیل قیصر اچانک قتل ہوگیا تو لوگوں نے پہلی بار ریاض شاہد کو روتے ہوئے دیکھا۔ خلیل قیصر کی موت بھی ڈرامائی تھی اور آج تک یہ اسرار حل نہیں ہوا ہے کہ اس قتل کے پیچھے کون سے محرکات تھے اور قاتل کون تھا؟ ریاض شاہد کے لیے یہ صدمہ معمولی نہیں تھا۔ خلیل قیصر اس کا پرانا دوست، ہم مشرب اور ہم ذوق تھا۔ انہوں نے زندگی کا بیشتر حصہ ایک دوسرے کی صحبت میں بسر کیا تھا۔ ایسی دوستی اور باہمی ہم خیالی بہت کم انسانوں اور فن کاروں میں ہوتی ہے۔ انہوں نے بہت سی یادگار فلمیں ایک ساتھ ہی تخلیق کی تھیں۔ شاید بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ جب ریاض شاہد نے ''زرقا'' کی کہانی بنانے کا ارادہ کیا تو اس اسکرپٹ پر خلیل قیصر کے ساتھ کام کیا تھا۔ اگر خلیل قیصر زندہ رہتا تو شاید ''زرقا'' کی ہدایت کاری وڈائلاگز بھی خلیل قیصر ہی کو سونپے جاتے۔ خلیل قیصر کی موت کا صدمہ ریاض شاہد نے بہ ظاہر بھلا دیا تھا مگر اس کی کمی وہ ہمیشہ محسوس کرتا ... ایک بار خلیل قیصر کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ سب لوگ اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے مگر ریاض شاہد خلافِ معمول خاموش تھا۔

''ریاض صاحب آپ چپ کیوں ہیں؟ خلیل قیصر کو آپ سے زیادہ کون جانتا ہوگا؟''

ریاض شاہد اپنے مخصوص انداز میں مسکرایا اور بولا۔ ''وہ بہت بڑا ڈراما باز تھا۔ اپنی موت کو بھی اس نے ڈراما بنادیا۔''

مگر اس وقت ریاض شاہد کو خود اپنی موت کے ڈرامے کے بارے میں وہم و گمان بھی نہیں تھا۔

ریاض شاہد کی بیماری اور پھر موت ڈرامائی صورت اختیار کرگئی۔ اس کے جنازے میں یوں لگتا تھا جیسے سارا شہر امڈ آیا ہو۔ لیڈروں اور اداکاروں کے جنازوں میں ہزاروں افراد کی شرکت اور گریہ وزاری تو معمول میں داخل ہے مگر ایک فلمی کہانی نویس اور فلم ساز کے مرنے پر ایسا ہنگامہ اور ... ماتم پہلی بار دیکھنے میں آیا تھا۔ ریاض شاہد ہر معاملے میں دوسروں سے مختلف اور منفرد تھا۔ اس کی یہ انفرادیت آخری وقت تک قائم رہی، لبِ گور تک۔

☆☆☆

احمد فراز کی اگست کو چوتھی برسی تھی۔ انہیں ہم سے بچھڑے چار سال گزر گئے، مگر ان کے مداح اور پرستار آج بھی انہیں نہیں بھولے۔ وہ 14 جنوری 1931ء کو نوشہرہ میں پیدا ہوئے تھے۔ 77 سال کی زندگی گزار کر دنیا سے رخصت ہوئے۔ وہ گردوں کی بیماری میں مبتلا تھے۔ 25 اگست کو وہ اسلام آباد کے ایک اسپتال میں انتقال کرگئے۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ صوبہ سرحد نے اردو ادب کو بڑے بڑے شاعر اور ادیب عطا کیے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی اور ضیاء سرحدی کا شمار بھی اس سرزمین کے بیٹوں میں ہوتا ہے۔

احمد فراز کو فیض صاحب کے بعد کے اس عہد کا مقبول ترین شاعر کہا جاتا ہے۔ جوان ہوں یا بوڑھے، خواتین ہوں یا مرد سبھی ان کی رومان انگیز شاعری کے دلدادہ تھے۔ ان

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے کلام میں قدیم شعرا کا رنگ نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے فارسی بھی پڑھی تھی۔ فیض صاحب کی شاعری میں بھی اس رنگ کی وجہ فارسی کی تعلیم ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں فارسی کی تراکیب بہت نمایاں ہیں جن سے ان کی شاعری میں قدیم شعرا کا رنگ نظر آتا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے مجموعوں کے نام بھی اسی انداز کے رکھے تھے۔ دستِ صبا، نقشِ فریادی جیسے نام اس کی واضح مثالیں ہیں۔

فراز کی شاعری میں بھی فیض صاحب کی طرح ایک باغی کی آواز سنائی دیتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ فیض صاحب نے اپنے مزاج کی شائستگی کے مطابق باغیانہ نظمیں اور غزلیں لکھیں اور احمد فراز کی باغیانہ آواز میں تلخی، ترشی اور شعلوں جیسی سلگتی ہوئی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک رومان پرور احساس بھی محسوس ہوتا ہے۔ ان کا پہلا اشعار کا مجموعہ ''تنہا تنہا'' ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا۔ اس نے ہر ایک کو متاثر کیا اور احمد فراز کو ایک سکہ بند شاعر تسلیم کرلیا گیا۔

فیض صاحب نے ان کے مجموعۂ اشعار کے بارے میں کہا ''بیک وقت غمِ جاناں اور غمِ دوراں کی وسیع دنیا سے آگہی اور اس کی تفسیر ایک مشکل کام ہے۔ احمد فراز اس میں بہت کامیاب ہیں۔ فراز کا پہلا مجموعہ شاعری ہے، شعر کی تلاش نہیں۔''

فراز نے اپنے پہلے مجموعہ سے لے کر آخری مجموعے تک اپنا معیار قائم رکھا۔ ایک نقاد نے لکھا تھا ''فراز کی شاعری میں آپ کو تھکن کے آثار نظر نہیں آئیں گے۔ ہر شعری مجموعے میں فراز آپ کو تازہ دم نظر آئیں گے۔''

ایک طرف ان کی شاعری کا یہ انداز ہے

پھر آج دانۂ گندم کے سلسلے میں فراز
کسی خدا نے مری خلد بیچ ڈالی ہے

کیا رخصتِ یار کی گھڑی تھی
ہنستی ہوئی رات رو پڑی تھی

اپنی تہی دستی پہ میں شرمندہ ہوں
تیرے لبوں پر تاج محل کی باتیں ہیں

بستیاں چاند ستاروں کی بسانے والو
کرۂ ارض پہ بجھتے چلے جاتے ہیں چراغ

ذوالفقار علی بھٹو کو ایک آمر نے پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا تو فراز بے چین ہوگئے۔

سارا شہر بلکتا ہے

پھر بھی کیا سکتہ ہے
گلیوں میں بارود کی بُو
یا پھر خون مہکتا ہے
تیرا بچھڑنا جانِ غزل
شہر غزل کا مقطع ہے

آمرانہ دور میں بھی وہ اپنی آواز بلند کرتے رہے جنہیں شوقِ کمانداری بہت ہے
ان ہی پر خوف بھی طاری بہت ہے
نہ جانے کب لٹے گا شہر اپنا
سنا ہے اب کے تیاری بہت ہے

اپنی ہی آواز بے شک کان میں رکھنا
لیکن شہر کی خاموشی بھی دھیان میں رکھنا

میرے جھوٹ کو کھولو بھی اور تولو بھی
لیکن اپنے سچ کو بھی میزان میں رکھنا

اس دریا کے آگے ایک سمندر ہے
اور وہ بے ساحل ہے یہ بھی دھیان میں رکھنا

دوسری طرف ان کا رومانی انداز دیکھئے

رنجش ہی سہی دل ہی دکھانے کے لیے آ
آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لیے آ

ضبط لازم ہے مگر دکھ ہے مخالف کا فراز
ظالم اب کے بھی نہ روئے گا تو مر جائے گا

.....

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

.....

تم تکلف کو بھی اخلاص سمجھتے ہو فراز
دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا

فراز کے اشعار کا ہر مجموعہ بے حد مقبول ہوا۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اس کی کتابیں ساتھ لیے پھرتے تھے۔ فراز ایک وجیہہ اور خوش شکل انسان تھا۔ اس وجہ سے بھی وہ صنف مخالف کی توجہ کا مرکز تھا۔ فراز کا مشاہدہ بہت گہرا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ احمد فراز کے اشعار پڑھ کر یوں لگتا ہے جیسے یہ خود آپ کی آپ بیتی ہے۔ یہ شعر ملاحظہ کیجئے۔

یوں ہی موسم کی ادا دیکھ کے یاد آیا ہے
کس قدر جلد بدل جاتے ہیں انساں جاناں

.....

اپنے اپنے بے وفاؤں نے ہمیں یکجا کیا

ورنہ میں تیرا نہیں تھا اور تو میرا نہ تھا

.....

میں تیرا نام نہ لوں پھر بھی لوگ پہچانیں گے
کہ آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے

.....

فراز کی کتاب ''خواب گل پریشاں ہے'' اس کی ہر غزل فراز کے مداحوں کے دلوں میں تیر کی طرح پیوست ہوگئی۔ ایک غزل کا شعر ملاحظہ کیجیے۔

سنا ہے لوگ اُسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں
سو اُس کے شہر میں کچھ دن ٹھہر کے دیکھتے ہیں

.....

شکوۂ ظلمتِ شب سے تو کہیں بہتر تھا
اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جاتے

فیض صاحب کے برعکس فراز کے شعر سنانے کا انداز بہت دلکش تھا۔ وہ تحت اللفظ میں شعر سناتے تھے۔ شعر کا ہر لفظ الگ الگ اور دل میں اتر جانے والا ہوتا تھا۔ ان کا پہلا مجموعۂ کلام ان کے زمانہ طالب علمی میں شائع ہوا تھا۔ اور اسی وقت سے وہ مقبول ہوگئے تھے۔ فراز کو اپنی مقبولیت اور محبوبیت کا پورا احساس وادراک تھا۔ آخری مجموعے میں ان کی ایک غزل کا شعر ملاحظہ کیجیے۔

اس سے بڑھ کر کوئی انعام ہنر کیا ہے فراز
اپنے ہی عہد میں اک شخص فسانہ ہوجائے

فراز نے کچھ غلط بھی نہیں کہا تھا۔ وہ زمانہ تعلیمی سے لے کر آخری دم تک ایک فسانہ ہی بنے رہے اور ان کے فسانے ان کی وفات کے بعد بھی یاد کیے جائیں گے۔ فراز کو خود بھی اپنی مقبولیت کا بہ خوبی احساس تھا جس کا اندازہ ان کے اس شعر سے لگا سکتے ہیں

اور فراز چاہئیں کتنی محبتیں تجھے
ماؤں نے تیرے نام پر بچوں کا نام رکھ دیا

فراز ایک رومانی اور باغی شاعر تو تھے ہی وہ نعت بھی کہتے رہے ہیں۔ جوش ملیح آبادی جیسے رند نے بھی کہا تھا

اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

اب فراز کی نعت کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے

مرے رسول کہ نسبت تجھے اجالوں سے
میں تیرا ذکر کروں صبح کے حوالوں سے

''صبح'' کے حوالے سے یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ نعتوں میں جوش نے بھی اور فراز نے بھی صبح کے حوالے سے آنحضرتؐ کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

اپنے اشعار اور ان کی خوبصورت ادائیگی کے وجہ سے فراز مشاعروں کی جان سمجھے جاتے تھے اور جس مشاعرے میں شرکت کرتے تھے اسے لوٹ کر ہی جاتے تھے۔

فراز کی غزلوں کو فلموں میں بھی پیش کیا گیا اور پاکستان کے نامور اور مایہ ناز گلوکاروں نے بھی ان کا کلام بہت ذوق وشوق سے گایا۔ جن گلوکاروں نے فراز کے کلام کو اپنی مترنم آواز دی ان میں سرفہرست تو ملکہ ترنم نور جہاں ہیں۔ انہوں نے فراز کے کلام کو لوگوں کے دلوں تک پہنچانے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ مہدی حسن اور غلام علی نے بھی فراز کا کلام گایا ہے۔

ہدایت کار رسید سلیمان کی فلم ''محبت'' میں نثار بزمی مرحوم نے ان کی غزل کو مہدی حسن کی آواز میں پیش کیا تھا اور محمد علی پر فلمایا تھا۔ وہ یہ غزل تھی

رنجش ہی سہی دل ہی دکھانے کے لیے آ
آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لیے آ

اس فلم کا اسکرین پلے اور مکالمے لکھنے کا شرف ہمیں حاصل ہوا تھا۔

احمد فراز سے ملاقات کا ہمیں صرف دو بار اتفاق ہوا۔ بے تکلف دوستوں کی محفل میں وہ اور زیادہ چہکنے لگتے تھے اور بلا فرمائش کیے اپنے اشعار سناتے تھے۔ ایک ایسی ہی محفل میں ہمیں بھی ہدایت کار و فلم ساز حسن طارق کے ساتھ شریک ہونے کا موقع ملا تھا۔ دوسری ملاقات بھی کسی دوست کے ساتھ ہی ہوئی۔ اس کے علاوہ کبھی ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔

فراز ان شاعروں میں شامل ہیں جنہوں نے اپنی زندگی میں بھی مقبولیت حاصل کی اور موت کو گلے لگانے کے بعد ان کی مقبولیت میں مزید اضافہ ہوتا رہا۔ ہم نہ ہوں گے تو ہمیں یاد کرے گی دنیا۔

☆☆☆

لاہور کے سحر میں جو بھی گرفتار ہوا پھر اس کو رہائی نہ ملی۔ ایسے ہی ایک صاحبِ علم ڈاکٹر حفیظ ملک بھی ہیں۔ وہ ایک امریکن یونیورسٹی کے پروفیسر اور امریکا کے ایک علمی وادبی جریدے کے ایڈیٹر بھی ہیں۔ جس کا نام ''جرنل آف ساؤتھ ایشن مڈل ایسٹرن اسٹڈیز'' کے ادارتی شعبے میں پروفیسر اسٹینلے ولپرٹ بھی شامل ہیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

جنہوں نے سالہا سال قبل ''جناح آف پاکستان'' کے عنوان سے کتاب بھی لکھی تھی جو برصغیر کے سیاستدانوں اور محمد علی جناح کی شخصیت اور بے پناہ قابلیت کا احاطہ کرتی ہے۔ ڈاکٹر حفیظ ملک بھی پرانے لاہور ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے سالہا سال امریکا میں قیام کرنے کے باوجود لاہور کو فراموش نہیں کیا بلکہ لاہور کی یادوں کو آج تک دل سے لگائے بیٹھے ہیں۔

ڈاکٹر حفیظ کی روداد پیش کی جارہی ہے جس میں ایک ایک لفظ ان کی لاہور سے دائمی محبت کا آئینہ دار ہے۔ انہوں نے بہت دلچسپ اور دلگداز انداز میں لاہور کا تذکرہ کیا ہے ملاحظہ فرمایئے۔

''میری پیدائش پرانے لاہور کے علاقے کوچہ فقیر خانہ میں ہوئی۔ کوچہ فقیر خانہ بھاٹی گیٹ کے اندر واقع ہے جسے عرف عام میں بازار حکیماں کہا جاتا ہے۔ لاہور شہر سلطان محمود غزنوی کے عہد تک قائم ہوگیا تھا اگرچہ بعض تاریخی ماخذ لاہور کے قیام کو راجہ کنشکا کے راج تک لے جاتے ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ لاہور اسلامی شہر کی حیثیت سے سلطان محمود غزنوی کی آمد یعنی گیارہویں صدی عیسوی کے آغاز میں آباد ہوا۔ 1160 میں جب غزنوی سلطان خسرو شاہ کو غزنی قبیلے کے ترکھانوں نے شکست دی تو وہ غزنی چھوڑ کر لاہور میں آبسا اور یہیں انتقال کیا۔ اب لاہور میں غزنوی دور کی کوئی عمارت نظر نہیں آتی اور اس بات کا بھی اندازہ نہیں ہوسکتا کہ خسرو شاہ کہاں مکین ہوا اور نظامِ سلطنت کس انداز سے قائم تھا۔

لاہور شہر ایک وسیع فصیل کے اندر بنایا گیا تھا۔ اس فصیل کے بارہ دروازے تھے جن میں سے تین تو عروج ایام کی بدولت تباہ ہوگئے لیکن 9 دروازے اب بھی قائم ہیں۔ بازار حکیماں ایک لحاظ سے بھاٹی گیٹ اور ٹکسالی گیٹ کے درمیان واقع ہے اور یہ دونوں دروازے اب بھی قائم ہیں۔ اگرچہ ٹکسالی گیٹ کی عمارت بھاٹی گیٹ کے مقابلے میں بہت بہتر ہے لیکن شاہ عالمی دروازہ تو میری موجودگی میں یعنی 1947ء میں نذرِ آتش ہوگیا تھا۔

افسوس ہے کہ لاہور ترقیاتی بورڈ نے اس علاقے کی تعمیر کے وقت تاریخ کو نظر انداز کردیا اور فصیل کا ایک حصہ گرادیا تاکہ فصیلی لاہور اور نئے لاہور کے علاقے ایک دوسرے سے مل جائیں۔

کوچہ فقیر خانہ وہ نقطہ ہے جہاں سے بازار حکیماں دو حصوں میں تقسیم ہوجاتا ہے۔ اگر آپ کوچے کے باہر کھڑے ہوکر دائیں طرف دیکھیں وہ علاقہ اونچی مسجد کا علاقہ شمار ہوتا ہے۔ جہاں سے ایک سڑک تحصیل بازار تک جاتی ہے اور دوسری ..... بازار جج محمد لطیف کی طرف۔ جج محمد لطیف نے انگریزی میں تاریخ لاہور تصنیف کی تھی۔ سامنے والی سڑک اونچی بٹی کو جاتی ہے اور وہ علاقہ ہیرا منڈی کہلاتا ہے۔ ہیرا سنگھ مہاراجہ رنجیت سنگھ کا پوتا تھا اور اسی علاقے میں اس کی بہت بڑی حویلی تھی جس کی نسبت سے یہ علاقہ ہیرا منڈی کے نام سے معروف ہوا ہے۔

اس علاقے میں وہ خاندان بھی آباد تھے جنہیں مغلیہ دور میں کلونت کہا جاتا تھا اور وہ تمام مسلمان تھے۔ ان خاندانوں کی لڑکیاں ناچ گانا بطور پیشہ اختیار کرتی تھیں۔ وہ لوگ جو اُن کے طبلہ نواز اور ستار نواز تھے عرف عام میں مراثی کہلاتے تھے۔ مراثی تمام مرد ہوتے تھے۔ مراثیوں کی خواتین اس علاقے میں نہیں رہتی تھیں۔ کلونت خاندانوں میں انگریزی دور میں ایکٹریسیں بھی پیدا ہوئیں۔

ہیرا منڈی سے گزرتے ہوئے سڑک شاہی مسجد تک اور قلعے کی طرف جاتی ہے۔ دوسری طرف چونا منڈی سے گزرتے ہوئے موتی مسجد اور رنگ محل کے علاقے سے مل جاتی ہے۔ رنگ محل بھی ہیرا سنگھ کی ملکیت تھی۔ 1949ء میں یہاں ایک مشن ہائی اسکول قائم ہوا تھا۔ یہ سرخ رنگ کی عمارت ہی میرا ہائی اسکول تھا جہاں سے میں نے میٹرک پاس کیا۔ لاہور شہر میں یہ پہلا ہائی اسکول تھا جو انگریزی راج میں قائم ہوا بعد میں بھاٹی دروازے کے باہر سینٹرل ماڈل اسکول بھی تعمیر ہوا۔ ان دونوں اسکولوں کی تعلیم کے لحاظ سے بہت شہرت تھی۔ ان دونوں اسکولوں کے تعلیم یافتہ لڑکے یا تو گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوتے تھے یا فارمن کرسچن نامی کالج یعنی ایف سی کالج میں داخلہ لیتے تھے۔ لڑکیوں کا کینرڈ کالج بھی بہت معیاری سمجھا جاتا تھا۔ میرے وقت میں کینرڈ کالج کی گریجویٹ کامنی کوشل بہت مشہور ہوئی تھی۔

کوچہ فقیر خانہ میری نظر میں دنیا کا دل نشیں اور خوبصورت حصہ ہے۔ میں نے دنیا کے بیشتر ممالک اور شہر دیکھے ہیں جن کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ ان تمام علاقوں میں وہ خوبصورتی نہیں جو کوچہ فقیر خانہ میں ہے۔ میں جب بھی لاہور جاتا ہوں بھاٹی دروازہ، بازار حکیماں اور

بالخصوص کوچہ فقیر خانہ کو دیکھ کر آتا ہوں۔ فقیر خانہ کے نظارے سے جو دلی سکون ملتا ہے وہ کہیں اور نہیں ملتا۔ میں شاعر نہیں ہوں لیکن ایک وقت میں اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ میں شعر کہہ سکتا ہوں۔ یہ اچھا ہوا کہ ایک عظیم اور بزرگ استاد نے اس غلط فہمی کو دور کردیا لیکن کوچہ فقیر خانہ کے متعلق میرا ایک شعر قابل ذکر ہے

اے جاناں، بے تکلف چلے آنا
بازار ہے حکیماں، کوچہ فقیر خانہ

کوچہ فقیر خانہ ایک تنگ و تاریک گلی ہے جو بہت زیادہ وسیع نہیں ہے۔ یہاں داخل ہوں تو ایک ہی بلب کی روشنی میں راستہ ملتا ہے۔ اگر یہ بلب نہ ہو تو کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوچہ فقیر خانہ کا آغاز ایک حویلی سے ہوتا ہے جو اوپر سے جڑواں ہے۔ یہ حویلی مہاراجا رنجیت سنگھ کے زمانے میں فقیر عزیز الدین نے بنوائی تھی۔ فقیر عزیز الدین مہاراجا کے حکیم بھی تھے اور وفادار ملازم بھی تھے۔ میرے بچپن میں یہ حویلی دو حصوں میں تقسیم ہوچکی تھی۔ دایاں حصہ فقیر الدین کا تھا اور بایاں حصہ فقیر حسن الدین کا۔ یہ دونوں بھائی مہاراجا کے ملازم تھے۔ فقیر حسین انسپکٹر پولیس تھے اور حسین الدین ریلوے میں ملازم تھے۔ دونوں بھائی فقیر عزیز الدین کی اولاد شمار ہوتے تھے۔

فقیر سیدوں کا خاندان شیعہ ہے اور سید مراتب علی شاہ جو پاکستان میں پاکستانی سفیر سیدہ عابد حسین کے والد ہیں وہ اسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔

کوچہ فقیر خانہ تاریک ہی نہیں اس کے ساتھ ہی گندگی کی ایک نالی بھی تھی۔ جب یہاں صفائی ہوتی تھی تو تعفن کی انتہا نہیں ہوتی تھی۔ گلی کے آغاز میں ایک نالی کے عین اوپر ایک دیوانی عورت چپاں رہتی تھی۔ اس کا اصلی نام کیا تھا اور یہ کہاں سے آئی تھی یہ بھی معلوم نہ ہوسکا۔ اس کی دیوانگی کا یہ عالم تھا کہ وہ ہمیشہ اپنے دور کے رشتے داروں سے مصروفِ گفتگو رہتی تھی۔ اسے اپنے اردگرد کے ماحول کا کچھ احساس نہ تھا۔ میرا طریقہ تھا کہ ہر صبح اسکول جاتے ہوئے اس سے ضرور پوچھتا تھا کہ چپاں تمہارا کیا حال ہے؟ وہ ہمیشہ جواب دیتی تھی ''بابو اچھا ہے۔''

کوچہ فقیر خانہ کے اندر جو خاندان آباد تھے ان میں کشمیریوں کے علاوہ سادات کے گھرانے، آرائیوں اور جاٹوں کے گھرانوں کے علاوہ نائی اور موچی خاندان بھی رہتے تھے۔ ہر ایک کے مالی وسائل مختلف تھے۔ سادات اور کشمیریوں کے مکانات آٹھ اور دس مرلے میں بنے ہوئے تھے۔ دوسرے مکانات چار سے پانچ مرلے کے تھے۔ سادات اور آرائیں گرمیوں میں چھتوں پر سوتے تھے۔ جاٹ کھلی گلی میں سوتے تھے۔ ائرکنڈیشن کا تو ہم نے نام بھی نہیں سنا تھا۔ بعض گھروں میں بجلی کے پنکھے لگ گئے تھے۔ امراء حویلیوں میں رہتے تھے۔

میرے بچپن میں کوچہ فقیر خانہ کا تہذیبی ماحول وہی تھا جو سارے شہر کا تھا۔ سکھ دربار کی زبان فارسی تھی لیکن عام سکھ پنجابی بولتے تھے۔ سکہ شاہی کا زمانہ بھی قریباً ختم ہوچکا تھا۔

1949ء میں انگریزی حکومت قائم ہوچکی تھی لیکن انگریزی حکومت کی برکتوں میں سے صرف دو برکتیں شہر میں نظر آتی تھیں یعنی بجلی لگ چکی تھی اور پانی نلکوں کے ذریعے گھروں میں آتا تھا۔ کوچہ فقیر خانہ کے ہر گھر میں بجلی نہیں تھی اور نہ ہی پانی ہر گھر میں نلکوں کے ذریعے آتا تھا۔

چلیے اب آپ کا تعارف ہر خاندان سے ہوجائے۔

ابتدا دائیں طرف کی حویلی سے کریں گے۔ فقیر حسین الدین کی اولاد نہیں تھی۔ ان کے ساتھ ان کی بیگم حنہ رہا کرتی تھیں جنہیں سب ''بہو'' کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ خاصی فربہ اندام تھیں۔ پان بہت کھاتی تھیں۔ ان کے ہونٹ اور دانت ہمیشہ سرخ نظر آتے تھے۔ ان کی حویلی کی بیٹھک کے دروازے بازار حکیماں میں کھلتے تھے۔ دروازے پر چکیں پڑی رہتی تھیں۔ باہر سے اندر تو نہیں دیکھ سکتے تھے مگر بہو حنہ اندر سے سب کو دیکھ لیا کرتی تھیں۔

بہو حنہ کے ساتھ ان کی بھانجی گُل رہتی تھی جس نے لاہور کالج فار ویمن سے بی اے کیا تھا۔ چھوٹا سا قد تھا لیکن گفتگو میں ملکہ حاصل تھا۔ شکل وصورت بھی دلکش تھی۔ بہو حنہ کی خواہش تھی کہ گل کی شادی میرے ماموں رحمن ملک سے ہوجائے جو اس زمانے میں فوج میں کیپٹن تھے۔

بہو حنہ نے یہ سمجھ لیا تھا کہ میں اس معاملے میں وسیلہ بن سکتا ہوں چنانچہ جب بھی میں اسکول سے واپس آتا اور حویلی کے پاس سے گزرتا تو آواز آتی۔

مسٹر حفیظ اِدھر آؤ'' میں جاتا تو بہو حنہ بڑے پیار سے کہتیں کہ جب کیپٹن ملک لاہور آئیں تو مجھے ضرور اطلاع دینا۔ میں سر ہلا دیتا۔ اور وہ کہتی ''ماشاءاللہ، تم بہت ذہین لڑکے ہو۔''

بہت سالوں کے بعد فقیر حسین الدین نے ایک اور

WWW.PAKSOCIETY.COM

شادی کرلی اور بہو حسنہ کو طلاق دے دی۔ سنا ہے کہ دوسری بیوی سے فقیر حسین الدین کی اولاد بھی ہوئی تھی۔

اس حویلی کے آگے کشمیریوں کے دو گھر تھے۔ یہ دونوں خاندان کشمیری شالوں اور قالینوں کا کاروبار کرتے تھے۔ ایک خاندان پیر جماعت علی شاہ کا مرید تھا اور پیر صاحب سال میں دوبار ان کے مہمان ہوا کرتے تھے۔ مریدوں کا ایک میلا لگ جاتا تھا۔ کشمیریوں کا دوسرا مکان دو بھائیوں کا تھا۔ اوپر کے حصے میں میرے دوست نعیم گل کا خاندان تھا۔ نچلے حصے میں زاہدہ اور رشیدہ کا خاندان رہتا تھا۔ یہ دونوں بہنیں بہت خوب صورت تھیں۔ سارے کوچے میں ان کے حسن کی شہرت تھی۔ ان دو گھرانوں کے آگے سادات کا بہت کشادہ مکان تھا جس میں میرے عزیز دوست سید عابد علی اور ان کے نانا سید سردار علی شاہ رہا کرتے تھے۔ مکان کے دوسرے حصے میں عابد کی خالہ (جن کے شوہر فلم ساز و ہدایت کار منور ایچ قاسم تھے) اپنے بچوں کے ساتھ رہتی تھیں۔ منور ایچ قاسم کو ایکٹر بننے کا شوق تھا مگر وہ ڈائریکٹر بن گئے۔ وہ انگریزی میں شاعری بھی کرتے تھے۔ بعد میں ان کی بڑی بیٹی کی شادی مشہور بینکر آغا حسن عابدی سے ہوگئی تھی۔ حسن عابدی نے ہی بی سی سی آئی بینک کی بنیاد رکھی تھی۔

سید عابد علی کے دو عزیز سجاد اور بشیر اسی مکان کے ایک حصے میں رہتے تھے۔ ان کے والدین کے علاوہ تین بہنیں بھی تھیں۔ ان میں انور بڑی تیز نظر تھی۔ عابد سے رنگ محل مشن اسکول میں پڑھنے سے پہلے ہی میری دوستی ہوگئی تھی۔ عابد سے روزانہ ملاقات ہوتی تھی۔ جب بھی میں عابد کے دروازے پر دستک دیتا تو انور ایک کنکر میری طرف پھینک دیتی تھی۔ میں نظر اٹھا کر دیکھتا تو مسکرا کر کہتی، ''ملاقات کب ہوگی؟'' میں گھبرا کر ہٹ جاتا تھا۔ ایک بار میں نے عابد سے اس بات کا ذکر کیا تو اس نے کہا کہ چھوڑو یار، تم زاہدہ سے شادی کرو۔ تمہاری طرح وہ بھی کشمیری ہے۔ انور تو اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔''

وقت گزرتا گیا۔ عابد کی دلچسپی زاہدہ میں بڑھتی رہی۔ اس وقت ہم لوگوں نے میٹرک بھی پاس نہیں کیا تھا۔ اب اللہ جانے انور اور زاہدہ کہاں ہیں۔ بہرحال اندازہ کیجیے کہ اس زمانے میں معاشقے ان باتوں سے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ انقلاباتِ زمانہ بعد میں آئے۔

عابد کے مکان کے سامنے ایک مسجد تھی۔ معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ کس نے بنوائی تھی۔ اس کے امام مسجد مولوی محمد صاحب تھے جو مردان سے آئے تھے۔ پشتو ان کی مادری زبان تھی۔ مسجد کے ایک حجرے میں رہا کرتے تھے۔ کچھ عرصے بعد غازی خان کابلی بھی ان کے ساتھ رہنے لگے۔ اس زمانے میں ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی تحریک چل رہی تھی۔ وہ خدائی خدمت گار تحریک میں بھی شامل تھے۔ غازی خان کابلی کا اصلی نام حبیب الرحمٰن تھا۔ وہ سیاسی شاعری کرتے تھے۔ وہ آغا شورش کاشمیری سے بہت متاثر تھے۔

ملک عبدالعزیز دلکش صورت کے مالک تھے۔ انہوں نے ایک پرائیویٹ اسکول بھی کھول رکھا تھا' جہاں رات کو وہ دس روپے ماہوار فیس وصول کرکے انگریزی، حساب اور الجبرا پڑھاتے تھے۔ میں کند ذہن طالب علم تھا اس لیے والدہ نے مجھے ان کے سپرد کردیا۔ انہیں کیپٹن عزیز کہا جاتا تھا۔ ان کا دستور تھا کہ جو لڑکا غلط سوال حل کرکے لائے اس کی خاصی مرمت کرتے تھے۔ کہتے ''کہاں ہے مولا بخش'' بانس کا ایک ڈنڈا الماری سے نکالا جاتا تھا۔ میری شامت آتی تھی اور ہر ہفتے کم از کم کچھ ضربیں میرے ہاتھوں پر لگ جاتی تھیں جن کی وجہ سے میرے ہاتھ سوج جاتے تھے۔ بعد میں کیپٹن صاحب نے ایل ایل بی کرکے وکالت شروع کردی تھی۔

کیپٹن عزیز کے سامنے ایک جاٹ خاندان رہتا تھا۔ اس خاندان کے سربراہ کُرتہ اور تہبند پہنا کرتے تھے جس کو وہ مہینے میں ایک دو بار دھلوا لیتے تھے۔ اس مکان کے آگے ہمارا تین منزلہ مکان تھا۔ میری نشوونما میں میرے نانا اور والدہ کا اثر نمایاں ہے جن سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ میرے نانا تعلیم یافتہ تھے اور ان کی باتیں بہت دلنشیں ہوتی تھیں۔ وہ کہا کرتے تھے ''بیٹے یارِ شاطر بنو نہ کہ یارِ خاطر'' میں نے بچپن میں سعدی شیرازی کی گلستان اور بوستان لفظ بہ لفظ معنوں کے ساتھ پڑھیں۔ ان کی حکایت کے آخر میں سبق ضرور ہوتا تھا۔ ہمارا خاندان ہمیشہ سے تعلیم یافتہ رہا۔ ہمارے آباؤ اجداد 1739ء میں آزربائیجان سے شاہ ایران کے لشکر کے ساتھ ہندوستان آئے تھے جب نادر شاہ نے مغل بادشاہ محمد شاہ کو شکست دے کر دہلی میں قتلِ عام کا حکم دیا تھا۔ نادر شاہ کے واپس چلے جانے کے بعد ہمارا خاندان کشمیر میں آباد ہوگیا۔ مغلیہ دور کے انحطاط کے زمانے میں ہمارا خاندان کشمیر سے لاہور منتقل ہوگیا۔

(جاری ہے)

لوربوائے

مسعود کھدرپوش
ترجمہ: ابراہیم جمالی

جنگل میں شکار کرنا ایک سنسنی خیز عمل ہے۔ شکار کھیلنے والا خود بھی کبھی کبھی شکار ہوجاتا ہے مگر انہیں تو شکار کھیلنے کا جنون تھا۔ وہ اسی جنون میں بنگال کے سندر بن میں جا پہنچے تھے اور اس محبوب و محبوبہ کی پھیلائی دہشت کا خاتمہ کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں کیسے کیسے واقعات نے جنم لیا۔

شکار کتھا پڑھنے والوں کے لیے تحفہ

مارچ 1967ء میں ہم نے اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ سُندر بن کے گھنے جنگل میں ایک شیر کا شکار کیا تھا۔ اس یادگار اور انتہائی دلچسپ شکاری مہم میں میرے ساتھ لاہور کے ماہر شکاری تہور علی خان اور کیپٹن عبدالسلام خان بھی شریک تھے۔ ہم نے مارچ 1985ء میں اس شکار کی اٹھارویں سالگرہ منائی جس میں اس سنسنی خیز ڈرامے میں شرکت کرنے والے تینوں دوستوں نے حصہ لیا۔ اس موقع پر ہم نے اس خطرناک مہم کے ایک ایک واقعے پر تفصیلاً بحث

WWW.PAKSOCIETY.COM

کی اور اس کے ساتھ ہی سب نے اپنی اپنی کتھا سنائی جسے ریکارڈ کیا گیا۔ اس طرح شکار کی ایک بھرپور کہانی مکمل ہوگئی۔

یہ 1967ء کی بات ہے۔ میرا ایک کام کے سلسلے میں مشرقی پاکستان جانے کا اتفاق ہوا۔ اس دورے کے آغاز میں میرے ذہن میں بالکل یہ بات نہیں تھی کہ وہاں پہنچ کر میرا کسی آدم خور شیر سے واسطہ پڑے گا۔ میں ڈھاکا میں چیف سیکریٹری ایسٹ پاکستان علی اصغر صاحب کے گھر ٹھہرا تھا۔ علی اصغر صاحب مجھ سے کچھ سینئر تھے لیکن ہماری دیرینہ دوستی تھی۔ دراصل ہم دونوں میں کئی باتیں مشترک تھیں۔ ان کا تعلق مشرقی پنجاب کے شہر فیروز پور سے تھا۔ اس حوالے سے وہ میری طرح پہلے پنجابی آئی سی ایس افسروں میں شمار ہوتے تھے۔ وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے پرانے طالب علم تھے اور میں بھی اولڈ راوئین تھا۔ پھر ہم دونوں یکے بعد دیگرے آکسفورڈ سے فارغ التحصیل ہوئے۔ ان مشترکہ خصوصیات کے سبب ہمارے درمیان دوستی کا پختہ رشتہ موجود تھا۔ ان تمام باتوں کے علاوہ علی اصغر کی بیگم اور ان کے پورے خاندان کے ساتھ میرے پرانے تعلقات تھے۔

مسز علی اصغر کی بیگم کا تعلق بمبئی کے ایک مشہور اور معروف خاندان سے تھا۔ ان کے والد سر علی محمد خان دہلوی بمبئی کی جانی پہچانی شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ماہر شکاری کے طور پر بھی بڑی شہرت کے مالک تھے۔

مسز زرینہ علی اصغر کے دو بھائی اور ایک بھانجا بھی بمبئی کے ماہر شکاری تصور کیے جاتے تھے۔ جب میں نے خان دیش ڈسٹرکٹ میں وحشی بھیل قبائلیوں کے ساتھ مل کر شیر، چیتے اور دوسرے خونخوار جنگلی درندوں کا شکار شروع کیا تو بعض اہم مواقع پر ان تجربہ کار شکاریوں نے مجھے اپنے مشوروں سے نوازا اور ہر مشکل گھڑی میں میری مدد کی۔ خود مسز زرینہ علی اصغر کو ذاتی طور پر شکار کرنے کا بہت شوق تھا۔ انہوں نے اپنے والد کے ساتھ سینٹرل پروینس (ایم پی) کے گھنے جنگلات میں کئی کئی ہفتے شکاری مہمات میں گزارے تھے۔

بمبئی میں پوسٹنگ کے دنوں میں ہی اس شکاری خاندان کے ساتھ میرے تعلقات قائم ہوگئے تھے۔ اسی دیرینہ شناسائی کے سبب جب بھی میں مشرقی پاکستان جاتا تو اکثر علی اصغر صاحب کے گھر ٹھہرتا تھا۔ وہ ایک طویل عرصے سے مشرقی پاکستان میں سرکاری خدمات انجام دے رہے تھے۔ انہوں نے یہاں آئی سی ایس کے پہلے عہدے، اسسٹنٹ مجسٹریٹ کی حیثیت سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا۔ اب وہ سب سے بڑے عہدے، چیف سیکریٹری ایسٹ پاکستان کی حیثیت سے اپنے سرکاری فرائض انجام دے رہے تھے۔ انہیں مشرقی پاکستان میں رہتے ہوئے اکیس، بائیس سال ہوگئے تھے۔ انہوں نے اپنی سروس کا زیادہ عرصہ اسی دھرتی پر گزارا تھا۔

انگریزوں نے اپنی نادر شاہی حکومت کے آخری برسوں میں بنگال میں انتظامی تبدیلیاں کی تھیں۔ انہوں نے ہندو اکثریت والے علاقوں میں ہندو افسروں کو تعینات کیا اور جہاں مسلمان آبادی زیادہ تھی وہاں مسلمان افسروں کی ڈیوٹی لگائی۔ چونکہ بنگالی مسلمان زیادہ تر سرکاری محکموں میں نوکریاں نہیں کرتے تھے اور آئی سی ایس بنگالی مسلمان افسر بہت کم تھے۔ اس لیے مسلم اکثریت کے وہ علاقے جو بعد میں پاکستان کا حصہ بنے، وہاں پنجاب اور یوپی، سی پی سے تعلق رکھنے والے مسلمان بیورو کریٹس کو تعینات کیا گیا۔

اس زمانے میں ایک قانون یہ بھی تھا کہ جو افسر ہندوستان کے کسی صوبے میں نوکری جوائن کرتا، اسے ہمیشہ کے لیے وہاں پکا کردیا جاتا۔ اس لیے ہمارے کئی افسر جو پاکستان بننے سے پہلے وہاں سرکاری خدمات انجام دے رہے تھے، وہ ہندوستان کی تقسیم کے بعد بھی انہی عہدوں پر فائز رہے۔

مشرقی پاکستان بننے کے کچھ ہی عرصے کے بعد ملک دشمن قوتوں نے سر اٹھانا شروع کردیا تھا۔ ملک توڑنے کے اس مشن میں مشرقی پاکستان کی ہندو اقلیت نے بڑا اہم رول ادا کیا۔ خاص طور پر وہ اسکول، کالج، جہاں ہندو اساتذہ بڑی تعداد میں موجود تھے، نے ملک دشمن پروپیگنڈے کے ساتھ بنگالی طلبہ کے ذہنوں پر بہت برا اثر ڈالا۔ ہر جانب تعصب کا زہر پھیل گیا۔ وہاں موجود پنجاب سے تعلق رکھنے والے لوگ محب وطن تصور کیے جاتے تھے۔ اس لیے جھوٹی اور بے بنیاد افواہیں پھیلا کر انہیں بدنام کیا گیا اور اس طرح عوام میں ملک توڑنے کا جذبہ ابھارا گیا۔ اس کے ساتھ ہی شرپسند عناصر نے جھوٹے پروپیگنڈے کے ذریعے بنگالی قوم کے ذہن میں یہ بات انڈیلی کہ پنجابی انہیں غلام بنا کر رکھنا چاہتے ہیں۔ پنجابیوں اور بنگالیوں کے درمیان پیدا ہونے والی خلیج اس وقت مزید وسعت اختیار کرگئی

جب 1962ء میں بنگالیوں نے اپنی مادری زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دینے کی تحریک کا آغاز کیا اور ہمارے لوگوں نے بعض وجوہات کے سبب اس کی شدید مخالفت کی۔ اس کے نتیجے میں قتل و غارت ہوا اور آخرکار سرکار کو اپنی احمقانہ ہٹ دھرمی چھوڑ کر عوام کی مانگ پوری کرنی پڑی۔ مشرقی پاکستان میں بنگالی کو سرکاری زبان کے طور پر رائج کیا گیا۔

بنگالی عوام کی جانب سے مادری زبان کے لیے چلائی جانے والی تحریک اس قدر بھرپور تھی کہ مشرقی پاکستان کی حکومت پوری طرح ہل گئی اور پھر اسے سنبھلنے کا موقع نہیں مل سکا۔ آخرکار ان ہنگاموں نے کچھ بیرونی شرپسند طاقتوں کی مدد سے ایک نیا روپ اختیار کرلیا۔ زبان کے نام سے شروع ہونے والی یہ تحریک کچھ اپنوں کی غفلت اور غیروں کی چالبازیوں سے ملک توڑنے کا سبب بن گئی۔

سقوط ڈھاکا انسانی تاریخ کا ایک دردناک واقعہ ہے۔ اب ہم اس کی وجوہات تلاش کرتے ہیں تو ہمیں دیگر بے شمار باتوں کے علاوہ یہ صاف نظر آتا ہے کہ اس کی ایک بہت بڑی وجہ عوام کی زبان کو پس پشت ڈالنا تھا۔

بہرحال بات کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ اب میں اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔ ڈھاکا میں علی اصغر کے ہاں رہتے ہوئے میں ایک دن اپنے سرکاری کام کے سلسلے میں باہر نکلا تو میری ملاقات تہور علی خان سے ہوگئی۔ وہ سیر و تفریح کی غرض سے وہاں آئے تھے اور ان کا قیام شاہ باغ ہوٹل میں تھا۔ وہ ہوٹل علی اصغر کے سرکاری بنگلے کے قریب تھا۔ تہور بڑے پُرجوش انداز سے ملے۔ ان کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کے پاس کوئی بڑی اور اہم خبر ہے۔ میرے دریافت کرنے سے پہلے ہی وہ بول اٹھے۔

”نیل کنول کھال سے میرے ایک دوست کیپٹن عبدالسلام کا پیغام آیا ہے کہ وہاں ایک آدم خور شیر نے پورے علاقے کو دہشت زدہ کیا ہوا ہے۔ انہوں نے فوراً مجھے بلوایا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ میرے دونوں بازوؤں کو اپنی مٹھیوں سے دباتے ہوئے اسی پُرجوش انداز میں بولے۔ ”اب آپ بھی تیاری کریں۔ ہم مل کر اس شیر کا شکار کریں گے۔“

میں مشرقی پاکستان میں ایک بہت ضروری کام سے آیا تھا۔ لیکن آدم خور شیر کے شکار کا موقع مل رہا تھا۔ اس لیے یہ خبر سن... کر میرا دل بھی مچل اٹھا۔

”آپ ہوٹل میں میرا انتظار کریں۔ میں ابھی اپنا بیگ اٹھا کر وہاں پہنچتا ہوں۔“

یہ کہہ کر میں علی اصغر کے بنگلے کی طرف چل پڑا۔ میں نے جوش میں آکر تہور کے سامنے آمادگی تو ظاہر کردی تھی لیکن راستے میں جب اپنے آفیشل کام کا خیال آیا تو میں کچھ ڈھیلا پڑ گیا۔ جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا اور میں سوچنے لگا کہ اگر اس قسم کے ایڈونچر میں پڑ گیا تو میرا تمام شیڈول درہم برہم ہوجائے گا۔ میں اسی سوچ میں ڈوبا بنگلے میں داخل ہوا۔ باہر لان ہی میں میری مڈبھیڑ بیگم زرینہ سے ہوگئی۔ علی اصغر اپنے دفتر گئے ہوئے تھے اور گھر پر صرف زرینہ موجود تھیں۔

انہوں نے مجھے پریشان دیکھ کر اپنی بمبئی والی انگریزی ملی اردو میں پوچھا۔ ”مسعود! کیا بات ہے......؟ واٹ از پرابلم ودیو......؟“

جب میں نے انہیں آدم خور شیر کے شکار کے ٹیلی گرام کے بارے میں بتایا تو وہ جوش میں آگئیں اور بولیں۔

”یو ول گیٹ نیورد اپر چونیٹی اگین۔“

”لیکن میں جس کام کے لیے یہاں آیا ہوں وہ رہ جائے گا۔“ میں نے بے بسی سے کہا۔

انہوں نے میری بات پر کوئی دھیان نہ دیا اور اسی جوشیلے انداز میں بولیں۔ ”او مین ڈونٹ مس دس گولڈن چانس۔“

ان کی پُرجوش اور حوصلہ افزا باتیں سن کر میں بھی ذہنی طور پر شکار کے لیے تیار ہوگیا۔ میں نے ان سے کہا۔ ”اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے اب تیاری کرنی چاہیے۔“

وہ نہ جانے کیا سمجھیں اور قدرے تیز لہجے میں بولیں۔ ”واٹ آر یو ڈوئنگ ہیئر۔ ہری اپ پلیز...... جلدی کرو، ائرپورٹ پہنچو۔“

میں ان کی باتیں سنتا ہوا اندر چلا گیا اور اپنا بیگ اٹھا کر باہر آگیا۔ وہ مجھے دیکھ کر ہنس پڑیں اور بولیں۔ ”تم کھدر کے سفید کپڑا میں شکار کرے گا۔ اسے دیکھ کر ٹائیگر دور سے بھاگ جاتا بابا! کوئی خاکی شکاری سوٹ لے لو۔“

”آپ اس کی فکر نہ کریں۔“ میں نے بھی ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ”جن لوگوں نے مجھے شکار کے لیے بلایا ہے، وہ اس کا بھی بندوبست کردیں گے۔“

جہاں جہاں اپنا سامان نظر آیا تھا اسے عجلت میں بیگ میں ٹھونسا اور اسے پیک کرکے ہوٹل روانہ ہوگیا... جہاں تہور علی خان میرے منتظر تھے۔ میں آج سوچتا ہوں کہ اگر اس دن زرینہ میری حوصلہ افزائی نہ کرتیں تو شاید میں اپنی

WWW.PAKSOCIETY.COM

سرکاری ڈیوٹی کی مجبوری کے سبب شیر کے اس شکار سے محروم رہ جاتا۔ دراصل خود زرینہ کو بھی شکار کرنے کا شوق ورثے میں ملا تھا۔ وہ آدم خور شیر کو شکار کرنے کے اس سنہری موقع کو ضائع نہیں کرانا چاہتی تھیں۔ ان کی پُرجوش باتوں نے میرا اس قدر حوصلہ بڑھایا کہ میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر سندر بن کے گھنے جنگلوں میں ایک آدم خور شیر کا شکار کرنے کے لیے چل دیا تھا۔

ڈھاکا ائرپورٹ زیادہ دور نہیں تھا۔ اس لیے میں اور تہور علی جلد ہی وہاں پہنچ گئے اور خوش قسمتی سے جیسور جانے والے پہلے جہاز میں سوار ہونے میں بھی کامیاب ہوگئے۔ جیسور سے ایک سرکاری جیپ کے ذریعے ہم کھلنا پہنچے۔ وہاں سے دریا میں تین گھنٹے لانچ پر سفر کر کے ہم منگلا پہنچ گئے۔ جہاں عبدالسلام خان ایک لانچ میں ہمارے منتظر تھے۔

ہمارے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت بالکل نہیں تھا۔ اس لیے ہم نے آرام کیے بغیر مزید تین گھنٹے لانچ میں سفر کیا اور سندر بن کے ٹائڈ جا پہنچے جہاں شیر کی موجودگی کی خبر ملی تھی۔ لیکن ہمیں مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ ہمارے پہنچنے سے پہلے شیر وہاں سے غائب ہو چکا تھا۔ ہمیں اپنا وہ تیز رفتار سفر بڑا فلمی انداز کا محسوس ہوا۔ ہم ایک دم ڈھاکا جیسے پُررونق شہر سے ایک شکاری مہم سر کرنے کے لیے سندر بن کے دور دراز علاقے میں جا پہنچے تھے۔

ہم نے سندر بن کے ٹائڈ میں شیر کا انتظار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ہم نے باہمی مشاورت سے ہرن پوائنٹ سے آگے دریا میں سفر شروع کر دیا۔ ہمارے درمیان طے پایا کہ شیر سے بعد میں نمٹیں گے۔

علی الصبح ہم ''نیل کنول کھال'' پہنچے اور بانسوں کی جیٹی سے گزر کر پائلٹ ریسٹ ہاؤس کی جانب چل دیے۔ وہاں ہم نے پُرتکلف ناشتا کیا اور پھر سفر کی تھکاوٹ دور کرنے کے لیے آرام کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

ہم ریسٹ ہاؤس کے ٹیرس میں کرسیاں ڈالے دریائے پسر کے لمبے چوڑے پاٹ میں بہتے پانی اور اردگرد پھیلے ہوئے دلدلی میدان کا نظارہ کر رہے تھے۔ ہمارے سامنے دور دور تک خلیج بنگال کا نیلگوں پانی پھیلا ہوا تھا۔ کافی فاصلے پر دریا میں موجود جیفر ڈلائٹ ہاؤس نظر آ رہا تھا اور سرور سینڈ کی مدھم روشنی دن کے دھندلکے میں بھی دکھائی دے رہی تھی۔ وہاں سے گزرنے والے بحری جہاز آسانی سے دیکھے جا سکتے تھے۔

ہمارے عقب میں سندر بن کا گھنا جنگل پھیلا ہوا تھا۔ ایک جانب سے دریائے پسر سے نکلنے والا ''نیل کنول کھال'' نامی نالا اس خوبصورت جنگل میں گم ہو رہا تھا۔ بحری جہازوں کو اطلاعات پہنچانے والے جیٹی کے مواصلاتی ریڈیو کی ریڈیائی آوازیں اور جنگل میں سے مرغابی کی آتی ہوئی تیز پکار ہمیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

ہم تینوں دوست آرام کرسیوں پر بیٹھے گپ شپ کے انداز میں پرانی یادیں تازہ کر رہے تھے۔ اس وقت ہم آیندہ چوبیس گھنٹوں میں پیش آنے والے ڈرامے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

مجھے اس علاقے کی خوبصورتی نے مسحور کر دیا تھا۔ نقشے میں یہ مقام وہاں موجود ہے جہاں دریائے پسر، خلیج بنگال میں گرتا ہے۔ وہاں سے ایک میل پیچھے جنگل کے اندر دریا کے دائیں جانب سے ایک نہر نوّے درجے کا زاویہ بنا کر نکلتی ہے۔ یہ ایک انتہائی خوبصورت مقام ہے۔ وہ نہر یا دریائی نالا کوئی سوفٹ چوڑا ہوگا اور بڑے دلکش انداز سے کیوڑا، سندری، امرود کے بے شمار درختوں سے بھرے اس گھنے جنگل کے درمیان اٹکھیلیاں کرتا ہوا گزرتا ہے۔

آگے پہنچ کر اس نالے کے دو حصے ہو جاتے ہیں جو دریائے پسر کے متوازی گزرنے والے ایک دوسرے دریا میں جا گرتے ہیں۔ دریائے کھلنا بنگالی دیہاتیوں کی مشہور گزرگاہ ہے۔ وہ جنگل سے کم از کم نوے میل دور سے اس دریا میں بہاؤ کے مخالف سمت میں اپنے سفر کا آغاز کرتے ہیں اور انتہائی سخت، جان توڑ مشقت کے بعد نیل کنول کھال پہنچتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ نالے میں سفر کرتے ہوئے جنگل سے لکڑیاں، گھاس اور جنگلی مکھیوں کا شہد جمع کرتے ہیں۔ اس نالے میں سال بھر نیل کنول کے پھول کثرت سے موجود رہتے ہیں۔ اس لیے ان دیہاتی بنگالیوں نے ہی اس نالے کو نیل کنول کھال یعنی نیلے کنول کے پھولوں والی ندی جیسا نام دیا ہے۔ یہ لوگ جنگل میں سے لکڑیاں اور دیگر کارآمد چیزیں اکٹھی کر کے اپنی کشتیوں پر لادتے ہیں اور شام ہونے سے پہلے دریا میں لے آتے ہیں۔

اس واپسی پر وہ سامان سے لدی پھندی کشتیاں دریائی مدوجزر کے سہارے چلاتے، اپنی سریلی آوازوں میں لوک گیت گاتے، گھروں کو روانہ ہو جاتے ہیں۔ اگر دریا میں مدوجزر ختم ہو جائے تو یہ لوگ وہیں پر لنگر انداز ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ وہیں پر ڈیرے جمائے رہتے ہیں جب تک کہ

دوبارہ دریا میں لہریں اٹھنا شروع نہیں ہو جاتیں۔

یہ دریا ان دیہاتی لوگوں کے لیے بے حد اہم اور زندگی کا سہارا ہے۔ یہ انتہائی سادہ اور بے حد ایماندار لوگ ہیں۔ ان کا لباس دھوتی اور بنیان ہے۔ ان کی خوراک چاول، دال، نمک اور دریائی مچھلی ہے۔ ان کی سب سے بڑی اور اکلوتی عیاشی ایک چھوٹا سا حقہ ہے۔ جب سانجھ سے جنگل کے اوپر سفر کرتا ہوا سورج مغربی افق پر پہنچ کر اس کائنات پر الوداعی نظر ڈالتا ہے تو اس کے چہرے کی سرخی دریا میں دور دور تک پھیل جاتی ہے۔ اس سنہری پانی پر ان دیہاتی لوگوں کی کشتیاں قافلوں کی صورت میں رواں ہوتی ہیں۔ اس حسین منظر کو دریائی لوک گیت گانے والوں کی سریلی آوازیں سحر انگیز بنا دیتی ہیں۔

سندر بن جنگل گنگا اور جمنا کے مشترکہ ڈیلٹا میں پھیلا ہوا ہے۔ دریائے برہم پتر کو بنگال میں جمنا کہا جاتا ہے۔ سندر بن برصغیر کا بالکل منفرد جنگل ہے۔ اس کے درختوں تلے موجود بے انت جھاڑیوں نے اسے انتہائی گھنا جنگل بنا دیا ہے۔ دریاؤں میں اکثر اٹھنے والے سیلاب کی وجہ سے کئی مقامات پر شکستہ ڈیلٹا میں یہ جنگل پھیلا ہوا ہے۔ یہ ڈیلٹا چڑھتے اترتے دریاؤں کے درمیان قدرتی طور پر پھیلے بے شمار ندی نالوں کے عجیب و غریب جال میں چھوٹے چھوٹے اَن گنت جزیروں میں تقسیم نظر آتا ہے۔ سمندر کے قریبی جنگل میں کیوڑے کے کئی درخت ہیں جو پنجاب کے مشہور زمانہ ٹاہلی سے بھی بلند ہوتے ہیں، سمندر کے قریبی درختوں کے نیچے جھاڑیاں کم تعداد میں ہیں۔ اس لیے اس چھدرے جنگل سے دور اندر تک کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ ساحل پر پچاس سے ڈھائی سو فٹ تک چوڑی پٹی میں خوبصورت ریت بچھی ہوئی ہے۔ اس کے سبب یہاں کا ساحل بھی دیکھنے کے قابل ہے۔

سمندر کے قریب پسر دریا کا پاٹ پانچ میل سے بھی زیادہ چوڑا ہو جاتا ہے۔ دریا اس مقام پر خلیج بنگال کے سامنے کا شمالی ساحل بناتا ہوا گزرتا ہے۔ یہ جگہ ہرن پوائنٹ کہلاتی ہے۔ یہاں اور جنگل میں ہر وقت کثیر تعداد میں ہرن موجود ہوتے ہیں۔ جہاں دریائے پسر میں سے نیل کنول کھال نامی نہر نکلتی ہے، اس مقام پر ہرن پوائنٹ ریڈیو اسٹیشن قائم کیا گیا تھا۔ یہ ریڈیو اسٹیشن، آنے والے بحری جہازوں کو ہدایات نشر کرتا تھا۔ قریب سے گزرنے والے نیل کنول کھال نامی دریائی نالے کی وجہ سے اس دریائے

قارئین متوجہ ہوں

پرچا نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل فون نمبر

ہر ماہ باقاعدگی سے اپنے گھر پر پرچا حاصل کرنے کے لیے آپ 12 پرچوں کی قیمت 720 روپے کے بجائے صرف 700 روپے ادارے کو ڈرافٹ، منی آرڈر، منی گرام یا کسی اور ذریعے سے ارسال کریں۔ ہم رجسٹرڈ ڈاک کا خرچ (14 روپے فی پرچا) خود ادا کریں گے اور آپ کو 12 ماہ تک اپنا پسندیدہ پرچا رجسٹرڈ ڈاک سے ملتا رہے گا

یہ سالانہ خریداری اسکیم ادارے کے چاروں رسائل کے لیے ہے

رابطے اور مزید معلومات کے لیے
ثمر عباس
03012454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت
C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبرز پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں
35802552-35386783-35804200
ای میل: jdpgroup@hotmail.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

پسر کے جزیرے کو بھی نیل کنول کھال ہی کا نام دیا گیا تھا۔

ہرن پوائنٹ ریڈیو اسٹیشن کے قریب ہی بندرگاہ میں کام کرنے والوں کے لیے ریسٹ ہاؤس بنائے گئے تھے اور ہم اس وقت انہی میں سے ایک پائلٹ ریسٹ ہاؤس میں آرام کررہے تھے۔ وہ کالونی دوسو کینال میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس بستی کے باسیوں کو شیر، چیتے اور دیگر خونخوار درندوں سے محفوظ رکھنے کے لیے تمام رہائشی علاقے کے گرد آٹھ فٹ بلند آہنی خاردار تاروں کی باڑھ لگائی گئی تھی۔

اس جزیرے میں دریا کے ساتھ ساتھ ایک طویل و عریض اور گہرا دلدلی میدان پھیلا ہوا تھا۔ جزیرے سے دریا تک پہنچنے کے لیے بانسوں کو جوڑ کر ایک جیٹی بنائی گئی تھی جو اکثر ٹوٹ جاتی تھی۔ پھر دریا میں کھڑی لانچ تک جانے کے لیے ایک ہی راستہ باقی رہ جاتا تھا کہ اس دلدل اور کیچڑ میں اتر جائیں اور اپنی پوری قوت صرف کرکے صاف پانی تک جا پہنچیں۔

یہ عمل سندر بن آنے والے تمام شکاریوں کے لیے انتہائی تکلیف دہ ہوتا تھا کہ انہیں چلتے پھرتے کئی مقامات پر دلدلی علاقوں میں سے گزرنا پڑتا تھا۔ اس لیے کئی آرام پسند اور شوقیہ شکاری جنگلی ندی نالوں ہی میں اپنی لانچوں پر سوار ہوکر شکار کرنے کے لیے نکلتے ہیں اور لانچ پر بیٹھے بیٹھے منتظر رہتے ہیں کہ کوئی جانور نشانے پر آئے اور اسے گولی مار کر کہہ سکیں کہ وہ شکار کرکے آئے ہیں، اور ہم نے بڑی بہادری کا کام سرانجام دیا ہے۔ لیکن ماہر شکاری کو اس طرح کے شکار میں مزہ نہیں آتا۔

اس مرتبہ جب ہم سندر بن پہنچے تھے تو سال کے ان دنوں میں جنگل میں دیہاتیوں کا شہد اکٹھا کرنے کا سیزن اپنے عروج پر تھا۔ ان ایام میں آدم خور درندے جنگلی دولت لوٹنے والے ان دیہاتیوں سے اپنا خراج وصول کرتے تھے۔ وہ درندے ہر وقت دیہاتیوں کی جانوں کے لیے سخت خطرے کا باعث بنے رہتے تھے۔ لیکن وہاں کے انتہائی غریب مگر بہادر باشندے اپنی جانوں کی پروا کیے بغیر شیر چیتوں کے حقیقی خطرے کو نظر انداز کرکے ہر سال کی طرح اس برس بھی بڑی تعداد میں جنگل میں آجارہے تھے۔ ان دیہاتیوں کا سب سے بڑا جانی دشمن اس جنگل میں وافر تعداد میں پایا جانے والا درندہ شیر تھا جو اکثر آدم خور بن جاتا تھا۔

سرکاری سروے کے مطابق 1967ء میں سندر بن میں تقریباً چار سو جنگلی شیر آزادانہ گھوم پھر رہے تھے۔ سندر بن کے شیر شمالی بنگال کے رائل بنگال ٹائیگر سے بالکل مختلف قسم کے درندے ہوتے ہیں۔ شمالی بنگال کے جنگلوں میں پایا جانے والا شیر انتہائی شریف اور مسکین مخلوق ہے۔ اس لیے جب وہ سردیوں میں ہمالیہ سے اتر کر نشیب کے جنگلوں میں آتا ہے تو کبھی کسی پالتو جانور یا مقامی باشندے پر حملہ نہیں کرتا۔ لیکن سندر بن کا شیر مختلف نسل سے تعلق رکھتا ہے۔ اسے ایک انتہائی کٹھن اور سخت ماحول میں گزارا کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے وہ کٹھور اور بے رحم ہوجاتا ہے۔

جب سندر بن کے قریبی دریاؤں میں زبردست لہریں اٹھتی ہیں تو پورے جنگل میں تباہ کن سیلاب آجاتا ہے جس کے سبب یہاں کے شیروں کے لیے جنگلی ہرنوں کا شکار مزید مشکل ہوجاتا ہے۔ کیونکہ ہرن گھٹنے گھٹنے پانی میں بھی اپنی بے پناہ پھرتی سے کام لے کر شیر سے دور محفوظ فاصلے پر چلے جاتے ہیں۔ جبکہ شیر دلدل، کیچڑ اور پانی میں زیادہ جدوجہد کرنے سے گھبراتا ہے۔ اس کے علاوہ ہرن اور ہرنیاں اگر اس بے شمار جزیروں والے جنگل میں کہیں شیر کا خطرہ محسوس کریں تو وہ تیر کر بڑی آسانی کے ساتھ نالا عبور کرکے دوسرے جزیرے میں جا پہنچتی ہیں۔

یہی سبب ہے کہ سندر بن کے شیروں کو بھی یہاں کے عوام کی طرح سخت فاقوں اور بڑی مشقت کے ساتھ وقت گزارنا پڑتا ہے۔ اس لیے ان شیروں کو پالتو جانوروں اور مقامی باشندوں پر حملہ کرتے ہوئے بالکل جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ بس موقع ملنا شرط ہے۔

انہی باتوں کی وجہ سے کھلنا ڈسٹرکٹ فارسٹ آفیسر نے ہمیں بتایا تھا کہ سندر بن کے تقریباً تمام شیر ہی آدم خور ہیں۔

یہاں کے لوگوں نے ایک عجیب رسم اپنائی ہوئی تھی۔ جب ان کا کوئی بندہ شیر کے ہتھے چڑھ جاتا تو وہ اس کے غم کے نشان کے طور پر ایک بلند سے پول پر کپڑے کا جھنڈا لگا دیتے تھے اور ہمیں ایسے کئی جھنڈے گڑے ہوئے نظر آئے تھے۔

میرے ساتھ اس شکاری مہم میں دو بہادر اور انتہائی ماہر شکاری موجود تھے۔ تہور علی خان کا تعلق لاہور کے ایک کاروباری خاندان سے تھا۔ وہ کئی شیروں، چیتوں اور دوسرے جنگلی درندوں کا شکار کرچکے تھے۔ وہ شکار کے موضوع پر ایک مشہور انگریزی کتاب ''دی مین ایٹرز آف سندر بن'' کے مصنف بھی ہیں۔ دوسرے دوست کیپٹن عبدالسلام خان تھے جو اس وقت دریائے پسر میں پائلٹ

کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ وہاں پائلٹ کا کام چالنا کی بندرگاہ میں آنے والے بحری جہازوں کو ساٹھ میل دور سے گائیڈ کرکے بحفاظت بندرگاہ تک پہنچانے میں مدد فراہم کرنا تھا۔

یہ بندرگاہ منگلا شہر کے ساتھ ہی اس مقام پر واقع ہے جہاں زرعی علاقہ ختم ہوتا ہے اور سندر بن کا جنگل شروع ہوجاتا ہے۔

عبدالسلام کا تعلق بھی لاہور ہی سے تھا اور وہ وہاں اپنی ریٹائرڈ لائف گزار رہے تھے۔

چالنا پورٹ کے دوسرے بہادر ملازموں نے بھی اس شکار میں ہمارا بڑا ساتھ دیا تھا۔ وہ لوگ اکثر ہتھیاروں کے بغیر بڑے بے خوف انداز سے ہمارے ساتھ جنگل میں دور تک چلے جاتے تھے۔ پہلے تو مجھے شک تھا کہ ہم جس شیر کو ہلاک کرنے کے لیے وہاں پہنچے ہیں، کیا وہ واقعی آدم خور ہے؟ لیکن یہ بات یقینی تھی کہ کھلنا کے ڈسٹرکٹ فارسٹ آفیسر نے اسے آدم خور درندے کے طور پر رجسٹر کیا ہوا ہے۔ اس لیے اگر وہ بے گناہ بھی ہوتا تو اس نے لوگوں کو سخت تنگ کرکے اپنی شہرت اس قدر خراب کرلی تھی کہ اسے مارنا بہت ضروری ہوگیا تھا۔

دراصل اس شیر کے ہاتھوں کیپٹن عبدالسلام خان اور پورٹ سروس کے دیگر ملازمین بہت تنگ آئے ہوئے تھے۔ وہ ہر صورت میں اس سے اپنی جان چھڑانا چاہتے تھے۔ جب اسے آدم خور ڈکلیئر کردیا گیا تو پھر اسے ہلاک کرنا آسان ہوگیا تھا۔

کھلنا پورٹ سروس کے تمام ملازم اس شرارتی شیر کو اچھی طرح پہچانتے تھے۔ انہوں نے اسے لور بوائے (Lover Boy) کا نام دیا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ اکثر دیکھی جانے والی اس کی ہمشکل شیرنی کو وہ پرنس کہتے تھے۔ شیروں کی اس جوڑی کے ان رومانی ناموں کے حوالے سے کیپٹن عبدالسلام خان نے ہمیں بڑا دلچسپ واقعہ سنایا تھا۔

''ہم کھلنا پورٹ سروس کے چار پائلٹ معمول کے مطابق لنچ کے سیلون میں رات کے نو بجے سونے سے پہلے رمی کھیل رہے تھے'' انہوں نے بتایا۔ ''ہم چاروں پائلٹوں کا تعلق مختلف رنگ، نسل، مذہب اور مزاج سے تھا۔ کیپٹن لیب جرمنی کے ایک سینئر اور تجربہ کار سمندری کپتان تھے۔ وہ دوسری جنگ عظیم میں جنگی قیدی بھی رہ چکے تھے۔ جنگ کے خاتمے کے بعد انہوں نے بندرگاہ کی نوکری کرلی تھی۔

شادی

ہمارے معاشی مسائل کا ایک اہم سبب بڑھتی ہوئی آبادی ہے اور اس آبادی کی وجہ صرف اور صرف شادی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ حکومت محکمہ منصوبہ بندی بنا کر ناحق بندوں اور بندیوں سے ''بچے دو ہی اچھے'' یا کم بچے خوشحال گھرانا کے پیغام پر عمل پیرا ہونے کی توقع رکھتی ہے اور سمجھتی ہے کہ والدین ان نعروں کا اثر لیں گے اور اس طرح آبادی کا سیلاب رک جائے گا لیکن ہو یہ رہا ہے کہ ''بچے دو ہی اچھے'' کے نعرے کا والدین نے کچھ اور ہی مطلب نکالا اور سمجھے کہ جڑواں بچوں کی پیدائش ہی اچھی ہے۔ اسی طرح ''کم بچے خوش حال گھرانا'' کے معنی بھی کچھ سے کچھ ہوگئے ہیں۔ مثلاً ہمارے دوست ''تفہیم الدین فہیم'' المعروف ٹی یو فہیم (جن کے نام کا مخفف بعض بے تکلف دوستوں نے ''تف'' کرلیا ہے) ایک اشتہار ساز کمپنی سے کاپی رائٹر کے طور پر منسلک ہیں۔ کچھ اپنی افتادِ طبع اور کچھ پیشہ ورانہ تقاضوں کے باعث موصوف کی اردو میں انگریزی الفاظ کی ملاوٹ ضرورت سے بہت زیادہ ہوتی ہے اور وہ اردو کے بہت سے عام اور نہایت مستعمل الفاظ کی جگہ انگریزی لفظوں کو یوں جڑتے ہیں کہ اردو پر تو جو گزرتی ہے سو گزرتی ہے، انگریزی الفاظ بھی اپنی ناموزونیت پر شرمندہ شرمندہ سے نظر آتے ہیں۔ تفہیم صاحب قومی زبان میں انگریزی کے بے جوڑ پیوند لگا کر جو گلابی اردو تخلیق کررہے ہیں، وہ درحقیقت اردو کے لہو سے سرخ ہوچکی ہے۔ ''سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے'' پڑھتے وقت وہ اردو کے سفر کا مطلب انگریزی کے Suffer لے لیتے ہیں چنانچہ ''کم بچے خوش حال گھرانا'' کے ''کم'' کو انہوں نے ''Come'' پر محمول کیا اور بچوں کی فوج کی فوج تیار کرلی۔ کسی نے کثرت اولاد کا سبب پوچھا ''تو فرمانے لگے ''بھئی، آپ نے وہ مشہور مقولہ نہیں سنا Come بچے خوشحال گھرانا۔ یعنی جس گھر میں جتنے زیادہ بچے آئیں گے، وہ اتنا ہی خوش حال ہوگا۔''

محمد عثمان جامعی کے کالم بہ عنوان ''شادی'' سے اقتباس

WWW.PAKSOCIETY.COM

دوسرے دونوں پائلٹ برطانوی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔

''یہ پچھلے سال انہی دنوں کی بات ہے۔'' انہوں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ موسم جنگلی جانوروں کے لیے اپنے جنس مخالف ساتھی تلاش کرنے کا سیزن ہوتا ہے۔ ہم چاروں پائلٹ اپنی لانچ کو نیل کنول کھال ندی میں لنگر انداز کیے بڑے مزے سے تاش کھیل رہے تھے۔ یکا یک دو شیروں کے دہاڑنے کی زبردست آواز سنائی دی۔ ہم گھبرا کے اٹھ کھڑے ہوئے اور باہر کی سمت جھانکا۔ ہم وہ منظر دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔ دو رومان پسند درندے تھوڑے فاصلے پر کھڑے باری باری انتہائی بھاری اور زبردست گونجتی ہوئی غراہٹ کے ساتھ بڑ ہکیں مار مار کر ایک دوسرے کو اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے۔ جوں جوں ان عاشق اور معشوق کی دھاڑنے کی آوازیں قریب آرہی تھیں، ہماری جان نکلی جارہی تھی۔ لانچ سے دو چار گز کے فاصلے پر ہی ساحل تھا۔ اس لیے ہمیں اپنی موت صاف نظر آرہی تھی۔

''دروازہ بند کردو۔'' اچانک کیپٹن لیب چیخ کر بولے۔ ''یہ درندے بہت قریب آگئے ہیں۔''

اس خوفناک رات کے بعد ہم نے اس ٹھرکی جوڑے کو لور بوائے اور پرنس کا نام دے دیا تھا۔

کیپٹن عبدالسلام خان نے مزید بتایا۔ ''اس رومانی جوڑے نے بستی کے قریب میری دو گائے کا پیچھا کرنا شروع کردیا۔ مگر ہر بار خاردار تار کی باڑھ ان کی راہ میں حائل ہوجاتی تھی۔ کئی بار پورٹ اسٹاف کے ملازم بارہ بور کی گن سے فائرنگ کر کے انہیں بھاگنے پر مجبور کرتے رہے۔ لیکن وہ بھی انتہائی مستقل مزاج تھے۔ چوبیس گھنٹے جنگلے کے اندر چلتی پھرتی گائے بھینسوں کو بھوکی نظروں سے دیکھتے رہتے تھے۔ آخر کار ایک دن بدقسمتی سے باڑھ کا گیٹ کھلا رہ گیا اور ایک گائے وہاں سے گزر کر بانکی چال چلتی جنگل میں داخل ہوگئی۔ لور بوائے وہیں جھاڑیوں کے عقب میں گھات لگائے بیٹھا تھا۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے گائے کی پشت پر سوار ہوگیا اور اس کی گردن میں دانت گاڑ کر ایک ہی جھٹکے سے گائے کا منکا توڑ دیا۔ مجھے گائے کا صدمہ ضرور ہوا لیکن میں نے طے کرلیا کہ اس لور بوائے کا خاتمہ لازمی ہوگیا ہے۔

''پھر میں نے اسی جگہ کے قریب ایک اونچے درخت پر مچان بندھوایا۔ جب میں شام کے دھندلکے میں مچان پر چڑھ کر شیر کا شکار کرنے کی غرض سے پہنچا تو معلوم ہوا کہ شیر تو ہم سے پہلے ہی وہاں موجود ہے۔ اس سے پہلے کہ میں اپنی بندوق سیدھی کر کے اسے نشانے پر لیتا، وہ بجلی کی پھرتی سے لپک کر جنگل میں غائب ہوگیا۔''

مارچ 1967ء تک لور بوائے کی خطرناک شرارتوں کی انتہا ہوچکی تھی۔ آخری مرتبہ کیپٹن عبدالسلام مال بردار جہاز ''سلائیڈ بینک'' کو دریا کے اندر لے جارہے تھے۔ اس دوران انہوں نے اپنی دوربین کے ذریعے سندر کوٹا کے ٹائڈ کی جانب دیکھا اور حیران رہ گئے۔ وہاں موجود عملے نے انہیں پانی کی پوزیشن بتانے کے بجائے بورڈ پر جلی حروف میں لکھا تھا۔ "HELP LION"

عملے کے لوگوں کے لیے پسر دریا کے اس دلدلی حصے پر ایک عارضی اور کمزور سا کیمپ بنایا گیا تھا۔ ان کا کام یہ تھا کہ وہ ادھر سے گزرنے والے بحری جہازوں کو ایک بڑے سے بلیک بورڈ پر واضح الفاظ میں لکھ کر پیغام دیں کہ اس وقت دریائی مدوجزر کی صورتِ حال کیا ہے۔ انہیں ٹائڈ واچرز کہا جاتا تھا اور یہ بے چارے پچھلے پندرہ دن سے شیر کے خوف کا شکار تھے اور اس غیر محفوظ سی جھونپڑی نما کیمپ میں قید سے ہو کر رہ گئے تھے۔

جب یہ صورتِ حال کیپٹن عبدالسلام خان کے علم میں آئی تو انہوں نے آگے اطلاع پہنچائی۔ اس کے بعد جا کر کھلنا سے ایک ریلیف لانچ ان کی مدد کو پہنچی اور انہیں وہاں سے بہ حفاظت نکال لیا گیا۔ وہ پچھلے پندرہ دن سے دریا میں تیرنے والے مگرمچھوں اور جنگل میں دندناتے ہوئے بھوکے شیر اور چیتوں کو دیکھ دیکھ کر اپنی جان ہلکان کرتے رہے تھے۔

زمین سے صرف آٹھ فٹ اونچی اس جھونپڑی میں ان کے پاس پرانے زمانے کی صرف ایک بارہ بور دونال بندوق اور ایل جی کے کارتوسوں کی صرف ایک جوڑی موجود تھی۔ دوسری جانب انہیں مالِ غنیمت سمجھ کر حملہ کرنے والے شیروں اور چیتوں سے جنگل بھرا ہوا تھا۔ جس واقعے نے انہیں بہت زیادہ دہشت زدہ کردیا تھا وہ یہ تھا کہ ایک رات رسوئی کی جانب سے آنے والی ٹھک ٹھک اور شپ شپ کی تیز آوازیں سن کے وہ بیدار ہوگئے۔ یہ باورچی خانہ ان سے صرف چار فٹ کے فاصلے پر تھا۔ جب انہوں نے ادھر ٹارچ کی روشنی ڈالی تو وہاں کا منظر دیکھ کر ان کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

ایک جوان شیر رسوئی میں داخل ہو کر ان کے پکائے ہوئے ہرن کے گوشت کو مزے لے لے کر کھا رہا تھا۔ جب

سالن ختم ہوگیا تو اس نے مرچوں کی جلن کو مٹانے کے لیے ہنڈیا کو بھی چبانے لگا۔ جس کی وجہ سے وہ عجیب وغریب آواز پیدا ہورہی تھی۔

شیر کو مارنے کے لیے انہوں نے شارٹ گن لوڈ کی لیکن پھر یہ سوچ کر فائر نہیں کیا کہ اس سے درندہ صرف زخمی ہوسکتا تھا جو ان کے لیے مزید خطرناک ثابت ہوتا۔ وہ شیر اس قدر ڈھیٹ تھا کہ اس نے اپنے قریب ان کی موجودگی کی بھی پروا نہیں کی اور نہایت اطمینان سے مزے لے لے کر بڑے مزے سے ان بے چاروں کی ہنڈیا چباتا رہا۔

عبدالسلام خان نے تختۂ سیاہ پر ان کا لکھا ہوا پیغام پڑھا تو اپنا جہاز ان لوگوں کے قریب لے جا کر روک دیا۔ انہوں نے لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے خوفزدہ ٹائڈ واچرز سے رابطہ کیا۔ جواب میں انہوں نے سہمی ہوئی آواز میں بتایا کہ پچھلی رات ایک شیر ان کے ہٹ کے نیچے ٹہلتا رہا تھا۔ ممکن ہے وہ رات کو دوبارہ آئے۔ وہ عبدالسلام خان کی منتیں کرنے لگے کہ جلد سے جلد انہیں یہاں سے نکلوانے کا انتظام کریں۔

جب عبدالسلام خان نے ان سے شیر کا حلیہ معلوم کیا تو انہیں یقین آگیا کہ یہ سب کچھ لور بوائے ہی کا کیا دھرا ہے۔ وہ چونکہ پہلے ہی اس سے بہت تنگ تھے۔ اس لیے انہوں نے فوراً جہاز کے ریڈیو کے ذریعے کھلنا ریڈیو اسٹیشن کو دو وائرلیس پیغام دیے تھے جو دشمنوں کے جہازوں کی جانب سے درپیش خطرے کے بجائے کسی شیر سے ہونے والے خطرے کی وجہ سے کیے گئے تھے۔

ایک پیغام کھلنا پورٹ کے ڈائریکٹر کے لیے تھا کہ وہ بلاتاخیر ٹائڈ واچرز کے لیے لانچ کا بندوبست کرے..... دوسرا پیغام شاہ باغ ہوٹل ڈھاکا میں تہور علی خان کے لیے تھا کہ وہ فوراً پہنچیں۔ ایک آدم خور شیر نے یہاں دہشت پھیلائی ہوئی ہے۔

یہی ٹیلی گرام انہوں نے مجھے پڑھ کر سنایا تھا اور پھر ہم دونوں سندربن کے لیے روانہ ہوگئے تھے۔ ہم انتہائی تیز رفتار رائج آمد ورفت کے ذریعے اسی دن روانہ ہو کر رات کو سندر کوٹا کے ٹائڈ اسٹیشن پہنچ گئے تھے۔ لیکن فی الحال شیر کی قسمت اچھی تھی کہ وہ اس رات ادھر نہیں آیا۔ اس لیے ہمیں مایوس ہو کر نیل کنول کھال کے ریسٹ ہاؤس جانا پڑ گیا تھا۔

ہم ریسٹ ہاؤس میں آرام دہ کرسیوں پر بیٹھے گپ شپ کررہے تھے۔ اس دوران تہور علی خان نے مشورہ دیا کہ ہمیں اپنے نشانے آزما لینے چاہئیں۔ اس طرح کچھ پریکٹس بھی ہوجائے گی۔ سب فوراً تیار ہوگئے۔ اس مقصد کے لیے ریڈرز ڈائجسٹ کے پرانے شماروں کو استعمال کیا گیا۔ نشانہ لگانے کے لیے ڈائجسٹ کا ٹائٹل لفظ "R" منتخب کیا گیا۔

اس وقت میرے پاس 306 ونچسٹر رائفل، تہور علی خان کے پاس 375 ونچسٹر رائفل اور عبدالسلام خان کے پاس برطانیہ کی بنی ہوئی 303 رائفل تھی۔ پورٹ سروس کا ایک ملازم ڈبل بیرل شارٹ گن سنبھالے ہمارے قریب کھڑا تھا۔ اس نشانے بازی کے سبب خوبصورت انگریزی رسالوں کے پرخچے اڑتے رہے۔

شیر کو پھانسنے کے لیے ہم نے باہمی مشورے سے چار پالتو جانوروں کا بندوبست کیا۔ یہاں کے انتہائی غریب مقامی لوگوں کے پاس پالتو جانور بہت کم تھے۔ اس لیے ہمیں شیر کے ''چارے'' کا انتظام کرنے کے لیے کافی بھاگ دوڑ کرنی پڑی۔ اس مقصد کے لیے ہم جو چار جانور حاصل کرسکے تھے ان میں سے ایک تو خود کیپٹن عبدالسلام خان کی اپنی گائے تھی۔ جسے وہ پیار سے ''ڈیزی'' کہتے تھے۔ یہ وہ گائے تھی جو شیر کی ''دست برد'' سے محفوظ رہی تھی۔ دوسرا جانور بھی کیپٹن کا اپنا پالتو کتا ''پونگو'' تھا۔ تیسری ایک بکری تھی جسے ہم نے منگلا کے ایس ایچ او سے زبردستی حاصل کیا تھا۔ ایک اور جانور بھی کتا ہی تھا جسے ہم نے منگلا کے مین بازار میں آوارہ گھومتے ہوئے پکڑا تھا۔ ہم نے اس کا نام ''جیک'' رکھا۔ بعد میں ایک نوجوان ہرنی اور اس کا شیر خوار بچہ بھی ہمارے ہتھے چڑھ گیا۔ ہم انہیں بھی شیر کے چارے کے طور پر استعمال کرسکتے تھے۔

شیر کو ترغیب دینے کے لیے ہم نے ان جانوروں کو ایک خاص ترتیب سے اس بستی کے قریب جنگل میں باندھ دیا۔ دو کتے، ایک بکری ہم نے نیل کنول کھال کے شمالی سمت کے جنگل میں ایک دوسرے سے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر درختوں کے ساتھ باندھ دیے۔ عبدالسلام کی گائے ''ڈیزی'' کو نالے کی دوسری سمت لیاقت علی ماٹھ (لیاقت علی کا میدان) کے جنوب میں باندھا گیا۔ اس میدان کے ایک طرف ہمارا ریسٹ ہاؤس تھا۔ اس کا نام لیاقت علی ماٹھ اس لیے رکھا گیا کہ اس میں ہرنوں کی ڈار در ڈار اس طرح اکٹھی ہوتی تھیں جیسے قائد ملت لیاقت علی خان کی تقریر کے دوران لوگ اکٹھے ہوتے تھے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

جنگل کے درمیان خودرو گھاس سے بھرا یہ غیر معمولی میدان ہمارے ریسٹ ہاؤس کے مغربی سمت سے شروع ہوکر جنگل میں بہت آگے تک چلا گیا تھا۔ اس کی انفرادیت یہ تھی کہ یہ کوئی ڈیڑھ میل لمبا تھا لیکن اس کی چوڑائی صرف ایک سو گز تھی۔ یہ میدان جنوبی کونے سے مغرب کی طرف ایک نیم دائرے کی شکل میں بڑھا ہوا تھا۔ اس کے درمیان میں جامن کا ایک بلند درخت تھا..... سندر بن کا جامن پنجاب کے جامن سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ اس کا پھل بھی چھوٹا ہوتا ہے۔ ڈیزی کو ہم نے جامن کے اسی پیڑ کے ساتھ باندھا تھا۔

یہ تمام کام ہم سب نے مل کر کیے تھے۔ شام تک ہم بری طرح تھک چکے تھے اور واپس پائلٹ ریسٹ ہاؤس پہنچے۔ غسل کر کے ہم نے ہرن کے بھنے ہوئے گوشت، مزیدار جھینگے اور تازہ مچھلی سے شاہی ڈنر کیا۔ پھر کمرے میں بیٹھ کر آدھی رات تک دنیا جہان کی باتیں کرتے رہے۔ شکاری جب ایک جگہ اکٹھے ہوتے ہیں تو ان کے پاس ایک دوسرے کو سنانے کے لیے بہت کچھ ہوتا ہے۔ وہ رات ہم نے ایک دوسرے کو اپنے شکار کی کہانیاں مرچ مسالا لگا کر سناتے ہوئے گزاری۔

رات دیر تک جاگنے کے باوجود ہم سب علی الصباح بیدار ہوگئے۔ کیپٹن عبدالسلام کسی ضروری کام کے سلسلے میں جلدی گھر سے نکل گئے۔ جاتے جاتے انہوں نے اپنے ملازموں کو ہدایات دیں کہ وہ بندوقیں لے کر جنگل چلے جائیں اور ساری جگہوں پر دیکھ کر آئیں کہ ہمارا کوئی جانور تو نہیں مارا گیا۔ پھر وہ ہم سے مخاطب ہوئے۔ ''اگر لور بوائے نے میرے کسی جانور کو نقصان پہنچایا تو آج رات ہم سب مچان پر بیٹھ کر اس سے پرانا حساب چکائیں گے۔''

وہ چلے گئے تو تہور علی خان اپنی رائفل کی صفائی کرنے بیٹھ گئے۔ جب پورٹ سروس کے ملازم بندوقیں اٹھائے جنگل میں جانے لگے تو یکا یک میری چھٹی حس بیدار ہوگئی۔ میں نے بلند آواز میں انہیں پکارا اور انہیں ٹھہرنے کا اشارہ کیا۔

''اٹھیے جناب!'' میں نے مسکراتے ہوئے تہور علی خان سے کہا۔ ''ہم بھی ان کے ساتھ جنگل کا ایک پھیرا لگا آئیں۔ ہوسکتا ہے کہ ہمیں کہیں شیر نظر آجائے۔''

تہور علی نے میری اس بات کو اہمیت نہیں دی۔

''فی الحال ان لوگوں کو جانے دیں۔'' انہوں نے کہا ''ہم طے شدہ پروگرام کے مطابق چلیں گے۔''

''ہمارے پروگرام میں شیر صاحب شریک نہیں تھے۔ میں نے خوش دلی سے کہا۔ ''اس لیے ہمیں اس کے پروگرام کا کچھ پتا نہیں۔ ہمیں ہوشیار رہنا چاہیے۔''

آخر کار میرے اصرار پر وہ گویا بادلِ ناخواستہ اٹھے اور ہمارے ساتھ چل دیے۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ اگر درندہ ہمارے کسی جانور کو زخمی کر گیا ہے تو اس کے قریب خود کو بھال کر کسی مضبوط بلند درخت پر اپنی مرضی کا مچان بندھوا دوں۔ تاکہ رات کو شیر اپنے کیے ہوئے شکار سے محظوظ پری کے لیے دوبارہ اس طرف آئے تو ہم تینوں اس کے استقبال کے لیے موجود ہوں اور اس پر اپنے نشانے آزما سکیں۔ میرا یہ تجربہ ہے کہ جو چیز اپنی نگرانی میں بنوائی جائے، بندہ اس پر زیادہ بھروسا کرتے ہوئے پورے اعتماد کے ساتھ شکار کھیل سکتا ہے۔

میں، تہور علی خان اور چلنا پورٹ سروس کے کچھ ملازمین اپنے اپنے ہتھیار اٹھا کر لانچ میں سوار ہوگئے۔ لانچ پوری رفتار کے ساتھ نیل کنول کھال کی اس ندی کی سطح آب پر پھسلتی ہوئی جنگل کے اندر کی جانب روانہ ہوگئی۔ آگے چل کر ہم نے شمالی سمت میں بندھے اپنے دو کتوں اور بکری کو دیکھا۔ وہ تینوں محفوظ تھے۔ بڑے کتے پونگو نے درخت کے ساتھ بندھی اپنی رسی تڑوالی تھی اور وہ اس وقت چھوٹے کتے ''جیک'' کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی بڑا کتا دوڑتا ہوا ہمارے قریب آگیا اور کبھی ہمارے پیروں میں لوٹنے لگتا اور کبھی پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہوکر اس طرح اگلی ٹانگوں سے ''چھپی'' ڈالنے کی کوشش کرتا جیسے وچھوڑے کی اس ایک طویل رات کے درد کو سینے سے لگ کر مٹانا چاہتا ہو۔ دوسری طرف چھوٹا کتا جیک اپنی پوری طاقت صرف کر کے اس طرح رسی کو کھینچ رہا تھا کہ اس کی پھولتی ہوئی رگیں صاف نظر آرہی تھیں۔

کتوں کے بالکل الٹ ایس ایچ او سے زبردستی حاصل کی جانے والی بکری نے ہمیں لفٹ نہیں کرائی۔ وہ ہماری طرف دیکھے بنا آرام سے گھاس چرتی رہی۔

پورٹ سروس کے ملازموں نے ان تمام جانوروں کو گھسیٹ گھسیٹ کر لانچ پر سوار کیا اور پھر ہم نیل کنول کھال سے لیاقت علی میدان کے جنوبی حصے کی طرف روانہ ہوگئے۔ ہم نے میدان کے قریب لانچ کھڑی کی اور بکری کو لانچ ہی میں باندھ کر ہم دونوں کتوں کے ساتھ جنگل میں داخل

ہوگئے۔ یہاں پہنچ کر کتوں پر ایک انجانا سا خوف طاری ہوگیا۔ وہ اپنی عادت کے مطابق ہمارے آگے آگے چلنے کے بجائے پیچھے رہ گئے۔ کتوں کا مزاج دیکھ کر دوبارہ میری چھٹی حس بیدار ہوگئی اور میرے وجود میں ایک عجیب سی سنسنی دوڑنے لگی۔

تہور علی خان بھی چوکس ہوگئے۔ انہوں نے اپنی رائفل لوڈ کر کے فائر کرنے کی پوزیشن میں مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں پکڑ لی۔ میں ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ چلنا پورٹ کے تمام ملازم بھی بری طرح سہمے ہوئے تھے۔ پونگو ادھر ادھر دوڑ رہا تھا۔ ہم گھنے جنگل میں داخل ہونے لگے تو وہ میرے قریب آکر کھڑا ہوگیا اور پھر ہمارے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

اچانک پونگو نے ایک طرف چھلانگ لگائی اور پھر بجلی کی تیزی سے دوڑنے لگا۔ اس کی اس حرکت سے ہم سب ٹھٹک گئے تھے۔ سب نے اس کی جانب دیکھا اور حیران رہ گئے۔ وہ ایک نوجوان ہرنی اور اس کے شیر خوار بچے کی جانب لپکا تھا۔ ہرنی نے اپنے معصوم بچے کی پروا کیے بغیر فوراً ایک لمبی چھلانگ لگائی اور گھنے جنگل میں غائب ہوگئی۔ جب کتا ہرن کے بچے کے سر پر جا پہنچا تو اس بے چارے نے خوفزدہ ہوکر چھلانگ ماری اور بھاگنے کی کوشش کی لیکن گھبراہٹ میں وہیں زمین پر گر گیا۔ وہ انسان کے بچے کی طرح بری طرح چیخنے لگا۔

اس سے پہلے کہ کتا اس مسکین کو چیر پھاڑ دیتا، میں نے دوڑ کر ہرن کے بچے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں اٹھا لیا۔ کتا چھلانگیں مار مار کر اسے مجھ سے چھیننے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن میری ڈانٹ سن کر پیچھے ہٹ گیا۔ ہرن کا بچہ بڑا نرم و نازک اور بے حد خوبصورت تھا۔ میں نے سوچا کہ اسے گھر لے جا کر پالوں گا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد اچانک کچھ فاصلے پر درختوں کے درمیان اس کی ماں دکھائی دی۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی التجا تھی۔ وہ کتے سے ڈر بھی رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی اس کی کوشش تھی کہ وہ ہمارے قریب آسکے۔ اس کی ممتا بھری یہ ادا دیکھ کر ہم سب کے دل پگھل گئے۔ میں نے ایک ملازم کو ہدایت کی کہ وہ پونگو کو مضبوطی سے پکڑ کے رکھے۔ جب اس نے کتے کو قابو کر لیا تو میں نے ہرن کے بچے کو چھوڑ دیا۔ وہ بے چارہ چھلانگیں مارتا، گرتا پڑتا اپنی ماں کے پاس جا کر کھڑا ہوگیا۔ ہرنی نے اپنے بچے کو ہر طرف سے اس طرح جانچا جیسے ہم نے اس کا کوئی پرزہ اتار لیا ہو۔ پھر وہ اپنے بچے کو چومتی جاتی، اچھلتی کودتی گھنے جنگل میں غائب ہوگئی۔

جب ہم جنگل کے درمیان سے گزر کر میدان تک پہنچے تو ہم نے یہ عقل مندی کی کہ کھلے میدان سے جامنوں کے پیڑ تک جانے کے بجائے جنگل کے اندر ہی اندر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے محتاط انداز میں اِدھر اُدھر کا جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھنا شروع کیا۔ میں اور تہور علی خان ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ پورٹ کے ملازم ہمارے عقب میں تھے۔ دونوں کتے جنگل میں کہیں غائب ہوگئے تھے۔

ہم میں سب سے پہلے تہور علی خان نے جنگلی جھاڑیوں میں سے اپنا سر نکال کر جامن کے درخت سے بندھی گائے کی طرف دیکھا۔ پھر وہاں میری نظر بھی پڑ گئی۔ گائے کی لاش کھلے میدان میں درخت تلے ادھڑی پڑی تھی۔ اس کی پشت کا تقریباً دس کلو گوشت غائب تھا۔ گائے کی لاش دیکھ کر ہم دونوں کے جسم تن گئے۔ رائفلوں پر ہمارے ہاتھوں کی گرفت مضبوط ہوگئی۔ ہم نے دائیں بائیں دیکھا لیکن کہیں بھی شیر دکھائی نہ دیا۔ لیکن جب ہم نے چند قدم آگے بڑھا کر دوبارہ بائیں سمت نظر ڈالی..... میدان میں ایک جوان شیر بے خبر سویا ہوا دکھائی دیا۔

وہی لور بوائے تھا اور جی بھر کے گائے کا گوشت کھانے کے بعد اپنی فطری کاہلی کے سبب وہیں غفلت کی نیند سویا ہوا تھا۔ ہمارے اور درندے کے درمیان بہت کم فاصلہ تھا۔ ہم کھلی جگہ پر موجود تھے اور بڑی آسانی سے اس کے قابو آسکتے تھے۔ اس خیال نے یکبارگی مجھے ہلا کے رکھ دیا۔ لیکن میں نے وقت ضائع کیے بغیر اپنی رائفل کی نال اس کی طرف سیدھی کی اور اس کا نشانہ درست کرنے لگا۔ میرے ساتھ ہی تہور نے بھی شیر کو اپنے نشانے پر لے لیا تھا۔

مزے کی نیند سوئے شیر کو بھی شاید خطرے کا احساس ہوگیا تھا۔ وہ اچانک ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا اور حملہ کرنے کے انداز میں ہماری جانب بڑھا..... لیکن ہم دونوں نے آگے پیچھے اس پر فائر کر دیے۔

تہور علی مجھ سے کچھ آگے تھے۔ اس لیے انہوں نے مجھ سے پہلے فائر کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے بھی سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں فائر کر دیا۔ ایک ساتھ دو فائروں کی آواز نے سارے جنگل کو لرزا کے رکھ دیا۔ زخمی شیر کی غراہٹ بھی کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھی۔

ہماری گولیوں نے درندے کو زخمی کر دیا تھا۔ وہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

انتہائی غصے میں بپھر کر جوشیلے انداز میں ہماری جانب بڑھا لیکن زخموں کی شدت سے محض اچھل کر رہ گیا۔ وحشت میں پاگل ہوکر اس نے اپنے سامنے گرے ہوئے ایک پرانے درخت کی موٹی اور خشک ٹہنی کو جھنجھوڑ ڈالا۔ میں نے دوبارہ رائفل لوڈ کر کے اس پر فائر کر دیا۔ یہ گولی بھی اذیت میں مبتلا درندے کے وجود میں پیوست ہوگئی۔ وہ ایک دم ڈھیلا پڑ گیا اور اس طرح زمین پر لیٹ گیا جیسے دوبارہ اسے نیند آ گئی ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کا پورا جسم تن گیا..... ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اب بھی اٹھ کر ہم پر حملہ کرنے کی کوشش میں ہے۔ لیکن یہ اس کی آخری اور ناکام کوشش ثابت ہوئی۔ وہ ہمیشہ کے لیے سو گیا۔

ہم سب کو شیر کی موت کا پختہ یقین ہو گیا تھا۔ اس لیے بلا خوف وخطر ہم سب خوشی سے نعرے لگاتے اور ایک دوسرے سے لپٹتے چمٹتے، مبارک باد دیتے مردہ درندے کے قریب جا کر کھڑے ہو گئے۔ اس کے جسم میں تین جگہ سے لہو کے فوارے ابل کر لیاقت علی ماٹھ کی زمین کو سرخ کر رہے تھے۔ قریب سے جائزہ لینے پر معلوم ہوا کہ ہماری چلائی ہوئی ایک گولی بھی ضائع نہیں ہوئی۔ میں نے اپنا شک دور کرنے کے لیے شیر کی اگلی ٹانگوں کو کھینچ کر دیکھا اور مجھے یقین آ گیا کہ پہلی گولی اس کے سینے میں سے گزر گئی تھی۔ اس لیے وہ نزدیک ہونے کے باوجود ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکا تھا۔ ورنہ وہ خشک ٹہنی کی طرح ہمیں بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیتا۔

میں نے تہور علی خان کو ایسے شاندار نشانے پر مبارک باد دی۔ مجھے کئی سال پہلے خان دیش میں اپنے پہلے شیر کے شکار کا منظر یاد آ گیا جب شیر کی پیشانی پر میرا نشانہ دیکھ کر ایک بوڑھے بھیل قبائلی نے شیر کے خون سے میری پیشانی پر ٹیکا لگا دیا تھا۔ (یہ دلچسپ روداد مارچ، اپریل 2012ء کے سرگزشت میں چھپ چکی ہے) میں نے بھی آگے بڑھ کر شیر کے گرم گرم لہو سے اپنا انگوٹھا تر کیا اور تہور علی کی پیشانی پر گولی کا نشان بنا دیا۔

تہور علی خان کا چہرہ جوشِ مسرت سے سرخ ہو گیا۔ بنگالی ملازم بھی جوش میں آ کر رقص کرنے لگے تھے۔ دونوں کتے نہ جانے کہاں سے خجل خوار ہو کر واپس لوٹ آئے تھے۔ لیکن وہ مردہ شیر سے بھی ڈر رہے تھے۔ پہلے تو وہ دور ہی سے خاموش کھڑے اپنا منہ اٹھا کر شیر کی جانب سے آنے والی ہوا سونگھتے رہے۔ پھر بھی وہ آگے آنے کی ہمت نہ کر سکے۔ وہیں کھڑے کھڑے انہوں نے بھونکنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد کیپٹن عبدالسلام بھی کھلے میدان کی طرف سے دوڑتے ہوئے ہماری طرف آتے دکھائی دیے۔ وہ مردہ شیر کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ وہ بار بار ہمیں گلے لگا کر بھینچتے۔

جب شیر کو ہلاک کرنے کے کریڈٹ کی بات ہوئی تو سب نے متفقہ فیصلہ دیا کہ یہ اعزاز سب کو ملنا چاہیے۔ دراصل شکاری قانون کے مطابق جو شکاری، درندے کو پہلے زخمی کرتا ہے، خواہ اس نے اسے محض ہلکی سی خراش ہی پہنچائی ہو، وہ جانور اس کا شکار سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اس شکاری مہم میں کیپٹن عبدالسلام کا بھی ایک اہم کردار رہا تھا۔ وہ اس علاقے سے واقف تھے، انہوں نے شیر کو گھیرنے اور پھانسنے کی پلاننگ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور یہ بنیادی کام تھا۔ پھر میری اور تہور علی خان کی مشترکہ گولیوں سے شیر ہلاک ہوا تھا۔ اس لیے ہم نے شیر کی لاش پر کھڑے ہو کر فیصلہ کیا کہ یہ درندہ ہم تینوں کا مشترکہ شکار ہے۔ جب نشانے بازی کا ذکر نکلا تو ہم دونوں نے تہور علی خان کی تعریف کی۔ کیوں کہ اس قدر قریب سے جبکہ رائفل پر ٹیلی اسکوپ بھی فٹ ہو جس میں سے ہر جانب بھورا بھورا دھندلکا ہی نظر آتا ہو..... اس کے ساتھ ہی ٹارگٹ بھی حرکت کر رہا ہو ایسی صورت میں یہ نشانہ لگانا واقعی بہت بڑی فنکاری تھی۔ اس شیر کو تو مار گرایا گیا شیرنی کو کسی اور وقت کے لیے چھوڑ دیا۔ کیونکہ شیر کی عدم موجودگی میں شیرنی کا حوصلہ پست ہو جانا ضروری تھا۔

کیپٹن عبدالسلام کو جب ہم نے ہرنی اور اس کے بچے کا قصہ سنایا تو وہ بولے۔ ”آپ لوگوں نے ہرنی کو اس کا بچہ لوٹا دیا تھا۔ رب کو آپ کی یہ رحمدلی پسند آئی۔ یہی سبب ہے کہ آپ نے ایک وحشی درندے کو کھلے میدان میں آمنے سامنے کھڑے ہو کر شکار کر لیا۔“

مارچ 1985ء میں جب ہم تینوں پرانے دوست اس دلچسپ اور سنسنی خیز شکار کی اٹھارویں سالگرہ منا رہے تھے تو اس موقع پر ہم نے ”لور بوائے“ کو بہت یاد کیا۔ اس کی شرارتوں کے قصے چھیڑ کر ہنستے رہے۔

اگرچہ میں ہمیشہ مصروف رہنے اور زیادہ سے زیادہ کام کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور نت نئے مسائل میں الجھا رہتا ہوں۔ لیکن اب اس پیرانہ سالی میں آ کر اپنے پرانے قصے اور ماضی کی کہانیاں کبھی کبھی بہت یاد آتی ہیں۔ پھر یہی یادیں وقت گزاری کا بہترین ذریعہ بن جاتی ہیں۔

خط نستعلیق

محمد ایاز راہی

فنِ خطاطی ایک فن ہے جو خود میں ایک جہان ہے۔ ہر لفظ کو لکھتے وقت ایک پوری کہانی بیان ہوجاتی ہے۔ یہ فن کن کن مراحل سے گزرا، کیسے کیسے ادوار دیکھے۔ کس کس طرح یہ ترقی کے اوج پر پہنچا۔

اہل علم کے لیے ایک تحفہ، ایک دلچسپ تحریر

لکیروں کی اپنی زبان ہوتی ہے۔ ان کے اندر کثیر الابعادی (Multi Dimensional) اور سہ رخی شخصیتیں چھپی ہوتی ہیں۔ ترسیل خیالات کی مقرر کردہ خطی شکلیں (Graphic Designs) ہیں۔ انہیں صحیح معنوں میں فارسی والوں نے نئی جہت عطا کی۔ جمالیاتی پہلو اور علامتیت کو جگہ دی۔ چنانچہ عرب، ایران اور شمالی افریقا میں خطاطی نے خوب ترقی کی۔ لیکن ہمارے ہاں بعض سطحی ذہن حضرات جو ہر چیز کو مغرب کی دوربین سے دیکھنے کے عادی ہیں وہ خطاطی کے پس منظر سے انجان ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں بعض اوقات یہ رسم الخط غیر سائنسی، مشکل، پیچیدہ اور اذکارِ رفتہ لگتا ہے۔ اس کے جوڑ پیوند کو بھی وہ سمجھنے سے قاصر ہیں اور اعتراضات کرتے ہیں۔

اردو رسم الخط کی یہی خوبی اسے ممتاز بناتی ہے۔ اسے کتابی ضرورت میں استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ سجاوٹ، آرائش، رمزی اور علامتی تحریروں میں بھی استعمال کیا گیا ہے۔ اس کی خاطر خوشنویس اور خطاط نے اپنی مشقوں میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

عجیب عجیب ترکیبیں استعمال کی ہیں۔ کہیں نقطے ملتے ہیں، کہیں نہیں۔ کہیں "ر" کو خنجر کی شکل میں لکھا گیا ہے کہیں "و" اور "ذ" کو خاص زاویہ سے خم دیا گیا تو کسی مقام پر مدات کی پیمائش زیادہ رکھی گئی۔
مشہور خوش نویس سلطان علی مشہدی نے کیا خوب کہا ہے

خط نوشتن شعار پاکان است
ہرزہ گشتن نہ کار پاکان است
داند آنکس کہ آشنای دل است
کہ صفائی خط از صفائی دل است

اس قطعہ... سے ظاہر ہے کہ خوشنویسی کو کیسا مرتبہ حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ "آداب المشق" میں بابا شاہ اصفہانی فرماتے ہیں

"بداں کہ کاتب باید از صفات ذمیمہ احتراز نماید زیرا کہ صفات ذمیمہ در نفس علامت بے اعتدال است وحاشا کہ از نفس بے اعتدال کاری آید درا و اعتدال باشد۔"

گویا خوش نویس مشق کے دوران ایک ایسے ذہنی اور کثیر الجہتی سفر کا راہی ہو جاتا ہے کہ متن سے اس کا رشتہ منقطع ہو کر ان بنیادی لکیروں یا حرفوں کے جسم کی طرف اس کا ذہن منعطف ہوتا ہے جس پر اعراب و نقاط محض اضافی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ اپنے وجود کی پیچیدگیوں کی اور شخصیت کے تضادات Abnormalitess سے لاشعوری طور پر فرار حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ مخصوص حرفوں کی جو تسلیم شدہ اور مثالی (Idial) صورتیں ہیں ان کے قریب خطاط پہنچا ہوتا ہے۔ خطاطی کے تمام نمونوں میں نستعلیق کو فوقیت حاصل ہے۔ یہ نمونہ ہم تک فارس سے پہنچا ہے۔

ایران کے میر علی تبریزی نے (بہ عہدِ امیر تیمور گورگاں صاحبِ قران۔ 1369 عیسوی تا 1398 عیسوی) خطِ نستعلیق کو وجود بخشا تو اپنے نام اور کام دونوں کو خلوص کا آبِ حیات پلا کر امر کر دیا۔ بلاشبہ اعلیٰ تخلیق کی روشنی اپنے تخلیق کار کو دائمی نور سے نوازتی اور ابد تک زندہ رکھتی ہے۔ (اس کی تفصیل ماہنامہ سرگزشت کے شمارہ جون 2009ء میں خطِ نستعلیق کے عنوان سے شائع ہو چکی ہے۔) خطِ نستعلیق ہندوستان کب، کیسے اور کیوں کر پہنچا؟ کس صاحبِ کمال نے یہ ان مول تحفہ اہلِ ہند کی نذر کیا؟ آیئے دیکھتے ہیں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب خطِ نستعلیق کو ایران میں جگمگاتے، روشنی بکھیرتے تقریباً تین سو برس گزر چکے تھے۔ اس وقت ایران پر بادشاہ عباس قلی کی حکومت تھی جب کہ ہندوستان پانچویں مغل شہنشاہ شاہ جہاں (1628 عیسوی تا 1658 عیسوی) کے زیرِ نگیں تھا۔ شاہ ایران عباس قلی کے عہد میں میر علی تبریزی ہی کے خاندان میں سے میر عماد نامی صاحبِ ہنر تھا جو خطِ نستعلیق کے فن میں نہایت کامل اور گل سرسید تھا۔ بادشاہ عباس قلی اس کا بڑا مداح تھا اور شاہی خزانے سے معقول مشاہرہ یعنی ماہ وار تنخواہ مقرر کر رکھی تھی۔ ایک روز بادشاہ عباس قلی نے میر عماد خطاط کو بلوایا اور کہا کہ میرا مدت سے ارادہ ہے کہ خدائے سخن فردوسی کے منظوم شاہکار شاہ نامہ کو عمدہ نستعلیق میں لکھواؤں چونکہ فی زمانہ آپ خطِ نستعلیق کے استاد کامل ہیں لہٰذا یہ محنتِ شاقہ آپ کو ہی گوارا کرنی ہو گی۔ واضح ہو کہ فردوسی کا شاہ نامہ کم و بیش ساٹھ ہزار اشعار پر مشتمل ہے جو اعلیٰ درجے کی تخلیق ہے میر عماد کاتب بڑے ادب سے عرض گزار ہوا کہ عالم پناہ! مجھے شاہ نامہ لکھنے سے ہرگز انکار نہیں مگر جیسا عمدہ کام آپ چاہتے ہیں ویسا تو جب ہی لکھا جا سکتا ہے کہ جس طرح کا سامان میں چاہوں مجھے سلطنت سے برابر ملتا رہے۔ بادشاہ نے وعدہ فرمایا کہ آپ کو سب کچھ آپ کی خواہش کے مطابق ملتا رہے گا۔ میر عماد خوش نویس نے دوبارہ آداب بجا لا کر گزارش کی کہ شاہ نامہ لکھنے کے لیے مجھے حضور کا پائیں باغ عنایت کیا جائے اور اس کا حوض کیوڑے اور عرق گلاب سے بھر دیا جائے، ساتھ ہی یہ حکم بھی صادر ہو کہ حوض کا کیوڑہ اور عرق گلاب ہر ماہ تبدیل کر کے تازہ بھرا جائے۔ بادشاہ کو چونکہ شاہ نامہ لکھوانے کا از حد شوق تھا لہٰذا تمام باتیں خوشی سے مانی گئیں اور میر عماد خوش رقم کو حسبِ دل خواہ سب کچھ فراہم کر دیا گیا چنانچہ میر عماد خامہ آراء بڑے چاؤ اور لگن سے شاہ نامہ لکھنے بیٹھ گئے۔ اس دوران تین برس گزر گئے۔ شاہی باغ (پائیں) کے اخراجات پر کثیر رقم اٹھ گئی۔ ایک روز بادشاہ عباس قلی کے مصاحبوں نے ہرزہ سرائی کی کہ عالی جاہ! اب تک چھ لاکھ سکہ رائج الوقت اس باغ کی مد میں صرف ہو چکا ہے جہاں بیٹھ کر میر عماد صاحب شاہ نامہ لکھ رہے ہیں۔ میر عماد صاحب سے پوچھنا تو چاہیے کہ انہوں نے اب تک کتنا کام مکمل کیا ہے؟ حاسد اور خوشامدی درباریوں نے کچھ اس انداز سے کج بیانی کی کہ چھ لاکھ کے بھاری اخراجات بادشاہ کے ذہن اور دہن میں زہر گھول گئے۔ سو اسی وقت میر عماد کو

بلا کر استفسار کیا کہ آپ نے اب تک کتنا شاہ نامہ لکھ لیا؟ میر عماد رقم نے نہایت ادب سے بادشاہ کو آگاہ کیا کہ حضور، ابھی تک صرف تین جزو لکھے ہیں مگر وہ بھی نامکمل ہیں کیونکہ جلی قلم (بڑے قط) سے سرخیاں اس لیے نہیں لکھی گئیں کہ شنگرف تیار نہیں ہو پا رہا تھا گو کہ تین برس سے شنگرف حل ہو رہا ہے مگر میرے مطلب کا ابھی تک نہیں ہوا۔ ہاں اب کچھ عرصہ بعد تیار ہو جائے گا۔ خوشامدی درباریوں کے کہنے میں آیا ہوا بادشاہ یہ ماجرا سن کر بڑا غضب ناک ہوا اور زہریلے لہجے میں طنز سے کہا۔ استاد محترم! اس کے لیے تو پھر خزانہ قارون اور عمر نوح درکار ہے۔ میر عماد زریں رقم کہ اپنے فن میں نابغۂ روزگار تھا ضبط نہ کر سکا اور کہہ اٹھا کہ اگر حضور کی نظر چھ لاکھ کے اخراجات پر ہے تو اس کا بندوبست ہو جائے گا۔ یہ کہہ کر میر عماد رقم طراز دربار سے اٹھ کر سیدھا اپنے گھر آیا۔ میر عماد کاتب کے پاس گو کہ ایک سکہ تک نہ تھا مگر چونکہ لوگ اس کے ہاتھ سے لکھے ہوئے انتہائی خوب صورت قطعات کو تبرک کی طرح رکھتے تھے اور جواہرات سے زیادہ بیش قیمت سمجھتے تھے لہٰذا میر عماد خوش رقم کو اس بات پر بڑا ناز تھا۔ میر عماد خطاط نے شاہ نامہ کے تینوں جزو جو لکھ رکھے تھے نکالے اور ہر صفحہ تراش کے علیحدہ علیحدہ کر دیا۔ پھر ہر صفحے کی سطریں ایک ایک کر کے قینچی سے جدا جدا کتریں۔ جب تینوں اجزاء کی سطریں الگ ہو چکیں تو ملازموں کو حکم دیا کہ پالکی لاؤ اور چوب دار کو ہدایت کی کہ پالکی کے آگے چلتے ہوئے بہ آواز بلند کہتا جائے۔ امروز تحریر میر عماد آرزاں است۔ اس طرح میر عماد خوش نویس پالکی میں سوار ہو کر چلے تو عصا بردار کی آواز "امروز تحریر میر عماد ارزاں است...!" شائقین ہجوم کر کے پالکی کے گرد آتے اور زر و جواہر، نقد رقم جو کچھ بھی ان کے پاس ہوتا نذر کرتے جاتے۔ میر عماد خوش قلم اس کے عوض شاہ نامہ کی صرف ایک سطر دے دیتے۔ ابھی دربار شاہی کا صرف آدھا راستہ ہی طے ہوا تھا کہ چھ لاکھ رقم کے برابر زر و جواہر اور نقدی کا ڈھیر لگ گیا۔ بادشاہ عباس قلی کو اس واقعے کی برابر خبر ملتی رہی کہ میر عماد استاد کامل کی تحریر ہاتھوں ہاتھ لی جا رہی ہے۔ لوگ بے دریغ زر و جواہر اور نقدی میر عماد کاتب پر نچھاور کر رہے ہیں۔ کچھ دیر گزری تو میر عماد کاتب کامل بڑے فخر و انبساط سے دربار میں داخل ہوا اور تمام درباریوں کو مخاطب کر کے کہا کہ رقم حاضر ہے داخل خزانہ ہونا چاہیے۔ میں نے یہ محنت شاقہ اس لیے گوارا کی تھی کہ بادشاہ کے پاس

زر و جواہرات تو دیگر بادشاہوں کی طرح بہت کچھ ہے۔ ہوگا اور آئندہ بھی رہے گا۔ کاش میری خطاطی کا گنجینہ اگر بادشاہ کے پاس ہوگا تو وہ بھی کسی حالت اور کسی بنا پر زر و جواہر یا لعل بے بہا سے کم ہرگز نہ ہوگا مگر میں کیا کروں سلطنت کی اپنی قسمت۔ میر عماد خوش نویس کی اس تقریر پر بادشاہ اور درباریوں نے بڑی ہتک محسوس کی شرم و خجالت سے ان کے چہرے سرخ ہو گئے۔ بادشاہ عباس قلی کے دل میں فوراً یہ خیال بھی آیا کہ جب دیگر شاہانِ مملکت کو خبر ہو گی کہ بادشاہ ایران نے ایک خطاط سے چھ لاکھ کی رقم واپس لی ہے تو بڑی

WWW.PAKSOCIETY.COM

رسوائی ہوگی اور سلطنت پر نہایت بدنما دھبا لگے گا بہتر یہی ہے اس خطاط کو قتل کرایا جائے چنانچہ اسی وقت میر عماد زریں رقم کے قتل کا حکم صادر ہوا اور میر عماد رقم پرور حسب الحکم سرِ دربار قتل کردیا گیا۔ اندھا جہل ایک بار پھر حسن و علم کی شمع پر حملہ آور ہوا مگر سوائے اپنا ہی دامن مزید داغ دار کرنے کے اور کچھ نہ کرسکا یہی اس کا مقدر تھا، ہے اور رہے گا۔ میر عماد شہیدِ فن کا ایک قریبی عزیز آغا عبدالرشید جو میر عماد مقتول کا داماد بھی تھا بہت بڑا خطاط اور میر عماد کے فن کا سچا امین و شاگرد تھا۔ میر عماد رقم پرور کے قتل اور بادشاہ کے عتاب سے سخت غم زدہ ہوا ساتھ ہی یہ خوف بھی دامن گیر ہوا کہ اگر بادشاہ نے میر عماد استاد کے سارے خاندان کو قتل کردینے کا حکم دیا تو میں بھی مارا جاؤں گا بہتر ہے یہاں سے نکل جاؤں۔ آغا عبدالرشید کا خدشہ درست تھا۔ بادشاہ عباس قلی اسے بھی موت کے گھاٹ اتارنے کا ارادہ کرچکا تھا۔ راج ہٹ، تریا ہٹ اور بال ہٹ جیسی نادانی پر اتر آیا تھا جس کا کوئی اپائے نہیں تھا۔ چنانچہ آغا عبدالرشید ایک تیز رفتار گھوڑے پہ سوار ہوکر اسی وقت نکل کھڑا ہوا۔ موت اس کے تعاقب میں تھی۔ کئی روز مسلسل سفر کے بعد لاہور میں داخل ہوا مگر ڈر کے مارے یہاں بھی نہ ٹھہر سکا اسی حالت میں دوبارہ پا بہ رکاب ہوکر دلی (اکبرآباد) کا رخ کیا۔ بالآخر کسی آہوئے مرگ دیدہ کی مانند ہندوستان کے دارالسلطنت میں وارد ہوا۔ چہرے پر حزن و ملال، پریشان حال، کپڑے میلے اور گرد سے اٹے ہوئے۔ قلعہ معلّٰی کے اندر شاہی محل کے دروازے پہ جا کھڑا ہوا اور دربان کی منت سماجت کی کہ مجھے بادشاہ سلامت سے کچھ عرض کرنا ہے براہ کرم بادشاہ کے حضور پہنچا دو۔ دربان نے پہلے تو ٹال مٹول سے کام لیا مگر آخر کار اندر جا کر خبر کردی کہ ایک فریادی شہنشاہِ ہند سے ملنا چاہتا ہے اور باہر کھڑا ہے۔ آغا عبدالرشید کی قسمت یاوری کررہی تھی۔ شہنشاہ شاہ جہاں نے ملاقات کی اجازت دے دی۔ آغا عبدالرشید اندر جانے لگے تو وہاں پر موجود دو تین امراء نے آغا سے کہا کہ بادشاہ نے اس طرح کسی کو بھی نہیں بلایا۔ تمہارے پاس شہنشاہ کے حضور کچھ نذر کرنے کے لیے ہے؟ آغا نے جواب دیا کہ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہاں اگر قلم دوات کا غذ مل جائے تو میں نذر کا سامان پیدا کرلوں گا۔ چنانچہ آغا نے اپنے حسبِ حال نہایت عمدہ نستعلیق میں یہ قطعہ لکھا

ایا خجستہ خصالی کہ ساکنان فلک
برآستان تو دارند میل دربانی
چہ حاجتست کہ گویم حالِ خستۂ خود
کہ حالِ خستۂ دل آں را تو خوب می دانی

ملاقات پر بادشاہ نے آغا عبدالرشید سے حال پوچھا تو آغا نے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا انتہائی عمدہ اور نستعلیق قطعہ پیش کردیا۔ اس پر شہنشاہ بے حد خوش ہوا۔ خط نستعلیق کا حسن شہنشاہ کے دل میں ترازو ہوگیا۔ مغل بادشاہ نے محسوس کیا کہ یہ شخص اپنے فن میں کامل ہے۔ حکم صادر ہوا کہ اس اجنبی کو عمدہ کھانا اور لباس دیا جائے۔ شام کو اس سے تمام حالات سنے جائیں گے۔ شام کی ملاقات میں آغا عبدالرشید نے تفصیل سے اپنی اور شہیدِ فن میر عماد استاد کی داستان بیان کی اور عرض کی کہ حضور، میں اب آپ کی پناہ میں ہوں میری زندگی اور فن آپ کے اختیار میں ہے۔

شہنشاہ شاہ جہاں نے وعدہ فرمایا کہ آپ ہرگز اندیشہ نہ کریں اور اپنے بے مثال خط سے ہر خاص و عام کو فیض پہنچائیں۔ ہم دل سے چاہتے ہیں کہ ہندوستان میں بھی خطِ نستعلیق کا رواج ہو۔ شہنشاہ شاہ جہاں نے خوش قلم آغا عبدالرشید کے لیے معقول تنخواہ کا حکم دیا۔ اس پر آغا عبدالرشید بے حد ممنون ہوئے اور باری تعالیٰ کے حضور سجدۂ شکر بجالائے۔ اس واقعہ کے چوتھے ہی دن شاہ ایران عباس قلی کا قاصد پیغام لے کر آیا کہ آغا عبدالرشید رقم پرور ہمارا مجرم ہے لہٰذا ہمارے حوالے کیا جائے۔ اس پر شہنشاہ شاہ جہاں نے دوٹوک جواب لکھوایا کہ آغا عبدالرشید خطاط بڑا باکمال اور مظلوم شخص ہے۔ بڑے دکھ اور افسوس کی بات ہے کہ سلطنتِ ایران نے میر عماد جیسے یکتائے روزگار قلم پرور کو قتل کروادیا۔ بادشاہوں نے تو ہمیشہ اہلِ کمال کی قدر، خدمت اور خاطرداری کی ہے ایک آپ ہیں کہ اہلِ فن کو نیست و نابود کرتے ہیں۔ بہرحال آغا عبدالرشید صاحبِ ہنر اب ہماری پناہ میں ہے اور سلطنتِ ہندان کی پوری پوری حفاظت کرے گی۔ اس مضبوط اور قطعی جواب پر بادشاہ ایران نے چپ سادھ لی کیونکہ اس وقت مغلیہ سلطنت بڑی طاقت ور اور مستحکم حکومت تھی۔ پس عہدِ شاہ جہاں (1628عیسوی 1658عیسوی) سے خطِ نستعلیق کا ہند میں آغاز ہوا جو آج تک روبہ ترقی ہے۔ الغرض اہلِ ہند کو آغا عبدالرشید زریں قلم نے ہی خطِ نستعلیق کا خوب صورت اور ان مول تحفہ دیا۔

پُراسرار گلاب

عفان آزاد

گلاب کا پھول روح میں تازگی بھرتا ہے، مزاج میں شگفتگی لاتا ہے۔ مگر نہ جانے اس گلاب کے پودے میں ایسی کیا بات تھی جو خوف کی علامت بنا رہا۔ یوں بھی قد آدم گلاب کے پودے ناپید ہیں مگر اس گھر میں سر اٹھائے جھومتے تھے، پھر جب اس کی جڑوں کو کھودا گیا تو کھودنے والے مزدور بھی خوف زدہ ہوگئے۔ آخر ایسی کیا بات تھی اس پودے میں؟

یورپ سے درآمد ایک اسرار بھرا واقعہ

وہ گلاسگو کے ایک وسیع و عریض گھر میں رہتے تھے۔ اُن کی زندگی بہت پُرسکون گزر رہی تھی مگر مسز میکڈونلڈ یہاں خوش نہیں تھیں۔ اُن کی خواہش تھی کہ وہ قدرتی حُسن سے مالا مال کسی قصبے میں نہایت سادگی سے زندگی کے دن بسر کریں۔ اُن کے شوہر اس بات پر رضا مند نہیں تھے لیکن کئی برسوں کی محنت رنگ لائی۔ آخر کار انہوں نے کسی نہ کسی طرح شوہر کو اپنی ضد کے آگے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر ہی لیا اور پھر تلاش ہوئی نئے مگر من پسند گھر کی۔

کئی مہینوں کی محنت کے بعد اُس جوڑے نے آخر ایک گھر کو تصاویر دیکھ کر خریدنے کے لیے پسند کرلیا۔ اس گھر کی فروخت کا اشتہار اخبار میں چھپا تھا۔ گھر ایک پراپرٹی ڈیلر کی ملکیت تھا اور اُسی سے سودا طے کرنا تھا۔ گھر گلاسگو سے بہت دُور ایک چھوٹے سے قصبے میں واقع تھا۔ پراپرٹی ڈیلر سے ابتدائی معاملات فون پر طے ہونے کے بعد میاں بیوی

WWW.PAKSOCIETY.COM

اپنے دو چھوٹے بچوں کے ہمراہ ٹرین کے ذریعے طویل سفر طے کر کے گھر دیکھنے کے لیے پہنچے۔ وہ اجنبی جگہ پر کسی کو نہیں جانتے تھے۔ اسی لیے ایک روز کے لیے کسی مقامی ہوٹل میں رُکنا چاہتے تھے مگر پراپرٹی ڈیلر نے ان کا ارادہ بدل دیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ لوگ ہوٹل میں ٹھہریں۔ اسی لیے اب وہ اُس کے مہمان تھے۔

مسز میکڈونلڈ جب اپنے شوہر کے ہمراہ اُس گھر کو دیکھنے کے لیے پہنچیں تو پہلی ہی نظر میں وہ ان کے دل میں گھر کر گیا۔ انہوں نے طے کر لیا تھا کہ یہی ان کے خوابوں کا گھر ہو سکتا ہے۔ بس پھر کیا تھا، جھٹ پٹ سودا طے ہو گیا۔ گھر کی تزئین و آرائش کی ذمّے داری پراپرٹی ڈیلر نے اپنے سر لے لی تھی۔ یوں طے ہوا کہ چند ہفتوں کے بعد جب کام نمٹ جائے گا، میکڈونلڈ فیملی یہاں رہنے کے لیے آ جائے گی۔

وہ اگست 1953ء کا پہلا ہفتہ تھا، جب پراپرٹی ڈیلر نے فون کر کے انہیں اطلاع دی کہ گھر رہائش اختیار کرنے کے لیے بالکل تیار ہے۔ بس پھر کیا تھا انہوں نے تیزی سے تیاریاں شروع کر دیں۔ چند روز بعد مال گاڑی کے ذریعے گھریلو سامان بھجوانے کے بعد ایک صبح وہ بھی ٹرین کے ذریعے نئے گھر کے لیے عازمِ سفر تھے۔

میکڈونلڈ فیملی اب تک نہایت پُرسکون زندگی بسر کر رہی تھی مگر جب سترہ اگست کی شام وہ بڑی چاہت سے خریدے گئے اپنے نئے مکان میں منتقل ہوئے تو اُس کے ساتھ ہی ان کی زندگی پریشانیوں کے ایک طویل سلسلے سے ہمکنار ہو گئی۔ اُس روز وہ اسکاٹ لینڈ کے قصبے انورنیس میں واقع اپنے نئے گھر اراچی لاج منتقل ہوئے تھے۔

گھر کی تزئین و آرائش نہایت خوش اسلوبی سے کی گئی تھی۔ یہ بات اُن کے لیے خوشی کا باعث تھی۔ پراپرٹی ڈیلر نے مال گاڑی کے ذریعے بھجوائے گئے گھریلو سامان کو بھی قصبے کے ریلوے اسٹیشن سے گھر پر منتقل کروا دیا تھا۔ یہ بات اُن کے لیے باعثِ اطمینان تھی کہ پراپرٹی ڈیلر کی مہربانیوں کے باعث وہ اس اجنبی قصبے میں کئی پریشانیوں سے بچ گئے تھے۔ وہ تہِ دل سے اُس کے مشکور تھے لیکن کیا یہ واقعی اُس کی مہربانی تھی یا وہ چاہتا تھا کہ گلاسگو سے انورنیس منتقل ہونے والا جوڑا گھر خریدنے اور یہاں منتقل ہونے سے پہلے کسی اور مقامی شخص سے نہ مل پائے۔ اگر ایسا تھا تو وہ اپنی اس کوشش میں نہایت کامیاب رہا تھا۔ گھر کی خریداری سے لے کر یہاں آنے تک، وہ دونوں کسی اور مقامی شخص سے مل نہیں سکے تھے۔ اسٹیشن پر بھی پراپرٹی ڈیلر انہیں لینے کے لیے موجود تھا اور جب وہ انہیں اراچی لاج میں چھوڑ کر واپس جا رہا تھا تو جاتے جاتے یہ خبر بھی دے گیا کہ یہ گھر انورنیس میں اُس کی واحد جائداد تھی جو فروخت نہیں ہو پائی تھی۔ اسی کی وجہ سے وہ یہاں ٹِکا ہوا تھا۔ اگلی صبح وہ ہمیشہ کے لیے انورنیس چھوڑ کر لندن منتقل ہو رہا تھا۔ اس جوڑے کو اتنے اچھے انسان کے یہاں سے چلے جانے کا سن کر دلی دکھ ہوا تھا مگر دوسری طرف پراپرٹی ڈیلر کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ وہ کامیابی سے ایسی جائداد منافع بخش دام پر بیچنے میں کامیاب ہو گیا تھا جسے انورنیس کا کوئی بھی باشندہ خریدنے پر تیار نہیں تھا۔

میکڈونلڈ فیملی کو ابھی اراچی لاج میں منتقل ہوئے چند گھنٹے ہی ہوئے تھے کہ رات ہو گئی۔ دن بھر کے سفر سے سب تھکے ہوئے تھے۔ اس لیے وہ سب جلدی سونے کے لیے کمروں میں چلے گئے۔

رات کا پہلا پہر ہو گا۔ مسز میکڈونلڈ سکون سے سو رہی تھیں کہ اچانک کچھ کھٹ پٹ کی آوازیں اُن کے کانوں میں پڑیں۔ یہ ان کے لیے پریشان کُن بات تھی۔ ان پر شدید نیند طاری تھی لیکن اس کے باوجود انہوں نے بڑی ہمت کر کے آنکھیں کھولیں اور اُن آوازوں پر اپنی توجہ مرکوز کر دی۔ کچھ ہی دیر میں انہیں احساس ہو گیا کہ گھر میں کچھ غیر معمولی بات ہے۔ ایسی غیر معمولی بات جو یقیناً ان کے لیے خوشی کا باعث نہیں۔ انہوں نے گھر میں کسی کے چلنے پھرنے، برتنوں کے آپس میں ٹکرانے، کوئی چھوٹی موٹی چیز فرش پر گرنے، کھڑکی کا پٹ کھلنے اور پردہ سرکنے جیسی آوازیں اور آہٹیں محسوس کی تھیں۔ اُس وقت وہ نیم غنودگی کی کیفیت میں تھیں۔ وہ لوگ طویل سفر طے کر کے یہاں پہنچے تھے۔ بدن تھکن سے چور تھا۔ جاگنے سونے کی کیفیت میں انہوں نے سر کو جھٹکا اور بیڈ پر برابر کی جانب دیکھا۔ اُن کے شوہر ڈاکٹر پیٹر میکوان میکڈونلڈ گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ انہوں نے ہمت کر کے ایک بار پھر سر جھٹکا اور کروٹ بدل کر لیٹ گئیں۔ وہ سمجھ رہی تھیں کہ جو آہٹیں انہوں نے سنی تھیں، وہ نئی جگہ پر پہلی رات اور طویل سفر کی تھکان کے باعث شاید اُن کے دماغ کا خلل تھیں مگر وہ جو سوچ رہی تھیں، یہ ایسا ہرگز نہیں تھا۔ چند لمحوں بعد وہ ایک بار پھر غفلت کی نیند سو چکی تھیں لیکن اُن کے سو جانے سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ جو آوازیں اور آہٹیں انہوں نے سنی تھیں، وہ وقفے وقفے سے بدستور گھر کے لاؤنج میں گونج رہی تھیں۔ یہ انہیں ایسی حقیقت تھی جو آنے والے دنوں میں اپنے وجود کو تسلیم کروانے کے لیے اُن کی نظروں کے سامنے آنے والی تھی مگر ابھی وہ اس سے غافل تھیں۔ مسز میکڈونلڈ کو گمان تھا کہ اب صرف ان کا خاندان ہی یہاں رہے گا مگر ان سے پہلے بھی اس گھر میں ایک بوڑھی عورت رہ رہی تھی۔ بوڑھی عورت جو اب مسٹر اور مسز میکڈونلڈ کی طرح جسمانی طور پر اس دنیا میں تو نہیں تھی مگر پھر بھی اس کا سایہ، اس کی روح یا پھر اس کا بھوت...... جو چاہے نام دے لو، اب بھی اس گھر کی مکین تھی، وہ گھر جس کا مالک اب یہ جوڑا تھا۔

وہ عورت کون تھی؟ یہ بات تو آگے جا کر ہی معلوم ہو گی مگر وہ بھوت جس عورت کا تھا، اس کی حرکات و سکنات بہت عجیب تھیں۔ وہ بوڑھی تھی۔ اس کے جسم پر ایک شال لپٹی ہوئی تھی۔ سب سے حیرت انگیز بات یہ کہ وہ دونوں پاؤں پر سیدھا کھڑا ہونے کے بجائے کسی شیر خوار بچے کے مانند کہنیوں اور گھٹنوں کے بل لاؤنج کے فرش پر چلا کرتی تھی۔ گھٹنوں کے بل گھسٹتی ہوئی عورت کا بھوت بہت جلد صرف مسز میکڈونلڈ کی نظروں کے سامنے آنے والا تھا۔ البتہ یہ اور بات تھی کہ اُن کی کہانی پر یقین کر لینے والا شوہر اور دیگر لوگ صرف پُراسرار آہٹیں اور آوازیں ہی سن پائیں گے۔

اگلے روز صبح ہوتے ہی مسز میکڈونلڈ گھر کے کام کاج میں لگ گئیں۔ نئے گھر کی تزئین و آرائش پہلے ہی ہو چکی تھی مگر سامان کو ترتیب دینا ان کے لیے نہایت مشقت طلب کام ثابت ہوا تھا۔ نئے گھر میں یہ اُن کی دوسری رات تھی۔ سارے دن کام کاج میں مصروف رہنے کے بعد وہ تھکن سے بے حال گہری نیند سو رہی تھیں کہ اچانک ان کے کانوں میں ایک بار پھر عجیب طرح کی آہٹیں گونجنے لگیں۔ ان پُراسرار آہٹوں سے اُن کی آنکھ کھل گئی۔ انہیں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے لاؤنج کے فرش پر کوئی گھٹنوں کے بل گھسٹتا ہوا اِدھر سے اُدھر چل جا رہا ہے۔ ان کے بچے چھوٹے تھے لیکن شیر خوار نہیں کہ یوں آدھی رات کو اپنے کمرے سے نکل کر لاؤنج کے فرش پر اچھل کود کرتے پھریں۔ ویسے بھی وہ تو اُن کی نظروں کے سامنے ہی سو چکے تھے۔

مسز میکڈونلڈ نے نیند سے بیدار ہونے کی کوشش کی مگر دن بھر کی تھکن سے چُور ان کا جسم ہلنے جُلنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ انہوں نے بدقت تمام آنکھیں کھولیں اور کمرے میں چاروں طرف دیکھا۔ اُن کے برابر میں شوہر خوابِ غفلت میں تھے۔ کھڑکی پر جالی کا پردہ پڑا ہوا تھا اور باہر چڑھتے چاند کی چٹکی چاندنی نے کمرے میں بھی ہلکی سی دودھیا روشنی

فیصلہ

سردار جی اپنی بیوی کو لے کر کورٹ گئے اور جج سے کہا کہ ہم طلاق چاہتے ہیں اور بچے آدھے میں رکھوں گا اور آدھے میری بیوی۔ جج نے کہا۔

''تمہارے تو پانچ بچے ہیں۔ آدھے آدھے تقسیم کیسے کرو گے؟''

سردار جی نے بیوی کے ساتھ مشورہ کیا۔ کافی سوچ بچار کے بعد جج سے کہا۔

''ٹھیک ہے، ہم اگلے سال آئیں گے۔''

(احتشام احسان، صفدر آباد)

پھیلا دی تھی۔ اس ہلکی مگر سحر انگیز روشنی میں انہیں کچھ نظر نہیں آیا۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر ٹیبل لیمپ روشن کر دیا۔ کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ روشنی کے ہوتے ہی آہٹیں بھی بند ہو چکی تھیں۔ انہوں نے سوتی جاگتی آنکھوں اور نیم بیدار دماغ سے ان آہٹوں کو پورے دھیان سے سننے کی کوشش کی مگر اب ہر طرف خاموشی تھی۔ ہوا کی سرسراہٹ تک سنائی نہیں دے رہی تھی۔ انہوں نے سر جھٹکا اور ان آوازوں کو اپنا وہم سمجھ کر ایک بار پھر نیند کی آغوش میں کھو گئیں۔

دوسرے دن صبح ناشتا بنانے کے بعد وہ ایک بار پھر سامان نکالنے اور قرینے سے لگانے میں جُت گئیں۔ اچانک انہیں کل رات والی بات یاد آ گئی۔ انہوں نے ذہن پر بہت زور ڈالا اور آخر یہ کہہ کر خود کو تسلی دے لی کہ دن بھر گتے کے ڈبوں میں پیک برتنوں کو نکالتی، صاف کرتی اور ریک میں لگاتی رہی ہوں، شاید انہی برتنوں کی کھنکھناہٹ ہو گی جو تحت الشعور میں بیٹھ گئے اور سوتے میں انہیں محسوس ہوئی تھی۔

گھر کے مالک مشہور ماہر نفسیات اور لندن سوسائٹی برائے نفسیاتی تحقیق کے رکن ڈاکٹر پیٹر میکوان میکڈونلڈ تھے۔ وہ اراچی لاج میں دو راتیں گزار چکے تھے۔ تیسری صبح اُن کی بیوی نے گزشتہ دو راتوں سے سنائی دی جانے والی آہٹوں کے بارے میں بتایا تو وہ چونک اٹھے۔ پہلی رات تو وہ تھکن کے مارے غفلت کی نیند سوئے تھے مگر دوسری رات انہوں نے بھی کچھ آوازیں سنی تھیں مگر نیند کے غلبے کے باعث وہ اٹھ کر ان کا پتا چلانے کی ہمت نہیں کر سکے تھے۔ اب جب بیوی نے ذکر کیا تو انہیں بھی وہ سب کچھ یاد آ گیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

ڈاکٹر میکڈونلڈ نفسیاتی ماہر تھے۔ شاید اسی لیے وہ ان آوازوں کو زیادہ خاطر میں نہ لائے۔ تب ہی 'رات گئی بات گئی' کہ مصداق یہ واقعہ اُن کے ذہن سے نکل گیا مگر جب بیوی نے گزشتہ دو راتوں کا تجربہ بیان کیا تو ان کے بھی کان کھڑے ہوئے لیکن انہوں نے ایسا کچھ نہ ظاہر ہونے دیا جس سے وہ بے چاری سہم جاتی۔

''کوئی خاص بات نہیں ہے یہ۔'' ڈاکٹر میکڈونلڈ نے پُرتشویش لہجے میں کہانی سنانے والی بیوی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''دراصل بات یہ ہے کہ جب ہم کسی نئی جگہ پر ٹھہرتے ہیں تو ہمارے دماغ کے ایک حصے میں یہ خوف پیدا ہو جاتا ہے کہ یہاں نقصان پہنچانے والی کوئی شے موجود ہو سکتی ہے۔ جب رات کے آخری پہر ہمارے شعور کا دماغ پر کنٹرول کمزور پڑ جاتا ہے تو دماغ زیادہ طاقت ور انداز میں اُس شے کو از خود بیان کرنا شروع کر دیتا ہے۔ یوں ہمیں اپنا شعوری ... خوف، دماغ کی دراندازی کے باعث نیند سے جگا کر ایسا تاثر دیتا ہے کہ جو تم نے شعوری طور پر سوچا تھا، وہ وقوع پذیر ہو رہا ہے۔''

''اچھا.....'' یہ سُن کر خاتون نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''ممکن ہے ایسا ہی ہو۔'' شوہر نفسیات کا ماہر تھا۔ اس کی بات سن کر بیوی کا مطمئن ہونا یقینی تھا۔

''ممکن نہیں، یقیناً ایسا ہی ہے۔'' یہ کہہ کر ڈاکٹر نے ایک کپ کافی کی فرمائش کی اور اسٹڈی میں چلا آیا۔ وہ خوش تھا کہ اُسے مطمئن کر دیا ورنہ ایسی پُراسرار صورتِ حال سے عورتیں بہت جلد خوفزدہ ہو جاتی ہیں۔ البتہ یہ اور بات تھی کہ وہ خود بے چین و فکرمند ہو گیا تھا۔

بطور ماہرِ نفسیات ڈاکٹر ماورائیت پر یقین تو رکھتا تھا لیکن اس کی سائنسی توجیہہ کے سبب۔ البتہ وہ کسی بھی ایسی شے کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھا جو صرف ضعیف العقیدہ سوچ پر مبنی ہو۔ اگرچہ وہ بڑی آسانی سے اپنی بیوی کے تجربے کو نظر انداز کر سکتا تھا مگر یہ بھی سچ ہے کہ گزشتہ رات خود اُس نے بھی ایسی آوازیں سنی تھیں کہ جیسے بیڈروم کے باہر لاؤنج میں کوئی گھٹنوں کے بل گھسٹتا ہوا چل رہا ہے۔ اس لیے وہ بیوی کو مطمئن کر کے اسٹڈی میں آ گیا تا کہ اس سارے معاملے پر تفصیل سے غور کر سکے۔

نئے گھر میں گزشتہ دو راتوں کے دوران جو کچھ ہوا تھا، وہ مسز میکڈونلڈ نے نہایت تفصیل اور جزئیات کے ساتھ شوہر کے گوش گزار کر دیا تھا۔ پھر کل رات وہ خود بھی اس تجربے سے گزر چکا تھا لیکن اب تک اس سارے معاملے پر اس کی رائے ملی جُلی تھی۔ وہ اسے کوئی واضح رُخ دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

ایک طرف ڈاکٹر یہ سوچ رہا تھا کہ اسے زندگی میں پہلی بار یہ موقع مل رہا ہے کہ وہ آسیب اور ماورائیت کے اس تجربے کو سائنسی تحقیق کا رخ دے کر اپنا نیا تحقیقی مقالہ لکھے۔ یہ مقالہ سوسائٹی میں اس کے قد کو بڑھا سکتا تھا، اس کی پیشہ ورانہ اہمیت میں اضافہ کر سکتا تھا۔ دوسری طرف وہ بطور انسان صرف اپنی بیوی اور بچوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ یہ تو سمجھ گیا تھا کہ گھر آسیب زدہ ہے اور اس آسیب سے اب اُسے اپنے گھر والوں کو بچانا تھا۔ اگر وہ تحقیق کرتا ہے تو اس کے لیے اس گھر میں رہنا ناگزیر تھا اور اگر وہ اہلِ خانہ کی سلامتی چاہتا ہے تو پہلی فرصت میں اسے یہاں سے نکلنا ہوگا۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا اب اسے کیا کرنا چاہیے؟

ڈاکٹر اپنی ذاتی ٹیلی فون ڈائریکٹری کھول کر لندن میں سوسائٹی کے سیکریٹری کا نمبر تلاش کر رہا تھا کہ اس کی بیوی کافی لے کر آ گئی۔ شوہر کو دیکھ کر اس نے برسبیلِ تذکرہ یہ کہہ دیا۔ ''کیا سوچ رہے ہو؟''

''وہ ذرا ایک فون کرنا تھا لندن۔'' ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ بیوی کے چلے جانے کے بعد اس نے سوسائٹی کے سیکریٹری کو فون کر کے اُسے پوری صورتِ حال سے آگاہ کیا اور دریافت کیا کہ کیا سوسائٹی کا کوئی رکن اِنورنیس یا اس کے اطراف میں رہتا ہے، جو اس معمے کو حل کرنے میں اُن کی مدد کر سکے۔ سیکریٹری نے اسے کچھ دیر انتظار کرنے کو کہا۔ اُس کے بعد اس نے دو نام اور ان کے فون نمبر اسے لکھوا دیے۔ وہ دونوں اِنورنیس کے ہی رہنے والے اور سوسائٹی کے پرانے ارکان تھے۔

میکڈونلڈ فیملی نے تیسری اور چوتھی رات بھی اراچی لاج میں گزشتہ دو راتوں سے پیش آنے والے تجربے کے ساتھ ہی گزاری۔ پچھلی دو راتوں میں سنائی دینے والی آہٹیں ہلکی تھیں لیکن اس بار ان آوازوں میں تیزی تھی۔ دونوں میاں بیوی اب یقین کر چکے تھے کہ یہ معاملہ صرف احساس کا نہیں بلکہ وجودیت کا بھی ہے۔ کوئی ایسی نادیدہ شے ہے، جو اس گھر میں اُن کی آمد سے بہت پہلے سے رہ رہی ہے۔ اب وہ اُس پرانے گھر کے نئے مکینوں پر اپنی موجودگی ثابت کرنا چاہتی ہے مگر وہ انہیں اپنی موجودگی کا احساس کیوں کروا رہی ہے؟ وہ انہیں کیوں پریشان کر رہی ہے؟ وہ چاہتی کیا ہے؟ ..... ڈاکٹر کے پاس سوالات تو تھے مگر جواب ان میں سے کسی ایک کا بھی نہیں تھا۔ جواب

پانے کے لیے وقت درکار تھا۔ تلاش ضروری تھی، تحقیق کرنا باقی تھی۔ ڈاکٹر میکڈونلڈ یہ سب کچھ کرنے کی ہمت رکھتا تھا۔ وہ اس آسیب زدہ گھر میں ماورائی شے کی حقیقت معلوم ہونے تک ٹھہر سکتا تھا لیکن اُس کی بیوی سخت خوفزدہ ہو چکی تھی۔ بیوی اور چھوٹے بچوں کے احساسِ عدم تحفظ کے باعث وہ خود بھی سخت پریشان تھا۔

تین راتیں تو جیسے تیسے کر کے گزر چکی تھیں لیکن چوتھی رات ڈاکٹر کچھ طے کر کے سویا تھا۔ رات کا دوسرا پہر تھا جب آہٹوں کے باعث اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ فوراً اٹھ بیٹھا۔ اس کی بیوی نہایت خوف کے عالم میں کمبل لپیٹے بستر پر بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں خوف کے باعث پھیل چکی تھیں۔ وہ اٹھا اور اس نے جیسے ہی کمرے کی لائٹ جلائی، یکدم آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ آوازیں لاؤنج سے آ رہی تھیں اور اس نے لائٹ بیڈروم کی جلائی تھی۔ وہ کمرے سے باہر نکلنا چاہتا تھا لیکن اس کی بیوی نے اُس کا بازو پکڑ کر ایسا کرنے سے روک دیا۔ ڈاکٹر حیرت زدہ کمرے کے بیچوں بیچ کھڑا تھا۔ لائٹ جلتے ہی پورے گھر میں سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر نے کمرے کی لائٹ بند کی اور بستر پر آ گیا۔ وہ سخت پریشان تھا۔

لائٹ بند ہوئے چند سیکنڈ ہی گزرے تھے کہ ایک بار پھر وہی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ اس بار یہ آوازیں ناصی اونچی تھیں۔ دونوں میاں بیوی بستر پر حیران بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ اپنی بیوی کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ سخت ڈری ہوئی تھی۔ خوف کے مارے اس کی آواز نکل نہیں پا رہی تھی۔ اچانک ڈاکٹر اٹھا اور کمرے کی ساری لائٹیں ایک بار پھر روشن کر دیں۔ لائٹ جلتے ہی لاؤنج سے آنے والی آوازیں ایک بار پھر بند ہو گئیں۔

''لائٹ جلی رہنے دو اور سو جاؤ۔'' وہ پلٹا اور بستر پر لیٹتے ہوئے بیوی سے کہا۔ ''میں سو رہا ہوں، تم بھی لیٹ جاؤ۔ اگر دوبارہ آوازیں سنائی دیں تو مجھے جگا دینا۔'' یہ کہہ کر وہ کروٹ لے کر لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ سو چکا تھا مگر نیند اُس کی بیوی کی آنکھوں سے کوسوں دور جا چکی تھی۔ وہ دم سادھے کمبل اوڑھے لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ انہوں نے گھر کا خوبصورت محلِ وقوع دیکھ کر اسے خوشی خوشی خریدا تھا لیکن اب وہ افسوس کر رہی تھی کہ انہوں نے اس منحوس گھر کو پسند ہی کیوں کیا تھا۔ اراچی لاج میں ان کی چوتھی رات تھی مگر وہ ایک رات بھی سکون کی نیند نہیں سو سکی تھی۔

جو مہمان بغیر اطلاع کے کسی کے گھر جاتے ہیں۔ وہ اپنے رسک پر ایسا کرتے ہیں اور جو فون کی سہولت ہونے کے باوجود اس سے اجتناب برتتے ہیں وہ بلاشبہ میزبان کے لیے مسئلہ کھڑا کر دیتے ہیں۔ خصوصاً جب کھانے کا وقت ہو۔ ایسے مہمان کی خاطر تواضع میزبان پر واجب نہیں۔ تاہم یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ آج کل کوئی کسی کے ہاں کھانا کھانے نہیں جاتا اور کھاتا ہے تو میزبان پر احسان کرتا ہے کہ اس نے میزبان کے دسترخوان کو یہ شرف بخشا ورنہ اسے کہیں نہ کہیں تو کھانا ہی تھا اس لیے اچانک آ جانے والے مہمان کی آمد پر دل چھوٹا کرنے کے بجائے خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے اور خندہ پیشانی سے اس کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔ رزق تو وہ اپنا خود لے کر آتا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ دانے دانے پر مہر لگی ہوتی ہے ایک شاعر نے کیسی پتے کی بات کہی ہے۔

ہو نہ تُو عاجز پیارے خاطرِ مہمان سے
اپنا کھانا کھاتا ہے وہ تیرے دسترخوان سے

اقتباس: خود خوش حملہ از ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی

انگریز کا بیٹا

انگلینڈ میں جو پاکستانی آباد ہیں ان کی غالب تعداد پنجاب اور آزاد کشمیر سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ لوگ آج سے قریباً تیس سال قبل ترکِ وطن کر کے یہاں آئے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر کا تعلق لیبر کلاس سے تھا اور انگریزی سے نابلد تھے چنانچہ انہیں مجبوراً اپنے بچوں سے پنجابی بولنا پڑی جس کا فائدہ یہ ہوا کہ یہاں پیدا ہونے والے اور نشوونما پانے والے بچے بھی پنجابی سیکھ گئے مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ بچے پنجابی صرف اپنے والدین کے ساتھ بولتے ہیں' آپس میں ہمیشہ انگریزی میں بات کرتے ہیں۔ ان میں سے جو احساس کمتری کا شکار ہیں وہ اپنے بچوں کو فرفر انگریزی بولتے دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں اور فرطِ مسرت سے اسے سینے کے ساتھ چمٹا کر کہتے ہیں ''آہا۔ میرا بیٹا تو کسی انگریز کا بیٹا لگتا ہے۔''

اقتباس: عطاء الحق قاسمی کے سفرنامے ''گوروں کے دیس میں''

WWW.PAKSOCIETY.COM

مسٹر اینڈ مسز میکڈونلڈ کو نئے گھر میں منتقل ہوئے چار دن گزر چکے تھے۔ یہ پانچویں رات تھی۔ اُس رات ان کے گھر میں کافی رونق تھی۔ گھر کے لاؤنج میں خاصے لوگ موجود تھے۔ ڈاکٹر میکدونلڈ نے نئے گھر کی خوشی میں اپنے چند جاننے والوں اور ہمسایوں کو دعوت دی تھی۔ وہ سب لوگ ضیافت اڑانے کے لیے یہاں جمع تھے۔ اُس وقت سب لوگ لاؤنج میں مشروب کی چسکیاں بھرتے ہوئے خوش گپیاں کررہے تھے۔ انہی مہمانوں میں مسٹر رَوس اور مسز مینتھیسن بھی شامل تھیں۔ یہ دونوں لندن سوسائٹی برائے نفسیاتی تحقیق کے رکن تھے۔ سوسائٹی کے سیکریٹری کی معرفت ہی اُن دونوں سے ڈاکٹر میکڈونلڈ کا تعارف ہوا تھا۔

پارٹی خاصی دیر تک چلتی رہی۔ ڈاکٹر اور اس کی بیوی نہایت خوش دلی سے مہمانوں کی تواضع میں مشغول تھے۔ ہمسائے بھی اُن سے مل کر بہت خوش تھے۔ وہ دونوں اپنے کسی بھی انداز سے یہ ظاہر نہیں ہونے دے رہے تھے کہ گزشتہ چار راتوں سے وہ اس گھر میں کتنی بڑی پریشانی کا شکار ہو چکے تھے۔ انہوں نے اپنے مہمانوں سے اشارے کنائے میں بھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی کہ کیا یہ مکان آسیب زدہ ہے۔ رات کھانے کے بعد ایک، ایک کر کے تمام مہمان رخصت ہوگئے۔ بچے بہت پہلے ہی سونے کے لیے اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔ اب لاؤنج میں صرف صاحبِ خانہ، اُن کی بیوی، مسٹر رَوس اور مسز مینتھیسن باقی رہ گئے تھے۔ چاروں نے مل کر تمام برتن اکٹھے کیے اور انہیں کچن میں رکھنا شروع کر دیا۔ رات کے ساڑھے دس بج چکے تھے مگر سوسائٹی سے تعلق رکھنے والے وہ دونوں مہمان بدستور گھر میں موجود تھے۔ اُن کے یہاں ٹھہرنے کا خاص سبب تھا۔

رات گیارہ بجنے والے تھے۔ لاؤنج سے تمام برتن اور دیگر اشیا اٹھا کر باورچی خانے میں رکھ دی گئی تھیں۔ کچن لاؤنج سے متصل تھا۔ اب لاؤنج بالکل خالی ہو چکا تھا۔ کچن میں بلب روشن تھا البتہ لاؤنج کے بلب بند کر کے وہ لوگ بیڈ روم میں آگئے تھے۔ مسٹر رَوس اور ڈاکٹر میکڈونلڈ بیڈ پر بیٹھے تھے۔ اُن کے درمیان مسز میکڈونلڈ بیٹھی ہوئی تھیں۔ بیڈ کے برابر آرام کرسی پر مسز مینتھیسن بیٹھی تھیں۔ کمرا لاؤنج کے بالکل سامنے تھا۔ کچن سے آنے والی روشنی ہلکی روشنی میں لاؤنج کا منظر صاف نظر آرہا تھا۔ اُن چاروں کی نگاہیں لاؤنج پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ چاروں دم سادھے دیکھ رہے تھے مگر کافی دیر گزرنے کے باوجود کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی۔

''میرے خیال میں ہمیں کمرے کی روشنیاں بھی بجھا دینی چاہئیں۔'' کافی دیر بعد مسٹر رَوس نے ڈاکٹر کو مخاطب کیا۔

''بہت بہتر۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کر بٹن تک گئے اور اگلے ہی لمحے کمرے میں بھی اندھیرا تھا البتہ کھلی کھڑکی اور لاؤنج سے آنے والی روشنی کے باعث کمرا کسی حد تک روشن تھا۔ ڈاکٹر بلب کا بٹن بند کر کے پلٹنے بھی نہ پائے تھے کہ لاؤنج میں ہلکی سی آہٹ پیدا ہوئی۔ سب کے کان کھڑے ہوگئے۔ ڈاکٹر جہاں تھے، وہیں پر اُن کے قدم جم گئے۔ چاروں کی نظریں لاؤنج کی طرف اٹھ گئیں مگر مسز میکڈونلڈ کے سوا کوئی شخص یہ نہیں دیکھ پا رہا تھا کہ لاؤنج میں کون ہے۔

مسز میکڈونلڈ نے دیکھا کہ لاؤنج میں اچانک ایک بوڑھی عورت نمودار ہوئی۔ وہ تھرتھراتا ہوا ایک ہیولہ تھا مگر اس کے باوجود اس کا وجود اور حلیہ واضح تھا۔ اُس کے سیدھے ہاتھ میں جلتی ہوئی سگریٹ تھی۔ اس نے جسم پر شال لپیٹ رکھی تھی۔ اگلے ہی لمحے اس نے سگریٹ فرش پر پھینکی اور نیچے بیٹھتی چلی گئی۔ سب دم بخود تھے۔ انہیں کچھ نظر نہیں آرہا تھا البتہ آہٹیں ضرور سنائی دے رہی تھیں۔ اُن میں صرف مسز میکڈونلڈ ہی سارا منظر دیکھ پا رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں خوف سے پھٹی ہوئی تھیں۔ وہ جو کچھ دیکھ رہی تھیں، ان کا تخیل نہیں، حقیقت تھا۔ خوف کے باعث ان کا جسم سرد پڑتا جا رہا تھا، ہونٹوں پر پپڑیاں جمنے لگی تھیں اور پورا جسم بے جان محسوس ہو رہا تھا۔ ان کے برخلاف دیگر تینوں پر ہلکا سا خوف تو ضرور چھایا تھا مگر پھر بھی وہ اپنے حواس میں تھے لیکن مسز میکڈونلڈ کو دیکھ کر یہ کہنا بہت مشکل تھا کہ ان کے حواس کام بھی کر رہے تھے یا نہیں۔

مسٹر رَوس نے مسز میکڈونلڈ کو بازوؤں سے تھام رکھا تھا۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ اس وقت وہ کوئی ماورائی شے دیکھ رہی ہیں جس کا اثر ان میں سے صرف ایک پر ہوا ہے۔ نیم بے خودی کی یہ حالت ظاہر کر رہی تھی کہ وہ سایہ انہیں اپنے سحر میں دانستہ طور پر جکڑ چکا ہے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ مسز میکڈونلڈ کے ذریعے ہی اب یہ راز سلجھ سکتا ہے مگر اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ جب اس سحر سے باہر نکلیں تو نیم غشی کی اس کیفیت میں وہ جو کچھ دیکھ پائی تھیں، اسے من وعن بیان کر سکیں۔ ان تینوں میں سے کوئی بھی یہ بات نہیں جانتا تھا کہ اس وقت وہ کیا دیکھ رہی ہیں۔

مسز میکڈونلڈ کی آنکھیں پھیل چکی تھیں۔ نظریں لاؤنج پر جمی ہوئی تھیں، وہ دیکھ رہی تھیں کہ بوڑھی عورت فرش پر بیٹھی چلی جا رہی تھی۔ چند لمحوں کے بعد وہ کہنیوں اور گھٹنوں کے بل شیر خوار بچے کی طرح گھسٹتی ہوئی لاؤنج کی کھڑکی کی طرف بڑھنے لگی۔ اس کے فرش پر گھسٹنے سے آہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ اس کی راہ میں کوئی شے حائل نہیں تھی مگر پھر بھی ایسا لگ رہا تھا کہ اس کے گھسٹنے سے کچھ چیزیں اس سے ٹکرا رہی ہیں۔ آہٹیں دوسرے لوگ بھی سن رہے تھے لیکن وہ نیم غشی کی کیفیت میں ہونے کے باوجود اچھی طرح یہ بات محسوس کر رہی تھیں کہ یہ آہٹیں گزشتہ چار راتوں کی طرح تیز نہیں تھیں۔

ہیولہ گھسٹتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ مسز میکڈونلڈ کی حالت سے اُن تینوں کو پختہ یقین تھا کہ ان کی آنکھیں اس وقت عجیب سے مناظر دیکھ رہی ہوں گی۔ ہیولہ گھٹنوں کے بل گھسٹتے گھسٹتے لاؤنج کی کھڑکی کے سامنے تک جا پہنچا اور پھر وہ بالکل سیدھی کھڑی ہوگئی۔ اس کے ہاتھ اٹھے۔ وہ کھڑکی پر پڑا ہوا پردہ ہٹا رہی تھی۔ پردہ ہٹانے کے بعد اُس نے کھڑکی کا پٹ کھولا اور پھر کھڑکی سے باہر کود گئی۔

مسز میکڈونلڈ کی حالت بہت بگڑ رہی تھی۔ اُن کا جسم بے جان ہو چکا تھا۔ سردی کے باوجود ان کی پیشانی سے ٹھنڈے ٹھنڈے پسینے کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ وہ بے سُدھ حالت میں مسٹر رَوس کے کندھے سے سر ٹکائے ہوئے تھیں۔ اُن کے شوہر جہاں تھے، وہیں کھڑے کے کھڑے رہ گئے تھے۔ ''بلب روشن کردو۔'' کمرے میں مسٹر رَوس کی آواز گونجی۔ ڈاکٹر نے تیزی سے آگے بڑھ کر بٹن دبائے۔ کمرا روشنی میں نہا گیا۔ روشنی ہونے کے ساتھ ہی آہٹیں ختم ہوگئیں۔ بلب روشن ہونے سے پہلے وہ صاف طور پر ایسی آہٹیں سن رہے تھے کہ جیسے کوئی درخت کی شاخوں کو پکڑ کر جھول رہا ہے۔ روشنی ہونے پر سب کی نظریں لاؤنج پر جمی ہوئی تھیں۔ مسز میکڈونلڈ نیم بے ہوش ہو چکی تھیں۔ آنکھوں پر روشنی پڑتے ہی انہوں نے پپوٹے بند کر لیے تھے۔ ان کے چہرے سے لگ رہا تھا جیسے وہ شدید اعصابی تھکن کا شکار ہو چکی ہیں۔ ان کی سانسیں اس طرح پھول رہی تھیں جیسے وہ بہت دور سے دوڑتی چلی آئی ہیں۔

ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر لاؤنج کے بلب بھی روشن کر دیے مگر وہاں سب کچھ اب پہلے جیسا ہی تھا۔ کھڑکی کا پردہ پڑا ہوا تھا اور اس کے پٹ بھی بند تھے۔ ڈاکٹر لاؤنج کا معائنہ سے جائزہ لے رہا تھا۔ اُدھر دوسری طرف مسٹر رَوس اور مسز مینتھیسن مسز میکڈونلڈ کو بیڈ پر سیدھا لٹا کر ان کی حالت بحال کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چند لمحوں کے بعد ڈاکٹر بھی بیڈ کے کنارے کھڑے ہو کر بیوی کے چہرے کو بغور دیکھ رہا تھا۔ وہ تینوں ماہرِ نفسیات تھے۔ ماورائیت کی حقیقت کو سائنسی بنیادوں پر سمجھتے تھے، شاید اسی لیے وہ خود کو بہت زیادہ پُرسکون رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

''میرا خیال ہے کہ تمہاری بیوی اس آسیب کے زیرِ اثر آچکی تھی۔'' مسٹر رَوس نے ڈاکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہنا شروع کیا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ اسی کے ذریعے ہم اب یہ جان سکتے ہیں کہ یہ سب کیا ہے؟ جو ہے، اُس کا اس گھر سے کیا تعلق ہے اور سب سے اہم بات کہ وہ کیا چاہتی ہے؟

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' یہ سن کر اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ ''اب ہمیں یہ راز معلوم کرنا ہے۔''

اسی دوران مسز مینتھیسن مسز میکڈونلڈ کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ان کی کوششیں بار آور ثابت ہوئیں۔ کچھ دیر بعد انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ ان کی آنکھوں کو دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے وہ طویل نیند سے بیدار ہوئی ہیں۔ ان کے پپوٹے اب بھی بھاری لگ رہے تھے۔

''پانی۔'' آنکھ کھولتے ہی اس نے کہا۔ ڈاکٹر نے فوراً گلاس میں پانی بھر کر اس کی طرف بڑھایا۔ ایک ہی سانس میں اس نے گلاس خالی کر دیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ شدید پیاسی ہے۔ ''ایک گلاس اور.....'' اس نے خالی گلاس شوہر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ تقریباً آدھا گھنٹا مزید گزر گیا۔ اب مسز میکڈونلڈ کی حالت قدرے بہتر تھی۔ اُن کے جسم کا درجۂ حرارت بھی نارمل ہو چکا تھا۔ چہرے سے اعصابی تھکاوٹ کے آثار بھی لگ بھگ غائب ہوگئے تھے۔ اب وہ اپنی سابقہ حالت میں مکمل طور پر لوٹ چکی تھیں۔

''کچھ یاد ہے، تم نے کیا کچھ دیکھا تھا؟'' حالت بہتر ہونے پر مسٹر رَوس نے سوال کیا۔

''میں نے دیکھا کہ کمرے میں ایک سایہ نمودار ہوا۔ وہ بوڑھی تھی، بہت ہی بوڑھی.....'' اس نے اٹکتے ہوئے بولنا شروع کیا۔ کچھ ہی دیر میں مسز میکڈونلڈ نے جو کچھ دیکھا تھا ذہن پر زور ڈالتے ہوئے من وعن بیان کر دیا۔

''یہ تو وہ تھا جو تم نے دیکھا۔ اُس وقت تم نے کیا محسوس کیا تھا؟ آہٹوں کے سوا کچھ اور بھی سنا تھا؟'' ڈاکٹر نے بیوی سے پوچھا۔ وہ تینوں بیڈ پر بیٹھے ہوئے مسز میکڈونلڈ کے اُس ہولناک تجربے کو پوری طرح سننے کے لیے بے قرار ہوئے

WWW.PAKSOCIETY.COM

جارہے تھے۔ وہ آرام کرسی پر نیم دراز تھیں۔

''کیا میں کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی تھی؟'' مسز میکڈونلڈ نے خاصی دیر بعد اپنے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''شاید.....'' انہوں نے گول مول جواب دیا۔ ''میری پیاری..... یہ یاد کرنے کی کوشش کرو کہ جسے تم ڈراؤنا خواب کہہ رہی ہو، اُس میں تم نے کیا کچھ سنا تھا؟'' اس نے ایک بار پھر اپنا سوال ذرا مختلف انداز سے دُہرایا۔

''وہ چلتے چلتے کچھ بڑبڑا تو رہی تھی لیکن اس کی آواز بہت صاف نہیں تھی۔'' انہوں نے بتانا شروع کیا۔ ''ایسا لگ رہا تھا کہ آواز نرخرے میں پھنس رہی ہے مگر پھر بھی وہ کچھ بربڑا رہی تھی۔'' یہ کہہ کر وہ رک گئیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ یہ بتاتے ہوئے وہ ایک بار پھر ڈری سہمی جارہی ہیں۔

''وہ کیا بول رہی تھی، وہ بتاؤ۔ تمہیں کچھ تو سمجھ آیا ہوگا۔'' ڈاکٹر نے اس کا ہاتھ تھام کر تسلی دیتے ہوئے سوال کیا۔

''وہ کہہ رہی تھی گلاب کا پودا..... نظر انداز کردیا..... مار ڈالا۔'' اُس نے دماغ پر زور ڈال کر، یاد کرتے ہوئے کہا۔

''اور کیا کہہ رہی تھی وہ، ذرا یاد کرنے کی کوشش کرو۔'' ڈاکٹر نے اسے خاموش ہوتا دیکھ کر بے چینی سے کہا۔

''وہ کہہ رہی تھی کہ ذرا ٹھہرو، میں آرہی ہوں..... کوئی پودے پر چڑھ رہا ہے..... یہ گلابوں کو مار ڈالے گا..... ٹھہرو، میں آرہی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئی۔

''اور کچھ بھی سنا تھا اس کے علاوہ۔'' اس بار رَوس نے سوال کیا تھا۔

''نہیں.....'' اس نے مختصر جواب دیا۔ ''بس وہ یہ بڑبڑاتی جارہی تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کھڑکی کے باہر گلاب کا کوئی اونچا سا پودا ہے اور جیسے وہ پودے کی ڈال پکڑ کے گلہری کی طرح اُس پر چڑھنے کی کوشش کررہی ہے۔''

''اس کے علاوہ اور کچھ بھی دیکھا یا سنا تھا؟'' مسز میتھیسن نے پوچھا۔

''بالکل نہیں۔'' اس نے اُن کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''اچانک میری آنکھیں روشنی سے چندھیا گئیں اور پھر مجھے ہوش نہیں رہا کہ اردگرد کیا کچھ ہورہا ہے؟''

''جب تم نے اسے دیکھا تو جسمانی طور پر کیا محسوس ہورہا تھا؟'' ڈاکٹر نے بیوی سے سوال کیا۔

''اس نے کھڑکی کی طرف بڑھتے ہوئے مجھ پر خفیف نظر ڈالی تھی۔'' مسز میکڈونلڈ نے خود پر گزرنے والی پچھلی ایک اور حصہ سنانا شروع کیا۔ وہ تینوں دم سادھے پوری دھیان سے اس کی بات سن رہے تھے۔ ''جیسے ہی اس نے اپنی آنکھیں میری آنکھوں سے چار کیں، ایسا لگا جیسے اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے ہوں۔ میری آنکھیں خود بخود اس کی آنکھوں پر مرکوز ہوچکی تھیں اور میں ٹکٹکی باندھے اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی غیر ارادی طور پر۔ پھر مجھے لگا کہ ان آنکھوں سے نکلنے والی چنگاریاں میری آنکھوں میں داخل ہوکر دماغ تک پہنچ رہی ہیں۔ جیسے ہی مجھے یہ احساس ہوا، میرا وجود بے جان اور دماغ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھا۔ مجھے لگ رہا تھا بس اب وہ ہے یا میں ہوں۔ اس کے علاوہ میرے اِردگرد ہی نہیں، پورے گھر میں کوئی اور انسان موجود نہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے آنکھیں بند کرکے گہری سانسیں لینا شروع کردیں۔ وہ سمجھ گئے کہ جو کچھ وہ سُن چکے تھے، بس یہی کچھ وہ بتانا چاہتی تھی۔

مسز میکڈونلڈ کی بات ختم ہونے کے بعد ڈاکٹر اور مسز رَوس ہاتھ میں ٹارچ لے کے باہر نکلے۔ وہ اندرونی طور پر لاؤنج کا پہلے ہی اچھی طرح جائزہ لے چکے تھے، اب وہ کھڑکی کے باہر والے حصے کو دیکھنا چاہتے تھے۔ کافی دیر تک وہ ٹارچ کی روشنی میں ہر شے کا بغور جائزہ لیتے رہے مگر انہیں کام کی کوئی بات معلوم نہیں ہوئی۔ ویسے بھی یہ ابتدا تھی۔ یہ پُراسرار گتھی اتنی آسانی سے سلجھنے والی نہیں تھی۔ وہ دونوں اندر لوٹ آئے اور پھر طے پایا کہ انہیں اس طرح کے تجربات مزید کرنے پڑیں گے۔ ڈاکٹر میکڈونلڈ کو بھی اس بات سے اتفاق تھا۔ مسز میتھیسن بھی راضی تھیں لیکن مسز میکڈونلڈ سیدھی سادی خاتون تھیں۔ وہ بری طرح سہم چکی تھیں۔ وہ اس گھر میں اب مزید ایک لمحہ بھی ٹھہرنا نہیں چاہتی تھیں مگر شوہر بضد تھا کہ وہ اس طرح گھر چھوڑ کر نہیں نکل سکتے، وہ بھی ایک آسیب کے باعث۔ بس! اسی وجہ سے وہ سب کچھ برداشت کرنے کو تیار تھی۔ وہ جانتے تھے کہ مسز میکڈونلڈ اُس آسیب کی معمول بن چکی ہیں۔ اب مزید تحقیق انہی کے ذریعے ہوسکتی ہے۔ انہی کے ذریعے وہ تینوں سچائی تک پہنچ پائیں گے۔ آخر خاصی رَد و قدح کے بعد مسز میکڈونلڈ بھی ان کی ہمنوا بن گئی مگر مجبوری میں۔

رات کا ایک بج چکا تھا لیکن اراچی لاج میں وہ چاروں جاگ رہے تھے۔ آخر طے پایا کہ اس حوالے سے مزید پیشرفت کے بارے میں کل صبح از سرِ نو غور کیا جائے گا۔ مسز رَوس اور مسز میتھیسن اٹھ کر گیسٹ روم میں چلے گئے۔ گیسٹ روم، بیڈ روم کے مقابل اور لاؤنج کے عین سامنے واقع تھا۔ اُن کے چلے جانے کے بعد وہ دونوں بھی سونے کے لیے لیٹ گئے۔ کمرے کی روشنیاں بجھی ہوئی تھیں مگر اس کے وجود لاؤنج میں مکمل خاموشی تھی۔ ہلکی سی آہٹ بھی محسوس نہیں ہورہی تھی۔ ڈاکٹر تو بیڈ پر لیٹتے ہی غفلت کی نیند سوگئے مگر اُس بے چاری کی آنکھوں سے نیند شاید روٹھ چکی تھی۔ وہ اپنے گرد اچھی طرح کمبل لپیٹ کر، اُس میں دُبکی ہوئی جاگ رہی تھی۔ کئی گھنٹے گزر گئے مگر کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی۔

صبح کے پانچ بجنے والے تھے۔ مسز میکڈونلڈ کی آنکھ ابھی لگی ہی تھی کہ وہ چونک کر اٹھ گئی۔ لاؤنج سے ہلکی ہلکی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ سہم کر کمبل میں کچھ اور سمٹ گئی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں کانوں پر رکھ کر کوشش کی کہ یہ آوازیں اس کی سماعتوں سے ٹکرانے نہ پائیں، مگر کوشش بے سود ہی رہی۔ آخر کچھ دیر بعد یہ آوازیں خود بخود تھم گئیں۔ کافی دیر تک آوازیں سنائی نہ دیں تو نیند ایک بار پھر اُس کی آنکھوں میں اتر آئی۔ کچھ دیر بعد کمرے میں اس کے ہلکے ہلکے خراٹے گونج رہے تھے۔

''کہیے..... رات کیسی گزری؟'' دوسری صبح وہ چاروں ناشتے کی میز پر اکٹھے بیٹھے ہوئے تھے، جب مسٹر رَوس نے سوال کیا۔

''کسی حد تک بُری۔'' یہ کہہ کر اُس نے ساری بات بتادی۔ عجیب بات تھی اس کے سوا کسی اور نے ان آوازوں کو سننے سے صاف انکار کردیا۔ ہوسکتا ہے کہ آوازیں تو ان کی سماعتوں تک ضرور پہنچی ہوں مگر وہ سب ڈاکٹر کی طرح غفلت کی نیند سوئے ہوئے ہوں۔

اگرچہ وہ چاروں خاموش بیٹھے کچھ سوچ رہے تھے مگر ڈاکٹر میکوان میکڈونلڈ کے ذہن میں وہ بات گونج رہی تھی، جسے شاید اُن کی بیوی بھول چکی تھی۔ کل رات سحر زدہ حالت میں اُس نے جو بوڑھی کو گلابوں کا ذکر کرتے سُنا تھا۔ اس بات پر کسی کا دھیان نہیں گیا تھا مگر اب انہیں یاد آرہا ہے کہ گلاب کے پودے کی بات ایک بار پہلے بھی ہوئی تھی۔

یہ میکڈونلڈ فیملی کے اراچی لاؤنج میں منتقل ہونے سے مہینا بھر پہلے کی بات ہے۔ اُس روز وہ گھر کی خریداری کے سودے کو آخری شکل دے کر باہر نکلے تو باغیچے میں مالی مل گیا تھا۔ یہ بوڑھا اِردگرد کے متعدد گھروں میں جزوقتی طور پر مالی کا کام کرتا تھا۔ گھر کافی عرصے سے خالی تھا مگر اُس دن پراپرٹی ایجنٹ اور خود اُن کی کار باہر کھڑی تھی، جنہیں دیکھ کر وہ اس لیے آگیا کہ شاید کچھ لوگ اس گھر میں رہنے کے لیے آگئے ہوں۔ یوں وہ کام کی تلاش میں اُن کے پاس چلا آیا۔ ڈاکٹر کو بھی باغیچہ اور کیاریاں پسند تھیں۔ مالی سے مل کر وہ بھی خوش تھا کہ یہ مسئلہ بھی بیٹھے بٹھائے حل ہوگیا۔

گھر کے باہر خاصی بڑی جگہ تھی۔ اُسے دیکھ کر لگتا تھا کہ کبھی یہاں کئی کیاریاں ہوں گی مگر اب وہاں پر صرف آڑو کا ایک بڑا سا درخت جب کہ لاؤنج میں کھلنے والی کھڑکی سے کچھ فاصلے پر گلاب کا ایک بڑا سا پودا لگا ہوا تھا۔ یہ پودا مرجھا گیا تھا اور اب تو اس کے پتے بھی خشک ہوکر ہوا میں کب کے بکھر چکے تھے۔ انہوں نے سرسری نظر سے یہ سب کچھ دیکھا تھا۔ اُس وقت گلاب کے پودے پر اُن کی کوئی خاص توجہ بھی نہیں تھی۔

''یہ کافی بڑی جگہ ہے، ذرا سی محنت کی جائے تو ٹماٹر اور کئی سبزیاں تو گھر میں ہی اُگائی جاسکتی ہیں۔'' کام مل جانے کا یقین ہونے پر مالی بہت خوش تھا۔ اس نے نئے مالک کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کہا۔

''تمہاری تجویز اچھی ہے۔ اپنا نمبر دے جاؤ، جیسے ہی ہم شفٹ ہوں گے، تمہیں بلالیں گے۔''

ڈاکٹر کے ذہن میں مالی سے ملاقات کا سارا منظر فلم کے مانند گھوم گیا۔ انہیں یقین ہوگیا کہ ہونا ہو، بوڑھی عورت کے بھوت نے جس گلاب کے پودے کا ذکر کیا تھا، یہ وہی ہوگا۔ وہ خاصی دیر تک بوڑھی عورت کے بھوت اور گلاب کے بارے میں ہی سوچتا رہا۔ وہ چاروں نہایت سنجیدگی اور خاموشی سے ناشتا کرنے میں مصروف تھے مگر ایک بات اُن چاروں میں یکساں تھی۔ سب کی سوچوں کا محور وہی آسیب تھا جو صرف مسز میکڈونلڈ کو ہی نظر آیا تھا۔

ناشتے کے بعد مسٹر رَوس اور مسز میتھیسن تو اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے، اس وعدے کے ساتھ کہ ڈاکٹر بھی سوچ بچار کرے، پھر وہ سب مل جُل کر اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کریں گے مگر وہ کیا کرے؟ یہ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا۔

اُن کے جانے کے بعد وہ دونوں میاں بیوی باہر آگئے۔ ڈاکٹر بیوی کو یہ بتانے کے لیے باہر لایا تھا کہ ممکن ہے کہ بوڑھی عورت کا بھوت جس گلاب کے پودے کی بات کررہا تھا، وہ یہی اونچا سا پودا ہو جو مرجھا کر صرف ڈنٹھلوں کی شکل میں باقی رہ گیا ہے۔ ابھی ڈاکٹر کچھ کہہ بھی نہ پایا تھا کہ کچھ فاصلے پر انہیں مسز بیکٹ نظر آگئیں۔ یہ اُن کی پڑوسن تھیں اور کل رات کی پارٹی میں بھی وہ دونوں میاں بیوی شریک تھے۔ انہیں اپنی طرف آتا دیکھ کر ڈاکٹر کو خیال آیا کہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

یہ تو مدتوں سے یہیں رہ رہی ہیں۔ ان سے باتوں باتوں میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جائے کہ بوڑھی عورت، بھوت اور گلاب کا آپس میں کیا تعلق ہے۔ گھر کے سامنے کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر بعد وہ تینوں اچھے ہمسائیوں کی طرح بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔

مسز بیکٹ سے ہونے والی یہ گفتگو، اُسے گھر کے سابق مالک کی بیٹی جینی میکلین اور مالی ڈیوی کوٹس تک لے گئی۔ اس تمام تر تفتیش میں کئی روز گزر گئے۔ اس دوران مسز میکڈونلڈ نے کئی بار اُس بھوت کو دیکھا۔ جب بھی وہ اسے دیکھتی تھیں، اُن کی حالت کئی گھنٹوں تک خراب رہتی تھی۔ اس دوران ڈاکٹر نے بھی فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ اب اس گھر میں نہیں رہیں گے مگر جانے سے پہلے وہ اپنی تفتیش کو انجام تک پہنچانا چاہتا تھا۔ وہ اس واقعے کو مقالے کی شکل میں سوسائٹی کے تحقیقی جرنل میں شائع کروانے کا خواہشمند تھا۔ اسی مجبوری کی بنا پر اُن کی مسز سب کچھ برداشت کر رہی تھیں۔

ڈاکٹر کو مسز بیکٹ، جینی میکلین اور ڈیوی کوٹس سے نہایت کارآمد معلومات حاصل ہوئی تھیں۔ جس کے مطابق اراچی لاج کی سابق مالکن مرحومہ مسز بروئین تھی۔ وہ خاصی بوڑھی عورت تھی۔ اس کی موت برسوں پہلے اچانک ہوئی تھی۔ مسز بروئین کو جاننے والوں نے اس کا جو نقشہ کھینچا تھا۔ اس کے مطابق وہ چھوٹے قد کی شائستہ اور خوش مزاج عورت تھی۔ اگرچہ بڑھاپے کے باعث اس کی کمر کسی حد تک جھک گئی تھی لیکن اس کے باوجود وہ پورے شہر میں اپنی سائیکل پر گھوما پھرا کرتی تھی۔ جب بھی وہ گھر سے باہر نکلتی، اُس کے سر پر چھوٹا سا ہیٹ اور جسم کے گرد ایک ہلکی سی گرم شال لپٹی ہوتی تھی۔ وہ سب سے خوش مزاجی سے ملتی تھی۔ اس کے ہمسائیوں کو کبھی اُس سے کوئی شکایت نہیں ہوئی تھیں۔ اُس کی زندگی میں ہر ملنے جلنے والا اُس کی تعریف ہی کیا کرتا تھا۔

مسز بیکٹ اور جینی میکلین نے مسز بروئین کا جو حلیہ بیان کیا تھا، وہ من وعن وہی تھا، جیسا اُن کی بیوی بتاتی تھی۔ انہیں حیرت تھی کہ ان کی بیوی نہ تو کبھی پہلے اِنورنیس آئی تھی اور نہ ہی اس بات کا امکان تھا کہ وہ کبھی اس سے ملی ہوگی۔ اس لیے ڈاکٹر کو یقین آچکا تھا کہ وہ بھوت مسز بروئین کا ہی تھا۔

مسز بیکٹ کا کہنا تھا کہ وہ بہت شائستہ اور نفیس خاتون تھی۔ اسے باغبانی سے عشق تھا۔ اس نے گھر کے باہر نہایت خوبصورت باغیچہ بنا رکھا تھا، جس کی کئی کیاریوں میں صرف گلاب لگے ہوئے تھے۔ وہ گلاب اتنے سارے تھے کہ اکثر اردگرد کے گھر بھی اُن کی مہک سے مہکتے رہتے تھے۔ کچھ کیاریوں میں سبزیاں اور ٹماٹر اُگتے تھے۔

مسز بیکٹ کے مطابق وہ نہایت تن دہی سے اپنے گلابوں کی حفاظت کرتی تھی۔ گلاب کے اکثر پودے چھوٹے تھے لیکن ایک ایسا پودا تھا جو لاؤنج کی کھڑکی کے قریب لگا ہوا سفید گلاب کا تھا۔ اس سفید گلاب کی ایک خاصیت تو یہ تھی کہ اس کی اونچائی نہایت ہی غیر معمولی تھی۔ دوسری خاص بات یہ تھی کہ اس پودے میں سفید گلاب، گلابوں کے موسم سے بہت پہلے ہی کھل اٹھتے تھے۔ مسز بیکٹ نے بتایا تھا کہ مسز بروئین اکثر اس گلاب کے پودے کے آس پاس ٹہلتی ہوئی نظر آتی تھی۔ قریب کے ہمسائے بھی اُس پودے کو حیرت سے دیکھتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عام لوگوں کے لیے یہ بہت حیرت کی بات تھی کہ کیا گلاب کا کوئی پودا انسان کے قد سے بھی اونچا ہوسکتا ہے۔ وہ صرف اونچا ہی نہیں بلکہ ایک چھوٹے درخت کے مانند گھنا بھی تھا۔ کئی لوگ مسز بروئین سے اس پودے کی قدآوری اور قبل از موسم اس میں گلاب کھل اٹھنے کا راز معلوم کرتے تھے مگر وہ ہنس کر ہر بار صرف ایک بات کہتی تھیں ”یہ میرا عشق ہے۔“

مسز بیکٹ نے اس پودے کے قریب جا کر یہ بھی کہا تھا کہ جب مسز بروئین کی موت ہوئی تو یہ پودا خود بخود سوکھتا چلا گیا۔ ویسے اب مسز بروئین کے باغیچے میں صرف اُس قد آور سوکھے گلاب کی خشک ٹہنیوں کے سوا نہ تو کوئی اور پودا باقی بچا تھا اور نہ ہی کیاریاں۔ البتہ کیاریوں کے آثار ضرور تھے، جن میں اُس دن وہ جُز وقتی مالی سبزیاں اگانے کا مشورہ دے گیا تھا۔

جینی میکلین نے ڈاکٹر میکڈونلڈ کو بتایا تھا کہ مسز بروئین شاید اُن کی دور پار کی رشتے دار بھی تھیں۔ اسی لیے ان کی موت کے بعد یہ مکان ان کے والد کو مل گیا تھا۔ انہوں نے چند روز اس گھر میں گزارے تھے لیکن بعد میں اسے کسی اور کے ہاتھ فروخت کر کے وہ واپس اپنے گھر چلے آئے تھے۔ ڈاکٹر میکڈونلڈ ان کے والد سے ملنا چاہتا تھا لیکن وہ دو سال قبل وفات پا چکے تھے۔ جینی کا بھی یہی کہنا تھا کہ مسز بروئین قصبے کی ہر دل عزیز شخصیت تھیں۔ جینی نے یہ بھی انکشاف کیا کہ مسز بروئین کی وفات کے بعد جس خاندان نے یہ گھر خریدا تھا، وہ صرف ایک ہفتے کے بعد ہی مکان ایک پراپرٹی دیلر کو فروخت کر کے نہیں چلا گیا تھا۔ جینی کو یہ تو

معلوم نہیں تھا کہ وہ خاندان گھر بیچ کر کیوں گیا، البتہ ڈاکٹر خود اُس وجہ سے بہت اچھی طرح آگاہ تھا۔ اب وہ پراپرٹی دیلر کی خوش اخلاقی کا راز بھی جان چکا تھا۔

مالی ڈیوی کوٹس کا کہنا تھا مسز بروئین کو باغبانی کا جنون تھا۔ اگرچہ وہ زیادہ تر کام خود اپنے ہاتھوں سے کرتی تھی مگر پھر بھی انہوں نے اسے جز وقتی طور پر بطور مالی رکھا ہوا تھا۔ ڈیوی کا کہنا تھا اس مٹی میں غیر معمولی طور پر افزائش کی صلاحیت تھی۔ اس نے بتایا کہ ایک بار اس نے صرف ایک چھوٹی سی کیاری میں ٹماٹر اگائے اور جب فصل اُتارنے کے بعد ٹماٹروں کا وزن کیا گیا تو وہ پچاس کلو سے بھی زیادہ تھے۔ یہی نہیں، اُن کا ذائقہ بھی بہت مزیدار تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ جتنی چھوٹی سی کیاری میں وہ ٹماٹر اُگائے گئے تھے، اس کے اندازے کے مطابق زیادہ سے زیادہ دس کلو ٹماٹر ہی پیدا ہوسکتے تھے۔ اُس کے لیے اب تک یہ راز ہی تھا کہ اتنی اچھی فصل کیسے اُتری تھی۔

ڈاکٹر میکڈونلڈ سخت حیرت زدہ تھے کہ مسز بروئین سے تو سب لوگ اچھی طرح آگاہ تھے لیکن کوئی شخص یہ بات یقین سے نہیں کہہ سکا تھا کہ اُن کی موت کیسے واقع ہوئی اور وہ غیر معمولی قد آور پودا کہاں سے لائی تھیں۔ اس نے یہ سوال ڈیوی سے بھی پوچھا لیکن وہ بھی یہ صرف کہہ کر رہ گیا۔

”جب میں اُن کے ہاں کام کرنے گیا، تب بھی اُس پر گلاب لگے ہوئے تھے۔ حالانکہ گلابوں کا موسم شروع ہونے میں ابھی دو تین ہفتے باقی تھے۔ جب میں نے مسز بروئین سے اس بارے میں پوچھا تو وہ ٹال گئیں۔ اُن کا کہنا تھا کہ یہ بہت ہی خاص گلاب ہے مگر کیوں خاص ہے، یہ بات صرف وہی جانتی تھیں۔ انہوں نے مجھ سے بھی اس پودے کے بارے میں کوئی خاص بات نہیں کی تھی۔“

یہ اگست کا آخری ہفتہ تھا۔ اُس رات مسز میتھیسن اور مسٹر رَوس اُس کے بیڈروم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ سب یہ سوچ رہے تھے کہ اب کیا کیا جائے۔ مسز میکڈونلڈ کی حالت خاصی غیر تھی۔ اُن کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے تھے۔ چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی۔ وہ اتنی سہمی ہوئی تھیں کہ اگر ان میں سے کسی کے قدموں کی چاپ بھی ہوتی، تب بھی وہ خوف سے چونک اٹھتی تھیں۔ پچھلے کئی روز اُن پر شدید بھاری گزرے تھے۔

شروع شروع میں تو مسز میکڈونلڈ کو بوڑھی عورت کا آسیب صرف رات میں نظر آتا تھا مگر اب صرف رات کو ہی نہیں، دن میں بھی وہ کئی بار اسے دیکھتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے اب وہ بھوت لاپروا ہوچکا ہے۔ البتہ یہ بہت عجیب بات تھی کہ قدموں کی آہٹ تو سب سنتے تھے لیکن بھوت صرف اسے ہی نظر آتا تھا۔ جس وقت وہ چاروں بیٹھے مستقبل کی پیش بندی کر رہے تھے، اُس وقت بھی وہ کبھی ہلکی اور کبھی تیز، کبھی پردہ اور کبھی کھڑکی کے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں وقفے وقفے سے سن رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ لاؤنج میں کوئی ہے اور جو تھا وہ صرف مسز میکڈونلڈ کو ہی نظر آسکتا تھا لیکن وہ اس وقت لاؤنج میں کھلنے والے بیڈروم کے دروازے کی جانب پیٹھ کیے بیٹھی تھی۔

خاصی دیر بعد آخر یہ طے پایا کہ ڈاکٹر مقالے کو چھوڑ کر اپنے گھر والوں کی فکر کرے۔ اگرچہ وہ صرف دو ہفتے کے قریب ہی یہاں رہ پائے تھے مگر ایک رات بھی سکون سے نہ سو سکنے والے اس خاندان کے لیے اطمینان کی بات تھی کہ خوف کے سوا انہیں کوئی اور نقصان نہیں پہنچا تھا۔

کافی دیر کی گفتگو کے بعد طے پا گیا کہ ڈاکٹر کی بیوی اور بچے کل دن کی ٹرین سے گلاسگو چلے جائیں گے اپنے پرانے گھر، جسے خوش قسمتی سے ڈاکٹر نے ابھی تک فروخت نہیں کیا تھا۔ یہ فیصلہ ہوجانے کے بعد ڈاکٹر اور مسٹر رَوس مل کر گھر کا ضروری سامان پیک کرنے میں لگ گئے اور مسز میتھیسن اس کے پاس بیٹھ گئیں۔ رات کے ڈھائی بجے تک تمام سامان پیک کیا جاچکا تھا۔ دوسری صبح ڈاکٹر نے مال گاڑی کے ذریعے سامان گلاسگو بھجوا دیا۔

یہ 29 اگست 1953ء کی سہ پہر تھی۔ مسز میکڈونلڈ اپنے دونوں بچوں کے ہمراہ بذریعہ لندن گلاسگو جانے والی ٹرین پر سوار ہو رہی تھی۔ وہ بڑی خوشی خوشی اپنے نئے گھر میں رہنے کے لیے آئی تھی مگر اب صرف سترہ روز کے بعد آنسوؤں اور خوف کے ساتھ اراچی لاج اور اِنورنیس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جا رہی تھی۔

مسز میکڈونلڈ بیک وقت افسردہ بھی تھیں اور خوش بھی۔ افسردہ اس لیے کہ ایک حسین قصبے میں رہنے کا خواب ادھورا رہ گیا اور خوشی یہ تھی کہ وہ کسی جانی نقصان کے بغیر سلامتی کے ساتھ یہاں سے جا رہی تھی۔ البتہ اس کی پریشانی مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی تھی۔ ڈاکٹر نے وہیں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ جب تک شوہر پلٹ کر نہیں آجاتا، تب تک پریشانیوں کی وہ وجہ باقی رہنا تھی، جس کا بنیادی سبب اراچی لاج ہی تھا۔ اسے امید تھی کہ بہت جلد وہ اس خوف کے سائے سے نکل کر پُرسکون زندگی بسر کرسکیں گی۔

فیملی کو بھیجنے کے بعد ڈاکٹر گھر لوٹ آیا۔ اب انہیں اس

WWW.PAKSOCIETY.COM

گھر کو فروخت کرنے کا سلسلہ شروع کرتا تھا۔

وہ کئی روز تک گھر کو بیچنے کی کوشش کرتے رہے۔ اس دوران اُن کا قصبے کے کئی لوگوں سے ملنا ہوا، تب انہیں پتا چلا کہ اس گھر کے بارے میں پورے قصبے میں طرح طرح کی باتیں پھیلی ہوئی تھیں۔ البتہ وہ سمجھ گئے تھے کہ بہت سی باتیں حقیقت سے زیادہ مبالغہ آرائی پر مشتمل تھیں۔ ان کے نزدیک حقیقت تو وہی تھی، جسے وہ جانتے تھے۔ اسی دوران انہیں یہ بھی پتا چلا کہ گھر کی مالکن مسز بروئین کے شوہر نے یہ مکان تعمیر کروایا تھا۔ وہ برطانوی فوج میں افسر تھے۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران اُن کی موت ہوگئی تھی۔ 1948ء میں ایک صبح مسز بروئین بھی نہایت پُراسرار حالت میں مردہ پائی گئیں۔ ان کی لاش پڑوسیوں نے دریافت کی تھی۔ لاش اوندھے منہ گلاب کے پودے کے پاس سے ملی تھی۔

مسز بروئین کی موت کے بعد یہ گھر ان کے ایک رشتے دار کو ترکے میں ملا مگر اس نے چند ہفتوں میں ہی اسے فروخت کردیا۔ جس کے بعد یہ گھر کئی بار فروخت ہوا لیکن کوئی بھی مکین ایک ڈیڑھ ہفتے سے زیادہ نہیں ٹھہر پایا۔ جس کی وجہ سے پورے اِنورنیس میں یہ مشہور ہوگیا تھا کہ گھر آسیب زدہ ہے۔ اراچی لاج کی یہی شہرتِ بد تھی کہ اس جائداد کو بیچنے کے لیے پراپرٹی ڈیلر ہمیشہ اخبارات میں اشتہار شائع کرکے اِنورنیس سے باہر خریدار کی تلاش کرتے تھے۔ ڈاکٹر کو لاکھ تلاش کے باوجود بھی ایسا کوئی شخص نہیں مل سکا جو کبھی اُس گھر کا مالک رہا ہو۔ ملتا بھی کیسے، جو اس آسیب زدہ اراچی لاج میں ٹھہرا، وہ گھر ہی نہیں قصبے کو بھی چھوڑ گیا اور پھر کبھی نہیں پلٹا۔

ڈاکٹر کی فیملی کو گلاسگو گئے ہوئے کئی روز گزر چکے تھے مگر وہ بدستور اراچی لاج میں ہی مقیم تھا۔ اسے اب بھی لاؤنج میں اکثر آہٹیں سنائی دیتی تھیں لیکن حیرت کی بات ہے کہ لاکھ کوششوں کے باوجود وہ مسز بروئین کے بھوت کو نہیں دیکھ پایا تھا۔

وہ گھر بیچنے کے لیے بہت بھاگ دوڑ کررہا تھا۔ آخر کئی روز کی تگ و دو کے بعد آخر ایک مالدار شخص نے یہ گھر خرید لیا۔ یہ اِنورنیس کے برابر والے قصبے کا ریٹائرڈ میجر ورنن تھا، جو جائداد میں سرمایہ کاری منافع کمانے کے لیے بلکہ اپنی ملکیت بڑھانے کے شوق میں کیا کرتا تھا۔ میجر ورنن اُس گھر کے بارے میں پھیلی ہوئی افواہوں کو جانتا تھا لیکن وہ ایک فوجی تھا اور اسے زعم تھا کہ بھوت انسان کو صرف خوفزدہ کرسکتے ہیں، نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ میجر ورنن نے اُسی قیمت پر یہ گھر خریدا تھا، جتنی قیمت ڈاکٹر نے ادا کی تھی۔ یوں وہ خوش تھا کہ اسے کوئی مالی نقصان نہیں پہنچا۔ وہ خوش تھے کہ مکان فروخت ہوگیا۔ فروخت کے دوسرے ہی روز وہ گلاسگو کے لیے روانہ ہوگیا۔ اُسے یقین تھا کہ اب وہ اپنے گھر پہنچ کر اس سارے واقعے پر اپنا تجزیاتی مقالہ لکھ سکے گا اور اس نے ایسا ہی کیا لیکن اس سے پہلے ہی اراچی لاج کے بارے میں ایک واقعہ شائع ہوچکا تھا۔ یہ مقالہ اُس دور میں خاصا مشہور ہوا تھا۔

اراچی لاج میں اُس رات مسز میکڈونلڈ پر جو کچھ بیتی تھی، مسٹر رَوس اس واقعے کے عینی شاہد تھے۔ انہوں نے لندن سوسائٹی برائے نفسیاتی تحقیق کے جرنل، شمارہ برائے دسمبر 1955ء میں یہ سارا واقعہ تفصیل سے تحریر کیا تھا۔ اراچی لاج کے بارے میں دو مقالوں کی اشاعت اور خود مسز میکڈونلڈ کے گلاسگو میں دیے گئے متعدد انٹرویوز سے یہ معاملہ کافی عرصے تک اخبارات کی زینت بنا رہا۔ یہ مسئلہ اس لیے بھی نہایت اہمیت کا حامل تھا کہ واقعہ ایک ایسے ماہرِ نفسیات اور اُس کے خاندان کو پیش آیا تھا جو ماورائیت اور انسانی نفسیات کا ماہر تھا۔

کافی عرصہ گزر جانے کے باوجود اُس واقعے کی سرگزشت گاہے بگاہے سنائی دے جاتی تھی۔ اس واقعے کی ماورائی اہمیت اور نفسیاتی اثرات کے بارے میں اکثر باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ کئی اخباری اور ریڈیو انٹرویوز میں ڈاکٹر میکڈونلڈ سے سوال کیے گئے کہ مسز بروئین کی بے چین روح کا سبب کیا تھا، گلاب کے پودے سے اُن کا ایسا کیا تعلق تھا کہ موت کے بعد بھی انہیں اُس سے جدائی منظور نہیں تھی، وہ عالمِ بالا میں رہنے کے بجائے آسیب بن کر کیوں اس گھر میں مقیم تھی...... کئی سوال تھے مگر اُن میں سے کسی ایک کا بھی تسلی بخش جواب اُن کے پاس ہی کیا، کسی کے پاس بھی نہیں تھا۔

یہ سن ستر کی دہائی کے آخری برس تھے جب اس واقعے کی شہرت سے متاثر ہوکر بی بی سی ٹیلی وژن نے ایک دستاویزی فلم بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس فلم کے لیے تمام تر واقعات کو اصل مقام پر فلمایا گیا۔ دستاویزی فلم میں وہ سب کچھ حقیقت سے قریب ترین رہتے ہوئے فلمانے کی کامیاب کوشش کی گئی، جن کا سامنا مسز میکڈونلڈ کو ہوا تھا۔ اُس زمانے کی تکنیکی سہولتیں آج کی طرح بہت جدید تو نہیں تھیں لیکن اس کے باوجود فلم پروڈیوسر نے ڈرامائی انداز میں ایک خاتون اداکارہ کے ذریعے مسز بروئین کے بھوت کے مناظر بھی

فلمائے۔ اس کردار کے لیے جس اداکارہ کا انتخاب کیا گیا تھا، وہ اُس کے قریب ترین تھی، جو حلیہ مسز بروئین کا بیان کیا جاتا تھا۔ مناظر کو حقیقت سے قریب دکھانے کے لیے دھندلا دیا گیا تھا۔ اس فلم کے نشر ہونے کے بعد میکڈونلڈ فیملی کو برطانیہ اور اسکاٹ لینڈ میں خاصی شہرت حاصل ہوگئی تھی۔

دوسری طرف اراچی لاج بدستور میجر ورنن کی ملکیت تھا البتہ میکڈونلڈ فیملی کے بعد وہاں کوئی اور آکر نہیں ٹھہرا۔ وہ گھر مدتوں خالی پڑا رہا البتہ اس گھر کی شہرت زبانِ زدِ عام ہونے کے بعد کئی عاملوں نے ڈاکٹر میکڈونلڈ سے رابطے کیے۔ وہ سب بھوت کی حقیقت جاننے کے خواہشمند تھے اور اس کام کے لیے وہ خود وہاں ٹھہرنا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر نے ہر شخص کی خاطر خواہ مدد کی اور وہ اراچی لاج تک پہنچے بھی۔ کچھ میجر ورنن کی اجازت سے ہفتوں تک وہاں ٹھہر کر اپنا عمل کرتے رہے لیکن شاید کسی کو کامیابی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ اسی لیے جتنی گرمجوشی سے وہ سامنے آتے تھے، اُسی شدت کے ساتھ بہت جلد خاموشی کے پردے میں کھو جاتے۔ اب تک کوئی ایک ایسا عامل سامنے نہیں آیا تھا جو اس گھر کے بھوت کی حقیقت تک پہنچنے کا دعویٰ کرسکتا۔ رفتہ رفتہ عاملوں کے وہاں جانے اور عمل کرنے کا سلسلہ بھی ختم ہوگیا۔

میجر ورنن مالدار اور فارغ شخص تھا۔ اسے اراچی لاج کی یہ شہرت، حقیقت جاننے کے خواہشمندوں کی کوششوں اور پھر اُن کے ناکام لوٹ جانے کے چکر میں مزہ آنے لگا تھا۔ اِنورنیس میں اس گھر کی شہرتِ بد اتنی عام ہوچکی تھی کہ بنا کسی ٹھوس وجہ کے اس کے اکثر ہمسائے بھی اپنے گھر بیچ باچ کر کہیں اور منتقل ہوگئے تھے۔ کئی گھر تو خود میجر ورنن نے خرید لیے تھے۔

یہ 1968ء کی بات ہے۔ ایک دن نہ جانے میجر ورنن کے دل میں کیا آئی کہ اُس نے اراچی لاج کو مسمار کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ اور بات تھی کہ اِنورنیس کا کوئی مزدور وہاں کام کرنے کو تیار نہیں تھا۔ میجر نے بہت کوشش کی مگر جب اسے مقامی سطح پر مزدور نہ مل سکے تو آخر اس نے ایک اخبار میں اشتہار دیا جس کے جواب میں ایک کمپنی نے اس کام کا ٹھیکا لے لیا۔

معاملہ طے ہوجانے کے چند روز کے اندر اندر ٹھیکیدار کے مزدوروں نے انہدام کا عمل شروع کردیا۔ درجنوں مزدور نہایت صفائی سے سارا دن گھر کو منہدم کرنے میں لگے رہتے تھے۔ رفتہ رفتہ انہیں بھی اس گھر کی آسیبی حقیقت کے بارے سُن گُن مل گئی مگر اس سے پہلے کہ مزدور کام چھوڑ کر بھاگ جاتے گھر کا انہدام مکمل ہوچکا تھا۔ تمام ملبہ اٹھائے جانے کے بعد میجر ورنن اپنی جائداد کا معائنہ کرنے پہنچا۔ وہاں اب سوکھے گلاب کے قدِ آدم پودے اور آڑو کے درخت کے سوا، کچھ اور باقی نہیں بچا تھا۔ جہاں کبھی مسز بروئین کے گلاب کی کیاریوں کے آثار تھے، وہاں بھی اب کچھ نہیں تھا۔ کیاریوں کی جگہ پر گھر کا ملبہ پھینکا گیا تھا۔ ملبہ تو اٹھ چکا تھا لیکن اس کے بعد کیاریوں کے نشانات بالکل ہی مٹ گئے تھے۔

میجر ورنن کے دماغ میں اس جائداد کے استعمال کے بارے میں ویسے تو کوئی خاص خیال موجود نہ تھا لیکن جب اُس دن اس نے چاروں طرف نظر ڈالی تو اُسے سوجھا کہ وہ اس زمین کے اطراف خاردار تاروں کی باڑ لگوا کر یہاں پودے لگوادے۔ یوں کئی سال بعد یہ زمین چھوٹا سا مصنوعی جنگل بن جائے گی۔ اس طرح کئی سال بعد جب وہ درخت کٹائی کے قابل ہوجائیں گے تو ٹمبر بیچ کر اسے خاصا منافع مل جائے گا۔ ویسے بھی اس کام پر زیادہ لاگت آنے اور مستقل نگرانی کا جھنجھٹ بھی نہیں تھا۔ اسے یہ خیال مناسب لگا۔ اس نے منصوبے پر فوری عمل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ ویسے بھی وہ فارغ آدمی تھا۔ یہ کام اسے ایڈونچر لگا سو اس نے کرنے کی ٹھان لی۔

کئی دن گزر گئے۔ دو ٹریکٹر دن بھر زمین کی صفائی کرتے رہے جہاں کبھی اراچی لاج تھا، وہاں صرف ہموار زمین ہی باقی رہ گئی تھی۔ البتہ گلاب کا سوکھا پودا اور آڑو کا درخت بدستور موجود تھا۔ صفائی کا عمل مکمل ہونے کے بعد ورنن نے وہاں ہل چلوانے کا فیصلہ کیا تاکہ زمین کے اندر گھر کی بنیادوں کو بھی صاف کردیا جائے۔

اُس دن ٹریکٹر عین اُس جگہ پر ہل چلا رہے تھے، جہاں کبھی اراچی لاج کا لاؤنج ہوا کرتا تھا۔ میجر ورنن بھی وہیں قریب میں موجود تھا اور اِدھر اُدھر ٹہلتے ہوئے وقت گزار رہا تھا۔ اچانک ایک ٹریکٹر رکا اور ڈرائیور نے زوردار آواز میں ورنن کو پکارا ”سر اِدھر آئیے۔“

میجر ورنن نے ڈرائیور کی بدحواسی محسوس کرلی تھی۔ وہ جلدی جلدی چلتا ہوا اُس مقام پر پہنچا۔ گلاب کا اونچا سوکھا ہوا پودا ٹریکٹر کے قریب زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اُس کی جڑیں بھی صاف نظر آرہی تھیں۔ ڈرائیور بدحواسی کے عالم میں اُس زمین کی طرف اشارہ کررہا تھا جہاں کچھ دیر پہلے گلاب کا یہ خشک پودا لگا ہوا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

''کیا ہوا؟'' میجر ورنن نے اس کے قریب پہنچ کر تشویش سے پوچھا۔

''یہاں..... زمین میں کچھ ہے؟'' ڈرائیور نے بس اتنا ہی کہا۔

''تمھیں کیسے پتا؟''

''جیسے ہی پھل زمین سے ٹکرایا، مجھے عجیب سی آواز سنائی دی اور پھل بھی زمین میں گھس نہیں سکا۔'' ڈرائیور نے اٹکتے ہوئے کہا۔

میجر ورنن نے دونوں ڈرائیوروں سے کہا کہ وہ بیلچے سے اس جگہ کی کھدائی شروع کریں لیکن وہ دونوں ڈرائیور سخت خوفزدہ تھے۔ ویسے بھی وہ اراچی لاج کی آسیبی حیثیت کے بارے میں پہلے سے ہی بہت کچھ سُن چکے تھے۔ اب جو کچھ معاملہ پیش آیا تھا، اس کے باعث وہ خوف زدہ تھے کہ کہیں خوامخواہ کسی نحوست کا شکار نہ ہو جائیں۔

آخر ورنن نے خود بیلچہ سنبھالا اور کھدائی شروع کر دی۔ کچھ دیر بعد اسے ایک تختہ نظر آیا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ تابوت ہے۔ اس نے تھوڑی سی مزید کھدائی کی اور جب مٹی صاف کرنے کے بعد تابوت کا ڈھکن کھولا تو اندر چند انسانی ہڈیاں اور ایک بڑی سی کھوپڑی اُسے نظر آئی۔

یہ سب کچھ دیکھ کر تو اُن دونوں ڈرائیوروں کے چہرے پیلے پڑ گئے مگر ورنن فوجی تھا۔ اسے کسی قسم کا کوئی خوف محسوس نہیں ہوا۔ وہ بڑے سکون سے اُن ہڈیوں کا معائنہ کرتا رہا۔ میجر ورنن سمجھ گیا کہ یہ ہڈیاں کسی عام انسان کی نہیں ہو سکتی تھیں۔ وہ ہڈیاں کافی بڑی اور بوسیدہ تھیں۔ اُسے لگا کہ اگر ان ہڈیوں کو اپنی اپنی جگہ رکھ کر گوشت پوست کی شکل دی جائے تو جو شخص بھی ہوگا، اس کا قد ایک عام آدمی سے دُگنا ہی ہوگا۔

وہ کافی دیر تک زمین پر ہڈیاں رکھ کر ان کا تجزیہ کرتا رہا مگر کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ دونوں ڈرائیور اس سے کچھ فاصلے پر کھڑے لرزتے ہوئے اُسے دیکھ رہے تھے۔ اگر انہیں ورنن کا ڈر نہ ہوتا تو وہ کب کے یہاں سے بھاگ گئے ہوتے لیکن جو صورتِ حال تھی، اُس میں وہ صرف کھڑا رہ کر کانپنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے، سو وہ ایسا ہی کیے جا رہے تھے۔

کافی دیر بعد ورنن نے تمام ہڈیاں اور کھوپڑی واپس تابوت میں رکھیں اور پھر قریب ہی بہت گہری قبر کھدوا کر گلاب کے سوکھے ڈنٹھل والے مُرجھائے پودے اور تابوت کو زمین میں گاڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بے نشان کر دیا۔

ورنن نے اُن دونوں ڈرائیوروں کو منہ بند کرنے کے لیے اچھی خاصی رقم اور راز افشا کرنے کی صورت میں قتل کی دھمکی دی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُس کا لگایا ہوا جنگل آسیب زدہ مشہور ہو۔ وہ اس قصے سے تنگ آ چکا تھا اور اب اس باب کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کرنا چاہتا تھا۔

اس بات کو کئی برس بیت گئے تھے مگر کوئی شخص تابوت کے راز سے واقف نہیں تھا۔ البتہ ایک دن لندن کی سوسائٹی برائے نفسیاتی تحقیق کے سیکریٹری کو ایک خط موصول ہوا جس میں ایک گمنام شخص نے یہ سارا واقعہ من وعن بیان کیا تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ اُن دو میں سے ایک ٹریکٹر کا ڈرائیور تھا۔ اس نے جواب کے لیے اپنا نام یا پتا بھی نہیں لکھا تھا۔ خط لکھنے والے کا دعویٰ تھا کہ تابوت اُسی نے دریافت کیا تھا اُس نے یہ بھی لکھا تھا کہ اب اُس جگہ خاصا بڑا جنگل موجود ہے اور ایسے میں یہ بتانا ناممکن ہے کہ میجر ورنن نے تابوت کس جگہ دفن کیا تھا۔ اُس نے ہی یہ اطلاع بھی دی تھی کہ خود ورنن دو برس پہلے مر چکا ہے اور وہ بھی اب موت کی دہلیز پر ہے، اسی لیے راز افشا کر رہا ہے۔

سوسائٹی نے اس خط کی کاپی مسٹر رَوس اور ڈاکٹر میکڈونلڈ کو بھی بھیجی۔ ڈاکٹر نے تحقیق کی تو ورنن کی موت اور جنگل والی بات درست ثابت ہوئی مگر سب سے مشکل بات جو جواب طلب تھی وہ معما ہی رہی۔ اُس خط کے بعد اب ڈاکٹر کے سامنے کئی نئے سوال اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ مسز بروئین کا آسیبی سایہ، گلاب کا پودا اور اُس غیر معمولی قد آور ڈھانچے کا کیا تعلق تھا؟ یہ سوال اُس کے دماغ میں برسوں کلبلاتا رہا مگر حاصل کچھ نہ ہوا۔

کچھ عرصے تک تو گمنام ٹریکٹر ڈرائیور کے خط کی بازگشت اخبارات میں سنائی دی جاتی رہی مگر پھر یہ بھی اپنی موت آپ مرتی چلی گئی۔ کئی من چلوں نے وہ جگہ تلاش کرنے کی بھی کوشش کی جہاں تابوت دفن کیا گیا تھا مگر کسی کو بھی کامیابی نہ ملی۔

ڈاکٹر پیٹر میکوان میکڈونلڈ اور مسٹر رَوس بھی برسوں سر کھپاتے رہے لیکن اس کے باوجود انہیں کسی ایک سوال کا جواب نہ مل پایا اور پھر سن ساٹھ کی دہائی میں پورے برطانیہ اور اسکاٹ لینڈ میں مشہور ہونے والا یہ واقعہ بھی گردشِ ایام میں وقت کی دھول تلے کہیں ویسے ہی کھو گیا جیسے ورنن کے مصنوعی جنگل میں اُس کے ہاتھوں دفن کردہ پرانے تابوت کا مقام۔

شائقینِ فٹ بال کے لیے تحفۂ خاص

صائمہ اقبال

جادوگر

فٹ بال دنیا بھر میں سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا کھیل ہے، یہ کھیل کبھی ہمارے ہاں بھی بہت زیادہ پسند کیا جاتا تھا۔ ہمارے ہاں مقبولیت کم ہوئی ہے لیکن اب بھی اس کھیل کے شائقین کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان میں سے آپ کسی سے بھی سوال کریں کہ کیا آپ لیونل میسی کو جانتے ہیں۔ اس کا جواب ہوگا، وہ جادوگر جس کے پیروں میں فٹ بال آکر چپک جاتا ہے؟ اسی جادوگر کا احوالِ زیست

روزیریو ارجنٹینا کے صوبے سانتا فے کا مرکزی شہر ہے۔ ایسا شہر جس کی بنیاد رکھنے والوں کے بارے میں تاریخ پُراسرار طور پر خاموش ہے، بالکل خاموش... اور اسی پُراسراریت سے مجھے عشق ہے!

ارجنٹینا، لاطینی امریکا کی ایک ترقی پذیر ریاست ہے جس کے باسی ایک سحر انگیز زندگی گزار رہے ہیں۔ اُن کا مذہب فٹبال ہے، اور اُن کا دیوتا ڈیگو میراڈونا!

24 جون 1987ء کی دوپہر روزیریو کے خاموش

WWW.PAKSOCIETY.COM

مضافات میں مقیم جس گھرانے میں میں نے آنکھ کھولی، وہاں مسائل کی ریل پیل تھی۔ میرا باپ جارج میسی ایک اسٹیل مل میں ملازم تھا اور میری ماں سیلیا میری ایک گھریلو ملازمہ۔

میرے اجداد کا تعلق اٹلی کے ایک چھوٹے سے ساحلی شہر انکونا سے ہے۔ میرے جدِ امجد اینجلو میسی نے 1883 میں ارجنٹینا کا رخ کیا اور دریائے پارانا کے مغربی کنارے پر واقع ایک حسین مگر خاموش شہر میں پڑاؤ ڈالا۔ اور جیسا میں نے کہا، اِس شہر کے بانی کے بارے میں وثوق سے کچھ کہنا تقریباً ناممکن ہے۔

شعور کی دہلیز عبور کرنے کے بعد دادی کا یہ جملہ متعدد بار میری سماعتوں سے ٹکرایا۔ ''میرا پوتا تو پیدائشی فٹبالر ہے!''

اور آج میں بغیر کسی شک کے کہہ سکتا ہوں کہ وہ دُرست تھیں، گیند کو ٹھوکر لگانے کی صلاحیت مجھ میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ شاید یہ مجھے وراثت میں ملی۔ ارجنٹینا کے دیگر باسیوں کی طرح میرے ماں باپ بھی اس کھیل کے رسیا تھے۔

میری ماں بتاتی ہے، جس دوپہر میں پیدا ہوا شہر میں فٹبال کا ایک زبردست مقابلہ تھا، جس نے پورے روزیریو کو دیوانہ بنا رکھا تھا۔

''تمہاری معصوم قلقاریاں سننے کے بعد میں نے نرس سے پہلا سوال میچ ہی کے بارے میں کیا تھا۔'' وہ شرماتے ہوئے کہتی ہے۔

میں اُس کی بات کا برا نہیں مناتا۔ اگر میرے پڑوس میں آگ لگی ہو اور ٹی وی سے کوئی فٹبال میچ ٹیلی کاسٹ ہو رہا ہو تو میری دلچسپیوں کا محور فٹبال مقابلہ ہی ہوگا، یقیناً!

بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے میں گھر بھر کا لاڈلا تھا۔ بڑے بتاتے ہیں، میں ڈیڑھ برس ہی کی عمر میں دوڑنے لگا تھا۔

''مجھے یاد ہے۔ ابھی تم نئے نئے چلنا شروع ہوئے تھے... ایک روز میں نے تمہارے سامنے فٹبال رکھ دیا۔ تم ننھے ننھے قدموں سے آگے بڑھے اور اُسے ٹھوکر لگائی۔'' یہ میرے باپ کے الفاظ ہیں۔

جب کبھی وہ یہ قصہ سنا رہا ہوتا ہے، اُس کی آنکھوں میں زندگی چمکتی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہ مبالغہ آرائی سے کام لیتا ہوگا۔ ارجنٹینا میں یہ ممکن ہے!

میری عمر فقط پانچ برس تھی جب میں بچوں کے ایک کلب گرینڈولی کا حصہ بن گیا، جس کا کوچ میرا باپ جارج تھا۔ یہ بتانے کی تو ضرورت نہیں کہ میں کلب کی تاریخ کا نوعمر ترین کھلاڑی تھا لیکن اِس کی وضاحت ازحد ضروری ہے کہ اِس اعزاز کے حصول کے لیے مجھے اپنے باپ کی سفارش درکار نہیں تھی۔ باقاعدہ ٹرائل کے بعد کلب انتظامیہ نے میرا انتخاب کیا تھا۔

میری پھرتی نے جلد ہی مجھے گرینڈولی کلب کا چہیتا بنا دیا۔ قرب وجوار میں میرے چرچے ہونے لگے۔

چند ہی روز قبل میری گرینڈولی کلب کے ایک پرانے عہدے دار سے ملاقات ہوئی تھی جس نے ایک انکشاف کر کے مجھے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔

''مجھے یاد ہے نوجوان...'' اُس معمر شخص کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ ''جس رفتار سے تم گیند کے ساتھ دوڑا کرتے تھے، بنا گیند کے تم کبھی اُس رفتار سے نہیں دوڑ پائے۔''

خیر، گرینڈولی کلب کے زمانے میں میری متاثر کن کارکردگی نے اخبارات کو بھی متوجہ کیا۔ میرے بارے میں آرٹیکل شائع ہونے لگے، جن میں مجھے ''ننھا میراڈونا'' کہہ کر پکارا جاتا۔

اُن ہی تحریروں کے طفیل عظیم ڈیگو میراڈونا میرے لاشعور کا حصہ بن گیا۔

فٹبال کے اُس دیوتا کے مانند میرا ہتھیار بھی بائیں پیر کی ٹھوکر ہی تھی۔ میری عادت تھی کہ گیند وصول کرتے ہی تیزی سے آگے بڑھتا، مخالف کھلاڑیوں کو جھانسا دے کر گول پوسٹ تک پہنچ جاتا اور پھر بائیں پیر سے زوردار کک لگاتا۔

جب ایک سینئر نے بتایا کہ ڈیگو میراڈونا بھی بالکل ایسا ہی کیا کرتا تھا، میں نے یہ عمل کثرت سے دہرانا شروع کر دیا۔ آنے والے دنوں میں یہ عادت راسخ ہوگئی۔

مجھے یاد ہے، میری ماں اپنے بیٹے کے بارے میں شائع ہونے والے آرٹیکل سنبھال سنبھال کر رکھا کرتی تھی۔ اس عمل کی اہمیت مجھ پر اُس وقت تک آشکار نہیں ہوئی، جب تک میں نے شعور کا صحن عبور نہیں کر لیا، جس کے بعد مجھے چسکا سا پڑ گیا کہ ہر اخبار میرے بارے میں خبر شائع کرے۔

☆☆☆

''مسٹر جارج، میں اِسے کیا سکھاؤں؟ یہ تو پیدائشی فٹبالر ہے۔'' کوچ ماریو ٹویز کے لہجے میں ایسا احتجاج تھا، جس پر شفقت غالب تھی۔

ماریو کم عمر کھلاڑیوں کی تربیت کے معاملے میں شہر کا ماہر ترین کوچ تھا۔ میرے والد کی خصوصی درخواست پر اُس نے میری تربیت کی ہامی بھری تھی۔

''جناب، ایسا کیوں کہہ رہے ہیں، یہ بچہ آپ کی توجہ کا طالب ہے۔'' میرے باپ کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ذرا دیکھو تو...'' ماریو نے انگلی کے اشارے سے آسے میدان کی جانب متوجہ کیا جہاں میں پریکٹس کر رہا تھا۔

''یہ کس پختگی سے پاس کرتا ہے، کس رفتار سے دوڑتا ہے، کس طرح مخالفوں کو جھانسا دیتا ہے اور کس خوبی سے حملہ کرتا ہے، واہ!''

ماریو سانس لینے کو رُکا۔ ''اُس کی ٹانگیں چھوٹی مگر مضبوط ہیں جن سے گیند بڑے ہی پُراسرار انداز میں چپک جاتی ہے، اور اس کی رفتار... حیران کن!''

میرا باپ خاموش رہا۔

''دوست تم خوش نصیب ہو۔ خدا نے تمہیں ایک ہیرے سے نوازا ہے۔ یہ مستقبل میں میسی خاندان کا نام روشن کرے گا۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنا بیگ اٹھا لیا۔ ''اچھا اب میں چلتا ہوں۔ زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔''

اِس مکالمے کی تفصیلات سے مجھے میرے بڑے بھائی نے آگاہ کیا جو اُس وقت میرے باپ اور ماریو ٹویز کے نزدیک کھڑا تھا۔

خیر، میں 1995 تک گرینڈولی کلب کا حصہ رہا جس کے بعد میں نے نیولز اولڈ بوائیز کلب میں شمولیت اختیار کر لی جو شہر کا سب سے مقبول کلب تھا۔

میری کارکردگی کیسی رہی؟ اِس کا جواب آپ کو ماریو ٹویز سے پوچھنا چاہیے، جو نیولز اولڈ بوائیز کا مینیجر تھا!

☆☆☆

کیا میں نے غموں سے پاک، ایک پُرمسرت بچپن گزارہ؟

نہیں، ایسا نہیں ہے۔ فٹبالر بننے کے لیے آپ کو ناقابلِ بیان درد برداشت کرنا پڑتا ہے۔ ان تھک جدوجہد کرنی پڑتی ہے اور میں اس کے لیے تیار تھا لیکن قدرت کا منصوبہ کچھ اور ہی تھا... دُکھوں کا ایک طوفان اُمڈ آنے کو تھا جو مجھے اپنے ساتھ ایک اجنبی دیس لے جانے کا تہیہ کیے بیٹھا تھا۔

میرے ماں باپ پر یہ خبر بجلی بن کر گری کہ اُن کا گیارہ سالہ لاڈلا ایک موذی مرض کا شکار ہے۔

''لیونل کے جسم میں نشوونما کے ذمے دار ہارمونز کی کمی ہے۔'' ڈاکٹر آواز ہموار رکھتے ہوئے اپنا کرب چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''یہ پیچویٹری گلینڈز کا مسئلہ ہے۔''

''وہ ٹھیک تو ہو جائے گا ناں؟'' میری ماں کے لہجے میں پریشانی تھی۔

''میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ دراصل اِس کا علاج مہنگا ہے، خاصا مہنگا۔'' ڈاکٹر نے گہرا سانس لیا۔

''کیا یہ فٹبال کھیل سکے گا؟'' اس بار میرے باپ نے سوال کیا۔

''مجھے افسوس ہے مسٹر جارج، شاید یہ ممکن نہ ہو۔'' ڈاکٹر یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گیا اور پیچھے رہ گئے میرے ماں باپ جو گہرے صدمے میں تھے۔

جہاں تک میرا تعلق ہے... میں نے ڈاکٹر کے اندیشے کو ایک لمحے کے لیے بھی سنجیدگی سے نہیں لیا۔ اُس وقت میں اسپتال کے بستر پر لیٹا تھا جس سے اٹھ کر میں سیدھا فٹبال کے میدان میں اتر سکتا تھا۔

میرے بلند ارادے معالجین کی تشویش کم کرنے میں ناکام رہے۔ مجھے اسپتال میں داخل کروا دیا گیا جہاں ہر نیا دن، نئی بیزاری لے کر آتا تھا۔

جلد ہی یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے شہر میں پھیل گئی کہ جارج میسی کا بیٹا، روزیریو کا چہیتا اب کبھی فٹبال نہیں کھیل سکے گا۔

میرے علاج کے لیے ہر ماہ 900 ڈالرز درکار تھے۔ یہ ایک خطیر رقم تھی۔ میرے اہلِ خانہ کے لیے اس کی فراہمی ناممکن تھی۔

اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں کے بعد کئی افراد مدد کے لیے آگے آئے۔ ارجنٹینا کا مشہور فٹبال کلب ریور پلیٹ بھی میرے ہمدردوں میں شامل تھا، تاہم علاج اتنا مہنگا تھا کہ یہ کوششیں بارآور ثابت نہیں ہوئیں۔ مخیر حضرات اور حکومتی اداروں کے تعاون سے چند ماہ تو علاج ممکن تھا مگر مستقل علاج کے لیے مستقل نوعیت کی سرپرستی درکار تھی۔

مجھے یاد ہے، اُن دنوں میری ماں کثرت سے چرچ جانے لگی تھی جہاں اس کے بیٹے کے لیے اجتماعی دعا ہوتی۔ درحقیقت ہم کسی فرشتے کے منتظر تھے۔ اور پھر... ہماری زندگی میں ایک فرشتہ آیا جس کا نام کارلس رکساچ تھا۔

کارلوس اُن دنوں مشہور زمانہ ہسپانوی فٹبال کلب بارسلونا کا اسپورٹنگ ڈائریکٹر تھا۔ اسپین میں مقیم میرے چند خیرخواہوں نے کسی طرح کارلوس سے رابطہ کر کے اُسے میری صلاحیتوں اور میرے مسائل سے آگاہ کر دیا۔

مجھے یقین ہے، میرے احباب نے بڑھا چڑھا کر میری تعریف کی ہوگی لیکن اُس نیک صفت شخص نے مسئلے کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

نوعیت سمجھتے ہوئے مجھے ایک موقع دینے کا فیصلہ کیا۔ اور اُسی فیصلے نے میری زندگی بدل دی۔

ہمیں اسپین سے ایک خط موصول ہوا جس میں ٹھیک دو ہفتے بعد اتوار کی صبح بارسلونا پہنچنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ ٹکٹ ساتھ تھے۔

جب میں اپنے والد کے ہمراہ روزیریو سے روانہ ہو رہا تھا، ماں کی آنکھوں میں بہ دقت امید اور اندیشے تھے۔

''اگر میسی، کارلوس کو متاثر کرنے میں ناکام رہا تو...''

وہ اِس سے آگے نہیں سوچ پاتی۔ یہ اندیشہ اُسے زخمی کر رہا تھا لیکن میں اِس بابت فکرمند نہیں تھا، مجھے تو بس ایک فٹبال کی ضرورت تھی اپنا جادو جگانے کے لیے!

کیا آپ سننا چاہیں گے ٹرائل والے روز کیا ہوا؟

''یہ بچہ حیران کن ہے!'' یہ کارلوس کے الفاظ تھے۔ جنہیں سن کر میرے باپ کا چہرہ دمک اٹھا۔

''بالکل ڈیگو میراڈونا کی طرح کھیلتا ہے۔ وہی انداز، وہی قد کاٹھ، خوب!''

''عظیم میراڈونا؟'' میرے باپ کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔ ''کیا واقعی؟''

''بالکل مسٹر جارج۔'' پھر وہ میری طرف متوجہ ہوا اور منہ پر ہاتھ رکھ کر چلایا۔ ''بچے، ذرا ادھر آؤ!''

میں دوڑتا ہوا اس میز تک پہنچ گیا جہاں وہ میرے والد کے ساتھ بیٹھا کافی پی رہا تھا۔

''سنو، میں تمہیں بارسلونا کا حصہ بننے کی پیشکش کرنا چاہتا ہوں۔'' چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ ''چلو معاہدہ سائن کرتے ہیں۔''

معاہدے کے کاغذات تیار نہیں تھے۔ اور یہ قابلِ فہم تھا۔ بارہ برس کے بچے کو فقط ایک ٹرائل کی بنیاد پر بارسلونا جیسے کلب کے لیے منتخب کرنے کی ماضی میں کوئی مثال نہیں ملتی تھی۔

''چلو کوئی سادہ کاغذ لے آؤ۔'' کارلوس نے اپنے اسسٹنٹ سے کہا۔

اِس بار بھی ناکامی ہاتھ آئی۔ کسی کے پاس سادہ کاغذ نہیں تھا۔ کارلوس جھلّایا گیا۔ بالآخر اُس نے میز پر پڑا نیپکن اٹھایا۔ جیب سے قلم نکالا۔ احتیاط سے چند سطریں لکھیں اور دستخط کر دیے۔

''چلو لڑکے، اب تمہاری باری ہے۔ دستخط کرو۔'' کارلوس نے نیپکن میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

جب میں روزیریو لوٹا، اس خاموش شہر میں جشن کا سماں تھا۔

اگلے روز ارجنٹینا کے مؤقر اخبارات نے یہ خبر شہ سرخیوں میں شائع کی۔ ''روزیریو کا میسی، بارسلونا کا حصہ بن گیا!''

علاج کے لیے اسپین میں قیام شرط تھی، سو میں اپنے والد کے ساتھ اسپین منتقل ہو گیا جہاں بارسلونا کی یوتھ اکیڈمی میں انوکھے تجربات میرے منتظر تھے۔

☆☆☆

نیا ماحول، نیا کلچر، نیا شہر... مگر میں نے اُن تبدیلیوں کی جانب دھیان نہیں دیا۔ مجھے تو فقط فٹبال سے غرض تھی۔ اور روزیریو کے برعکس وہاں اِس کھیل کے معیارات خاصے بُلند تھے۔ سہولیات بھی اعلیٰ پائے کی تھیں۔ ہمیں بہترین رہائش، معیاری غذا اور سب سے بڑھ کر ماہر کوچ میسر تھے۔ بس، وہاں روزیریو کی فضاؤں میں بسی پُراسراریت کی کمی تھی!

بارسلونا میں پہلی بار میرا سامنا ایسے نوجوانوں سے ہوا جو بڑی حد تک میرے ہم پلّہ تھے۔

میرا علاج شروع ہو چکا تھا جس کے نتائج خاصے حوصلہ افزا رہے۔ میدان میں بھی میری کارکردگی متاثر کن تھی۔ چند ہی ماہ میں اسپین کے اخبارات میں ارجنٹینا سے آئے ایک باصلاحیت نوجوان کا ذکر ہونے لگا۔

اِس بار اخبارات کی کٹنگ سنبھالنے کی ذمّے داری میرے باپ نے نبھائی۔

خوش قسمتی سے بارسلونا جونیئر ٹیم سے وابستگی کا دورانیہ خاصا مختصر رہا.... اپنے منہ سے اپنی تعریف کرنا اچھا نہیں لگتا سو میں کارلوس کی رپورٹ کا ایک ٹکڑا پیش کر دیتا ہوں۔

''لیونل میسی مستقبل کا سُپر اسٹار ہے۔ جونیئر ٹیم میں اُس کی صلاحیتیں ضائع ہو جائیں گی۔ میں اس کی قبل از وقت ترقی کی سفارش کرتا ہوں!''

کلب انتظامیہ نے سفارش قبول کر لی اور میں جونیئر ٹیم سے الگ ہو گیا۔ 2000 سے 2003 تک میں نے بارسلونا کی جانب سے یوتھ اے کیٹیگری کے مقابلوں میں شرکت کی جہاں 30 میچز میں 37 گول اسکور کر کے ناقدین کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔

اگلے سیزن میں تو میری کارکردگی اتنی متاثر کن رہی کہ ہر میچ کے بعد انتظامیہ مجھے پروموٹ کر کے اوپری

درجے میں بھیجتی رہی اور مجھے اساطیری شہرت کے حامل بارسلونا کلب کے لیے کھیلنے کا خواب سچ ہوتا نظر آنے لگا۔

نومبر 2003 میں، جب میں نے بارسلونا سی ٹیم کی نمائندگی کی، اُس وقت وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ فقط چند ماہ بعد میں بارسلونا بی ٹیم کا حصہ بن جاؤں گا۔

☆☆☆

''حبّ الوطنی کا جذبہ کتنا پُرقوت ہے؟ اپنی زمین انسان کے لیے کیا معنی رکھتی ہے؟'' اِس سوال کا جواب مجھے 2004 کے موسمِ سرما میں ملا جب میرا اندرون پکار اٹھا۔

''لیونل میسی ارجنٹینا کا باسی ہے۔ فقط ارجنٹینا کا!''

یہ اُس زمانے کی بات ہے، جب اسپین مجھے اپنا چکا تھا، مجھے ارجنٹینین نژاد ہسپانوی سمجھا جانے لگا تھا۔ اس نئی شناخت پر مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ خوشی محسوس ہوتی تھی مگر جب مجھے اسپین کی کیٹیگل یوتھ ٹیم سے کھیلنے کی پیش ہوئی، میرا ضمیر پکار اٹھا۔ ''میں ایک ارجنٹینین ہوں!''

میں نے اِس پیشکش کو رد کرنے میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا۔

''بین الاقوامی مقابلوں میں میرا ملک ہی میری ترجیح ہے!'' میرا لہجہ واضح تھا۔

یہ بیان نہ صرف اسپین بلکہ ارجنٹینا کے اخبارات کی بھی زینت بنا۔ مجھے یاد ہے، اُس شام روزیریو میں مقیم میرے بھائی نے فون کیا تھا۔

''ارجنٹینا کو تم پر فخر ہے لیونل۔'' وہ پُرجوش تھا۔ ''اور سنو، یہاں تمہیں یوتھ ٹیم کے لیے منتخب کرنے کے معاملے پر بحث چھڑ گئی ہے۔ لگتا ہے، تم اپنے سپنے کے قریب ہو۔''

وہ دُرست تھا۔ چند ہی روز بعد مجھے ارجنٹینین فٹبال فیڈریشن کی جانب سے وہ پیغام موصول ہوا جس نے میری روح کو مسرت سے بھر دیا۔

دو روز بعد میں ایک ہوائی جہاز میں بیٹھا تھا جو ارجنٹینا کی طرف جا رہا تھا۔

جس روز میں نے ارجنٹینا کی جرسی پہنی، میرے دل میں خوشی سے لڈو پھوٹ رہے تھے۔ جون 2004 میں پیراگوئے کے خلاف کھیلے جانے والے ایک دوستانہ میچ سے میں نے اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔

گو کہ میں گول اسکور نہیں کر سکا لیکن مایوس ہونے کے بجائے میں نے محنت جاری رکھی جو بے ثمر نہیں گئی۔ اگلے ہی ماہ یورگوئے کے خلاف کھیلے جانے والے میچ میں میری زوردار ٹھوکر نے گیند نیٹ میں پہنچا دی۔

گو کہ میں نے اسپینش فٹبال فیڈریشن کی پیشکش قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا لیکن اُنہوں نے اپنے دل میں کسی تعصب کو جگہ نہیں دی۔ اسپین کل کی طرح آج بھی مجھ سے محبت کرتا تھا۔ کلب ٹیم کے ساتھ میں ارجنٹینا کی یوتھ ٹیم سے بھی کھیلتا رہا اور دونوں ہی میدانوں میں میری کارکردگی متاثر کن رہی۔

☆☆☆

میری حوصلہ افزائی کرنے والوں میں مایۂ ناز ڈچ کھلاڑی فرینک ریجکارڈ سرفہرست تھا جسے میں اپنا محسن گردانتا ہوں۔ فرینک اُن دنوں بارسلونا کلب کا منیجر تھا۔

مجھے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ وہ مجھے پرکھنے کے لیے باقاعدگی سے جونیئر ٹیم کے مقابلے دیکھنے آیا کرتا تھا۔

اسی کی کرم فرمائیوں اور یقین کے سہارے میں نے سترہ برس کی عمر میں بارسلونا کی جانب سے کھیلنے کا اعزاز حاصل کیا۔ وہ... ایک خوشگوار لمحہ تھا!

دنیا کے مایۂ ناز کھلاڑیوں کے ساتھ کھیلنا آسان ثابت نہیں ہوا۔ مقابلہ انتہائی سخت تھا۔ ابتدائی میچز میں تو میں گول کرنے میں ناکام رہا جس کی وجہ سے مایوسی ذہن میں جڑ پکڑنے لگی۔

فرینک نے بھی میرے اندر آنے والی تبدیلی کو محسوس کیا۔ ایک شام جب میں پریکٹس کے بعد ڈریسنگ روم میں بیٹھا تھا، وہ میرے پاس آیا۔

''نوجوان، اداس معلوم ہوتے ہو؟'' چہرے پر دوستانہ مسکراہٹ تھی۔

''اوہ... نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' میں نے خود کو نارمل ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

وہ خاموش کھڑا انتظار کرتا رہا، بالآخر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''میں اپنی کارکردگی کی وجہ سے پریشان ہوں سر... کوشش کے باوجود میں اچھا پرفارم نہیں کر پا رہا...'' میں نے ہچکیوں کے درمیان کہا۔

''کون کہتا ہے کہ تم اچھا پرفارم نہیں کر سکے؟'' اُس کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔

''میں... ایک بھی گول اسکور نہیں کر سکا۔'' میں نے دھیرے سے کہا۔

''اوہ... تو اِس لیے افسردہ ہو۔'' ڈریسنگ روم میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

فرینک کا قہقہہ گونجا۔ ''نوجوان ذرا سوچو، اگر تم گول کیپر ہوتے، یا دفاعی کھلاڑی، تب بھی کیا اس بات پر گریہ کرتے کہ تم گول اسکور نہیں کر سکے؟''

''مگر میں ایک فارورڈ...'' میرے چہرے پر حیرت تھی۔

''تم بہت باصلاحیت کھلاڑی ہو میسی۔'' اُس نے بات کاٹی۔ ''مستقبل تمہارا ہے۔ مایوسی کو اپنے پاس مت پھٹکنے دو۔'' اُس کا ہاتھ میرے کاندھے پر تھا۔

میں نے اس کی نصیحت گرہ سے باندھ لی۔

جس روز میں نے بارسلونا کی جانب سے اپنا پہلا گول اسکور کیا، فرینک نے میرا کاندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا تھا۔ ''مجھے خوشی ہے، تم نے میری نصیحت پر عمل کیا۔ مبارک باد قبول کرو۔ تم بارسلونا کی جانب سے پروفیشنل ڈویژن میں گول اسکور کرنے والے نوعمر ترین کھلاڑی کا اعزاز حاصل کر چکے ہو۔''

میں لیفٹ ونگ کا کھلاڑی تھا، فرینک ہی کے مشورے پر میں نے رائٹ ونگ کی پوزیشن پر کھیلنا شروع کیا جس سے میری کارکردگی میں واضح بہتری آئی۔ میں نے اُس سیزن میں 17 گول داغے۔ میری حوصلہ افزائی کے لیے بارسلونا انتظامیہ نے ایک خصوصی تقریب منعقد کی جہاں مجھے اپنے محسن کو خراجِ تحسین پیش کرنے کا موقع ملا۔ میں نے کہا تھا۔

''مسٹر فرینک، میں کبھی یہ بات نہیں بھولوں گا کہ آپ نے اُس وقت مجھ پر بھروسا کیا جب میں خود پر بھروسا کھو بیٹھا تھا۔ میں آپ کا ممنون ہوں۔''

☆☆☆

2005 میں کولمبیا میں ہونے والی ساؤتھ امریکن یوتھ چیمپین شپ میں مجھے ایک بار پھر اپنے وطن کی نمائندگی کا موقع ملا۔ اُس ٹورنامنٹ میں ہم نے تیسری پوزیشن حاصل کی۔

جب ہم گھر لوٹے، ہمارا استقبال سورماؤں کی طرح کیا گیا۔ خصوصاً میری بہت آؤ بھگت ہوئی لیکن میں افسردہ تھا۔ مجھے دُکھ تھا کہ اپنے ملک کو فتح نہیں دلوا سکا۔

اس موقع پر ماں نے میری دل جوئی کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''لیونل تم افسردہ ہونے کا حق رکھتے ہو لیکن یاد رکھو، دنیا ختم نہیں ہوئی۔ جو گزر گیا، اسے بھول جاؤ، اگلے مقابلے کی تیاری کرو۔''

اس نصیحت نے میرے دل پر انمٹ نقوش چھوڑے۔

میں نے فیصلہ کر لیا، مایوسی سے دامن چھڑا کر اگلے مقابلے کی تیاری کا!

اور میں نے جم کر تیاری کی جس کا نتیجہ ایک ایسی فتح کی صورت سامنے آیا جس نے پوری دنیا کو میری طرف متوجہ کر دیا۔

2005 میں ہالینڈ میں ہونے والے فیفا یوتھ ورلڈ کپ کا فاتح کوئی اور نہیں... ارجنٹینا ہی تھا۔ اور ٹورنامنٹ کے اہم ترین اعزازات ''گولڈ بال'' اور ''گولڈ بوٹ'' جس کھلاڑی کے نام ہوئے، وہ تھا لیونل میسی... جسے پریس اب ''جادوگر'' کہنے لگا تھا۔

مجھے ایک مؤقر اخبار کی سرخی یاد ہے، جو کچھ یوں تھی ''ورلڈ کپ جادوگر میسی کے نام، جس نے دشمن کے جبڑے سے فتح چھین لی!''

میں نے اس ٹورنامنٹ میں مجموعی طور چھ گول اسکور کیے۔ اہم بات یہ تھی کہ میں نے آخری چار میچوں میں لگاتار گول داغے۔

میں ہیرو بن چکا تھا مگر لیونل میسی کی بابت شائع ہونے والے مضامین، خبریں، ٹاک شوز سب اس وقت میرے لیے بے معنی ہو گئے جب میں نے روزریو لوٹنے کے بعد ایک مقامی اخبار میں شائع ہونے والا بیان پڑھا۔ ''میسی واقعی باصلاحیت ہے، میں اُس سے ملنا چاہوں گا۔''

یہ بیان ایک دیوتا کا تھا... جس کا نام تھا، ڈیگو میراڈونا!!

☆☆☆

واقعات بہت تیزی سے وقوع پذیر ہوئے۔ اُن کی رفتار میرے لیے حیران کن تھی۔

جب مجھے قومی ٹیم کے لیے منتخب کیے جانے کی اطلاع اخبارات کی زینت بنی، میں چونک اٹھا!

''کیا وہ لمحہ آن پہنچا ہے؟'' میں نے خود سے سوال کیا۔

ہاں، وہ لمحہ آن پہنچا تھا۔ 17 اگست 2005 کو ہنگری کے خلاف بڈاپسٹ میں ہونے والے مقابلے سے میں نے اپنا انٹرنیشنل ڈیبو کیا۔ اُس وقت میری عمر 18 برس تھی۔

ورلڈ کپ کوالیفائی راؤنڈ کے اس میچ کا شمار دورِ جدید کے متنازع ترین مقابلوں میں ہوتا تھا جس کا سبب کوئی اور نہیں بلکہ میں ہوں۔

اس شام میں فقط دو منٹ میدان میں رہا۔ 63 ویں منٹ میں مجھے میدان میں اتارا گیا اور 65 ویں منٹ میں ریفری مارکیوز مارک نے مجھے ریڈ کارڈ دے دیا۔ مجھ پر الزام تھا کہ میں نے ہنگری کے کھلاڑی ولموس کو کہنی ماری ہے۔ یہ جھوٹ تھا، سفید جھوٹ۔ وہ مسلسل میری شرٹ کھینچ رہا تھا۔ میں نے فقط خود کو اس کی گرفت سے آزاد کروانے کی کوشش کی تھی تاہم مجھے میدان سے باہر بھیج دیا گیا۔

میں باقی میچ نہیں دیکھ سکا، ان آنسوؤں کی وجہ سے جو آنکھوں میں اتر آئے تھے۔ ہر منظر دھندلا گیا تھا۔ دُکھ اتنا شدید تھا کہ مجھے اندازہ ہی نہیں ہوا، میدان میں موجود ارجنٹینا کے دس کھلاڑیوں نے ہنگری کو دو۔ ایک سے شکست دے کر میرے ساتھ ہونے والی ناانصافی کا بدلہ لے لیا ہے۔

مجھے یاد ہے، کوچ حوزے پیکرمین نے میرا کاندھا جھنجھوڑتے ہوئے کہا تھا۔ ''سر اٹھاؤ نوجوان۔ دیکھو ساتھی تمہیں میدان میں بلا رہے ہیں، تاکہ جیت کا جشن منا سکیں۔''

بعد میں ڈیگو میراڈونا نے بھی کہا کہ میسی کو باہر کرنا ایک سازش کا نتیجہ تھا۔ اُس کے الفاظ تھے۔ ''یہ ایک باصلاحیت نوجوان کا کیریئر تباہ کرنے کی گھٹیا کوشش ہے!''

مجھے اِن الفاظ نے حوصلہ دیا۔ 3 ستمبر کو پیرو گوئے کے خلاف کھیلے جانے والے میچ کے لیے ایک بار پھر میرا انتخاب کیا گیا۔

میچ سے قبل ڈریسنگ روم میں جب میرا کوچ سے سامنا ہوا، اس نے بلند آواز میں کہا۔ ''نوجوان ماضی بھول جاؤ، لمحہ موجود کی فکر کرو۔''

جب میں میدان میں اترا، اس وقت میچ کے خاتمے میں فقط آٹھ منٹ باقی تھے لیکن اس مختصر سے وقت نے مجھے مسرت سے بھر دیا۔ میں نے خود سے کہا۔ ''یہ انٹرنیشنل فٹبال میں میرا دوسرا جنم ہے!''

اکتوبر میں ہم نے اپنی سرزمین پر پیرو کے خلاف کوالیفائنگ راؤنڈ کا میچ کھیلا۔ بلاشبہ... وہ میری زندگی کا اہم ترین مقابلہ تھا کیونکہ مجھے پہلی بار اپنے اہلِ وطن کے سامنے کھیلنے کا موقع مل رہا تھا۔ ہاں، اس سے قبل یوتھ ٹیم کی نمائندگی کرتے ہوئے میں نے چند وارم اپ مقابلوں میں شرکت کی تھی لیکن یہ پہلا موقع تھا جب میں ارجنٹینا کی زمین پر انٹرنیشنل ٹیم کے لیے کھیل رہا تھا۔

اہلِ خانہ کے علاوہ میرے کئی دوست اور رشتے دار وہ مقابلہ دیکھنے آئے ہوئے تھے۔

کوچ نے اس بار مجھے بھرپور موقع دیا۔ میں میدان

ہائیڈ پارک ایک بڑا اور مشہور زمانہ پارک ہے جو لندن کے بیچوں بیچ کافی رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کی اصل وجہ شہرت یہ ہے کہ اس میں ہر شخص کو اظہارِ رائے اور تقریر کی آزادی ہے۔ اس لیے چھٹی والے روز بے فکرے اور پرجوش مقرر یہاں اسٹول اپنے گھر سے لاتے ہیں اور پھر ان پر چڑھ کر اپنے اپنے انداز سے مجمع سے خطاب کرتے ہیں۔ جب ہم پارک میں داخل ہوئے۔ تقریریں کرنے والے حضرات گروہ در گروہ اپنے مشغلے میں مصروف تھے۔ مرزا چند لمحے تو ان مقررین کو غور سے دیکھتے رہے پھر اچانک کیا ہوک اٹھی کہ انہیں خود بھی تقریر کرنے کا سودا سمایا۔ میں نے سمجھایا بھی کہ وہاں اردو کوئی نہیں سمجھے گا لیکن کہنے لگے تم ہو نا...... ساتھ ساتھ ترجمہ کرتے جانا۔ ان کا اضطراب دیکھتے ہوئے میں نے ہار مان لی۔ اب مسئلہ تھا ایک عدد اسٹول کا سو یہ بھی اللہ کے فضل سے حل ہو گیا۔ ایک چگی ڈاڑھی والے انگریز چچا ابھی تقریر سے فارغ ہی ہوئے کہ ہم نے ان کا اسٹول عاریتاً لے لیا۔ مرزا ایک جوش اور ولولے میں اسٹول پر چڑھے۔ کچھ لوگوں نے تالیاں بجائیں۔ مرزا کورنش بجا لائے۔ پھر اپنی چنگھاڑتی ہوئی آواز میں تقریر کی جس کا انگریزی ترجمہ مجھے ساتھ ہی کرنا پڑا لب لباب کچھ یوں تھا ''لندن کے باسیو! سدھر جاؤ' تمہارے رنگ سفید کیوں ہیں؟ اس لیے کہ تمہارے خون سفید ہیں۔ آسمان سے تم پر بم برسنے والے ہیں (لفظ بم مرزا کے منہ سے سن کر لوگ ہنسے) آج تم لوگ ہنس رہے ہو لیکن بم کسی کو نہیں بخشے گا۔ (لوگ بم سن کر پھر ہنسے) بے حیائی فحاشی سے باز آ جاؤ۔ ورنہ عنقریب تم پر امریکا کی ''چتکبری اور گلابی سنڈی'' کا حملہ ہوگا۔ تم اپنے پسندیدہ ''بے نمک مرچ'' کے کھانوں کو ترسو گے' ابلے ہوئے آلو اور مٹر کے بھرتے کو محتاج ہو جاؤ گے۔ زمین میں خندقیں کھود کر رہو گے۔ ایک دوسرے کا طبلہ بجا کر موسیقی کا لطف اٹھاؤ گے' گنجے ہو گے تو سر چھپانے کو وگ نہیں ملے گی۔ سگریٹ کی جگہ چسنی پیو گے! اکھوں اکھوں کر کے کھانستے پھرو گے۔ دانتوں سے ناخن کترتے رہو گے' ایسے بم تم پر برسیں گے۔ (لفظ بم پر لوگ خوب ہنسے) جو بظاہر بم ہوں گے لیکن ان میں سے امریکی سنڈیاں نکلیں گی جیسی ہمارے ہاں کپاس کی فصل پر آتی ہیں۔ سب کچھ کھا جائیں گی۔ ہوشیار ہو جاؤ' ہوش میں آ جاؤ۔'' مرزا نے تقریر ختم کی تو لوگوں نے ہاتھوں سے بھونپو بنا کر خوب آوازیں نکالیں۔ دو چار نے ازراہ تفنن سگریٹ کے پیکٹ پر مرزا کے دستخط لیے۔ لیکن موصوف خود اپنی تقریر سے بے حد مطمئن تھے۔ اسٹول شکریے کے ساتھ واپس کر کے ہم پارک میں آگے بڑھے تو مرزا نے پوچھا ''لوگ بم پر کیوں ہنستے تھے؟'' دراصل تم اردو میں بم کہہ رہے تھے لیکن لوگ انگریزی میں ''Bum'' سمجھ رہے تھے جس کے معنی ''کولہوں'' کے ہوتے ہیں جن پر آپ تشریف رکھتے ہیں۔ میں نے مرزا کی معلومات میں اضافہ کیا۔

اقتباس: لندن اور شریر مرزا از پروفیسر محمد وسیع اللہ خان

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں اترنے والے گیارہ کھلاڑیوں میں شامل تھا بلکہ گیند کو پہلی ٹھوکر میں نے ہی لگائی۔

وہ ایک سخت مقابلہ تھا۔ پورے ملک کی نظریں مجھ پر مرکوز تھیں اور مجھ پر خاصا دباؤ تھا لیکن قسمت نے میرا ساتھ دیا۔

اس دن میں گول تو اسکور نہیں کرسکا لیکن میں نے گول پوسٹ پر پانچ حملے کیے۔ میری پھرتی سے خوف زدہ مخالف ٹیم کے دفاعی کھلاڑیوں نے کم از کم سات بار مجھے گرانے کی کوشش کی۔ اس حرکت کا خمیازہ انہیں بھگتنا پڑا۔ ہمیں پینالٹی کک مل گئی جس پر ارجنٹینا نے اپنا پہلا گول اسکور کیا۔

جب ریفری نے اختتامی سیٹی بجائی، ہم میچ دو۔صفر سے جیت چکے تھے۔

میچ کے بعد ہونے والی پریس کانفرنس میں ہمارے کوچ پیکر مین نے مجھے ایک ہیرا قرار دیا۔

''مجھے لگتا ہے، ہم نے وہ نوجوان کھوج نکالا ہے جو آنے والے وقتوں میں ہماری امیدوں کا مرکز ہوگا!''

یہ الفاظ میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں تھے۔

دوسرے روز کے اخبارات میں بھی لیونل میسی کی پھرتی کے چرچے تھے۔ میں نے اس ستائش کا مثبت اثر لینے کے بجائے ان امیدیوں پر پورا اترنے کا فیصلہ کیا جو ارجنٹینا کے باسیوں نے مجھ سے وابستہ کرلی تھیں۔

اپنے پہلے انٹرنیشنل گول کے لیے مجھے تھوڑا انتظار کرنا پڑا۔ کوالیفائی راؤنڈ کے خاتمے کے بعد 2006 کے اوائل میں چند دوستانہ میچ کھیلے گئے جن میں سے ایک کروشیا کے خلاف تھا۔

اُسی میچ میں، میں نے پہلی بار گیند نیٹ میں پہنچائی... گول اسکور کرنے کے بعد میں پورے دو منٹ تک رقص کرتا رہا۔

☆☆☆

''تمہارے پیروں سے گیند چپک جاتی ہے نوجوان۔'' آواز میں جوش تھا۔ ''میں نے زندگی میں کئی عظیم کھلاڑی دیکھے لیکن گیند پر کنٹرول کا ایسا مظاہرہ میری نظروں سے نہیں گزرا!''

میں خوشی سے یا شاید غیر یقینی کی کیفیت سے لرز رہا تھا کیونکہ میں اپنے ہیرو ڈیگو میراڈونا کے سامنے تھا جس کی زبان سے ادا ہونے والے ستائشی الفاظ کی مہک کئی روز تک میرے ساتھ رہنے والی تھی۔

یہ ملاقات ایک اعلیٰ سطح کی سرکاری تقریب میں ہوئی جہاں ارجنٹینا کی ٹیم کو مدعو کیا گیا تھا۔

میری مسرت کو مذکورہ ملاقات کے چند روز بعد اخبارات کی زینت بننے والے میراڈونا کے انٹرویو نے مہمیز کیا جس میں اس نے کہا تھا:

''میرے نزدیک میسی دنیا کا بہترین کھلاڑی ہے، میں اسے اپنے جانشین کے روپ میں دیکھتا ہوں!!''

2006 کا سال کئی معنوں میں یادگار رہا۔

اُس برس بارسلونا نے میرے ساتھ نیا معاہدہ کیا۔ معاوضے میں خاطر خواہ اضافہ کردیا گیا۔ اسپین کی اعزازی شہریت سے بھی نوازا گیا۔ مجھے یاد ہے، یوتھ ورلڈ کپ میں ارجنٹینا کو فتح دلانے کے بعد جب میں بارسلونا کی جرسی پہن کر میدان میں اترا، مداحوں نے کھڑے ہوکر میرا استقبال کیا تھا۔

اِس بار مجھے برازیلین جادوگر، رونالڈینیو کے ساتھ کھیلنے کا موقع ملا۔ گو کہ اس کا شمار عہد کے عظیم کھلاڑیوں میں ہوتا تھا لیکن اس میں رعونت کی رمق بھی نہیں تھی۔ وہ دوستوں کی طرح پیش آیا۔ میدان میں اترنے سے قبل ہی ہمارے درمیان ہم آہنگی پیدا ہوگئی جو دورانِ میچ بھی نظر آئی۔ ہماری مربوط پاسنگ نے مخالف ٹیم کی ناک میں دم کردیا۔

اس برس بارسلونا نے شان دار کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ نہ صرف اسپین کے لیگ مقابلے میں فتح کے جھنڈے گاڑے بلکہ یورپ کی سطح پر بھی اپنی حکمرانی ثابت کردی۔ میری کارکردگی بھی متاثر کن رہی، البتہ مجھے اس وقت شدید صدمے سے دوچار ہونا پڑا، جب میں چیلسی کے خلاف ہونے والے میچ میں زخمی ہوگیا۔

آنے والے دنوں میں یہ انجری میرے لیے ڈراؤنا خواب بن گئی، کیونکہ اسی کو بنیاد بنا کر مجھے ورلڈ کپ کے لیے منتخب ہونے والی ارجنٹینین ٹیم سے ڈراپ کردیا گیا!

☆☆☆

ورلڈ کپ میں اپنے ملک کی نمائندگی کرنا ہر کھلاڑی کا خواب ہوتا ہے۔ میرا بھی خواب تھا کہ اس عظیم مقابلے میں اپنی ٹیم کے لیے پرفارم کروں لیکن انجری نے مجھے لگ بھگ دو ماہ فٹبال کے میدانوں سے دُور رکھا جس کی وجہ سے سلیکٹرز نے بہتر جانا کہ مجھے اسکوڈ سے ڈراپ کردیں۔

یاسیت کے اُن دنوں میں میرے خیر خواہوں نے بھرپور ساتھ دیا۔ میری حوصلہ افزائی کی۔ سابق کھلاڑیوں نے بھی میری حمایت میں بیانات دیے جن میں سب سے

نمایاں میراڈونا تھا جس کے مسلسل اصرار نے میرے حق میں رائے عامہ ہموار کی۔

بالآخر ورلڈ کپ سے چند روز قبل عوام کے دباؤ پر مجھے اسکوڈ میں شامل کرلیا گیا۔

ٹورنامنٹ سے پہلے آزمائشی طور پر مجھے چند مقابلوں میں میدان میں اتارا گیا جہاں میری پھرتی نے ثابت کردیا کہ لیونل میسی مقابلے کے لیے تیار ہے۔

چند روز بعد میں جرمنی میں تھا جہاں گھمسان کا رن پڑنے والا تھا۔

ارجنٹینا نے اپنا پہلا میچ آئیوری کوسٹ کے خلاف کھیلا جہاں انتظامیہ نے مجھے میدان میں بھیجنے سے اجتناب برتا۔ اس میچ میں ارجنٹینا نے کامیابی حاصل کی۔ دوسرے روز کے اخبارات میں ٹیم کی کارکردگی کو سراہا گیا مگر یہ سوال بھی اٹھایا گیا کہ باصلاحیت لیونل میسی کو میدان میں کیوں نہیں اتارا گیا؟

میراڈونا بھی میچ دیکھنے جرمنی آئے ہوئے تھے، اُنہوں نے بھی انتظامیہ کو مجھے آزمانے کا مشورہ دیا۔

اگلا میچ سربیا کے خلاف تھا جس کے 74 ویں منٹ میں مجھے میدان میں بھیجا گیا۔

آگے جو کچھ ہوا وہ تاریخ کا حصہ ہے۔ میدان میں قدم رکھنے کے فقط ایک منٹ بعد میرے خوبصورت پاس پر کورسپو نے گول داغ دیا۔

وہ لمحہ حیران کن تھا۔ گول اسکور کرنے والے کھلاڑی سے زیادہ داد مجھے دی جارہی تھی۔

اس میچ میں ہم نے چھ۔صفر سے فتح حاصل کی۔ میچ کا آخری گول میں نے ہی اسکور کیا۔

یوں میں نے نہ صرف ورلڈ کپ میں ارجنٹینا کی نمائندگی کرنے والے کم عمر ترین کھلاڑی کا اعزاز اپنے نام کرلیا بلکہ اس ورلڈ کپ میں گول داغنے والا سب سے نوجوان کھلاڑی بھی ٹھہرا۔

اگلا میچ ہالینڈ کے خلاف تھا۔ گو کہ مقابلہ برابر رہا لیکن مجھے اپنی پھرتی کا بھرپور مظاہرہ کرنے کا موقع ملا۔

اگلے راؤنڈ میں ہمارا مقابلہ میکسکو سے ہوا۔ اس میچ میں مجھے 84 ویں منٹ میں میدان میں اتارا گیا جب مقابلہ ایک۔ایک سے برابر تھا۔

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ مخالفین مجھ سے اتنے خائف ہیں۔ میدان میں اترتے ہی میکسکو کے دفاعی کھلاڑیوں نے

بدلاؤ

☆ باپ نے ہچکچاتے ہوئے بیٹی سے کہا۔ ''تمہارا منگیتر بہت رات گئے تک بیٹھا رہتا ہے۔ اچھا نہیں لگتا۔ کیا تمہاری ماں نے اس سلسلے میں تم سے بات کی ہے؟''

''جی پاپا وہ کہہ رہی تھیں زمانہ بدل گیا یہ مرد نہیں بدلے۔''

☆☆☆

☆ چھوٹے سے بچے علی کو ہوم ورک میں ایک ڈراما لکھنے کو ملا تو اس نے لکھا۔ پہلا سین، باغ میں بادشاہ سلامت اور ملکہ عالیہ ٹہل رہے ہیں۔ ملازم حاضر ہوتا ہے۔ آداب بجالاتا ہے اور کہتا ہے۔

''مبارک ہو بادشاہ سلامت اور ملکہ عالیہ آپ کے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے۔''

مرسلہ: ہاجرہ خان، کراچی

مجھے گھیر لیا۔ جونہی ... گیند میرے قدموں میں آتی، وہ مجھے گرانے کی کوشش شروع کردیتے، تاہم ان کی کوشش ناکام گئی۔ میرے بائیں پاؤں کی ٹھوکر نے گیند نیٹ میں پہنچادی اور اسٹیڈیم میں موجود ارجنٹینا کے مداح جھوم اٹھے... مگر اُن کی خوشی اگلے ہی لمحے دم توڑ گئی۔ گول کو ''آف سائیڈ'' قرار دے کر رد کردیا گیا تھا۔

بہرحال، اضافی وقت میں ہم نے میکسکو کو شکست دے دی اور کوارٹر فائنل کے لیے کوالیفائی کرلیا۔

نہ جانے کیوں، جرمنی کے خلاف کھیلے جانے والے اگلے مقابلے میں کوچ نے مجھے میدان میں اتارنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ وہ میچ ہم پینالٹی شوٹ آؤٹ پر ہار گئے اور ورلڈ کپ گھر لانے کا سپنا چُور چُور ہوگیا۔

☆☆☆

محبت ایک انوکھا تجربہ ہے، جو آپ کو دنیا و مافیہا سے بیگانہ کردیتا ہے، لیکن... اپنی تمام تر قوت کے باوجود... یہ ایک عارضی جذبہ ہے، جو ہمیشہ قائم نہیں رہتا۔ کم از کم میرا تو یہی خیال ہے۔

پہلی بار جس لڑکی سے مجھے محبت ہوئی، اس کا نام میکارینا لیموز تھا اور اُس کا تعلق میرے آبائی شہر روزیریو سے تھا۔

وہ بلا کی حسین تھی۔ ہماری پہلی ملاقات 2006 کے ورلڈ کپ سے قبل ہوئی، جب میں انجری کے باعث

WWW.PAKSOCIETY.COM

مشکلات میں گھرا ہوا تھا۔

جلد ہی ہماری دوستی ہوگئی۔ آنے والے برسوں میں ہماری کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ ٹیلی فون اور انٹرنیٹ پر بھی رابطہ رہا۔

اس زمانے میں مجھے یقین تھا کہ میکارینا ہی میرا مستقبل ہے، لیکن جیسا میں نے کہا... محبت ایک عارضی جذبہ ہے۔

میں ایک لاابالی نوجوان تھا، جب کہ وہ بہت ہی تہذیب یافتہ اور باشعور لڑکی تھی، کتابوں سے محبت کرنے والی، شعر کہنے والی۔ شاید اسی وجہ سے میں اُس کی جانب متوجہ ہوا تھا۔ اور شاید اسی وجہ سے... ہماری راہیں جدا ہوگئیں۔ قصوروار کا تعین کرنے کی ضرورت نہیں، شاید ہم دونوں ایک دوسرے سے مختلف تھے۔

اس وقت تو مجھے لگتا تھا کہ زندگی ختم ہوگئی ہے لیکن جلد میں اُس صدمے سے ابھر آیا۔ واقعی، وقت بڑا مرہم ہے۔

چند ماہ بعد میں ایک ارجنٹینین ماڈل روکینا کی زلف کا اسیر ہوگیا جس کی آنکھوں میں جادو تھا۔

جلد ہی ہم شہ سرخیوں میں تھے۔ میری اور اس کی تصاویر اخبارات میں شائع ہورہی تھیں۔ ہماری بابت مضامین لکھے جارہے تھے۔

ان خبروں نے بین الاقوامی توجہ حاصل کی لیکن محبت کے مانند خبروں کی زندگی بھی تو محدود ہوتی ہے۔

ہماری پہلی ملاقات کے فقط چند ماہ بعد ہم الگ ہوگئے۔

☆☆☆

پورے ملک کی نظریں مجھ پر مرکوز تھیں، اور میری نظریں 2007 میں ہونے والے کوپا امریکا کپ پر، جس کے لیے میں جم کر ٹریننگ کررہا تھا۔

اس ٹورنامنٹ میں ہم نے اپنا پہلا میچ امریکا کے خلاف کھیلا، جس میں ہم نے چار ایک سے فتح اپنے نام کی۔ تین گول اس خاکسار کی معاونت سے ہوئے۔

اگلا میچ کولمبیا کے خلاف تھا۔ مخالف کھلاڑیوں نے پھر وہی غلطی دہرائی۔ انہوں نے لیونل میسی کو محدود کرنے کے لیے اپنی صلاحیتوں کے بجائے اپنی طاقت کا اظہار کیا۔ مجھے دھکے دیے، گرانے کی کوشش کی۔ نتیجتاً ہمیں پینالٹی ایوارڈ کردی گئی، جس پر کورسپو نے گول اسکور کیا۔ اگلے گول کا سبب بھی میں ہی تھا۔ اس بار بھی مجھے گرایا گیا۔ ہمیں فری کک ملی، جس پر ریکو لمے نے گیند نیٹ میں پہنچادی۔

چونکہ ہم اگلے راؤنڈ کے لیے کوالیفائی کر گئے تھے، اس لیے میں پیرو کوئے کے خلاف 64ویں منٹ تک بینچ ہی پر بیٹھا رہا۔ البتہ میدان میں اترنے کے بعد جو مختصر وقت میسر آیا، اس سے میں نے بھرپور انصاف کیا۔

میچ کا اکلوتا گول میرے ہی پاس پر ہوا۔

کوارٹر فائنل میں ہم نے پیرو کو بہ آسانی چار گول سے شکست دے دی، جن میں ایک گول میں نے اسکور کیا۔ یہی فائنل میں ہم نے میکسیکو کے سپنوں کا محل توڑ ڈالا۔ اُس مقابلے میں میکسیکو کے تجربہ کار گول کیپر اوسولدو شیچیر کے سر کے اوپر سے میں نے اِس مہارت سے گیند نیٹ میں پہنچائی کہ وہ ششدر رہ گیا۔

میچ کے بعد اس نے میرا کاندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا تھا۔ ''تم حیران کن ہو!''

یہ اُس کا بڑا پن تھا۔

فائنل میں ہمارا مقابلہ برازیل سے تھا۔ اس میچ میں ہم اپنا جادو جگانے میں ناکام رہے۔ شکست ارجنٹینا کا مقدر بنی، جس نے مجھے کرب سے بھر دیا... ٹورنامنٹ کے بہترین نوجوان کھلاڑی کا اعزاز بھی اس دکھ کو کم نہیں کرسکا۔

☆☆☆

''اب تمہیں فلاحی کاموں کی جانب توجہ دینی چاہیے!''

جونہی یہ الفاظ میرے کانوں سے ٹکرائے، میرے چہرے پر حیرت سمٹ آئی۔ میں نے اپنی ماں کی جانب دیکھا جس کی آنکھوں سے شفقت جھلک رہی تھی۔

''اوہ... میں نے کبھی اس بارے میں سوچا نہیں!'' میرے لہجے میں تذبذب تھا۔

''تو اب سوچ لو۔'' اُس کا لہجہ نرم تھا۔ ''تم خوش قسمت رہے لیونل۔ خدا نے تمہیں دولت اور شہرت سے نوازا۔ بہتر ہے، اب اُن کے لیے کچھ کیا جائے، جو چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے محروم ہیں!'' اس نے میرا گال تھپتھپایا۔

میں نے اِس بارے میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا۔ جوں جوں میں گہرائی میں اترتا گیا، میری سوچ اپنی ماں کی فکر سے ہم آہنگ ہوتی گئی۔

''ایک زمانے میں مجھے بھی مالی مدد کی ضرورت پیش آئی تھی۔'' میں نے خود سے کہا۔ ''اگر اُس وقت کوئی میرا سرپرست نہیں بنتا، تو میں آج لیونل میسی نہیں ہوتا۔ اب مجھے وہ قرض چکانا ہوگا۔''

2007 وہ سال تھا، جب میں نے ''لیونل میسی فاؤنڈیشن'' کی بنیاد رکھی، جس کے تحت ہم نے سہولیات سے محروم بچوں کے لیے تعلیمی و طبی پروگرام شروع کیے۔ ابتدا میں تو مجھے اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس کام کو کیسے سرانجام دینا ہے، لیکن میرے اہلِ خانہ نے اس ضمن میں بہت تعاون کیا۔ خوش قسمتی سے لوگ بھی اچھے ملے۔ یوں دھیرے دھیرے یہ کام پھیلنے لگا۔

میں نے چندہ اکٹھے کرنے کی مہم شروع کی تو ہسپانوی فلاحی تنظیموں نے بھرپور ساتھ دیا۔ مداحوں نے بھی بھرپور تعاون کیا۔

میں اکثر اپنی فاؤنڈیشن کے تحت قائم ہونے والے طبی مراکز اور اسکولوں کے دورے کرتا ہوں، جہاں مجھے مستقبل کے کئی میسی نظر آتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ فلاحی میدان میں قدم رکھنے کے بعد جو اطمینان مجھے نصیب ہوا، اُسے بیان کرنے کے لیے شاید ہزاروں الفاظ بھی کم پڑجائیں۔

☆☆☆

پروفیشنل فٹبالر کی حیثیت سے 08-2007 کے سیزن میں میں نے کئی کامیابیاں حاصل کیں۔ بارسلونا کی طرف سے اپنا 100واں میچ کھیلا، مختلف ایوارڈز کے لیے نامزد ہوا، اسپین کے مؤقر روزنامے کی جانب سے ہونے والے ایک سروے کے نتیجے میں ''دنیا کا بہترین کھلاڑی'' قرار پایا۔ البتہ مجھے سب سے زیادہ خوشی تب ہوئی، جب عہد کے بہترین کھلاڑیوں میں شمار ہونے والے اطالوی فٹبالر فرانسسکو ٹوٹی نے مجھے مستقبل کا معمار کہہ کر پکارا۔

گو کہ اُس برس میں ''فیفا ورلڈ پلیئر آف دی ایئر ایوارڈ'' اور ''IFFHS ورلڈز بیسٹ پلے میکر'' ایوارڈ اپنے نام نہیں کرسکا، لیکن اِن ایوارڈز کے فاتحین کو مجھ سے سخت مقابلہ کرنا پڑا۔ مجھے یاد ہے، مذکور ایوارڈز اپنے نام کرنے والے معروف برازیلی کھلاڑی کاکا نے کہا تھا۔ ''لیونل میسی نے مجھے بہت ٹف ٹائم دیا۔ مجھے خطرہ تھا کہ کہیں وہ مجھے ہرا نہ دے۔ وہ واقعی باصلاحیت ہے!''

اُس برس میرے چھ گولز کی بدولت چیمپئنز لیگ میں بارسلونا نے سیمی فائنل تک رسائی حاصل کی۔ مجموعی طور پر اس لیگ میں میں نے 13 کلیدی مقابلوں میں 16 گول داغے۔

☆☆☆

روزِ اول ہی سے مجھے دس نمبر کی جرسی سے عشق تھا!

اگر آپ ارجنٹینین ہیں تو آپ کو اس پر حیرت نہیں ہوگی، سچ تو یہ ہے کہ ارجنٹینا کا ہر کھلاڑی دس نمبر کی جرسی پہننے کا خواب دیکھتا ہے۔ سبب فقط ایک ہے... ہمارا عظیم ہیرو

مسئلہ

☆لڑکی کا باپ۔ ''میں نہیں چاہتا کہ میری بیٹی پوری زندگی ایک گدھے کے ساتھ گزار دے۔''

لڑکا۔ ''بس انکل اسی لیے میں اسے یہاں سے لے جانے آیا ہوں۔''

☆☆☆

☆بحری جہاز پوری رفتار سے چلا جارہا تھا۔ اچانک ایک نئے ملاح نے شور مچادیا کہ ''ایک آدمی سمندر میں گر گیا ہے۔'' چند منٹ میں اطلاع کیپٹن تک پہنچی اس نے جہاز کا رخ موڑنے کا حکم دیا۔ جہاز کئی میل پیچھے آگیا۔ تو ملاح ہکلاتے ہوئے بولا۔ ''سر! دراصل کوئی آدمی سمندر میں نہیں گرا۔''

کیپٹن ملاح پر خوب گرجا برسا۔ جہاز کا رخ ایک بار پھر موڑا گیا۔ جہاز تیز رفتاری سے منزل کی جانب روانہ ہوگیا تو ملاح نے گویا سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔

''سر، میں یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ سمندر میں آدمی نہیں ایک عورت گری ہے۔''

نیلوفضل، کراچی

میرا ڈونا، جو دس نمبر جرسی پہنا کرتا تھا۔

ارجنٹینا کی ٹیم میں میرا شمار جونیئرز میں ہوتا تھا، وہاں دس نمبر جرسی میری پہنچ سے ابھی دُور تھی، البتہ بارسلونا کی سطح پر اُس وقت میری یہ خواہش پوری ہوگئی، جب 2008 کے اوائل میں برازیلی کھلاڑی رونالڈینیو کلب سے الگ ہوگیا اور دس نمبر کی جرسی پر لکھ دیا گیا: ''لیونل میسی!''

شاید جرسی ملنے کی خوشی تھی یا کچھ اور... میں نے اُس سیزن میں اپنی پہلی ہیٹ ٹرک اسکور کی، اہم میچز میں مخالف ٹیم کے نیٹ میں گیند پہنچانے کا سلسلہ جاری رکھا اور چیمپئنز لیگ میں مجموعی طور پر آٹھ خوبصورت گول اسکور کیے۔

اسپین کی سطح پر ہونے والے کلب ٹورنامنٹس میں بارسلونا ناقابلِ شکست ٹیم کی شکل اختیار کرگئی تھی جس کے لیے سب سے زیادہ مجھے سراہا جاتا۔

سیزن کے اختتام تک میں 38 گول داغ چکا تھا۔ 18 گول میری معاونت سے ہوئے۔ کلب کی سطح پر کئی اعزازات میرے نام ہوئے۔ البتہ اِس بار بھی ''فیفا ورلڈ پلیئر آف دی

WWW.PAKSOCIETY.COM

ایئر ایوارڈ" میری پہنچ سے دُور رہا جس سے مجھے گہرا صدمہ پہنچا۔ البتہ ارجنٹینا اور اسپین کے مؤقر اخبارات میں میرے حق میں شائع ہونے والے مضامین اور عظیم کھلاڑیوں کے بیانات سے یہ غم بڑی حد تک گھٹ گیا۔

2008 میں اُس وقت ایک مشکل صورتِ حال پیدا ہوگئی، جب ارجنٹینا کی ٹیم اولمپکس میں شرکت کے لیے روانہ ہونے والی تھی۔

دراصل اسپین میں لیگ مقابلے جاری تھے جن میں میرا کلب ہر صورت میری صلاحیتوں سے استفادہ کرنا چاہتا تھا۔

انتظامیہ اور میرے درمیان مذاکرات کے کئی راؤنڈز ہوئے۔ بالآخر انہیں میرے جذبۂ حب الوطنی کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑے۔

اس ضمن میں ہمارے نئے کوچ پیپ گرویندلا کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ اس شخص نے سنجیدگی سے میرا مسئلہ سنا اور اسے حل کرنے میں بھرپور ساتھ دیا۔

اولمپکس میں ہم نے پہلا میچ آئیوری کوسٹ کے خلاف کھیلا، جہاں میرے گول نے ٹیم کو فتح دلائی۔ اگلا میچ ہالینڈ کے خلاف تھا جہاں ہم نے دو۔ایک سے فتح اپنے نام کی۔

مجھے یاد ہے، اگلے دن کے اخبارات میں سرخی لگی تھی۔

"میسی کھیل پر چھایا رہا!"

دراصل میں نے اس مقابلے میں ہالینڈ کے گول پوسٹ پر تابڑ توڑ حملے کیے، پہلی بار تو گیند میری ہی کوشش سے نیٹ میں پہنچی، اگلی بار یہ میرے پاس سے ممکن ہوا۔

اگلا میچ ہمارے پرانے حریف برازیل سے تھا جس نے کوپا امریکا کپ کے فائنل میں ہمیں شکست دی تھی جس کا دکھ میں اب تک نہیں بھولا تھا۔

میدان میں اترنے سے قبل میں نے قسم کھائی کہ میچ کے اختتام پر ارجنٹینا جشن منائے گا...اور ایسا ہی ہوا۔ ہم نے برازیل کو تین، صفر سے شکست دے دی اور یوں ہم فائنل میں پہنچ گئے جہاں ہمارا مقابلہ نائیجیریا سے تھا۔

اُس میچ میں فقط ایک بار گیند نیٹ میں پہنچی۔ خوش قسمتی سے یہ کارنامہ ہمارے فارورڈ نے انجام دیا۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اُس نے یہ کارنامہ میرے ہی پاس پر انجام دیا تھا۔

جب ہم گھر لوٹے، گولڈ میڈل ہمارے گلے میں جھول رہا تھا!!

☆☆☆

ورلڈ کپ 2010...ایک خواب جو میری آنکھوں میں بس گیا، ایک خیال جو میرے ذہن سے چپک گیا۔ اور اس کے کئی اسباب تھے۔ ملک کی نمائندگی کرنے کا اعزاز، دس نمبر کی جرسی پہننے کی مسرت اور سب سے بڑھ کر اپنے ہیرو کی سرپرستی میں کچھ نیا سیکھنے کی آرزو!

اس برس کروڑوں فٹبال شائقین کی نظریں ارجنٹینا پر مرکوز تھیں۔ نہیں، اِس بار وجہ میں نہیں تھا... اصل وجہ تو ڈیگو میراڈونا تھا جسے ٹیم منیجر مقرر کر دیا گیا تھا۔

جس روز مجھے اس کی تعیناتی کی خبر ملی، میں مسرت سے بھر گیا۔ فوراً اسے فون کیا۔ ہماری طویل گفتگو ہوئی۔ ہم دونوں کی ایک ہی خواہش تھی، ورلڈ کپ ٹرافی!

تربیتی کیمپ میں مجھ سمیت ہر کھلاڑی انوکھے تجربے سے گزرا۔ جب میراڈونا جیسا کوچ میسر ہو تو ہر دن کچھ نیا رونما ہوتا ہے۔

مجھ پر تو وہ بہت مہربان تھا، ایک باپ کی طرح۔ اس کے مشوروں سے میرے کھیل میں خاصا نکھار آیا۔

ہم نے ٹورنامنٹ کا اچھا آغاز کیا۔ پہلے گروپ میچ میں ہم نے نائیجیریا کو شکست دی۔ اگلا میچ کوریا کے خلاف تھا جس میں ہم نے چار گول اسکور کیے۔

میں نے اُس مقابلے میں فارورڈ کا کردار نبھانے کے بجائے مڈفلیڈ میں اپنے جوہر دکھائے جس کی وجہ میراڈونا کی نصیحت تھی۔

"دیکھو میسی، تم اِس عہد کے سب سے باصلاحیت کھلاڑی ہو، یہ سب جانتے ہیں لیکن بڑا کھلاڑی وہ ہوتا ہے جو نہ صرف خود کھیلے بلکہ اپنے ساتھیوں کی بھی مدد کرے۔ اپنی خوبیوں سے اُن کی خامیاں پُر کر دے!"

"جیسے آپ کیا کرتے تھے!" میں مسکرایا۔

"کچھ حد تک!" اس منکسر المزاج شخص نے کاندھے اچکائے۔ "تو بتاؤ میسی، کیا تم یہ کرنے کے لیے تیار ہو؟"

"جو حکم باس!" میں نے سلوٹ مارتے ہوئے کہا۔

تو کوریا کے خلاف لیونل میسی اپنی ٹیم کے لیے سازگار حالات پیدا کرتا رہا جس کا نتیجہ فتح کی صورت سامنے آیا۔

اگلے میچ میں ایک انوکھا واقعہ ہوا۔ کپتان نے آرام کا فیصلہ کر لیا اور کپتانی سونپ دی گئی ایک نوجوان کو... یعنی مجھے!

اُس میچ میں ہم نے یونان کو شکست دی۔ اس روز بھی میں گول اسکور کرنے کے بجائے گول کرنے کے لیے معاون حالات پیدا کرنے میں جتا رہا۔

اگلے راؤنڈ میں ہمارا مقابلہ میکسیکو سے تھا جسے ہم نے تین کے مقابلے میں ایک گول سے شکست دے دی۔

فتح کے بعد میراڈونا نے میرا کاندھا تھپتھپایا، دو گول میرے ہی پاس کے نتیجے میں ہوئے تھے۔

کوارٹر فائنل میں ہمیں جرمنی سے ٹکرانا تھا۔ میچ سے ایک رات قبل ہم بہت پُرجوش تھے لیکن اگلی صبح جب ہم بیدار ہوئے، بری خبر ہماری منتظر تھی۔

گزشتہ رات ایک طوفان ارجنٹینا کی ساحلی پٹی سے ٹکرایا تھا جس نے شدید تباہی پھیلائی تھی۔ درجنوں ہلاکتیں ہوئی تھیں اور سیکڑوں گھرانے بے گھر ہو گئے تھے۔

ہماری ٹیم میں موجود چند کھلاڑیوں کے آبائی قصبے بھی طوفان کی لپیٹ میں آ گئے تھے جس کی وجہ سے وہ اندیشوں کا شکار نظر آتے تھے۔ رہی سہی کسر ہمارے مرکزی فارورڈ کی بگڑتی طبیعت نے پوری کر دی جس کا جسم بخار سے تپ رہا تھا۔

بظاہر معمولی معلوم ہونے والے اِن مسائل کے اثرات کا اندازہ مجھے میچ کے اختتام پر ہوا۔

ہم چار۔صفر سے میچ ہار گئے اور ورلڈ کپ اٹھانے کا خواب کرچی کرچی ہو گیا۔

میری آنکھوں میں نمی تھی اور سینے میں دُکھ۔ دیگر کھلاڑیوں کی حالت بھی مختلف نہیں تھی۔ البتہ میراڈونا ایک عظیم کھلاڑی کے مانند اپنے جذبات ظاہر کرنے کے بجائے ہماری دل جوئی کرنے میں لگا رہا۔

جب وہ میرے پاس آیا، جذبات کی شدت سے میں اس سے لپٹ گیا۔

"مجھے معاف کر دیں، میں آپ کا سپنا سچ نہیں کر سکا۔" میری آواز لرز رہی تھی۔

"یہ تم سے کس نے کہا؟" میراڈونا نے میرے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "میسی، جو خواب میں نے دیکھا ہے، تم ہی اس کی تعبیر ہو۔"

"مگر ہم ورلڈ کپ نہیں... جیت سکے۔"

"ہم یہ ورلڈ کپ نہیں جیت سکے۔" میراڈونا کی آواز میں بلا کا اطمینان تھا۔ "2014 کا ورلڈ کپ ہمارا ہوگا!"

ہم دُکھی دل کے ساتھ گھر لوٹے، لیکن ہمارے ملک کے عوام نے یوں استقبال کیا جیسے ہم جیت کر واپس آئے ہوں۔ یہ ہمارا کرب کم کرنے کی ایک کوشش تھی۔

ہمیں سربراہِ مملکت نے صدارتی محل میں مدعو کیا لیکن

"پاسنگ مارکس"

یہ کارگل کے دنوں کا ذکر ہے۔ بنگلہ دیش کی وزیراعظم حسینہ واجد، پاکستان اور بھارت کے درمیان بڑھتی ہوئی تلخی ختم کرانے مصالحتی مشن پر پاکستان تشریف لائیں۔ ایوانِ صدر میں ان کی ملاقات اس وقت کے صدر جناب محمد رفیق تارڑ سے ہوئی۔ میں بھی اپنی منصبی ذمے داری کے حوالے سے اس ملاقات میں موجود تھا۔ حسینہ واجد نے ماحول کو خوشگوار بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا کہ انہیں اردو میں بات کرنے میں بڑا لطف آتا ہے۔ گفتگو شروع ہوئی۔ محترمہ نے بھارت سے آئے کسی ایلچی کی طرح طرزِ کلام اور اسلوب استدلال اختیار کیا۔ موصوفہ کے دلائل کا مرکزی نکتہ یہ تھا کہ کشمیر کے بنیادی مسئلے کو پسِ پشت ڈال کر پاکستان کو چاہیے کہ بھارت کے ساتھ تجارتی، ثقافتی اور سماجی تعلقات میں گرمجوشی لائے۔ چھوٹے چھوٹے مسائل حل ہو گئے تو کشمیر کو بھی دیکھ لیا جائے گا۔ اپنی بات میں تمثیل کا رنگ بھرتے ہوئے انہوں نے گوش برآواز صدر سے کہا "دیکھیے نا صدر صاحب! آپ بھی جانتے ہیں اور ہمیں بھی استاد ہمیشہ یہی کہا کرتے تھے کہ امتحانی پرچے میں سب سے زیادہ آسان سوال پہلے حل کرنا چاہیے اور مشکل سوالات کو آخر کے لیے چھوڑ دینا چاہیے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟" اپنی دانست میں ایک انتہائی کارگر تیر چلانے کے بعد ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے انہوں نے طرح دار نظروں سے صدر تارڑ اور اپنے وفد کے ارکان کی طرف دیکھا۔ جہاندیدہ صدر کے اندر چھپے وکیل نے انگڑائی لی۔ انہوں نے بڑی متانت کے ساتھ جوابی سوال داغ دیا۔ "محترمہ! اگر تمام آسان سوالوں کے پورے نمبر ملا کر بھی "پاسنگ مارکس" نہ بنیں اور فیل ہونا یقینی ہو تو آپ کیا کریں گی؟"

شیخ مجیب الرحمن کی بیٹی کے پاس کھسیانی ہنسی ہنسنے کے سوا کوئی جواب نہ تھا۔ ملاقات کا باقی سارا وقت وہ اپنی پسپائی کی خفت مٹاتی اور کھمبا نوچتی رہیں۔

معروف کالم نگار عرفان صدیقی کی کتاب "نقشِ خیال" سے

مرسلہ: قیصر شاہ۔ ضلع کوہاٹ

WWW.PAKSOCIETY.COM

میراڈونا نے یہ کہتے ہوئے انکار کردیا:
''شکریہ جناب، مگر ہم خود کو اِس قابل نہیں سمجھتے!''

☆☆☆

انٹرنیشنل لیول پر بدقسمتی نے 2011 میں بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ گوکہ کوپا امریکا کپ کے دو مقابلوں میں مجھے مین آف دی میچ کا ایوارڈ دیا گیا لیکن مین کوئی گول اسکور نہیں کرسکا۔ اس پر مستزاد، کوارٹر فائنل میں یوروگوئے نے ہمیں شکست دے دی۔ ہاں، کلب لیول پر میں نے بے شمار کامیابیاں سمیٹیں۔

میری کارکردگی کی بدولت بارسلونا نے تین بار چیمپئنز لیگ جیتی۔ دو بار سُپر کپ جیسا اہم ٹورنامنٹ اپنے نام کیا اور دو ہی بار کلب ورلڈ کپ کا فاتح ٹھہرا۔ آج میں بارسلونا کی جانب سے سب سے زیادہ گول کرنے والا کھلاڑی ہوں۔

2011-12 کے کلب سیزن میں، میں نے 73 گول اسکور کر کے ایک ورلڈ ریکارڈ قائم کیا۔

جب میں پہلی بار فیفا کی جانب سے سال کے بہترین کھلاڑی کے لیے نامزد ہوا تھا، اُس وقت میری عمر فقط 21 سال تھی اور میں اُس اعزاز کے لیے زیرِغور آنے والا کم عمر ترین کھلاڑی تھا۔

دو برس تک میں اس ٹرافی سے دور رہا لیکن 2009 میں فیفا کو مجھے منتخب کرنا ہی پڑا۔ اس برس یورپ کے بہترین کھلاڑی کا ایوارڈ بھی میرے حصے میں آیا۔ مجموعی طور پر میں تین بار اُس ایوارڈ کا حق دار ٹھہرا۔

میں نے 2010 اور 2011 میں منعقد ہونے والے UEFA کپ کے بہترین کھلاڑی کا ایوارڈ اپنے نام کیا۔

2012 میں UEFA چیمپئنز لیگ میں، میں نے ایک میچ میں پانچ گول داغ کر ایک انوکھا ریکارڈ بنایا۔ اسی برس میں نے چیمپئنز لیگ میں 14 گول کرنے کا حوزے الٹافن کا ریکارڈ برابر کیا۔

2010 میں ایک مؤقر روزنامہ نے مجھے دنیا کا امیر ترین فٹبالر قرار دیا۔ میں نے اس دوڑ میں ڈیوڈ بیکھم اور پرتگالی کھلاڑی رونالڈو کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ اس وقت میرے اثاثوں کی کُل مالیت 110 ملین ڈالر ہے... میں واقعی امیر ہوں۔

آج میری نظریں 2014 کے ورلڈ کپ پر مرکوز ہیں جو ہمارے روایتی حریف برازیل کی پُراسرار زمین پر کھیلا جائے گا۔

یہ ورلڈ کپ میرے لیے چیلنج ہے۔ کپتانی کی ذمے داری میرے کاندھوں پر ہے اور میں ہر صورت سنہری ٹرافی کے ساتھ گھر لوٹنا چاہتا ہوں، تاکہ خود کو حقیقی معنوں میں میراڈونا کا جانشین ثابت کرسکوں جس کی محنت نے 86ء کے ورلڈ کپ میں ارجنٹینا کو فتح سے ہم کنار کیا تھا۔

2014 ورلڈ کپ کے کوالیفائنگ راؤنڈ میں ہماری کارکردگی خاصی اچھی رہی۔ تفصیلات میں جانا تو لازمی نہیں، البتہ ایک میچ کا ذکر ضرور کرنا چاہوں گا، جو ہم نے 2 جون 2012 کو ایکوڈور کے خلاف کھیلا جہاں ہم نے چار، صفر سے فتح حاصل کی۔

میں نے اُسی میچ میں اپنے انٹرنیشنل کیریئر کا 23 واں گول اسکور کیا۔

گول اسکور کرنے کے بعد میں نے گیند اٹھا کر اپنی جرسی میں ٹھونس لی تھی اور میدان کا ایک چکر لگایا تھا۔

کیا آپ کو میرا انداز عجیب لگا؟ دراصل اِس طرح جشن منانے کا سبب اینڈونیلا روکوزو تھی، میری گرل فرینڈ۔

اس خوبرو مگر سادگی پسند لڑکی سے میری ملاقات 2008 کے اواخر میں ہوئی تھی۔ اِس بار محبت سے پہلے دوستی ہوئی۔ یوں ہم دونوں عشق کے عطا کردہ اندھے پن سے محفوظ رہے۔ خود کو اور سامنے والے کو سمجھنے کا موقع ملا، جس کے بعد میں سنجیدگی سے یہ سوچنے لگا۔ ''اِس ارجنٹینین لڑکی کے ساتھ زندگی گزاری جاسکتی ہے!''

بالآخر میں نے ایک ٹی وی چینل کو دیے جانے والے انٹرویو میں اعلان کردیا۔ ''ہاں، میں لیونل میسی ایک دوشیزہ سے محبت کرنے لگا ہوں۔''

تو ہم ذکر کررہے تھے جشن منانے کے میرے عجیب ڈھنگ کا۔

دراصل میچ کے آغاز سے قبل اینڈونیلا نے ٹیلی فون پر مجھے ایک خوش خبری سنائی تھی۔ ''لیونل، تم باپ بننے والے ہو!''

وہ امید سے تھی... اور جشن منانے کا میرا انداز اُس بے پناہ محبت اور مسرت کا اظہار تھا جو میں اینڈونیلا اور اپنے آنے والے بچے کے لیے محسوس کررہا تھا۔

ممکن ہے، جس وقت آپ یہ سطریں پڑھ رہے ہوں، جادوگر کہلانے والا لیونل میسی روزیریو کے کسی اسٹور میں کھڑا، اپنے بچے کے لیے شاپنگ کررہا ہو!

ناقابلِ یقین

امیمہ سلیم

پوری دنیا میں ایسے واقعات تواتر سے پیش آرہے ہیں جن میں انسان کے جسم سے روح نے رشتہ توڑ لیا۔ لوگوں نے اسے مردہ سمجھ لیا اور اس کی آخری رسومات کی تیاری ہونے لگی۔ ابھی رسومات آخری مراحل میں تھیں کہ وہ اٹھ بیٹھا۔ دل کی دھڑکن پھر سے معمول پر آگئی۔ تنفس کی رفتار بحال ہوگئی۔ ایسے جتنے بھی لوگ ہیں سب ایک جیسی کہانیاں سناتے ہیں خواہ وہ چین کے کسی شہر کے ہوں یا افریقا، امریکا کے۔ سب کی داستان میں یکسانیت ہے۔ اس بچے کی روداد بھی بالکل ایسی ہی ہے۔ آپ بھی پڑھ کر چونک پڑیں گے۔

مرنے کے بعد زندہ ہوجانے والے بچے کا حیرت انگیز واقعہ

مسٹر اور مسز نینسی بیپرڈ (Beepro) کی شادی کو کئی سال گزر چکے تھے۔ یہ امریکی جوڑا ریاست ڈلاس میں خوش و خرم زندگی گزار رہا تھا لیکن اللہ کا دیا سب کچھ ہونے کے باوجود مشرق کی طرح مغرب میں بھی لوگوں کو اولادِ نرینہ کی شدید خواہش ہوتی ہے۔ مسز بیپرڈ بھی اس محرومی سے دوچار تھی۔ وہ عورت تھی اور اکثر آنسو بہا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرلیتی تھی لیکن مسٹر بیپرڈ مرد ہونے کی وجہ سے آنسو تو نہیں بہا سکتا تھا لیکن اس کے دل میں بھی ایک خلش تھی کہ کاش خدا

WWW.PAKSOCIETY.COM

اسے بھی ایک بیٹے سے نواز دیتا۔

ان دونوں میاں بیوی کی توجہ اور دلچسپی کا مرکز ان کی بیٹی سیسی تھی جو انتہائی خوب صورت اور ذہین تھی۔ وہ بے چاری تو یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ اس کے والدین غم کی کس آنچ میں سلگ رہے ہیں۔ وہ اپنی معصوم باتوں اور شرارتوں سے اجنبیوں کا دل بھی موہ لیتی تھی۔ اس کے والدین نے بھی بیٹے کی محرومی کو اپنا مقدر سمجھ کر قبول کرلیا تھا۔

وہ بیٹی کی ہر خواہش پوری کرتے تھے، اسے ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھتے تھے اور اس کی چھوٹی سے چھوٹی تکلیف پر بھی تڑپ اٹھتے تھے۔

ایک دن اچانک مسز بیپر و کی طبیعت خراب ہوگئی۔ صبح بستر سے اٹھنے کو دل ہی نہ چاہا۔ بیپر و نے کئی بار بیوی کو اٹھایا اور کہا۔ ”آج تمہیں آفس نہیں جانا؟ ابھی تک تم نے سیسی کو اسکول کے لیے تیار بھی نہیں کیا ہے۔ اس کی اسکول وین بھی آنے والی ہوگی۔

”بیپر و، میری طبیعت آج کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ میں نے اپنے دفتر بھی ٹیلی فون کردیا ہے کہ میں آج آفس نہ آسکوں گی۔ پلیز تم سیسی کو تیار کر کے اسکول بھیج دو۔“

”ڈارلنگ، طبیعت زیادہ خراب ہے تو میں ڈاکٹر کو بلاؤں؟“

”نہیں معمول کی کچھ تھکن ہے اور بخار سا محسوس ہو رہا ہے۔ میں نے بخار اور پین کلر ٹیبلٹس لے لی ہیں۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔“

بیپر و نے پہلے اپنی بیٹی سیسی کو تیار کیا، اسے ناشتا کرایا پھر وہ خود ناشتا کر رہا تھا کہ سیسی کی اسکول وین آگئی۔ بیپر و اسے وین میں سوار کرنے کے بعد خود بھی جانے کے لیے تیار ہوگیا اور جاتے جاتے بیوی سے پوچھا۔ ”ڈارلنگ! پریشانی کی تو کوئی بات نہیں ہے نا؟“

”نہیں ڈیئر!“ اس نے جواب دیا۔ ”میں اب پہلے سے بہتر محسوس کر رہی ہوں۔“

”دیکھو، اگر طبیعت زیادہ خراب ہو تو ڈاکٹر ڈینیل کو ٹیلی فون کرلینا اور مجھے بھی ادھر ہاں، مارتھا کو بلالینا۔ اس کی باتوں میں تمہارا دل بہل جائے گا۔“

مارتھا ان کی پڑوسن تھی۔ وہ خود کہیں ملازمت نہیں کرتی تھی۔ اس کا شوہر انشورنس کمپنی میں بہت اعلیٰ عہدے پر تھا۔ وہ دونوں اولاد سے محروم تھے۔

مارتھا کو بس دو ہی کام تھے، کھانا اور سونا۔ ہفتے میں وہ ایک دن سبزی وغیرہ کی خریداری کے لیے مارکیٹ چلی جاتی تھی۔

نینسی اکثر اس سے کہتی تھی کہ ”اپنی خوراک پر قابو پاؤ ورنہ یک دم غبارے کی طرح پھٹ جاؤ گی۔“

”ارے، آج کل تو میں ڈائٹنگ کر رہی ہوں۔“ مارتھا جواب دیتی۔ ”تمہیں محسوس نہیں ہوا کہ میرا وزن تقریباً ساڑھے تین کلوگرام کم ہوا ہے؟“

”لگتا تو نہیں۔“ نینسی کہتی۔ ”تم جس رفتار سے چاکلیٹ اور کینڈیز کھاتی ہو، اس میں وزن بھلا کم کیسے ہوسکتا ہے۔ میری ایک بات یاد رکھنا، مرد بھدی اور بے ڈول عورتوں کو پسند نہیں کرتے۔“

اس روز بھی وہ مارتھا کو ٹیلی فون کرنے ہی والی تھی کہ مارتھا خود ہی آگئی اور آتے ہی اس کی زبان قینچی کی طرح چلنے لگی۔

نینسی کی طبیعت خراب ہو رہی تھی اس لیے وہ مارتھا کی باتوں میں دلچسپی نہیں لے رہی تھی۔

اچانک نینسی نے کہا۔ ”مارتھا! میری طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب ہو رہی ہے، تم پلیز بیپر و کو ٹیلی فون کردو۔“

آدھے گھنٹے کے اندر اندر بیپر و گھر پہنچ گیا۔ وہ نینسی کو لے کر فوری طور پر اسپتال روانہ ہوگیا۔

وہاں اس کے چیک اپ کے بعد ڈاکٹر نے اسے بتایا۔ ”مسٹر بیپر و! پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ مسز بیپر و ماں بننے والی ہیں۔“

بیپر و نے یہ خوش خبری سنی تو خوشی سے جھوم اٹھا۔ نینسی بھی اپنی تکلیف بھول گئی۔

پھر تو گویا بیپر و نے نینسی کو ہتھیلی کا چھالا بنالیا۔

عام مردوں کے برعکس وہ یوں بھی گھر کے زیادہ تر کام خود ہی کرتا تھا۔

آخر خدا خدا کر کے وہ لمحہ آیا جب نینسی نے کاؤنٹی اسپتال میں خوب صورت سے ایک بچے کو جنم دیا۔

ڈاکٹرز کی رائے یہ تھی کہ بچہ انتہائی ایکٹو (چلبلا) اور ذہین ہے۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ اپنی خوب صورتی کی بنا پر وہ بچہ جلد ہی تمام ڈاکٹرز اور نرسوں میں مقبول ہوگیا۔

بیپر و نے اس کا نام کالٹن رکھا۔

تین دن بعد نینسی ننھے کالٹن کو لے کر گھر منتقل ہوگئی۔

اب نینسی کی مصروفیات میں اضافہ ہوا تو اس نے شوہر کے کہنے پر اپنی ملازمت چھوڑ دی اور پورا وقت اپنے دونوں بچوں کو دینے لگی۔ سیسی کا تو صرف نام تھا ورنہ نینسی کی توجہ کا

ایسا لگتا ہے کہ اردو ادب کا ستون ایک کے بعد ایک گرتا جا رہا ہے۔ حاجرہ مسرور کا غم کم نہ ہوا تھا کہ رضیہ بٹ بھی راہی ملک عدم ہوئیں۔ رضیہ بٹ 1924ء میں راول پنڈی میں پیدا ہوئیں۔ ان کے ابتدائی ایام پشاور میں گزرے۔ افسانے، کہانیاں پڑھنے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ دیگر لکھاریوں کے ساتھ راجندر سنگھ بیدی، صلاح الدین، عصمت چغتائی، عظیم بیگ چغتائی کو بڑے ذوق وشوق سے پڑھتیں۔ وہ فارسی اور انگلش کے ناول بھی پڑھتیں مگر الگ انداز سے۔ وہ پہلے ایک کاپی میں ناول کا ترجمہ کرتیں پھر مزے لے لے کر پڑھتیں۔ جب وہ پانچویں جماعت میں تھیں تو انہیں اردو میں..... سو نمبر ملے۔ جب یہ بات اسکول ٹیچر سے ایک انگریز خاتون ٹیچر نے سنی تو وہ حیران ہوکر بولیں کہ لٹریچر میں کسی کا سو میں سو حاصل کرنا ناممکن ہے۔ کاپیاں دوبارہ چیک ہوئیں اور انگریز ٹیچر کو بھی ماننا پڑا کہ اسے مزید نمبر دیے جاسکتے ہیں۔ 1940ء میں انہوں نے ”عصمت“ میں ایک تحریر بھیجی جو قابل اشاعت ٹھہری پھر تو ایک سلسلہ سا چل پڑا مگر 1946ء میں ان کی شادی ہوگئی اور یہ سلسلہ رک گیا پھر 1950ء میں یہ سلسلہ دوبارہ سے شروع ہوگیا۔ انہوں نے اپنی ایک شائع شدہ کہانی کو نائلہ کے عنوان سے ناول کی شکل دی جسے بہت زیادہ پسند کیا گیا اور ایک کے بعد ایک ناول مقبول ہوتے چلے گئے۔ پچاس سے زائد ناولز 350 کہانیاں لکھنے والی رضیہ بٹ کے متعدد ناولز پر فلمیں اور ٹی وی سیریلز بنے۔

محور اب صرف اور صرف کالٹن تھا۔

کالٹن کی وجہ سے ایک طرف تو گھریلو اخراجات میں اضافہ ہوا اور دوسری طرف نینسی کے ملازمت چھوڑنے کی وجہ سے ان کی آمدنی میں اچھی خاصی کمی واقع ہوگئی۔ نتیجے کے طور پر بیپر و ایک جگہ پارٹ ٹائم ملازمت بھی کرنے لگا۔

شام کو جب وہ تھکا ہارا گھر واپس آتا تو ننھے کالٹن کی شرارتیں سن کر اس کی ساری تھکن اتر جاتی۔

دونوں میاں بیوی بچوں کو بہترین مستقبل دینا چاہتے تھے، انہیں بہترین تعلیم سے آراستہ کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے بیپر و دن رات محنت کر رہا تھا۔ وہ کالٹن کے لیے اعلیٰ سے اعلیٰ چیزیں خریدتا، بہترین کپڑے، بہترین کھلونے، کھلونوں سے کالٹن کا کمرا بھر گیا تھا۔

کالٹن جب ایک سال کا ہوا تو نینسی نے شوہر کا ہاتھ بٹانے کے لیے پھر ملازمت شروع کردی۔

سیسی تو اسکول جاتی تھی۔ بیپر و نے کالٹن کے لیے ایک بے بی ڈے کیئر کا بندوبست کردیا۔

یوں مزید تین سال گزر گئے اور اب ننھے کالٹن کی عمر چار سال تھی اور وہ اب اسکول جانے کے قابل ہوگیا تھا۔

بیپر و نے اپنی بساط سے بڑھ کر اسے شہر کے ایک بہترین اسکول میں داخل کرادیا۔

کالٹن فطری طور پر ذہین تھا۔ اس کی یادداشت غضب کی تھی۔ اسے جو بات ایک بار بتادی جاتی تھی وہ پھر اسے کبھی نہیں بھولتا تھا۔

ابھی اسکول جاتے ہوئے اسے چار پانچ مہینے ہی ہوئے تھے کہ ایک دن اس کے پیر میں شدید درد اٹھا۔

اسکول والوں نے اسے فوری طور پر اسپتال بھیج کر بیپر و کو ٹیلی فون کیا۔

بیپر و چکرا کر رہ گیا کہ ابھی صبح تو میں ہنستا کھیلتا چھوڑ کر اسکول آیا ہوں، اچانک اسے کیا ہوگیا؟

وہ گھر سے دور تھا اس لیے اس نے نینسی کو ٹیلی فون کردیا اور اس سے کہا کہ ”میں ابھی آفس سے نکل رہا ہوں، تم بھی اسپتال پہنچو۔“

وہ پریشانی کے عالم میں جب اسپتال پہنچا، نینسی اسپتال کے کوریڈور میں عالم اضطراب میں ٹہل رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور حالت سے وہ برسوں کی مریض لگ رہی تھی۔

نینسی کو اس حالت میں دیکھ کر بیپر و بری طرح گھبرا گیا

WWW.PAKSOCIETY.COM

اور فکر مند لہجے میں بولا۔ ''کیا بات ہے ڈارلنگ! کالٹن خیریت سے تو ہے؟''

نینسی نے کھوئی کھوئی ویران آنکھوں سے شوہر کی طرف دیکھا، پھر اس سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اس کے رونے سے ہیپرو کا دل اچھل کر اس کے حلق میں آگیا، اس نے چیخ کر پوچھا۔ ''تم بتاتی کیوں نہیں کہ کالٹن کیسا ہے، وہ ہے کہاں؟''

نینسی نے روتے ہوئے بتایا کہ کالٹن اس وقت آپریشن تھیٹر میں ہے۔ اسے اپینڈے سائٹس کا درد اٹھا تھا اور اب ڈاکٹرز کہہ رہے ہیں کہ وہ پھٹ چکا ہے۔ کالٹن کی حالت اس وقت بہت نازک ہے۔''

''خدا نے چاہا تو ہمارا کالٹن بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔'' ہیپرو نے نینسی سے زیادہ خود کو تسلی دی۔

پھر وہ آپریشن تھیٹر کے دروازے پر جلتی ہوئی اس سرخ لائٹ کو دیکھنے لگا جس کے بجھنے پر اسے کالٹن کے بارے میں واضح طور پر معلوم ہو سکتا۔

دیوار گیر گھڑی کی ٹک ٹک اس کے دماغ پر ہتھوڑے برسا رہی تھی اور نینسی کی سسکیاں اسے مزید مایوس کیے دے رہی تھیں۔

اس کوریڈور میں وہ اکیلے نہیں تھے بلکہ وہاں ایک نوجوان لڑکی اور بھی تھی۔ اس کا شوہر ٹریفک کے ایک حادثے میں بری طرح زخمی ہونے کے بعد اس وقت موت و زندگی کی کشمکش میں مبتلا تھا اور لڑکی اس وقت سکتے کی سی حالت میں بیٹھی تھی۔

اچانک اس آپریشن تھیٹر کی سرخ لائٹ بند ہو گئی جس میں کالٹن موت سے لڑ رہا تھا۔

ہیپرو نے چونک کر لائٹ کو دیکھا پھر عالمِ اضطراب میں کھڑا ہو گیا۔

نینسی کو تو اتنا بھی ہوش نہیں تھا کہ اس کے اردگرد کیا ہو رہا ہے۔

آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا اور سر پر ٹوپی اور چہرے پر ماسک لگائے ہوئے ڈاکٹر ایڈورڈ باہر آگیا۔ باہر آتے ہوئے اس نے اپنا ماسک چہرے سے ہٹا دیا۔

ہیپرو لپک کر ڈاکٹر کی طرف بڑھا۔ نینسی بھی ڈاکٹر ایڈورڈ کو دیکھ کر گویا ہوش میں آگئی اور ہیپرو کے ساتھ ساتھ وہ بھی ڈاکٹر کی طرف لپکی۔

ڈاکٹر ایڈورڈ کے چہرے پر کسی قسم کا کوئی تاثر نہیں تھا۔

پھر اس نے ہیپرو کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ ''سوری مسٹر ہیپرو! ہم آپ کے بیٹے کو نہیں بچا سکے۔''

ہیپرو نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ڈاکٹر ایڈورڈ کو دیکھا پھر اس کی نظر نینسی پر پڑی جو یہ خبر سن کر چکرا کر فرش پر گر پڑی تھی۔

نینسی کو فوری طبی امداد کے لیے ایمرجنسی روم میں شفٹ کر دیا گیا۔

چند منٹ بعد اسی آپریشن تھیٹر سے ایک اسٹریچر برآمد ہوا جسے دو وارڈ بوائز دھکیل رہے تھے اور اسٹریچر پر ننھے کالٹن کی لاش تھی۔

ہیپرو نے چادر کا کونا ہٹا کر ایک نظر بیٹے کی لاش پر ڈالی پھر اپنے آنسو پونچھتا ہوا بوجھل قدموں سے اسپتال کی کاغذی کارروائی کے لیے ایڈمنسٹریشن آفس کی طرف بڑھ گیا۔

وہاں اسے ایک دو فارم بھرنا تھے۔ اس کے بعد ڈاکٹر ایڈورڈ سے کالٹن کی موت کا سرٹیفکیٹ لینا تھا اور کالٹن کی میت کو گھر لے جانا تھا۔ اسے نینسی کی بھی فکر تھی جو اس وقت ای آر (ایمرجنسی روم) میں تھی۔

اس نے اسپتال کا فارم لیا اور کانپتے ہاتھوں سے اسے پُر کرنے لگا۔ اس کی آنکھیں بار بار دھندلا جاتی تھیں جنہیں وہ اپنی ہتھیلی کی پشت سے پونچھنے کے بعد پھر فارم پُر کرنے میں مصروف ہو جاتا تھا۔

اس نے فارم پُر کر کے اسپتال کی انتظامیہ کے حوالے کر دیا اور خود نینسی کی خیریت معلوم کرنے ای آر کی طرف بڑھ گیا۔

نینسی کی حالت بہت خراب تھی اور وہ ابھی تک بے ہوش تھی۔

اسے ہوش میں آنے اور حالت سنبھلنے میں دو گھنٹے مزید گزر گئے۔

بالآخر وہ اٹھ بیٹھی اور خلا میں تکنے لگی جیسے وہاں کالٹن کو تلاش کر رہی ہو۔

اچانک اسپتال میں جیسے بھونچال آگیا۔ نرسوں اور ڈاکٹروں کی بھاگ دوڑ اور ان کے حلق سے نکلتی ہوئی تحیر خیز اور لایعنی آوازیں ہیپرو کو حیرت زدہ کر رہی تھیں۔

اچانک ایک نرس دوڑتی ہوئی ای آر میں داخل ہوئی اور بھرے ہوئے سانسوں کے درمیان بولی۔ ''مسٹر ہیپرو؟''

''ہاں، میں ہی ہیپرو ہوں۔'' ہیپرو نے حیرت سے جواب دیا۔

''آپ ڈاکٹر ایڈورڈ سے مل لیں۔''

''میں ان ہی کی طرف جا رہا ہوں۔'' ہیپرو نے جواب دیا اور نینسی کو دلاسا دے کر بوجھل قدموں سے ڈاکٹر ایڈورڈ کے کمرے کی طرف مڑ گیا۔

ڈاکٹر کے کمرے میں اسپتال کے پانچ مزید سینئر ڈاکٹرز موجود تھے۔ وہ کسی بحث میں مصروف تھے۔ ہیپرو کو دیکھ کر وہ خاموش ہو گئے۔

ڈاکٹر ایڈورڈ نے مسکرا کر کہا۔ ''مسٹر ہیپرو! آپ کے لیے ایک خوش خبری ہے۔''

''خوش خبری؟'' ہیپرو حیران ہو کر بولا۔ ''کیسی خوش خبری ڈاکٹر؟''

''آپ کا بیٹا کالٹن زندہ ہے۔'' ایڈورڈ نے کہا۔

''کیا؟'' ہیپرو حیرت اور خوشی سے چیخ کر بولا۔ ''کیا واقعی کالٹن زندہ ہے ڈاکٹر؟ آپ مجھ سے مذاق تو نہیں کر رہے ہیں؟ میں نے تو خود اسے......''

''اسے مذاق نہیں معجزہ کہیں مسٹر ہیپرو!'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''آپریشن ٹیبل ہی پر آپ کے بیٹے کی موت واقع ہو چکی تھی اس کے گواہ میرے علاوہ دو اسسٹنٹ ڈاکٹرز اور نرسیں ہیں جو میرے ساتھ آپریشن میں مصروف تھے۔ میں تو ابھی اس کی موت کا سرٹیفکیٹ بنا رہا تھا۔ اچانک مجھے اطلاع ملی کہ کالٹن سانس لے رہا ہے۔ میں دیوانہ وار اس طرف بھاگا۔ کالٹن واقعی سانس لے رہا تھا اور اس کی نبض بھی چل رہی تھی۔ میں نے فوری طور پر اسے (آئی سی یو) انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں منتقل کر دیا ہے۔ بچے کی حالت لحہ بہ لحہ بہتر ہو رہی ہے۔''

''کیا، میں اس سے مل سکتا ہوں ڈاکٹر؟'' ہیپرو نے خوشی سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''ابھی نہیں۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''ابھی اسے مزید کچھ گھنٹے آئی سی یو میں رکھوں گا۔ اس کے مختلف قسم کے ٹیسٹ وغیرہ ہوں گے۔ اس کے بعد آپ اس سے مل سکیں گے۔''

مسز ہیپرو کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ آئی سی یو کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو جائے۔ اسے ابھی تک اس خبر پر یقین نہیں آیا تھا۔ ہیپرو نے بہ مشکل اسے روک رکھا تھا۔ وہ اسے صبر کی تلقین کر رہا تھا حالانکہ خود اس کی حالت بھی بیوی سے مختلف نہیں تھی۔

آخر کئی گھنٹوں کے انتظار کے بعد ڈاکٹرز نے کالٹن کو آئی سی یو سے وارڈ میں شفٹ کر دیا اور ہیپرو اور مسز ہیپرو کو اجازت دے دی کہ وہ اپنے بیٹے سے مل سکتے ہیں لیکن اسے زیادہ ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ اس کے ذہن پر کسی قسم کا بوجھ بھی

ہوسکتا ہے کہ کچھ قومیں اپنے قومی ہیرو کو فراموش کر دیتی ہوں لیکن عام طور پر قومیں اپنے بڑوں کی یادوں کو اپنے سینوں سے لگا کر رکھتی ہیں۔ ان کی یادگاروں کی حفاظت کی جاتی ہے اور وہ اس سلسلے میں اتنی جذباتی ہوتی ہیں کہ فرضی کرداروں کی یادگاریں بھی محفوظ کر لیتی ہیں۔

جیسے شرلاک ہومز اور ڈراکولا وغیرہ۔ اور جب وہ فرضی کرداروں کے حوالے سے اتنی جذباتی ہو سکتی ہیں تو اصلی کرداروں کے ساتھ ان کے جذبات اور احترام کا کیا حال ہوگا۔

لیکن اس سلسلے میں برطانیہ کی بوڈیکا بہت بدقسمت رہی ہے۔ یہ عورت برطانوی تاریخ کا ایک درخشاں کردار تھی۔ اس کا زمانہ 60 یا 61 اے ڈی کا ہے۔ وہ برطانیہ کے بادشاہ Prasul Tagus کی وفادار اور جنگجو بیوی تھی۔

اس نے رومن فوجوں کے خلاف خونریز جنگیں لڑیں۔ اپنے شوہر کی موت کے بعد اس نے سربراہی اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ اس کا یہ جملہ آج تک مشہور ہے ''برطانیہ کو کبھی بھی، کبھی بھی غلام نہیں بنایا جا سکتا۔''

وہ ایک شیرنی کی طرح زندہ رہی۔ اس کی ایک آواز پر ہزاروں افراد اس کے جھنڈے تلے جمع ہو جاتے۔ اس نے ثابت کر دیا کہ وہ اپنے ملک کی کتنی وفادار ہے لیکن آج اس کی قبر کا بھی کوئی سراغ نہیں ہے۔ وہ ایک جنگ کے دوران ماری گئی تھی۔

اسے اعزاز اور احترام کے ساتھ دفنایا گیا تھا لیکن اس کے بعد کوئی سراغ نہیں ملتا کہ اس کی قبر برطانیہ میں کہاں ہے؟

برطانوی قوم اس کے نام اور کارناموں سے تو واقف ہے لیکن اس کی قبر کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ نہ جانے کتنی صدیوں سے اس کی قبر کی تلاش جاری ہے اور آج بھی کوششیں ہو رہی ہیں۔

مرسلہ: نادیہ عامر، فیصل آباد

WWW.PAKSOCIETY.COM

نہ ڈالا جائے۔

سپرو اور نینسی نے بیٹے کو دیکھا۔ انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ وہ بہ ظاہر بالکل ٹھیک ٹھاک نظر آرہا تھا لیکن اس وقت بھی اس کے چہرے پر نقاہت اور کمزوری کے آثار تھے۔

وہ ماں باپ کو دیکھ کر مسکرایا اور مدھم آواز میں بولا۔

"ہیلو ڈیڈ، مم! آپ لوگ رو کیوں رہے ہیں؟"

"نہیں بیٹا! ہم رو کہاں رہے ہیں؟" سپرو نے کہا۔

اس وقت ڈاکٹر آگیا اور اس نے کہا۔ "اب آپ لوگ پلیز باہر جائیں۔ کالٹن اس وقت اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ وہ مزید بات کر سکے۔"

"مجھے کیا ہوا ہے ڈاکٹر؟" کالٹن نے کہا۔ "میں بالکل ٹھیک ہوں؟"

"تم بالکل ٹھیک ہو۔" ڈاکٹر نے ہنس کر کہا "لیکن تمہیں ابھی آرام کی ضرورت ہے۔"

مسٹر اور مسز سپرو باہر آگئے۔

ڈاکٹرز نے انہیں یقین دلایا کہ دو دن کے اندر اندر کالٹن بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ لوگ اسے گھر لے جا سکتے ہیں۔

اس دوران میں ماں باپ صبح شام اسپتال کے چکر لگاتے رہے۔ کالٹن کی حالت ہر لحہ سدھرتی ہی جارہی تھی۔

دو روز بعد ڈاکٹرز نے اسے گھر لے جانے کی اجازت دے دی۔

کالٹن اب بالکل صحت مند تھا۔ اس کے زخم کے نشان کے علاوہ جو آپریشن کے بعد آیا تھا، وہ ہر طرح سے ٹھیک تھا۔

پھر چند روز بعد وہ اسکول بھی جانے لگا۔ سپرو کے پڑوسی، اس کے دوست اور آفس کے ساتھی بھی اس معجزے پر ششدر تھے۔

اور ایک دن شام کو کھیلنے کے بعد کالٹن گھر آیا تو مسز سپرو نے فوراً اسے اورنج جوس دیا۔ اورنج جوس وہ بہت شوق سے پیتا تھا۔ جوس پیتے پیتے اچانک اس نے کہا۔ "مام! کیا میری کوئی بہن بھی تھی؟"

نینسی نے چونک کر بیٹے کو دیکھا اور بولی۔ "تمہاری بہن تو اب بھی ہے موجود ہے۔ کیا تمہاری اس سے لڑائی ہوگئی ہے؟"

"میں اپنی دوسری بہن کی بات کر رہا ہوں۔" کالٹن نے کہا۔

اس کی بات پر نہ صرف نینسی چونک اٹھی بلکہ سپرو بھی بری طرح چونک اٹھا، اس نے نرمی سے پوچھا۔ "تم کس کی بات کر رہے ہو کالٹن؟"

"ڈیڈ! میری ایک بہن اور بھی تھی جس کا بہت پہلے انتقال ہو چکا تھا۔"

نینسی اس مرتبہ پھر چونکی۔ واقعی ان کی ایک بیٹی اور تھی جو بچپن میں ہی مر گئی تھی لیکن یہ تو کالٹن کی پیدائش سے بھی بہت پہلے کی بات تھی۔ اس کے ماں باپ نے کبھی کالٹن کو اس کی دوسری بہن کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔

"ہاں بیٹا!" نینسی نے کہا۔ "تمہاری ایک بہن اور تھی لیکن وہ تو تمہاری پیدائش سے پہلے مر گئی تھی۔ تمہیں اس کے بارے میں کس نے بتایا؟"

"کسی نے بھی نہیں۔" کالٹن نے کہا۔

"میں جب اسپتال میں تھا تو بے ہوشی کے دوران مجھے ایسا لگا جیسے میں بہت ہلکا ہو کر پرندوں کی طرح ہوا میں اڑ رہا ہوں۔ میں اس طرح اڑتا ہوا ایک دوسری ہی دنیا میں پہنچ گیا۔ وہاں مجھے بھورے بالوں اور نیلی آنکھوں والی ایک لڑکی ملی۔ اس نے مجھے گلے لگایا اور بولی کالٹن! تم نے مجھے پہچانا؟ نہیں تم مجھے کیسے پہچان سکتے ہو، میں تو اس وقت یہاں آئی تھی جب تم پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔"

میں نے پوچھا۔ "تم کون ہو؟"

وہ ہنس کر بولی۔ "میں تمہاری بہن ہوں۔ مجھے غور سے دیکھو، کیا تمہیں میری شکل میں مام کی شباہت نظر نہیں آتی؟"

پھر وہ مجھے دیر تک اس عجیب و غریب دنیا کی سیر کراتی رہی۔

"تم..... تم واقعی اس سے ملے ہو؟" نینسی نے بھرائی آواز میں پوچھا۔

"ہاں مام!" کالٹن نے کہا۔ "میں اس سے ملا ہوں۔ اس سے باتیں کی ہیں، اس نے مجھے اس عجیب و غریب دنیا کی سیر کرائی ہے۔"

"ایک منٹ ٹھہرو۔" نینسی نے پُرجوش لہجے میں کہا اور تہ خانے میں چلی گئی جہاں گھر کا پرانا سامان، لکڑی کا فرنیچر اور کاٹھ کباڑ پڑا رہتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ ایک پرانا سا البم لے کر آئی اور بولی۔ "اس البم میں تمہاری دونوں بہنوں اور خاندان کے دوسرے لوگوں کی تصویریں ہیں، ذرا ان میں دیکھ کر بتاؤ کہ تمہاری کس لڑکی سے ملاقات ہوئی تھی؟"

کالٹن نے وہ البم اس سے قبل نہیں دیکھا تھا۔ اس نے البم کھولا۔ اس میں پہلے صفحے پر اس کی ماں اور باپ کی تصویر تھی۔ "یہ دونوں تو آپ ہیں۔" کالٹن ہنس کر بولا۔ "آپ

پہلے کے مقابلے میں کچھ موٹی ہوگئی ہیں اور ڈیڈ نے بھی مونچھیں رکھ لی ہیں لیکن میں آپ کو پہچان سکتا ہوں۔ اگلے صفحے پر کالٹن کے باپ اور پھوپی کی تصویر تھی۔ کالٹن نے اسے بھی پہچان لیا۔ اس سے اگلے صفحے پر نینسی کے ساتھ ایک خوب صورت سی بچی کی تصویر تھی۔ اس کی عمر بہ مشکل پانچ سال ہوگی۔ اس کے بال بھورے اور آنکھیں نیلی تھیں۔

کالٹن پُرجوش لہجے میں بولا۔ "یہ میری وہ بہن ہے جو مجھ سے ملی تھی۔"

نینسی اور سپرو دونوں گنگ سے ہو کر رہ گئے، واقعی وہ ان کی اس بیٹی کی تصویر تھی جو کالٹن کی پیدائش سے قبل مر چکی تھی اور کالٹن نے یہ البم بھی اس سے قبل نہیں دیکھا تھا۔

البم کے صفحات پلٹتے ہوئے اچانک اس کی نظر ایک ادھیڑ عمر کے آدمی پر پڑی۔ اس نے بوٹائی لگا رکھی تھی اور جسم پر پرانی وضع کا سوٹ تھا۔ کالٹن چیخ کر بولا۔ "یہ میرے دادا ہیں، ان سے بھی میری ملاقات ہوئی تھی۔"

سپرو سناٹے میں آگیا۔ واقعی وہ اس کے باپ کی تصویر تھی جس کا انتقال برسوں پہلے سپرو کی شادی سے بھی قبل ہو چکا تھا۔

پھر کالٹن نے البم میں ان تمام افراد کو شناخت کر لیا جو سب پہلے مر چکے تھے۔ اس نے بتایا۔ "سب لوگ مجھے وہاں ملے تھے۔ گرینڈ پا تو مجھ سے مل کے بہت خوش بھی تھے اور اداس بھی۔ وہ بار بار یہ کہہ رہے تھے کہ تم ابھی سے یہاں کیوں آگئے؟ ابھی تو تم نے دنیا میں کچھ دیکھا ہی نہیں ہے۔"

"وہاں کا موسم عجیب تھا، وہاں دھوپ کی رنگت نیلی تھی اور ہوا میں عجیب قسم کی مہک تھی۔" کالٹن نے سوچتے ہوئے کہا۔ "گرینڈ پا مجھے بہت دیر تک وہاں کی سیر کراتے رہے۔ شاید انہوں نے مجھے کچھ کھانے کو بھی دیا تھا اور دودھ بھی پلایا تھا۔"

پھر وہ مجھ سے بولے۔ "کالٹن بیٹا! اب تم واپس جاؤ، ابھی تمہارے یہاں آنے کا وقت نہیں آیا۔ تمہارے مام اور ڈیڈ تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

میں نے ان سے کہا۔ "گرینڈ پا آپ بھی میرے ساتھ چلیں اور میری بہن کو بھی ساتھ لے لیں۔ آپ کے ساتھ بہت مزہ آئے گا۔"

گرینڈ پا افسردگی سے بولے۔ "کالٹن مائی سن! میں اب واپس نہیں جا سکتا۔ البتہ تمہارے واپس جانے کا وقت آگیا۔"

انہوں نے گلے لگا کر مجھے پیار کیا، پھر مجھے ایسا لگا جیسے میں بلندی سے نیچے کی طرف گر رہا ہوں لیکن میری رفتار ایسی تھی جیسے کوئی پرندہ اوپر سے نیچے کی طرف آتا ہے۔ پھر اچانک میرا ذہن اندھیروں میں ڈوب گیا۔ میری آنکھ کھلی تو میرے سامنے کھڑی ہوئی نرس بری طرح بوکھلا گئی اور نہ جانے کہاں چیختی ہوئی بھاگی۔"

سپرو کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، اس نے کہا۔ "کالٹن! تم وہاں جتنے افراد سے ملے ہو، وہ سب تمہارے رشتے دار تھے اور بہت پہلے وفات پا چکے ہیں۔ ڈاکٹروں نے تو تمہاری موت کا بھی اعلان کر دیا تھا بلکہ تمہارا ڈیتھ سرٹیفکیٹ بنایا جارہا تھا کہ اچانک تم ہوش میں آگئے۔ نرس اس لیے وہاں سے چیختی ہوئی بھاگی تھی لیکن تم یہ باتیں کسی کو بتانا مت، کوئی بھی تمہاری ان باتوں پر یقین نہیں کرے گا۔"

کالٹن نے باپ کی بات گرہ میں باندھ لی اور کسی سے بھی اس بات کا تذکرہ نہیں کیا لیکن وہ اس واقعے کو کیسے بھول سکتا تھا۔

اب کالٹن کی عمر گیارہ سال ہے۔

اس نے باتوں باتوں میں اپنے ایک کلاس فیلو کو اس واقع کے بارے میں بتا دیا۔ اس کے ذریعے یہ خبر اس کے والد کو ملی۔ وہ ڈلاس کے ایک روزنامے میں میگزین ایڈیٹر ہیں۔ انہوں نے فوری طور پر کالٹن اور اس کے والدین سے ملاقات کی اور کالٹن سے نئے سرے سے سب کچھ پوچھا۔ کالٹن کو ایک ایک لفظ ازبر تھا۔ اس نے میگزین ایڈیٹر کو بھی تفصیل سے سب کچھ بتا دیا۔

دوسرے ہفتے اخبار میں کالٹن کی ناقابلِ یقین کہانی شائع ہوگئی۔ اس کے بعد تو کالٹن کو دیکھنے اور اس سے ملنے والوں کا ایک ہجوم سپرو کے گھر آیا۔ انہیں روزانہ سیکڑوں کی تعداد میں ٹیلی فون موصول ہوتے، ہزاروں افراد کے خطوط اور میلز ملتیں کہ ہم صرف ایک مرتبہ کالٹن سے ملنا چاہتے ہیں۔

سپرو نے تنگ آکر ڈلاس چھوڑ دیا اور کیلی فورنیا چلا گیا۔

کالٹن آج بھی صحت مند اور تندرست ہے۔ اب وہ کسی کو بھی کچھ بتانے سے احتراز کرتا ہے۔ اس کے لیے ماضی کا تجربہ ہی کافی ہے جب اس سے ملنے والوں اور اسے ایک نظر دیکھنے والوں نے اس کی اور اس کے خاندان کی زندگی اجیرن کر دی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

سراب

راوی : شہبازملک

تحریر: کاشف زبیر

67

وہ پیدائشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکارسی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب ... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر آسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

WWW.PAKSOCIETY.COM

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بابا کا اصرار تھا کہ مجھے کیڈٹ کالج بھیج دیا جائے جبکہ میں آرمی میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ سویرا جو میرے دل کا حصہ تھی اور میرے بھائی کا مقدر بنادی گئی اور میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ میں نے کاروبار شروع کیا۔ ایک روز مری سے واپسی آتے ہوئے نادر علی کا ہم سے ٹکراؤ ہوگیا۔ دشمنی اور دربدری کا ایک سلسلہ شروع ہوا جو دراز ہوتا چلا گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے لوگ میرے دشمن ہورہے تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست بھی تھے۔ اس کے بعد ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئی تھیں۔ میں دوبارہ اپنے وطن لوٹا تو فتح خان سے ٹکراؤ ہوگیا۔ ایک دن میں زرین کو لے کر سیر کے لیے نکلا تھا کہ دشمنوں نے گھیر لیا۔ ان سے بچتے بچاتے ہم نکلے تو راستہ بھٹک کر ایک ایسے علاقے میں پہنچ گئے جو مری کی طرف جاتا تھا۔ ایک ڈاکٹر نے آبادی تک پہنچانے کا وعدہ کرلیا۔ جب اس کے بنگلے پر پہنچے تو احساس ہوا کہ ہم قید ہوچکے ہیں۔ زرین کی طبیعت بھی خراب ہوگئی تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ ڈاکٹر نے ہم پر ایک خطرناک وائرس کا تجربہ کیا ہے۔ زرین جانبر نہ ہوسکی۔ تبھی ڈیوڈ شا آ گیا۔ اس نے مجھے رہا کرالیا اور کہا کہ اگر تم مجھے پراسرار وادی تک پہنچادو تو میں مرشد سے بھی گلوخلاصی کرادوں گا۔ اس کے بعد شانے مجھے اپنے ایک آدمی مارشل کے ساتھ کردیا کہ وہ مجھے شہر چھوڑ آئے مگر راستے میں ہی اس کی نیت بدل گئی۔ وہ پستول سے مجھ پر فائر کرتا کہ ایک کینیے مارشل کے پستول والے ہاتھ پر منہ مارا تھا۔ سفیر وغیرہ اس کتے کی مدد سے مجھ تک پہنچے تھے۔ ان کے ساتھ میں شہر آ گیا۔ پھر ہم شہلا کی تلاش میں نکلے۔ شہلا کو راضی کیا کہ وہ مجھے بینک کے لاکر تک پہنچادے تاکہ میں چائنیز بریف کیس حاصل کرلوں۔ ہم بینک میں سیف سے بریف کیس نکال چکے تھے مگر باہر نکلتے کہ شہلا نے پستول سے وسیم کو نشانے پر لے لیا۔ تب پتا چلا کہ شہلا نے فتح خان کے آدمیوں کو بلالیا ہے۔ وہ مجھے یرغمال بنا کر فتح خان کے گھر میں لے آئی۔ وہاں ایک خانہ بدوش عورت کو فتح خان کے آدمی پکڑ لائے تھے اور اس کی عزت سے کھیل رہے تھے کہ خانہ بدوش چڑھ دوڑے، انہوں نے لڑکی کو بھی برآمد کرلیا تھا۔ فتح خان نے خانہ بدوشوں کو بھگادیا۔ تب میں نے دیکھا کہ اس کے ساتھ سویرا بھی ہے۔ وہ اسے اغوا کرلایا تھا۔ پھر اس نے مجھے مجبور کردیا کہ سویرا کو حاصل کرنے کے لیے مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کرکے دینے ہوں گے، میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ فتح خان، برٹ شا کو لے آیا جو پاگل ہوچکا تھا۔ پھر اس نے میری طرف سے میل کرکے ایمن کو بلوالیا۔ وہ دور رہ کر ہم پر نظر رکھے ہوئے تھا کہ فتح خان کے آدمیوں پر فائرنگ شروع ہوگئی۔ برٹ شا نے میرے پستول سے فتح خان کو نشانے پر لیا تھا کہ اس کے آدمی نے برٹ شا کو گولی ماردی۔ مرتے وقت برٹ شا بڑبڑایا ''نارتھ..... بگسٹ'' دم توڑتے برٹ شا کی آواز صرف میں نے سنی تھی، تبھی مائیک سے اعلان ہوا کہ جو بھی ہے، وہ ہاتھ اٹھا کر باہر آجائے۔ وہ راجا صاحب کے آدمی تھے۔ وہاں سے میں محل میں آیا۔ اگلے دن ہم پنڈی جانے کے لیے نکلے۔ راستے میں فتح خان نے گھیر کر بے بس کردیا اور ایمن کو خودکش جیکٹ پہنادی جسے اتارنے کی کوشش کی جاتی تو دھماکا ہوجاتا۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کردیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کے تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر پھر نکل بھاگا۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ کرنل زروسکی نے ہم دونوں کو پکڑلیا۔ وہ مجھے پھر سے انڈین آرمی کی تحویل میں دینا چاہتا تھا۔ میں نے کرنل کو زخمی کرکے بساط اپنے حق میں کرلی۔ زخمی فتح خان اور زروسکی کو لے کر چلا۔ راستے میں فتح خان کو اتاردیا۔ کچھ دور جانے کے بعد ایک کوٹھی نظر آئی جو ایک ملیٹری آفیسر کی تھی۔ میں نے اسے حالات بتا کر مدد طلب کی۔ زروسکی تو ملیٹری پولیس کے حوالے کرنے چلا گیا تھا کہ کوٹھی پر حملہ ہوگیا۔ میں نے حملہ پسپا کیا۔ ملیٹری افسر زخمی تھا، مجھے ملیٹری اعلیٰ جنس والے ساتھ لے گئے۔ انہی لوگوں نے مجھے پنڈی پہنچانے کا انتظام کردیا۔ میں دوستوں کے درمیان آکر ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی کہ ایک کوٹھی میں بم دھماکا۔ وہ کوٹھی نادر علی کی تھی۔ ہم شہلا کی تلاش میں نکل پڑے۔ کافی تگ ودو کے بعد پتا چلا کہ اسے کالی کوٹھی میں قید رکھا گیا ہے۔ یہ خبر مرشد کے ایک غنڈے صابر کے ذریعہ ملی۔ اسے میں نے قابو کرلیا تھا پھر میں اپنے دوستوں کے ساتھ کالی کوٹھی جا پہنچا جہاں شہلا زندگی کی آخری سانسیں لے رہی تھی۔ اسی لمحے پولیس سائرن سنائی دیا۔

(اب آگے پڑھیں)

WWW.PAKSOCIETY.COM

پولیس سائرن کی آواز نے ہمیں چونکا دیا تھا۔ میں نے ہم کی طرف دیکھا۔ ''اس کوٹھی کو مکمل طور پر تباہ کرنا ہے۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''یہ کام میں پہلے ہی کرچکا ہوں۔ ہم نے یہاں آگ لگانے والے بم لگادیے ہیں دس منٹ کا ٹائم سیٹ ہے۔ اس سے پہلے سب کو یہاں سے نکل جانا ہے۔''

''کوئی بچا تو نہیں ہے؟''

''نہیں سب مارے گئے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''آپ کو شہلا نے بتایا کہ یہاں ہونے والی باتیں ریکارڈ ہوتی ہیں اور کوئی اجنبی اندر داخل ہو تو کہیں اور بھی الارم بجتا ہے۔''

''ہاں اسی لیے میں اس کوٹھی کی مکمل تباہی چاہتا ہوں۔ اگر یہاں کوئی ریکارڈنگ ہورہی ہے تو وہ بھی تباہ ہوجائے۔''

وسیم نے اپنے آدمیوں کو واپسی کا حکم دیا۔ ہم تیزی سے مڑ کر عقب کی ٹوٹی دیوار کے پاس آئے۔ اچانک مجھے خیال آیا اور میں نے وسیم سے کہا۔ ''جب عبداللہ راستے میں تھا تو پولیس کالونی میں کیسے آگئی؟'' اس نے روکا کیوں نہیں؟''

اسی لمحے وسیم کے موبائل پر کال آئی۔ اس نے کال ریسیو کی دوسری طرف عبداللہ تھا اس نے وسیم کو پولیس کی آمد سے خبردار کیا اور بتایا کہ اتفاق سے پولیس پارٹی دوسری طرف سے آگئی تھی اس سے پہلے وہ اسے روکنے کے لیے کچھ کرتے پولیس موبائل کالونی کے اندر داخل ہوگئی تھی۔ اس وقت سائرن کی آواز کوٹھی کے سامنے والے حصے تک پہنچ گئی تھی۔ سڑک اس طرح سے گھوم کر آتی تھی کہ آنے والی پولیس ٹوٹی ہوئی دیوار نہیں دیکھ سکتی تھی۔ لیکن یہ بات یقینی تھی کہ چند منٹ بعد وہ کوٹھی کے چاروں طرف پھیل جائیں گے اور سب دیکھ لیں گے۔ اس سے پہلے ہی ہمیں یہاں سے نکلنا تھا۔ وسیم کے دو آدمی نالے میں ہی کوٹھی کے سامنے کی طرف گئے تھے وہ نالے سے واپس آرہے تھے اس لیے امید تھی کہ پولیس پارٹی انہیں نہیں دیکھ سکے گی۔ ایک منٹ سے پہلے ہم نالے میں پہنچ گئے تھے۔

نالے میں آنے کے بعد ہم پولیس یا کسی کی نظروں سے فوری طور پر بچ گئے تھے۔ ہم جھک کر وین کی طرف جانے لگے۔ اب بم بلاسٹ ہونے میں پانچ منٹ کا وقت رہ گیا تھا۔ دو منٹ بعد ہم وین کے پاس تھے۔ اس دوران میں وسیم کے باقی دو آدمی بھی دوڑتے ہوئے پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک ہانپتے ہوئے بولا۔ ''جلدی نکلیں یہاں سے پولیس والے درجن سے بھی زیادہ ہیں۔''

ایک موبائل وین میں عام طور سے چار پانچ سے زیادہ اہلکار نہیں ہوتے ہیں لیکن وہ شاید کہیں چھاپا مارنے گئے تھے اور واپسی میں انہیں یہاں دھماکے سنائی دیے تو وہ اس طرف آگئے۔ ہم وین میں اور وسیم کے آدمی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ گئے۔ اب ہمیں انتظار تھا کوٹھی میں آگ لگنے کا اس کے بعد جو افراتفری مچتی وہ ہمارے فرار میں آسانی پیدا کرتی۔ جیسے ہی دس منٹ پورے ہوئے پہلے کوٹھی کے سامنے والے حصے سے ایک ہلکے دھماکے کے ساتھ بہت بڑا شعلہ نمودار ہوا۔ دہشت زدہ پولیس والوں کے چلانے کی آواز یہاں تک آئی تھی۔ وین اور گاڑیوں کے انجن اسٹارٹ ہوئے اور ہم وہاں سے روانہ ہوئے تو یکے بعد دیگرے دھماکے ہونے لگے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کوٹھی شعلوں کی لپیٹ میں آگئی تھی۔ وسیم کے آدمیوں نے بم اس طرح لگائے تھے کہ کوٹھی کا کوئی حصہ ان سے محفوظ نہ رہے۔ ابھی ہم کالونی کے گیٹ تک پہنچے تھے کہ اچانک کوٹھی کی طرف سے بہت بڑا دھماکہ ہوا۔ دھماکے کی لہر نے زمین کو ہلا دیا تھا اور وین لہرائی تھی۔ آواز نے بھی سب کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میں نے سنبھل کر وسیم کی طرف دیکھا۔

''یہ کیا تھا؟''

''میرا خیال ہے کوٹھی میں بھی کچھ گولہ بارود موجود تھا وہی بلاسٹ ہوا ہے۔''

میں نے وین کے عقبی شیشوں سے دیکھا تو کوٹھی کی جگہ ہوا میں گرد وغبار اور شعلوں کا بہت بڑا بادل اٹھ رہا تھا۔ دھماکے نے سب تباہ کردیا تھا۔ وہاں موجود لاشوں کو بھی ریزہ ریزہ کردیا ہوگا۔ مجھے شہلا کا خیال آیا۔ جیسی آزاد اس کی زندگی تھی ویسی ہی آزاد موت تھی۔ نہ جنازہ اٹھے گا اور نہ لاشہ دفن ہوگا۔ وہ مٹی کے ذروں میں مل کر ہمیشہ کے لیے آزاد ہوگئی تھی۔ عجیب آزاد خیال اور آزاد مزاج عورت تھی۔ وسیم اب عبداللہ کو اطلاع دے رہا تھا کہ ہم بہ حفاظت نکل آئے ہیں اس لیے وہ بھی واپسی کی راہ اختیار کرے۔ یہ دھماکا معمولی نہیں تھا اور ایک پولیس پارٹی بھی اس کا شکار ہوئی تھی اس لیے کچھ دیر میں یہاں پولیس کی بھاری نفری کی آمد لازمی تھی۔ ان کی آمد سے پہلے یہاں سے دور نکل جانا ضروری تھا۔ میں خیالوں میں گم تھا کہ وسیم کی آواز آئی۔

''کیا سوچ رہے ہیں ذرا یہ بھی دیکھیں۔''

شروع میں میں نے غور نہیں کیا تھا کہ واپسی میں وسیم کا ایک آدمی ایک بڑے سائز کے سوٹ کیس کو بھی اٹھائے ہوئے تھا جبکہ جاتے ہوئے ہمارے پاس ایسا کوئی سوٹ کیس نہیں تھا۔ یہ سوٹ کیس اب وین کے فرش پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے بے دلی سے پوچھا۔ ''کیا ہے اس میں ہے؟''

''یہ دیکھیں۔'' اس نے سوٹ کیس کھول دیا۔ اس

کے لاک توڑ دیے تھے اس لیے وہ آسانی سے کھل گیا' میں حیران رہ گیا۔ سوٹ کیس اوپر تک مختلف مالیت کے نوٹوں کی گڈیوں سے بھرا ہوا تھا۔ "ہمیں کوٹھی کے ایک مقفل کمرے سے ملا ہے۔"

زیادہ تر گڈیاں پانچ سو اور ہزار روپے مالیت کی تھیں کچھ پانچ ہزار اور کچھ سو روپے والی گڈیاں بھی تھیں' پانچ ہزار کا نوٹ نیا آیا تھا اس لیے اس کی ساری گڈیاں فریش تھیں جبکہ باقی گڈیوں میں پرانے نئے نوٹ مکس تھے۔ میں نے گڈیاں اٹھا کر چیک کیں۔ یہ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے خود سے نوٹوں کو گڈیوں کی صورت دی تھی اور یہ اچھی خاصی مالیت تھی بلکہ کروڑ سے اوپر کی رقم لگ رہی تھی۔ اتنی بڑی دولت کا یوں بغیر حفاظت چھوڑ دینا سمجھ سے بالاتر تھا۔ وسیم میری طرف دیکھ رہا تھا۔ "شہباز صاحب میں نے ٹھیک کیا نا... دشمن کا مال جائز ہوتا ہے۔"

"ہاں یار... ان کا جوتا ان کے سر ماریں گے ان کی دولت سے ان کے خلاف کارروائی کریں گے۔" میں نے کہا تو وسیم خوش ہو گیا۔

"میں بھی یہی سوچ کر اٹھا لایا جناب۔"

اس نے سوٹ کیس بند کر دیا۔ مین روڈ پر آنے کے بعد وسیم کے آدمیوں والی گاڑیاں واپس حویلی کی طرف چلی گئیں۔ ہم فارم کی طرف جا رہے تھے۔ مجھے رہ رہ کر شہلا کا خیال آ رہا تھا۔ کتنے بلند عزائم تھے۔ ان عزائم کی خاطر اس نے اپنی جوانی کا خزانہ بھی بے دریغ لٹایا تھا۔ وہ کسی اچھی فیملی سے تعلق رکھتی تھی لیکن اس کی بے راہ روی کی وجہ سے سب نے اس سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ وہ اکیلی اور اپنی مرضی سے جی رہی تھی۔ شاید اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ موت اسے یوں اچانک اور اتنے عبرت ناک انداز میں دبوچ لے گی۔ ایاز میری کیفیت سمجھ رہا تھا اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "شہباز صاحب اس کی قسمت میں ایسی ہی موت لکھی تھی سچی بات ہے کہ وہ دشمن تھی اس کے باوجود اس کی موت کا دکھ ہے۔ ہم نے اس کے قاتلوں سے بدلہ بھی لے لیا۔"

"ہاں یار... لیکن ایسی موت دیکھ کر خیال آتا ہے کہ آدمی پھر کس لیے اتنی جدوجہد کرتا ہے۔"

"یہ آدمی کی فطرت ہے وہ موت کو سامنے دیکھ کر بھی زندگی کی چاہ کرتا ہے اور اگلے پل کی خبر نہ ہونے کے باوجود برسوں کی پلاننگ کرتا ہے۔" ایاز نے دو جملوں میں انسان کی زندگی کا نچوڑ پیش کر دیا۔ میں نے سر ہلایا اور ایک طرف دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا، وین کے عقبی خانے میں گنجائش پیدا کرنے کے لیے سوائے کمپیوٹر آپریٹر کی سیٹ کے باقی تمام نشستیں اور چیزیں ہٹا دی گئی تھیں اور فرش پر موٹا دھاگوں والا قالین بچھا تھا۔ یہ گاڑیوں کے لیے ہوتا ہے۔ آدھے گھنٹے بعد ہم فارم پہنچ گئے تھے۔ وہاں بھی سب نے شہلا کی موت کی خبر افسردگی کے ساتھ سنی۔ اس سے دشمنی کا سہی لیکن ایک تعلق تو تھا۔ مانی کے سوا سب کا اس سے اچھی طرح واسطہ پڑ چکا تھا۔ اس لیے مانی نارمل تھا اور اس نے سب سے زیادہ دلچسپی سے سوٹ کیس دیکھا اور پھر اسے کھولا تو اس کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ اس نے مشکوک نظروں سے وسیم کی طرف دیکھا۔

"آپ سچ مچ مرشد کے کسی ٹھکانے پر گئے تھے؟"

"تمہیں شک ہے برخوردار؟"

"ہاں یہ سوٹ کیس دیکھ کر تو لگ رہا ہے کہ آپ کسی بینک سے ہو کر آ رہے ہیں۔"

"تمہارا انداز درست ہے۔" وسیم نے ڈانٹ کر کہا۔ "ہم ڈاکا مار کر آ رہے ہیں۔"

مانی کا منہ بھی کھل گیا تھا۔ "سچ میں جی۔"

سفیر بھی وسیم کی اس شرارت میں شامل ہو گیا۔ "آدمی کو اخراجات بھی تو پورے کرنے ہوتے ہیں۔ اب تم یہ جو صبح شام پڑے کھاتے ہو اور دھڑا دھڑ کمپیوٹر استعمال کرتے ہو اس کے لیے رقم کہاں سے آئے گی؟"

مانی برا مان گیا۔ "آپ کو بس میرا کھانا نظر آتا ہے' مجھ سے دوگنا زیادہ تو آپ کھا جاتے ہیں اور میں کھاتا ہوں تو کام بھی کرتا ہوں۔ آپ کرتے ہی کیا ہیں۔"

"ٹھیک کہا یار۔" سفیر نے سرد آہ بھری۔ "شادی نے ہمیں نکما کر دیا غالب... ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے۔"

ان کی نوک جھوک نے سب کے چہروں پر مسکراہٹ بکھیر دی تھی اور شاید ان لوگوں کا مقصد بھی یہی تھا۔ رات کے آٹھ بج رہے تھے اور ابھی بھوک کسی کو نہیں تھی۔ کچھ دیر بعد عبداللہ بھی ایک ٹیکسی میں آ گیا۔ احتیاط کے طور پر اس نے ٹیکسی سڑک پر رکوا دی تھی اور باقی راستہ پیدل طے کیا تھا۔ ایک اچھا کام اس نے یہ کیا کہ آتے ہوئے سب کے لیے کھانا لیتا آیا تھا۔ یہ سامان اسے اٹھا کر لانا پڑا تھا اس نے سامان ایک طرف رکھا اور درمیان میں رکھے سوٹ کیس کی طرف دیکھا تو وسیم نے سوٹ کیس کھول کر اسے بھی نوٹوں کی زیارت کرائی۔ عبداللہ خوش ہو گیا۔ "یہ ہوئی نا دوہری چوٹ..."

"ہاں مرشد بھی یاد کرے گا۔" سفیر نے کہا۔

"میرا خیال ہے یہ اس کی حرام کی کمائی کا کوئی حصہ تھا جو اس تک پہنچانا تھا اور اس کوٹھی میں پڑا ہوا تھا۔ اس سے پہلے مرشد رقم منگواتا ہم وہاں پہنچ گئے۔" وسیم نے کہا۔

"وسیم بھائی یہ کتنا رقم ہے؟" بیتو نے پوچھا۔

"اتنی ضرور ہے کہ تمہاری شادی کے ساتھ ولیمہ و ہنی مون بھی آسانی سے نمٹ جائے گا۔" وسیم نے غیر سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"ایسا کرو تم اور مانی یہ رقم گنو جب تک ہم کچھ ضروری باتیں کر لیں۔" میں نے کہا تو مانی اور بیتو سوٹ کیس سے گڈیاں قالین پر گرا انہیں الگ الگ ترتیب سے رکھنے لگے تاکہ گننے میں آسانی رہے۔ انہیں اس کام میں مگن چھوڑ کر میں، وسیم، سفیر اور عبداللہ اسٹڈی میں آ گئے۔ ایاز گاڑیوں کا چیک اپ کرنے چلا گیا۔ سفیر کافی کے لیے الیکٹریکل کیتلی لے آیا تھا جس میں ہمہ وقت کافی گرم موجود رہتی تھی بس نکالنی پڑتی تھی۔ وہ ہم سب کے لیے کافی نکال لایا۔ عبداللہ نے کہا۔ "جناب میری بات ہو گئی ہے ہیلی کاپٹر ایک گھنٹے کے نوٹس پر تیار ملے گا؟"

"تم نے اسی پائلٹ سے بات کی ہے جو مجھے بھی راجا صاحب کے محل لے گیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں جناب' میرا خیال ہے وہ ہمارے دشمنوں کی نظروں میں آ گیا ہے اور اسے پھر استعمال کرنا خطرناک ہو سکتا ہے۔ میں نے ایک دوسرے ائر کلب میں بات کی ہے۔"

"یہ ٹھیک ہے کیا اسے بتایا ہے کہ جانا کہاں ہے؟"

عبداللہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں اسے روانگی سے ایک گھنٹا پہلے بتایا جائے گا۔ وہ ائر ٹریفک کنٹرولر سے اجازت لے گا اور دوسرے لوازمات پورے کرے گا۔"

میں نے سر ہلایا۔ "تب ہمیں جلد از جلد خواتین اور سفیر کو حویلی منتقل کر دینا چاہیے۔"

"صبح سورج طلوع ہونے کے بعد آپ جب کہیں یہ کام ہو جائے گا۔" عبداللہ نے کہا۔ سفیر کے چہرے پر تذبذب کے تاثرات تھے۔

"یار مجھے اچھا نہیں لگ رہا ہے' تم لوگوں کو اس طرح چھوڑ کر عورتوں کے ساتھ گھر جا کر بیٹھ جاؤں۔"

"تو گھر نہیں بیٹھے گا وہاں ان عورتوں کی حفاظت کرے گا اور پھر موتا کو بھی تیری ضرورت ہے۔" میں نے اسے تسلی دی۔

"جو انتظار کرتے ہیں وہ بھی کمال کرتے ہیں۔" وسیم نے بھی اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"یہ ضروری ہے۔" عبداللہ بولا تو سفیر بے بسی سے ہمیں دیکھنے لگا۔

"جیسے تم سب کی مرضی یارو!"

"ہماری مرضی چھوڑو یہ بتاؤ کہ خواتین کیسے مانیں؟" میں نے کہا۔

عبداللہ مسکرانے لگا۔ "مجھے تو وہ خاطر میں کہاں لاتیں لیکن جب میں نے کہا کہ یہ شہباز صاحب کا حکم ہے تو انہیں ماننا پڑا۔"

"بس بھائی یہ وقت بھی دیکھنا تھا۔" سفیر اپنے موڈ میں آ گیا اور وسیم کی طرف دیکھ کر رقت آمیز لہجے میں بولا۔ "بیویاں ہماری ہیں اور حکم بھائی صاحب کا چلتا ہے۔"

"ہاں بھائی۔" وسیم نے بھی سرد آہ بھری۔ "وہ محاورہ غلط تھوڑی ہے ساری خدائی ایک طرف..." اس نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"جورو کا بھائی ایک طرف۔" سفیر نے بات مکمل کی۔

"میرا خیال ہے کل صبح کا وقت ٹھیک رہے گا۔" میں نے عبداللہ سے کہا۔ "تم ان کی روانگی سے کچھ دیر پہلے حویلی بات کرنا۔"

عبداللہ نے سر ہلایا۔ "میں سمجھ رہا ہوں ویسے ہیلی کاپٹر میں میرے دو آدمی بھی جائیں گے۔"

"میں بھی ہوں گا۔" سفیر نے کہا۔

"کیا پرواز کے دوران آرمز لے جانے کی اجازت ہو گی؟"

"اجازت تو نہیں ہوتی ہے جیسے پبلک ٹرانسپورٹ میں تمباکو نوشی منع ہوتی ہے۔" عبداللہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"لیکن سب سگریٹ پیتے ہیں۔" سفیر ہنسا۔

"اسی طرح ہم آرمز بھی لے جائیں گے۔" عبداللہ بولا۔ "کل صبح کا وقت مناسب رہے گا۔ اس وقت سڑکوں پر رش بھی نہیں ہوتا ہے۔ ہم جلدی ائر کلب پہنچ جائیں گے اور اگر کسی نے تعاقب کرنے کی کوشش کی تو وہ بھی ہماری نظر میں آ جائے گا۔"

"میں اور میرے آدمی تعاقب یا مداخلت کرنے والے سے نمٹ لیں گے۔"

"عبداللہ یہ بہت رسکی کام ہے' تمہیں اور تمہارے آدمیوں کو پوری طرح چوکس رہنا ہو گا اور اگر کسی طرف سے مداخلت ہو تو اس کا پوری قوت سے جواب دینا ہو گا۔ دشمن کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

کسی چال کو کسی بھی قیمت پر ناکام بنانا ہوگا۔ مرشد جانتا ہے یہ عورتیں ہماری کمزوری ہیں اور وہ اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا رہا ہے۔"

عبداللہ سنجیدہ ہو گیا۔ "انشااللہ ایسا ہی ہو گا شہباز صاحب۔"

"ٹھیک ہے کل صبح سات بجے کا وقت ٹھیک رہے گا۔ تم بات کر لینا کہ ہیلی کاپٹر پرواز کے لیے تیار ملے۔"

عبداللہ نے سر ہلایا۔ "ہو جائے گا... بہ شرط کہ موسم ٹھیک رہے۔"

ابھی اس کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ باہر سے بادل گرجنے کی آواز آئی۔ وسیم نے اٹھ کر کھڑکی کا پردہ ہٹایا اور بولا۔ "لے بھئی بادلوں نے تیری بات سن لی ہے بارش کے آثار ہیں۔"

"میری بات سن لی ہے یا تمہارے دل کی بات سن لی ہے۔" عبداللہ نے معنی خیز انداز میں کہا تو وسیم کھسیا گیا۔ اسی لمحے بادل پہلے سے زیادہ زور سے گرجے اور یک دم تیز بارش شروع ہوگئی۔ ہم میں سے کوئی پریشان نہیں ہوا کیونکہ ابھی رات کے آٹھ بجے تھے اور صبح ہونے میں خاصا وقت تھا۔ اس کا امکان تھا کہ موسم ٹھیک ہو جائے۔ لیکن اس اتفاق نے سب کو محظوظ کیا تھا کہ ہم ابھی موسم کی بات کر رہے تھے اور موسم خراب ہو گیا۔ عبداللہ کھڑا ہو گیا۔ "میں جا رہا ہوں... ایاز کو بھی لے جا رہا ہوں ہمیں انتظامات کرنے ہوں گے۔"

بارش تیز تھی لیکن راولپنڈی اور اسلام آباد میں رہنے والوں کے لیے یہ معمول کی چیز تھی۔ وسیم نے اسے روکا۔ "کھانا کھا کر جانا۔"

"نہیں جا کر کھالوں گا۔" عبداللہ نے کہا۔ وسیم اس کے ساتھ باہر چلا گیا۔ سفیر اور میں رہ گئے تھے۔ سفیر نے میری طرف دیکھا۔

"آج کے واقعے پر مرشد کا کیا ردِعمل ہوگا؟"

"خوفناک... لیکن اسے کیسے معلوم ہوگا کہ یہ ہمارا کام ہے؟"

"مرشد کو احمق مت سمجھو... وہ واردات کے انداز سے بھی جان سکتا ہے۔ اس کا شبہ لازمی فتح خان اور ہماری طرف جائے گا۔"

"فتح خان کی طرف جانے کا زیادہ امکان ہے کیونکہ شہلا کا تعلق اس سے تھا۔ دوسرے فتح خان پہلے بھی اس کے خلاف ایسی سبوتاژ کی کارروائیاں کرتا رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن تم بھی ٹھیک کہہ رہے ہو مرشد کا خیال ہماری طرف بھی جا سکتا ہے اور وہ طبعاً کمینہ شخص ہے جو اپنے شک کو یقین کی حد تک لے جاتا ہے۔"

"اس صورت میں ہمیں زیادہ محتاط رہنا چاہیے۔ عبداللہ والی کوٹھی اس کے علم میں ہے اور وہ وہاں کوئی کارروائی کر سکتا ہے۔" سفیر نے کہا تو مجھے اس کی بات میں وزن محسوس ہوا تھا۔ مرشد جیسے آدمی سے کچھ بعید نہیں تھا ابھی دو دن پہلے اس نے اپنے بھائی کو مروانے کی کوشش کی تھی۔ وہ عبداللہ کی کوٹھی پر بھی حملہ کروا سکتا تھا اگر وہ کوٹھی کو تباہ کرانے کی کوشش کرتا تو یہ کام مشکل نہیں تھا۔ بم اور راکٹ لانچر جیسی چیزیں اب عام دستیاب ہیں۔ مرشد جیسے لوگ تو اس سے بھی زیادہ مہلک اسلحہ حاصل کر سکتے تھے اور استعمال بھی کر جاتے کیونکہ انہیں جس قانون کا خوف تھا وہ تو خود ان کا رکھوالا تھا۔ عبداللہ کی سیکورٹی کسی حملہ آور کو کوٹھی میں داخلے سے روکنے کے لیے تھی لیکن اگر کوئی تباہی کے ارادے سے دور سے حملہ کرتا تو عبداللہ کے آدمی شاید ہی اسے روک پاتے۔ مارنے اور بھاگ جانے والے کو روکنا بہت مشکل کام ہے یہی وجہ ہے گوریلا وار میں چند سو گوریلوں پر قابو پانے کے لیے بعض اوقات ایک بریگیڈ فوج بھی ناکافی ثابت ہوتی ہے۔

"عبداللہ کے ذہن میں بھی یہ بات ہو گی۔" میں نے کہا۔

"ممکن ہے لیکن اسے پھر بھی خبردار کر دینا مناسب ہے۔ وہ آج رات کے لیے اپنی سیکورٹی کو ہائی الرٹ کر دے۔" سفیر نے کہا اور موبائل نکالتا ہوا باہر گیا۔ کیونکہ عبداللہ اور ایاز جا چکے تھے اس لیے سفیر کال پر ہی ان سے رابطہ کر سکتا تھا۔ میں باہر آیا تو بیتو اور مانی بدستور گڈیاں گن رہے تھے اور وسیم کل رقم کا حساب لگا رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "میں نے عبداللہ کو رقم دینے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے نہیں لی اس کا کہنا ہے اس کے پاس رقم موجود ہے۔"

"ہاں راجا عمر دراز نے اسے ہمارے لیے کھلی رقم دے رکھی ہے۔" میں نے کہا۔ "اگرچہ مجھے اچھا نہیں لگتا ہے لیکن مجبوری ہے، میں راجا صاحب کے خلوص کو سختی سے نہیں ٹھکرا سکتا۔"

سفیر کال کر کے آ گیا تھا اس نے کہا۔ "تم دونوں میں سے ایک میرے ساتھ چلے کھانا گرم کر کے لگانا ہے۔"

"آپ خود کر لو۔" بیتو نے کہا۔ "ہم مصروف ہے۔"

"مصروف کے بچے۔" سفیر نے ہنس کر کہا۔ "ٹھیک ہے لگے رہو نوٹوں کے ساتھ، اب انہیں ہی کھانا۔ میں اپنا، شوبی اور وسیم کا کھانا گرم کرنے جا رہا ہوں۔"

"میں چلتا ہوں یار۔" میں نے کہا۔ ہم کچن میں آئے اور شاپرز میں موجود سالن نکال کر گرم کرنے لگے۔ عبداللہ سری پائے اور کٹا کٹ لے کر آیا تھا، ساتھ میں نرم تندوری روٹی تھی۔ سفیر بڑبڑا رہا تھا۔

میں نے کہا۔ "یار بچے ہیں۔"

"یہ بچے ہیں؟" سفیر نے احتجاج کیا۔ "کھانے میں تو میرے بھی باپ بنتے ہیں۔ ابھی دیکھنا کھانا لگے گا تو سب چھوڑ کر دوڑے آئیں گے۔"

ایسا ہی ہوا میں نے سفیر کے ساتھ مل کر کھانا گرم کر کے ٹیبل پر لگایا تو انہیں بلانے کی ضرورت بھی پیش نہیں آئی۔ وہ خود بھاگے آئے تھے خوشبو پر۔ آتے ہی اپنے لیے نکالا اور کھانا شروع کر دیا۔ سفیر نے شکایتی نظروں سے میری طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو دیکھیں ان کی حرکتیں۔ میں مسکرا کر رہ گیا۔ عمر کے لحاظ سے وہ دونوں بالغ تھے لیکن مزاج کے اعتبار سے بچے تھے اور سفیر ان کے ساتھ بچہ بنتا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ دونوں طرف سے چھیڑ چھاڑ ہوتی ہے۔ آخر میں وسیم بھی آ گیا۔ کھانے کے دوران مجھے دونوں اسیروں کا خیال آیا۔ "ان کو بھی کچھ دیا ہے کھانے کو؟"

"ہاں شام کو بچا کھچا ڈال دیا تھا۔" سفیر نے بتایا۔ "میں نے مانی کے ساتھ مل کر صابر سے تفتیش کی تھی۔"

"اللہ معاف کرے۔" مانی نے نوالہ حلق سے اتار کر کانوں کو ہاتھ لگائے۔ "سفیر بھائی نے ظلم و تشدد کی انتہا کر دی تھی۔"

"چند تھپڑوں اور لاتوں کو تم انتہا کہہ رہے ہو۔" سفیر نے اسے گھورا۔

میں نے سر ہلایا۔ "برخوردار ابھی تم نے وہ نہیں دیکھا ہے جو ہم دیکھ کر آ رہے ہیں" کہہ کر میں نے سفیر سے پوچھا۔ "اس نے مزید کچھ بتایا؟"

سفیر نے سر ہلایا۔ "مرشد کو شہلا کے ساتھ مہرو نام کی ایک عورت کی تلاش تھی۔"

میں چونک گیا۔ "مہرو... اسے مہرو کے بارے میں پتا ہے؟"

"صابر کے انکشاف سے تو ایسا ہی لگ رہا ہے۔" سفیر نے اثبات میں سر ہلایا۔ "مرشد نے اسے مہرو کا حلیہ بتایا تھا۔"

میں فکرمند ہو گیا۔ "اس کی تلاش کے بارے میں وہ کیا کہتا ہے؟"

"اس کا کہنا ہے کہ وہ ابھی تک اسے تلاش نہیں کر سکا ہے۔"

سفیر کے انکشاف نے میرے لیے کھانا مشکل کر دیا تھا اور اب میں جلد از جلد صابر سے بات کرنا چاہتا تھا۔ جیسے تیسے میں نے کھانا مکمل کیا اور کھڑا ہو گیا۔ سفیر نے میری طرف دیکھا۔ "خیریت تم نے صحیح سے کھایا بھی نہیں ہے۔"

"بس یار اتنی ہی بھوک تھی۔ میں ذرا صابر سے بات کر لوں۔"

میں اوپر آیا، چہرے پر شیر کا نقاب پہنا۔ خالی کمرے میں صابر بدستور لباس سے عاری ایک کونے میں سکڑا سمٹا بیٹھا تھا۔ بارش کے بعد سردی کی شدت میں نمایاں اضافہ ہوا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی التجا کی۔ "خدا کے لیے میرے کپڑے لا دو مجھے سردی لگ رہی ہے۔"

میں کچھ دیر اسے گھورتا رہا پھر سرد لہجے میں کہا۔ "کپڑے بھی مل جائیں گے لیکن پہلے میرے کچھ سوالوں کے جواب دو۔"

"سب تو پوچھ لیا ہے تم نے..." وہ کراہ کر بولا۔ تفتیش کے نشانات اس کے چہرے اور جسم پر نظر آ رہے تھے۔

"تم نے بہت کچھ نہیں بتایا ہے۔" میں نے کہا۔ "مرشد نے تمہیں مہرو نامی عورت کو تلاش کرنے کا حکم دیا تھا لیکن تم نے یہ بات مجھ سے چھپائی تھی۔"

"وہ..... اس وقت میرا خیال تھا کہ اس کا تم سے تعلق نہیں ہے۔" صابر نے جلدی سے وضاحت کی۔ "اس طرح تو میں بہت ساری باتیں جانتا ہوں اگر تم کو بتانے بیٹھ گیا تو کئی دن لگ سکتے ہیں۔"

"اب تمہیں پتا چل گیا ہے کہ اس کا ہم سے تعلق ہے اس لیے اس بارے میں تم جو جانتے ہو سب بتاؤ گے۔"

"میں تمہارے ساتھی کو سب بتا چکا ہوں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "سب نہیں بتایا ہے..... مرشد نے اس عورت کو تلاش کرنے کا حکم دیا تھا لیکن اس نے کچھ نہ کچھ اشارہ بھی کیا ہوگا کہ وہ کہاں ملے گی؟"

"اس نے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔"

"صابر مجھے بے وقوف مت سمجھو..." مرشد تم سے ایک بالکل اجنبی عورت کی تلاش کی امید کیسے کر سکتا ہے جب تک تمہیں اس بارے میں کچھ نہ کچھ معلوم نہ ہو۔"

"میں سچ..."

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ میں نے اچانک اسے گردن سے پکڑ کر کھینچا اور سامنے کی دیوار پر دے مارا۔ وہ ایک دھماکے کے ساتھ دیوار سے ٹکرایا اور پٹ سے نیچے گرا تھا۔ وہ مرا نہیں تھا لیکن اداکاری ایسی کر رہا تھا جیسے اس تصادم سے اس کی جان نکل گئی ہو۔ مگر جب میں نے اس کی رانوں کے درمیان پاؤں رکھا تو وہ تڑپ کر بیٹھ گیا۔ اس بار میں نے گھٹنا اس کے منہ پر مارا تو وہ دوبارہ لیٹ گیا۔ دو منٹ کے اندر میں نے اس کی ہڈی پسلی برابر کر دی تھی۔ اس کے منہ ناک سے خون جاری ہو گیا تھا اور وہ دہائیاں دے رہا تھا۔ اس کی شاید ایک پسلی ٹوٹ گئی تھی اور جبڑا بھی متاثر ہوا تھا۔ میں رک گیا۔ مگر مجھے اس پر رحم نہیں آیا، اس نے کسی بھیڑ بکری کی طرح شہلا کو مرشد کے حوالے کر دیا تھا، یہ سوچے بغیر کہ وہ اس کا کیا حشر کرے گا۔ وہ حشر جو میں دیکھ کر آ رہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ صابر کا اس سے بھی برا حال کروں۔ میں نے غرا کر کہا۔ ”اگر اب بھی تمہاری یادداشت بحال نہیں ہوئی ہے تو میں...“

”خدا کے لیے۔“ وہ دہشت زدہ ہو کر پیچھے سرکا۔ اس وقت وہ اپنی عریانی بھی بھول گیا تھا۔

”صابر... اگر اس وقت میں تمہیں قتل کر دوں تو یہ عین انصاف ہوگا۔ میں شہلا کو ایسی حالت میں دم توڑتے دیکھ کر آ رہا ہوں کہ اس کے جسم کا کوئی حصہ زخموں سے خالی نہیں تھا۔ مرشد کے کتوں نے اذیت پہنچانے کی انتہا کر دی تھی۔ بہرحال اب وہ کتے نہیں رہے ہیں اور نہ ہی مرشد کی وہ منحوس کوٹھی باقی رہی ہے وہاں صرف ایک بہت بڑا گڑھا رہ گیا ہے۔“

صابر کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ ان سے بے پناہ خوف جھلک رہا تھا۔ اس نے کراہ کر کہا۔ ”میرے خدا اب مرشد مجھے نہیں بخشے گا اسے معلوم ہو جائے گا کہ میں نے اس کے بارے میں بتایا ہے، وہ مجھے میرے خاندان سمیت مار ڈالے گا۔“

”تم ہو بھی اسی قابل۔“ میں نے بے رحمی سے کہا۔ ”اگر تم نے مجھے پوری بات نہیں بتائی تو میں تمہیں مرشد ہاؤس کے سامنے پھنکوا دوں گا۔ تمہارے ساتھ ایک رقعہ ہوگا جس میں تمہارے کارنامے لکھے ہوں گے۔ اس کے بعد مرشد تمہارے اور تمہارے خاندان کے ساتھ کیا کرے گا یہ تم صرف سوچ سکتے ہو۔“

”تم ایسا نہیں کرو گے...“ وہ مرنے کی حد تک خوفزدہ ہو گیا تھا۔ اس کی رنگت دھلے لٹھے کی طرح سفید پڑ گئی تھی۔

”میں نے بتا دیا ہے میں ایسا ہی کروں گا، اگر تم نے مجھے مہرو کے بارے میں نہیں بتایا۔“

وہ سوچنے لگا پھر بولا۔ ”سنو اگر تم وعدہ کرو کہ تم مجھے چھوڑ دو گے تو میں تمہیں مہرو کے بارے میں وہ بتا دوں گا جو میں نے مرشد کو نہیں بتایا ہے۔“

میں چونکا۔ ”کیا مطلب تم مہرو کے بارے میں کچھ جان چکے ہو؟“ ”تم نے پہلے جھوٹ بولا تھا۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”لیکن یہ سچ ہے۔ یہ بات اتفاق سے میرے علم میں آئی...“ میں نے خاص طور سے کوشش نہیں کی تھی۔“

”تم بات بتاؤ اگر مجھے لگا کہ تم سچ بول رہے ہو تو میں وعدہ کرتا ہوں تمہیں چھوڑ دوں گا۔“

وہ بہ مشکل پیچھے ہو کر دیوار سے ٹک کر بیٹھ گیا۔ ”میں تمہارے وعدے پر اعتبار کر رہا ہوں... میرا ایک جاننے والا ہے جو خانہ بدوشوں کی مدد سے کشمیر میں کنٹرول لائن کے دونوں طرف اسمگلنگ کرتا ہے۔ وہ مجھ سے ملا تو میں نے مہرو کا ذکر کر دیا۔ وہ مہرو کے بارے میں تو نہیں جانتا تھا لیکن وہ جس قبیلے سے کام لیتا تھا پچھلے دنوں وہ راولپنڈی کے پاس کسی حادثے کا شکار ہوا اور اس کے کئی لوگ مارے گئے۔ ساتھ ہی ایک لڑکی بھی غائب ہو گئی تھی۔ ایک دو ہفتے قبیلے والے سرگرمی سے لڑکی کو تلاش کرتے رہے اس کے بعد وہ اچانک ہی یہاں سے چلے گئے۔ اس شخص کو قبیلے والوں سے کچھ کام تھا وہ ان کے پیچھے آزاد کشمیر تک گیا تھا لیکن وہ لوگ اتنی دیر میں لائن آف کنٹرول کے دوسری طرف جا چکے تھے۔“

میں نے شک سے اسے دیکھا۔ ”بکواس کرتے ہو تم، لائن آف کنٹرول پر بھارتیوں نے اتنی سختی کر رکھی ہے کہ ایک چیونٹی بھی ان کی نظروں میں آئے بغیر پار نہیں جا سکتی۔“

”یہ ٹھیک ہے لیکن لائن آف کنٹرول کے بعض حصے ایسے ہیں جن کی نگرانی ناممکن ہے، وہاں فوج بھی نہیں لگائی جا سکتی ہے۔ یہ خانہ بدوش ایسی جگہوں سے لائن آف کنٹرول پار کرتے ہیں۔“

”اپنے سامان اور بیوی بچوں سمیت؟“

”ہاں ان کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔“ صابر نے ناک سے بہنے والا خون ہاتھ کی پشت سے صاف کیا۔

اگر اس کی بات درست تھی تو مہرو کا قبیلہ اس بریف کیس سمیت بھارت کے مقبوضہ کشمیر میں جا چکا تھا۔ خود مہرو کہاں تھی اس بارے میں صابر نے کچھ نہیں بتایا تھا، میں نے اس کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا۔ ”میں نہیں جانتا..... ممکن ہے مہرو اپنے قبیلے والوں کو مل گئی ہو یا ممکن ہے

نہ ملی ہو، یہ تو اسی وقت پتا چل سکتا ہے جب میں اس قبیلے تک رسائی حاصل کر لوں۔“

صابر کی بات نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کر لیا تھا۔ ”صابر فی الحال میں تمہیں کچھ سہولتیں دے رہا ہوں لیکن اس کا غلط مطلب مت نکالنا۔“ میں نے اسے خبردار کیا اور باہر آیا۔ اس کا لباس کمرے میں پھینکا۔ پھر ایک چھوٹا تولیا گیلا کر کے لایا جس سے اس نے اپنے زخم صاف کیے۔ سردی سے بچنے کے لیے اسے ایک کمبل اور ایک تکیہ دیا۔ زخموں کے لیے اسے ایک اینٹی بایوٹک کیپسول اور دو عدد پین کلر گولیاں دیں۔ کھانا وہ پہلے ہی کھا چکا تھا۔ رات سو کر گزارتا تو صبح تک اس کی حالت خاصی بہتر ہو جاتی۔

جیسے جیسے بریف کیس کی لوکیشن کے بارے میں میرے علم میں اضافہ ہو رہا تھا میری پریشانی میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ پہلے بریف کیس آزاد کشمیر میں کہیں تھا اور اب یہ لائن آف کنٹرول عبور کر کے مقبوضہ کشمیر جا چکا تھا۔ ہم آزاد کشمیر تک جا سکتے تھے لیکن مقبوضہ کشمیر تک رسائی حاصل کرنا جان جوکھم کا کھیل تھا۔ مجھے اب تک یہ بات ہضم نہیں ہو رہی تھی کہ خانہ بدوش قبیلے لائن آف کنٹرول کے پار جاتے رہتے تھے۔ یہ دنیا کی مشکل ترین اور خطرناک ترین سیر حد تھی جو دنیا کے دشوار گزار ترین خطے میں واقع تھی۔ دنیا کی چوتھی اور چھٹی بڑی فوجی قوتیں یہاں برسرپیکار تھیں۔ یہاں سوائے فوج کے اور کسی کی نقل و حرکت نہایت مشکل کام تھا۔ سچی بات ہے صابر کی یہ بات مجھے ہضم نہیں ہو رہی تھی کہ بریف کیس سمیت خانہ بدوش قبیلہ کنٹرول لائن کے پار جا چکا ہے۔

میں نے واپس آ کر سفیر اور وسیم کو تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کیا۔ وسیم بولا۔ ”مجھے تو لگ رہا ہے کہ وہ بریف کیس ہمارے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔“

”ہو سکتا ہے لیکن ایک نیا خطرہ سامنے آیا ہے۔ ممکنہ طور پر چینی حکومت مجھے اور بیتو کو اس بریف کیس کی گم شدگی کا ذمے دار قرار دے رہی ہے اور اس نے پاکستانی انٹیلی جنس حکام کو میری اور بیتو کی تصاویر بھی فراہم کی ہیں۔ مگر فی الحال پاکستانی حکام نے اس سلسلے میں معذرت کر لی ہے۔ میں انٹیلی جنس کی تحویل میں رہ کر آیا ہوں اگر وہ چاہتے تو مجھے اس معاملے میں گرفتار کر لیتے۔“

”لیکن انہوں نے تجھے چھوڑ دیا۔“ سفیر بولا۔

”ہاں مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مقامی حکام کا یہ رویہ برقرار رہے گا اگر ان پر بیرونی دباؤ آئے تو یہ یوٹرن لینے میں دیر نہیں لگاتے ہیں۔ اس لیے ہماری بچت کے لیے اس بریف کیس کی واپسی لازمی ہے۔“

وسیم غور سے میری بات سن رہا تھا۔ ”آپ کا مطلب ہے ہم اس کے حصول کے لائن آف کنٹرول کے پار جائیں؟“

”میرا ہرگز بھی یہ مقصد نہیں ہے۔ بریف کیس جن لوگوں کے پاس ہے، ممکنہ طور پر وہ اس کی اہمیت سے ناواقف ہیں وہ اسے قیمتی ضرور سمجھتے ہوں گے۔ وہ اسے کھول بھی نہیں سکے ہوں گے۔“

”فرض کریں انہوں نے اسے کھولنے کی کوشش کی ہو اور وہ پھٹ کر ضائع ہو گیا؟“ وسیم نے کہا۔

”یہ ایک مفروضہ ہے۔ ممکن ہے وہ اسے اب تک سنبھال کر بیٹھے ہوں۔“

”ایک مفروضہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لائن آف کنٹرول کے دوسری طرف جانے کا مقصد بھارتیوں سے بریف کیس کا سودا کرنا ہو۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میرا خیال ہے وہ ایسی حماقت نہیں کریں گے۔ بھارتیوں سے سودا کرنے کے لیے ان کی زمین پر جانا ایسا ہی جیسے سانپ کا زہر نکالنے کے لیے اس کے بل میں ہاتھ ڈالنا۔ اگر انہوں نے سودا کرنا ہوتا تو یہیں رہ کر کرتے۔“

”تب آپ کے خیال میں وہ لائن آف کنٹرول کے پار کیوں گئے ہیں؟“

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”کیا مطلب کیوں گئے ہیں... بھائی وہ صدیوں سے ان راستوں پر اسی طرح سفر کرتے رہے ہیں۔ یہ ان کا روٹ ہے اور وہ اس پر سفر کر کے زندگی بتاتے ہیں۔ یہ ان کی کمائی کا ذریعہ ہے۔“

”آپ دو باتوں پر یقین رکھتے ہیں بلکہ تین باتوں پر، اول بریف کیس اب تک ان خانہ بدوشوں کے قبضے میں ہے، وہ نہ تو ضائع ہوا ہے اور نہ انہوں نے اس کا کسی سے سودا کیا ہے۔ دوسرے وہ اسے قیمتی سمجھتے ہیں لیکن اس کی اصل اہمیت سے بے خبر ہیں۔ تیسرے وہ اسے بدستور اپنے پاس رکھتے ہوئے واپس آئیں گے؟“

”تم نے ٹھیک کہا ہے میں تقریباً ان ہی خطوط پر سوچ رہا ہوں۔“

”یہ تو تیری خواہش ہوئی؟“ سفیر نے کہا۔

”تم اسے مثبت سوچ بھی کہہ سکتے ہو۔“ میں نے ملائمت سے کہا۔ ”اگر میں پہلے سے وہ ساری منفی باتیں سوچ

WWW.PAKSOCIETY.COM

لوں جو ممکنہ طور پر ہو سکتی ہیں تو میں بریف کیس کو تلاش کرنے اور واپس حاصل کرنے کی کوشش ہی نہیں کروں گا۔ اس لیے ہمیں مثبت ذہن کے ساتھ اپنا کام کرنا چاہیے۔ اس میں نقصان کا اندیشہ نہیں ہے لیکن ہم کوشش ہی نہ کریں اور بعد میں پتا چلے کہ ہم بریف کیس حاصل کر سکتے تھے لیکن موقع گنوا دیا۔"

سفیر اور وسیم کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ میری بات سے متفق نہیں ہیں، شاید ان کی خواہش تھی کہ میں اپنی ساری توجہ مرشد کی طرف رکھوں۔ وہ شاید بریف کیس کی اہمیت نہیں سمجھے تھے یا سمجھے تھے لیکن میرے لیے اس کی اہمیت تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے۔ میں اسے آنے والے وقت میں ایک بڑے رسک کے طور پر دیکھ رہا تھا۔ یہ حکومت کا معاملہ تھا کسی فردِ واحد کا معاملہ نہیں تھا۔ حکومتوں کے معاملات ایک نتیجے پر پہنچے بغیر بند نہیں ہوتے ہیں، جبکہ معاملہ ایک سپر پاور کا بھی ہو۔ جس سے ہمارے بہت اچھے تعلقات تھے اور ایک فردِ واحد کی خاطر ان تعلقات کو خراب نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میرے ذہن میں یہ تلخ حقیقت پوری شدت سے واضح تھی کہ ایک پاکستانی کے طور پر میں ایک نہایت کمزور ملک کا شہری ہوں اور بین الاقوامی طور پر میرے کوئی حقوق ہیں تو انہیں تسلیم کرانے والی کوئی طاقت میری پشت پر نہیں ہے۔ مجھے اپنے دفاع کے لیے جو کرنا تھا خود ہی کرنا تھا۔ اپنے ساتھیوں کے تاثرات دیکھتے ہوئے میں نے فی الحال مزید بحث سے گریز کیا۔

"میرا خیال ہے ماہا کو چھوڑ دیتے ہیں۔"

"سونے کی ڈلی کا کیا کرنا ہے؟" سفیر نے پوچھا۔

"وہ بھی اسے دے دو..." میں نے کہا۔ "وسیم، اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے کسی ایسی جگہ چھوڑ آؤ جہاں سے وہ مدد حاصل کر سکے۔"

وسیم نے سر ہلایا اور کھڑا ہو گیا۔ ہم لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ سفیر نے ٹی وی آن کر دیا۔ ایک نیوز چینل سے مرشد کی تباہ ہونے والی کوٹھی کے بارے میں خبر آ رہی تھی۔ نیوز کاسٹر بتا رہی تھی کہ کوٹھی مرشد علی نامی سیاست دان اور رکن قومی اسمبلی کی ملکیت ہے جو آج کل حکومت میں شامل ہے اس سے پہلے بھی اس کی ملکیت میں دو فیکٹریاں اور ایک کیمیکل فارم اسی طرح تباہی کا شکار ہوئے تھے۔ مرشد علی نے اس کا الزام اپنے سیاسی حریفوں پر لگایا تھا۔ خبر میں نادر علی کی کوٹھی میں ہونے والا دھماکا بھی شامل تھا۔ ڈھکے چھپے انداز میں بتایا گیا کہ مرشد علی کی اپنی شہرت اچھی نہیں تھی، ماضی اور حال میں وہ کئی ایسے واقعات میں ملوث رہا تھا جن سے اس کی شہرت کو داغ لگا تھا۔ کالی کوٹھی کی تباہی نے مرشد کو سب کی توجہ کا مرکز بنا دیا تھا۔ مختلف چینل والے اس کے بارے میں خبریں کھود کھود کر لا رہے تھے۔

کام کی رپورٹ ایک انگریزی زبان کے چینل سے ملی۔ پولیس حکام کے مطابق کوٹھی میں آگ لگانے والے بم نصب تھے اور جب کوٹھی میں آگ لگی تو اس میں کہیں ذخیرہ کیا ہوا گولہ بارود بھی پھٹا اور اس سے کوٹھی مکمل طور پر تباہ ہو گئی۔ اس دھماکے کی زد میں آ کر چار پولیس اہلکار ہلاک اور اتنے ہی شدید زخمی ہوئے تھے۔ وہ اس وقت کوٹھی کے پاس تھے اور وہاں ہونے والے دھماکوں کی آوازیں سن کر آئے تھے کہ ناگہانی طور پر پہلے آگ لگی اور پھر دھماکا ہو گیا۔ پولیس پارٹی اس دھماکے کی لپیٹ میں آ گئی۔ انہیں فرض شناسی مہنگی پڑی تھی۔ پولیس نے اس تباہی کا ذمے دار نامعلوم افراد کو قرار دیا تھا۔ پولیس کے علاوہ کسی اور تحقیقاتی ایجنسی کی طرف سے تفتیش کا امکان بھی مسترد کر دیا تھا۔ مرشد علی نے فی الحال کسی خاص شخص پر شبہ ظاہر کرنے سے گریز کیا تھا اور اس نے فوری طور پر میڈیا والوں سے بات کرنے سے معذرت کرتے ہوئے عنقریب ایک پریس کانفرنس کر کے حقائق قوم کے سامنے لانے کا وعدہ کیا تھا۔ البتہ اس نے کوٹھی میں کسی قسم کے غیر قانونی اسلحے یا گولہ بارود کی موجودگی کی نفی کی تھی۔

"حقائق قوم کے سامنے لانے کا وعدہ۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "کیسے کیسے لوگ ہمارے لیڈر بنے ہوئے ہیں۔"

"ایسے ہی لیڈر ہیں یار۔" سفیر نے کہا۔ "ان ہی لوگوں نے اس ملک کا یہ حال کیا ہے۔"

"ان لوگوں نے نہیں ہم جیسی بے حس عوام نے جسے ذرا فکر نہیں ہے کہ حکمران ملک و قوم کا مفاد کتنے سستے داموں بیچ رہے ہیں اور عوام کو صرف اپنی پڑی ہے۔ اگر لوگ متحد ہو جائیں صوبائیت، لسانیت، فرقہ واریت اور ہر قسم کی تقسیم بھول کر صرف پاکستانی بن جائیں۔ یقین کرو یہ سیاست دان، جاگیردار وڈیرے اور لٹیرے ملک چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔"

سفیر نے ٹھنڈی سانس لی۔ "تو ٹھیک کہتا ہے لیکن جو تو کہتا ہے وہ ہو گا نہیں۔"

"ہو گا۔" میں نے یقین سے کہا۔ "اب نہیں تو دس سال بعد پچاس سال بعد یا سو سال بعد ہو گا۔ سفیر قوموں کی صدیاں سالوں کی طرح ہوتی ہیں۔ ہم اپنے لحاظ سے سوچتے کہ ہم برسوں میں بنتے یا بگڑتے ہیں لیکن قومیں صدیوں میں بنتی بگڑتی ہیں۔ تبدیلی آئے گی... اس ملک کو میں نے یا تم نے نہیں بنایا ہے۔ اسے اللہ نے بنایا ہے۔ اسے میں یا تم نہیں چلا رہے

ہیں اسے اللہ چلا رہا ہے۔"

سفیر نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ "شہباز تو اس طرح سوچتا ہے؟"

"ہاں بہت سارے لوگوں کے نزدیک یہ ایک احمقانہ آئیڈیلسٹ سوچ ہے۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "وہ لوگ جو اپنے منصوبوں، اپنی آل اولاد اور اپنے کاروباروں و کاموں کے لیے بدترین حالات میں بھی پُرامید ہوتے ہیں۔ لیکن جیسے ہی پاکستان کے مستقبل کی بات آتی ہے وہ یوں منہ بھر کر اس کی تباہی اور خاتمے کی پیش گوئیاں کرنے لگتے ہیں جیسے نعوذ باللہ اس ملک کے کاتبِ تقدیر وہی ہیں۔ انہیں اس ملک کے لیے ذرا بھی امید نظر نہیں آتی ہے اور جو امید کی بات کرتا ہے اسے یہ احمق قرار دیتے ہیں۔ میرا ایمان ہے یہ ملک قائم رہنے کے لیے بنا ہے اور قائم رہے گا۔ اس کی تباہی اور خاتمے کی پیش گوئیاں کرنے والے خود ختم ہو جائیں گے۔ نئے لوگ آئیں گے جو اسے آگے لے جائیں گے اور پرانے یوں صاف ہو جائیں گے جیسے خزاں میں جھڑ جانے والے پتے غائب ہو جاتے ہیں اور بہار میں نئے پتے نکل آتے ہیں۔ کوئی عمارت، کوئی باغ اور کوئی راستہ بنانے سے پہلے کچرا صاف کیا جاتا ہے تو سفیر صاحب ہم وہی کچرا ہیں ہم صاف ہوں گے تو کوئی نئی صورت سامنے آئے گی۔"

سفیر نے تالیاں بجائیں۔ "اتنی زبردست تقریر..." شہباز تجھے تو سیاست دان ہونا چاہیے..." تو سب کو سیدھا کر دے گا۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "سیاست دان اسی معاشرے کی پیداوار ہیں اور عوام کا زیادہ منافقانہ ورژن ہیں ہمیں خود کو ٹھیک کرنا ہے۔ جب ہم ٹھیک ہوں گے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

سفیر نے جماہی لی۔ "ٹھیک ہے یار ٹھیک کر لیں گے... اتنی جلدی کیا ہے..... مجھے تو نیند آ رہی ہے۔"

"تو سو جا... میں دیکھوں کہ ان لوگوں نے رقم گن لی۔ چار گھنٹے سے اسی کام میں لگے ہوئے ہیں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

مانی اور بیتو اب اسٹڈی میں تھے۔ انہوں نے کام مکمل کر لیا تھا اور اب کمپیوٹر پر کوئی گیم کھیل رہے تھے۔ دونوں کے ہاتھ میں جوائے اسٹک تھی۔ اسے استعمال کرتے ہوئے ان کے جسم بھی حرکت کر رہے تھے۔ رقم انہوں نے واپس سوٹ کیس میں پیک کر دی تھی۔ میں نے رقم کے بارے میں پوچھا تو مانی نے گیم روک دیا اس پر بیتو نے شور مچایا۔

"یہ بے ایمانی ہے تم ہار رہا تھا اس لیے گیم روک دیا۔"

"کوئی بات نہیں تم اسے دوبارہ ہرا دینا۔" میں نے اسے تسلی دی۔ مانی نے پیڈ اٹھایا جس پر اس نے سارا حساب لکھایا لکھوایا تھا۔

"شوبی بھائی... سوٹ کیس میں ٹوٹل ٹو ففٹی تھری گڈیاں ہیں۔ ان میں فورٹی ہنڈرڈز کی، ون ہنڈرڈ اینڈ سیون فائیو ہنڈرڈ کی، ناٹی ون تھاؤزینڈ کی ہیں اور ففٹین فائیو تھاؤزینڈ کی ہیں۔"

میں حیران ہوا یہ سوا دو کروڑ روپے سے زیادہ کی رقم تھی جو مرشد نے یوں بے پروائی سے اس کوٹھی میں ڈال رکھی تھی۔ بے شک مرشد کے لحاظ سے یہ کوئی بہت بڑی رقم نہیں تھی اس سے کئی گنا زیادہ مالیت کی تو کالی کوٹھی تھی۔ مگر مرشد جیسے آدمی کے لیے اپنے ایک ایک روپے کی بھی اہمیت تھی اور وہ اس معاملے میں کسی پر اعتبار کرنے والا شخص نہیں تھا۔ یقیناً یہ رقم کسی خاص مقصد کے تحت وہاں رکھی گئی تھی اور قسمت نے اسے ہماری جھولی میں ڈال دیا تھا۔ یہ دشمن کا مال تھا اور ہمارے لیے حرام نہیں تھا۔ مرشد نے کوٹھی کے ساتھ رقم کو بھی صبر کر لیا ہو گا کیونکہ اگر اسے ہم نہ لاتے تو یہ کوٹھی میں جل کر تباہ ہو جاتی۔ اب یہ ہمارے کام آتی۔ مجھے حساب بتا کر مانی دوبارہ بیتو کے ساتھ گیم میں لگ گیا۔ اس نے کوئی چالاکی کی تھی جو بیتو کی سمجھ میں نہیں آئی لیکن جب وہ ہارنے لگا تو اس نے شور کر دیا۔ میں اسٹڈی سے نکلا تو ان کی باقاعدہ لڑائی شروع ہو گئی تھی۔

سفیر سونے چلا گیا تھا۔ میں اوپر کمرے میں آیا وہاں لیپ ٹاپ دیکھ کر مجھے ایمن کا خیال آیا۔ اس کی رہائی کے بعد سے مجھے اس سے رابطہ کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ میں نے اپنا ای میل اکاؤنٹ کھولا۔ حسبِ توقع اس میں ایمن کی کئی ای میل موجود تھیں۔ ہر میل میں اس نے مجھ سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اس نے اپنے کونٹیکٹ نمبرز دیے تھے۔ وہ یقیناً واپس جا چکی تھی کیونکہ یہ سارے نمبرز برطانیہ کے تھے اور ای میلز دو دن سے آ رہی تھیں۔ میں نے انٹرنیٹ سے اس کے ایک نمبر پر کال کی، ایمن نے دوسری بیل پر کال ریسیو کی۔ "ہیلو۔"

"ہیلو... کیا حال ہیں؟"

"شہباز۔" اس نے چیخ ماری۔ "میرے خدا تم کہاں تھے، میں تمہیں ای میل کر کر کے تھک گئی۔"

"حسبِ معمول اپنے مہربانوں کے پاس تھا۔" میں نے

WWW.PAKSOCIETY.COM

معنی خیز انداز میں کہا۔ ''اپنے خان صاحب کے پاس۔''

''مجھے معلوم ہے شکر ہے تم چھوٹ گئے۔ لیکن تم نے مجھے کیسے بچایا... سچ پوچھو تو مجھے اب بھی یقین نہیں آرہا ہے، ایسا لگتا جیسے میں نے کوئی بھیانک خواب دیکھا تھا۔''

''بس یہ سب تمہارے چچا کی مہربانی ہے۔'' میں نے کہا اور مناسب اضافے و ترمیم کے ساتھ اسے اپنی کہانی سنائی۔ درمیان میں اس نے بہت سارے سوالات کیے تھے لیکن بالآخر میں نے اپنی بات مکمل کرلی۔

''شہباز تم اتنے مشکل مراحل سے گزرے۔'' وہ روہانسے لہجے میں بولی۔ ''فتح خان کو تم سے کس بات کا خوف ہے؟''

''یہ تو میں نہیں جانتا۔'' میں نے غلط بیانی سے کام لیا۔ میں نے اسے بریف کیس والے معاملے سے بے خبر رکھا تھا۔ ایمن کو اس معاملے سے بے خبر رکھنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ گوری اقوام میں ملک و قوم کا مفاد اولیت رکھتا ہے اور یہ اس پر خون و محبت کے رشتوں کو قربان کردیتے ہیں۔ ایمن مجھے پسند کرتی تھی اور اب شاید احسان مند بھی تھی لیکن اس کا بھی امکان تھا جب ملک کے مفاد کی بات آئے تو وہ یہ سب بھول جائے۔ میں نے اسے انٹیلی جنس والا حصہ بھی نہیں سنایا تھا۔ البتہ اس کے انکل کی خباثت کے بارے میں بتا دیا تھا۔

''ایمن اب تمہیں بہت محتاط رہنا ہوگا۔ ڈیوڈ شا نے اس شرط پر تمہارے معاملے میں دخل اندازی سے گریز کا وعدہ کیا تھا کہ میں اس کے کام آؤں گا۔''

''دخل اندازی۔'' ایمن پھٹ پڑی تھی۔ ''اس نے مجھے مروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔''

''یہ تو ہے لیکن عین آخری موقع پر جب جیکٹ کو ڈی ایکٹی ویٹ کیا جانا تھا تب ڈیوڈ شا نے مداخلت سے گریز کیا۔ کوڈ کونسلیٹ حکام کے توسط سے پہنچا تھا اور ان میں سے کوئی ڈیوڈ شا کے اشارے پر اس میں ایک نمبر کی تبدیلی کردیتا تو تم سوچ سکتی ہو تمہارے ساتھ کیا ہوتا۔''

''یہ ٹھیک ہے۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''وہاں سب اس کے غلام بیٹھے ہیں... اینی وے تم اب اس کے کام آؤ گے؟''

''اگر میرے معاملات سمٹ گئے۔ یہاں مرشد نے ایک بار پھر میرا پیچھا لے لیا ہے اور فتح خان بھی پیچھے ہے۔ یہ دونوں ڈیوڈ شا کے بندۂ بے دام ہیں۔ اگر وہ چاہے تو ان سے میرا پیچھا چھڑا سکتا ہے اس کے بعد ہی میں اس کے کسی کام آسکوں گا۔''

''میں نے... کچھ دیر پہلے ٹی وی پر مرشد کی ایک کوٹھی کے بارے میں خبر دیکھی ہے۔''

''ہم بھی دیکھ رہے ہیں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''میرا خیال ہے یہ فتح خان کا کام ہے۔ اس کا ایک کزن مرشد کے آدمیوں کے ہاتھ مارا گیا تھا تب سے وہ اس کا دشمن بنا ہوا ہے۔ اس کی کئی فیکٹریاں اور جائدادیں اسی طرح تباہ کرچکا ہے۔ مرشد بھی اس کے خون کا پیاسا ہو رہا ہے۔ خیر دفعہ کرو اسے یہ بتاؤ تم کیسی ہو اور کہاں ہو؟ واپس کب پہنچیں؟ میرا خیال ہے ابھی آرام کر رہی ہوگی۔''

''میں گھر آگئی ہوں اور کیسی ہوں یہ دیکھنے کے لیے اسکائپ پر آجاؤ۔'' اس نے ترغیب آمیز لہجے میں کہا۔ ''میں بھی تمہیں دیکھنا چاہتی ہوں۔''

لیپ ٹاپ میں اسکائپ انسٹال تھا۔ ایمن نے مجھے اپنی آئی ڈی بتائی۔ میں نے پہلے اپنی آئی ڈی بنائی اور پھر ایمن کو ایڈ کیا اسے کال کی تو وہ فوراً آگئی۔ سامنے اسکرین پر اس کی لائیو ویڈیو آنے لگی۔ وہ اپنے گھر میں تھی اور خاصے گھریلو لباس میں تھی۔ لندن میں یقیناً غضب کی سردی تھی لیکن ایمن کا گھر سینٹرلی ہیٹڈ تھا اس لیے وہ آرام سے نہ ہونے کے برابر لباس میں بیٹھی تھی اور پہلی نظر پڑتے ہی میں نے دل میں لاحول پڑھی۔ مختصر سے بلاؤز اور مختصر ترین نیکر میں اس کا صحت مند سراپا چھلکا پڑ رہا تھا۔ اس نے نہایت اشتیاق سے پوچھا۔ ''کیسی لگ رہی ہوں؟''

''بالکل ٹھیک... لگ ہی نہیں رہا ہے کہ تم اتنے بڑے حادثے سے گزر کر آرہی ہو بلکہ لگتا ہے کسی صحت افزا مقام پر لمبی چھٹیاں گزار کر آرہی ہو۔''

''پریشانیاں میری صحت پر زیادہ اثر نہیں ڈالتی ہیں۔'' اس نے کسی قدر جھجکتے جھلاہٹ کے ساتھ کہا۔ ''میں اپنے بارے میں پوچھ رہی ہوں کہ کیسی لگ رہی ہوں۔''

''ہمیشہ کی طرح دل کش اور ہوش رُبا۔''

اس بار وہ دل سے ہنسی۔ ''سچ میں تمہیں اچھی لگتی ہوں۔''

''ہاں بابا... تم پہلے بھی کئی بار پوچھ چکی ہو اور میں کئی بار بتا چکا ہوں تم مجھے کتنی اور کس طرح سے اچھی لگتی ہو۔''

اس کی ہنسی بجھ گئی۔ ''یعنی میں تمہیں صرف دوست ہونے کی حیثیت سے اچھی لگتی ہوں۔ میرا خوب صورت لڑکی ہونا تمہارے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا ہے۔''

''رکھتا ہے لیکن کسی اور معنی میں نہیں۔'' میں نے کہا۔

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی پھر اس نے سرد آہ بھری۔ ''شہباز کاش...''

اس نے آگے کچھ نہیں کہا اور میں نے پوچھا بھی نہیں۔ بات جتنی کٹتی رہے اتنا اچھا ہوتا ہے۔ ایک بار کھل جائے تو معاملہ جب تک کسی ایک کروٹ نہ بیٹھ جائے حل نہیں ہوتا اور خواتین سے اللہ بچائے بندے کو کھینچ تان کر اپنے موضوع پر لے آتی ہیں اس لیے میں ایمن سے سوچ سمجھ کر بات کر رہا تھا۔

''ایمن تم بہت محتاط رہو... ڈیوڈ کمینہ آدمی ہے۔ وہ اس سے پہلے بھی میرے ساتھ وعدہ خلافی کرچکا ہے۔''

''تم فکر مت کرو، میں نے اسے بہت ڈھیل دے دی ہے اب میں معاملے کو عدالت تک لے جاؤں گی۔''

''تم حماقت کروگی۔'' میں بے چین ہوگیا۔ ''تم ڈیوڈ شا کے اصل روپ سے واقف نہیں ہو یا سرسری سا جانتی ہو، اس کا بھیانک روپ میں نے دیکھا ہوا ہے۔ اس سے الجھنے کی کوشش مت کرو۔ ویسے تم عدالت میں بھی اس سے نہیں جیت سکتیں۔ تم نے حکومتی اداروں پر اس کا اثر و رسوخ دیکھ لیا ہے۔''

''ہاں لیکن برطانیہ میں عدالتیں آزاد ہیں۔''

''عمومی تاثر ایسا ہی ہے لیکن کیا برطانوی عدالتیں ہر معاملے میں انصاف کرتی ہیں۔'' میں نے کسی قدر چبھتے لہجے میں پوچھا۔ ''نہیں، بہت سارے معاملات میں وہ حکومت یا عوام کی خواہش کے مطابق بھی فیصلہ کرتی ہیں حال ہی میں کئی ایسے فیصلے سامنے آئے ہیں۔ میں حوالہ نہیں دوں گا لیکن تم سمجھ گئی ہوگی۔ ڈیوڈ شا بھی کچھ ایسا ہی استثنار رکھتا ہے۔''

وہ سمجھ گئی تھی کہ میرا اشارہ دہشت گردی کے حوالے سے بعض کیسز کے فیصلوں کی طرف ہے جن پر انسانی حقوق کی تنظیموں کی جانب سے تنقید کی گئی تھی۔ ''تو تم چاہتے ہو میں ڈیوڈ شا کے خلاف عدالت میں نہیں جاؤں؟''

''میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ فی الحال چپ کرکے بیٹھ جاؤ۔ ڈیوڈ شا جو کھیل کھیل رہا ہے اس میں آدمی زیادہ عرصے اپنی پوزیشن برقرار نہیں رکھ سکتا ہے۔ وہ مارا جاتا ہے یا اپنے عہدے سے ہاتھ دھو لیتا ہے۔ دونوں صورتوں میں تم اس کے خلاف کچھ کرسکو گی؟''

''ٹھیک ہے تم نے کہا ہے تو میں غور کروں گی۔'' وہ بے دلی سے بولی اور موضوع بدل دیا۔ ''تم نے غور سے خود کو آئینے میں دیکھا ہے کتنے بدل گئے ہو؟''

''کیا ہوا ہے مجھے؟'' میں نے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

''چہرہ ستا گیا ہے، آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے ہیں، تم کمزور بھی لگ رہے ہو۔ لگتا ہے نہ ٹھیک سے کھاتے ہو اور نہ آرام کرتے ہو۔''

''دشمن مہلت ہی کہاں دیتے ہیں۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

''تم نے بہت عرصے سے شیو بھی نہیں بنائی ہے۔ بال بھی بے ہنگم ہو رہے ہیں۔''

''دشمنوں کی بدنظروں سے بچنے کے لیے یہ حلیہ ضروری ہے۔''

''بالکل نہیں اس حلیے کے ساتھ تم نمایاں ہو رہے ہو کیونکہ بہت کم لوگ داڑھی اور بال کو اس طرح چھوڑتے ہیں اور ایسا آدمی نمایاں ہوتا ہے۔ اگر تمہیں عام آدمی نظر آنا ہے تو اپنے بال اور شیو کو ترتیب دو۔ اس سے لوگ تمہاری طرف متوجہ نہیں ہوں گے۔'' اس نے مشورہ دیا۔

میں نے لیپ ٹاپ کے ویب کیم میں خود کو دیکھا تو ایمن کی بات درست لگی اس طرح بے ہنگم بالوں اور بڑھی شیو کے ساتھ میں نمایاں ہو رہا تھا۔ اس لیے میں نے پہلی فرصت میں اپنا حلیہ درست کرنے کا سوچا۔ ایمن موت سے بچ کر اور زندگی پاکر بہت خوش تھی میری احسان مند تھی۔ ایک موقع پر اس نے جذباتی ہوکر کہا۔ ''شہباز میں سچ میں تمہاری شکر گزار ہوں اگر تمہارے لیے جان بھی دینا پڑے تب بھی دریغ نہیں کروں گی۔ آج سے میری جان، میرا جسم، میرا دل اور میرا سب کچھ تمہارے لیے ہے۔ تم بس ایک بار مانگ کر دیکھنا۔''

''میں نے احسان نہیں کیا ہے دوستی نبھائی ہے اور دوستوں کے لیے تو آدمی اس سے بھی زیادہ کرتا ہے۔'' میں نے اس کی پیش کش کے جذباتی انداز سے صرف نظر کرتے ہوئے کہا۔ اس دوران میں کمرے کا دروازہ بجا میں نے بلند آواز سے کہا۔ ''آجاؤ۔''

وسیم نے اندر جھانکا اور مجھے لیپ ٹاپ کے ساتھ دیکھ کر ہاتھ سے اوکے کا اشارہ کیا۔ اس کا مطلب تھا کہ ماہا کو ڈراپ کرنے کا کام خوش اسلوبی سے تکمیل پا گیا تھا۔ میں نے سر ہلایا تو وہ دروازہ بند کرکے چلا گیا۔ ایمن مجھ سے بات کرنے لگی۔ اس نے میرے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔ اس سے بات کرتے ہوئے میرا ذہن پُرسکون ہوتا چلا گیا۔ جب سے میں نے شہلا کو دیکھا تھا میرے اعصاب منتشر تھے۔ واپسی کے بعد بھی میرے ذہن میں رہ رہ کر اس کا مسخ جسم آرہا تھا۔ وہ جسم جو کبھی دیکھنے والوں کو پاگل کردیتا ہوگا اب اسے دیکھ کر آدمی کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے۔ وہ جسم باقی بھی نہیں رہا تھا۔ ایمن

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے بات کر کے میں نے اسے خدا حافظ کہا اور پھر وسیم کے کمرے کی طرف آیا۔ ہلکی ناک کے جواب میں اس نے اندر سے کہا۔ ''یس۔''

میں دروازہ کھول کر اندر آیا۔ وسیم سونے کے لیے لیٹ گیا تھا وہ سونے جاگنے اور کھانے پینے کے معاملے میں نظم وضبط کا قائل تھا ہنگامی حالات سے قطع نظر وہ اپنی روٹین برقرار رکھتا تھا۔ ''ماہا کو کہاں چھوڑا؟''

''راجا بازار میں ایک ساری رات کھلے رہنے والے ریستوران کے باہر چھوڑا ہے۔ وہاں سے ٹیکسی لے کر کہیں بھی جاسکتی ہے۔ سونے کی ڈلی میں نے اس کے حوالے کر دی تھی۔ ساتھ ہی اسے سمجھا دیا تھا کہ اس کی یہ بچت دوبارہ نظر آنے کی حد تک ہے اب وہ ہماری نظروں میں آئی تو ہم خطرہ سمجھتے ہوئے اسے فوراً ٹھکانے لگا دیں گے۔''

''یہ تم نے اچھا کیا... وہ ویسے بھی ملک سے فرار ہو رہی تھی اس دھمکی کے بعد وہ مزید تاخیر نہیں کرے گی۔'' میں نے کہا اور اپنے کمرے میں چلا آیا۔ ماہا کا معاملہ نمٹ گیا تھا۔ اب صابر کا معاملہ نمٹانا تھا۔ وسیم کے آدمیوں نے اس کے ڈرائیور کو بھی چھوڑ دیا تھا اور اسے کچھ نہیں معلوم تھا کہ اسے کن لوگوں نے پکڑا تھا۔ میں نے گرم پانی سے غسل کیا۔ ایک گلاس دودھ گرم کر کے لیا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ باقی سب بھی سو چکے تھے صرف مانی جاگ رہا تھا حسب معمول۔ مجھے اس مختصر جسامت والے لڑکے نے اپنی صلاحیتوں سے حیران کر دیا تھا۔ کمپیوٹر اور اس کی پروگرامنگ کے معاملے میں وہ جینئس تھا۔ اگر وہ کسی اور ملک میں ہوتا تو کسی بہت اچھی آئی ٹی کمپنی میں اعلیٰ عہدے پر ہوتا لیکن یہاں بے چارہ اپنے باپ کی طرح حرام کھانے پر مجبور کیا جا رہا تھا اور اس سے بچنے کے لیے گھر سے بھاگا ہوا تھا۔

رات بارہ بجے کے قریب جب میں سویا تو بارش جاری تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ صبح موسم پرواز کے لیے سازگار نہ ملے۔ عبداللہ نے کہا تھا اگر موسم پرواز کے لیے سازگار ہوا تو وہ مجھے بتا دے گا اور میں ائر کلب پہنچ جاتا۔ مزید حفاظتی انتظامات وسیم اور اس کے آدمی کرتے جو دور رہ کر نگرانی کرتے اور اگر کسی طرف سے مداخلت ہوتی تو وہ اس سے نمٹتے۔ میری آنکھ کھلی تو سات بج رہے تھے اور بارش رک گئی تھی۔ میں نے اٹھ کر پردہ ہٹایا سورج یقیناً نکل آیا تھا لیکن آسمان پر نہایت گہرے سرمئی بادل تھے اور صاف لگ رہا تھا کہ مزید بارش ہوگی اس موسم میں ہیلی کاپٹر کی پرواز ممکن نظر نہیں آ رہی تھی۔ ابھی میں موسم کا معائنہ کر رہا تھا کہ عبداللہ کی کال آگئی۔

''آپ اٹھ گئے ہیں... موسم دیکھا؟''

''ہاں کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔''

''اس پورے علاقے میں ایسے ہی گہرے بادل ہیں۔ آج شام تک موسم خراب رہنے کی پیش گوئی ہے۔'' اس نے موسم کی سرکاری رپورٹ پیش کی۔

''کوئی بات نہیں... روانگی موسم ٹھیک ہونے کے بعد ہی ہوگی۔'' میں نے کہا۔ عبداللہ سے بات کر کے میں نیچے آیا تو سب ہی محوِ خواب تھے۔ میں باہر نکل آیا۔ سردی غضب کی تھی لیکن مزہ دے رہی تھی۔ مسلسل بارش سے لان کی گھاس پانی آمیز کیچڑ میں ڈوب گئی تھی اس لیے میں نے لان پر جانے سے گریز کیا اور پورچ کی جگہ ٹہلتا رہا۔ ابھی ہمارے سامنے دو معاملات تھے ایک مرشد کا اور دوسرا بریف کیس کا۔ میرے ساتھی فی الحال بریف کیس کے معاملے کو پسِ پشت ڈالنا چاہتے تھے۔ وہ مرشد پر اپنی ساری توجہ مرکوز رکھنا چاہتے تھے۔ اس کے خلاف ہمارے پاس دو کارڈ تھے ایک کال گرل ثمینہ کا، لیکن یہ کارڈ اصل میں نادر کے خلاف تھا اور وہ ہمارے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ دوسرا کارڈ صابر کا تھا اور یہی اصل کارڈ تھا۔ صابر یقیناً مرشد کے بارے میں اور بھی بہت کچھ جانتا تھا۔ میں نے ابھی اس کے بارے میں فیصلہ نہیں کیا تھا کہ مجھے اس کا کیا کرنا چاہیے۔ اسے مزید اپنی تحویل میں رکھا جا سکتا تھا، اگر اس کا کوئی فائدہ نظر آتا۔ شہلا کے ساتھ جو ہوا تھا اس میں صابر کا قصور بھی تھا۔ اگر کسی موقع پر ہمیں اس سے چھٹکارا حاصل کرنا پڑتا تو یہ جواز بھی مناسب ہوتا۔ عقب سے دروازہ کھلا تو میں نے مڑ کر دیکھا۔ سفیر جھانک رہا تھا اور سوتے سے اٹھ کر آیا تھا اس لیے خاصا بھنایا ہوا تھا۔ ''وہ منحوس شور مچا رہا ہے۔''

''کون... صابر؟''

''اور کون ہے نیند حرام کر دی ہے۔'' سفیر نے کہا اور دوبارہ غائب ہو گیا۔ میں اندر آیا تو اوپر سے دروازہ دھڑ دھڑانے کے انداز میں بجانے کی آواز آئی۔ صابر کا انداز بتاتا تھا کہ وہ کتنا بے تاب ہے۔ میں نے اوپر جا کر نقاب پہنا اور دروازہ کھولا تو وہ خوف زدہ انداز میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ چہرے سے پریشانی ٹپک رہی تھی۔ ''مجھے معاف کر دو لیکن خدا کے لیے مجھے جانے دو۔''

''تمہیں معاف کر دوں اور جانے دوں۔'' میں نے اسے پیچھے دھکا دیا اور دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ ''لگتا ہے رات کی پُرسکون نیند نے تمہیں کسی خوش فہمی کا شکار کر دیا ہے۔''

''تمہیں مجھے ابھی خیال آیا ہے۔ میں گھر سے غائب

ہوں۔ مرشد یا اس کے کسی آدمی نے مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی ہوگی لیکن جب میں نہیں ملا ہوں گا تو وہ کھٹک جائے گا کہ...''

میں نے اس کا جملہ مکمل کیا۔ ''کہ تم دشمنوں کے ہاتھ لگ گئے ہو اور تم نے ہی انہیں کالی کوٹھی کے بارے میں بتایا ہے۔''

صابر کی آنکھیں خوف سے پھٹ رہی تھیں۔ ''یہی بات ہے مرشد اسی نتیجے پر پہنچے گا اور پھر...''

''وہ اپنے آدمی تمہارے گھر بھیجے گا۔ تم نہیں ملو گے لیکن تمہارے گھر والے تو ہوں گے۔''

''نہیں۔'' وہ چیخ مار کر میری طرف لپکا لیکن میں نے رحمی سے لات مار کر اسے پیچھے پھینک دیا۔

''اپنے گھر والوں پر بات آئی تو یوں بلبلا رہے ہو۔ تم نے کبھی ان لوگوں کے بارے میں سوچا جو تمہاری وجہ سے مارے گئے۔ ان میں شہلا بھی شامل ہے جسے تم نے مرشد جیسے درندے کے حوالے کیا تھا۔ یقیناً تم نے کبھی نہیں سوچا ہوگا لیکن اب تم سوچو گے جب تمہارے گھر والوں پر بات آئی ہے۔''

وہ دہاڑیں مار کر رونے لگا۔ ''خدا کے لیے مجھے معاف کر دو... بے شک مجھے مار دو لیکن میرے گھر والے...''

''گیہوں کے ساتھ گھن بھی پستا ہے یہ محاورہ تم نے سنا ہوگا۔ صابر یہ مکافاتِ عمل ہے جو ہر ظالم کے ساتھ ہوتا ہے۔ لیکن افسوس اسے دیکھ کر دوسرا ظالم عبرت نہیں پکڑتا ہے۔ دوسرے مجھے شبہ ہے تم نے ابھی بھی مجھے پوری معلومات نہیں دی ہیں، تم مرشد کے بارے میں اور بھی جانتے ہو لیکن بتا نہیں رہے ہو۔''

وہ بلبلانے لگا۔ ''میں بتاؤں گا... بالکل بتاؤں گا لیکن مجھے موقع دو میں اپنے گھر والوں کو کسی محفوظ مقام پر پہنچا دوں، مرشد کی دسترس سے دور۔''

''یہ کام کرنے کے بعد تم اپنے وعدے سے مکر جاؤ تو ہم کیا کریں گے۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں پہلے تم ہمیں مرشد کے بارے میں باقی سب بھی بتاؤ گے اس کے بعد ہی ہم تمہاری کوئی مدد کر سکتے ہیں۔''

وہ سوچ میں پڑ گیا تھا پھر اس نے کہا۔ ''باقی باتیں تو عام ہیں لیکن میں ایک ایسی خاص بات سے واقف ہوں جس کے بارے میں مرشد اور اس کے بہت ہی معتمد ساتھی جانتے ہیں اور اگر انہیں بھنک بھی پڑ جاتی کہ میں اس بات سے واقف ہو گیا ہوں تو وہ مجھے کب کا ختم کر چکے ہوتے۔ یہ ان کے اندر کی بات ہے۔''

''ایسی کون سی بات ہے۔''

''تم نے خانقاہ مرشد یہ دیکھی ہے؟''

''تمہارا مطلب ہے اس کے دادا کی قبر جسے ان لوگوں نے مزار بنا لیا ہے؟''

''بالکل وہی راولپنڈی سے کچھ دور واقع ہے اب تو وہ نئی تعمیر ہونے والی سڑک سے صرف ایک کلومیٹر دور ہے اور بہت بڑے رقبے پر پھیلی ہے۔ نہ صرف زمین کے اوپر اس کی کئی منزلیں ہیں بلکہ زیرِ زمین بھی اس میں بہت کچھ ہے۔''

''یہ کوئی خاص بات نہیں ہے اس قسم کے دھندے کرنے والے زیرِ زمین تہ خانے بناتے ہیں تاکہ ساری دنیا سے چھپ کر اپنا کام کر سکیں۔ مجھے معلوم ہے وہاں عورتیں آتی ہوں گی مجبور و بے بس یا زر کے لالچ میں، ان کے ساتھ عیاشی کرنے مرشد اور اس کے قریبی لوگ آتے ہوں گے۔ وہاں شراب اور منشیات کا دھندا بھی ہوتا ہوگا۔ صاحبِ ثروت لوگوں کو یہ سب چیزیں منہ مانگے داموں فراہم کی جاتی ہوں گی۔ خانقاہ میں اسمگلنگ کا مال ڈمپ ہوتا ہوگا۔ شہروں سے دولت مند اغوا کر کے وہاں رکھے جاتے ہوں گے اور ان کا تاوان لیا جاتا ہوگا۔ لڑکیوں اور بچوں کو اغوا کیا جاتا ہوگا یا معمولی قیمت کے عوض خرید لیا جاتا ہوگا اور انہیں دلالوں اور خرکاروں کو بیچا جاتا ہوگا۔ مجرموں کو پناہ دی جاتی ہوگی اور اس کے بدلے ان سے اپنے کام لیے جاتے ہوں گے۔ ملک دشمن، تخریب کار اور دشمن کے جاسوس ایسی جگہوں پر پناہ لیتے ہیں۔''

صابر کا منہ کھل گیا تھا۔ ''تمہیں کیسے پتا ہے یہ سب؟''

''مرشد جیسے ڈبا پیروں کی خانقاہوں میں یہی سب ہوتا ہے۔ یہ روحانیت کے نہیں اصل میں شیطانیت کے مرکز ہیں اور جو جگہ شیطان کا مرکز ہو وہاں یہی سب ہو سکتا ہے۔''

''تم نے ٹھیک کہا وہاں یہی سب ہوتا ہے بلکہ شاید اس سے بھی بڑھ کر ہوتا ہے۔'' صابر کے لہجے میں نفرت آگئی۔ ''ہر رات وہاں ابلیس عریاں ہو کر رقص کرتا ہے۔''

''کیا تم مجھے یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہو کہ وہاں جو ہوتا ہے اس سے تم متفق نہیں ہو یا تمہیں وہ سب اچھا نہیں لگتا ہے۔'' میں نے طنز کیا۔ ''تم خود اس شیطانی کاروبار کا ایک حصہ ہو۔''

''یہ سچ ہے۔'' وہ بولا۔ ''میں اچھا آدمی نہیں ہوں مجرم ہوں لیکن میں شیطان نہیں ہوں۔ اس لیے وہاں جو ہوتا ہے میں سچ میں اس سے نفرت کرتا ہوں خود میری بھی دو بیٹیاں ہیں۔''

''تم کیا جانتے ہو اس جگہ کے بارے میں؟''

WWW.PAKSOCIETY.COM

"بدی کے اس اڈے کے نیچے تہ خانے سے ایک خفیہ راستہ نکلتا ہے جو تقریباً نصف کلومیٹر دور ایک ڈیرے تک جاتا ہے۔ بہ ظاہر اس ڈیرے کا مرشد سے کوئی تعلق نہیں ہے اور وہ عظیم سبحانی نامی زمیندار کا ڈیرا ہے۔ مرشد کے اڈے سے نکلنے والا یہ خفیہ راستہ اسی ڈیرے پر نکلتا ہے۔ مجھے یہ تو معلوم تھا کہ عظیم سبحانی کا مرشد سے تعلق ہے کیونکہ اس کے ڈیرے پر آنے یا جانے والا مال اصل میں مرشد کا ہی ہوتا ہے۔"

"خفیہ راستے کا مقصد؟"

شاید مرشد نے برے وقت کے لیے یہ راستہ بنایا ہے پھر یہاں سے خفیہ مال کی ترسیل ہوتی ہے۔"

"جب یہ راستہ اتنا ہی خفیہ ہے تو تمہیں کیسے پتا چلا؟"

"ایک بار مرشد کی طرف سے غیر ملکی شراب کے کریٹ اس ڈیرے پر پہنچانے کا حکم ملا۔ کیونکہ اس کی طرف سے مجھے اس قسم کے کام ملتے رہتے تھے اس لیے میں نے یہ کام بھی کر دیا اور اس بارے میں زیادہ سوچنے سمجھنے کی زحمت نہیں کی۔ لیکن جب میں ایک پک اپ میں کریٹ لے کر ڈیرے پر پہنچا تو ڈیرے کے محافظوں نے مجھے معتمد سمجھتے ہوئے میرے سامنے ہی وہ خفیہ راستہ کھول دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ راستہ خانقاہ تک جاتا ہے۔ اس وقت میں خاموش رہا۔ بعد میں بھی ڈرتا رہا کہ کہیں مرشد کو اس بارے میں پتا نہ چل جائے۔ کہیں محافظ اسے نہ بتا دیں اور میں یوں غائب کر دیا جاؤں جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔"

میں نے سر ہلایا۔ "میرا خیال ہے محافظوں کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہوگا اور انہوں نے اس بات کو وہیں دبا دیا ورنہ تم واقعی کسی نامعلوم قبر میں پہنچ گئے ہوتے۔ مگر ساتھ ہی غلطی کی پاداش میں وہ تمام محافظ بھی تمہارے ساتھ ہی دفن ہوتے۔"

"یہی ہوا ہوگا۔ مرشد بے خبر رہا کہ میں اس کے ایک اہم راز سے واقف ہو گیا ہوں۔ لیکن وہ اس بات سے بے خبر نہیں رہے گا کہ میں غائب ہوں اور اس کوٹھی کو کسی نے تباہ کر دیا۔ اس کے بعد وہ میرے لیے میرے گھر پر چڑھائی کرے گا اور جب میں نہیں ملوں گا تو وہ میرے بیوی بچوں کو..." اس کی آواز حلق میں پھنس گئی۔ پھر اس نے کہا۔ "دیکھو میں نہیں جانتا کہ تم کون ہو اس لیے اگر میں مرشد کے ہاتھ آ گیا تب بھی تمہارے بارے میں اسے کچھ نہیں بتا سکوں گا۔ خدا کے واسطے مجھے جانے دو، ایسا نہ ہو وقت میرے ہاتھ سے نکل جائے۔"

اس کی حالت قابلِ رحم ہو رہی تھی وہ سخت جان شخص اپنے بیوی بچوں کی زندگی کے لیے گڑگڑا رہا تھا۔ اگر اسے کتے کی طرح میرے قدموں میں لوٹنا پڑتا تو وہ اس سے بھی گریز نہیں کرتا۔ مجھے ترس آنے لگا۔ "چلو میں تمہیں جانے دیتا ہوں اور تم اپنے بیوی بچوں کو کسی محفوظ مقام پر پہنچا دیتے ہو لیکن تمہارے خیال میں اس طرح تم مرشد سے محفوظ ہو جاؤ گے؟"

اس نے جلدی سے کہا۔ "میرے پاس ذرائع ہیں۔ میں بیوی بچوں سمیت ملک سے باہر جا سکتا ہوں۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ صابر نے جو کہا تھا وہ صرف خدشہ نہیں تھا اس کا بہت زیادہ امکان تھا کہ یہ بات سچ ثابت ہو چکی ہو۔ مرشد رحم اور مروت کے نام سے بھی نا آشنا تھا۔ اگر اسے علم ہو چکا تھا کہ صابر غائب ہے تو اس کے آدمی اب تک صابر کے گھر پہنچ چکے ہوں گے اور اس کے بیوی اور بچوں کی عافیت سخت مشکوک تھی۔ مرشد خود جس درجے کا گھٹیا آدمی تھا اس کے ساتھی اور ملازم بھی اسی درجے کے گھٹیا تھے۔ عورتوں کے بارے میں ان کے رویے کا میں خود گواہ تھا۔ میں نے پوچھا۔ "تمہاری فیملی میں کتنے ممبر ہیں؟"

"میری بیوی اور دو بیٹیاں ہیں، بڑی بیٹی کالج میں پڑھ رہی ہے اور اس سے چھوٹی ابھی اسکول میں ہے۔"

"صابر تمہیں کچھ دیر صبر کرنا ہوگا۔ اس کے بعد ہی میں تمہیں چھوڑنے کا فیصلہ کر سکوں گا لیکن تب تک آرام سے بیٹھو شور شرابا کرنے سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"

میں باہر آیا تو وسیم جاگ گیا تھا اور کچن میں کافی کی کیتلی سے کافی نکال رہا تھا۔ "کیا کہہ رہا ہے صابر؟" اس نے میرے سامنے کافی رکھتے ہوئے پوچھا۔ میں نے اسے صابر اور اپنی گفتگو سنائی وہ غور سے سنتا رہا۔ جب میں نے بات مکمل کر لی تو اس نے پوچھا۔ "آپ کیا چاہتے ہیں اسے چھوڑ دیا جائے؟"

"صرف چھوڑ نہیں دیا جائے۔" میں نے کافی کے گرم گھونٹ کو حلق سے اتار کر کہا۔ "میرے ذہن میں ایک خیال بھی ہے۔ ہم صابر کو اس کے گھر کے پاس چھوڑ دیتے ہیں اور پھر نگرانی کرتے ہیں میرا خیال مرشد کے آدمی بھی وہاں ہوں گے۔ اگر اس نے سچ کہا ہے تو یہ بیوی بچوں کو لے کر نکل جائے گا لیکن اگر اس نے جھوٹ کہا اور مرشد کے پاس جانے کی کوشش کی تو..."

"تو ہم اسے دوسری دنیا روانہ کر دیں گے۔" وسیم نے میری بات مکمل کی۔ "لیکن فرض کریں صابر کا خدشہ درست ثابت ہوا تو...؟"

"تب مرشد کے دشمنوں میں ایک کا اضافہ ہو جائے گا۔"

وسیم نے نفی میں سر ہلایا۔ "صابر بہت معمولی درجے کا

آدمی ہے وہ مرشد کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

"دشمن کبھی معمولی نہیں ہوتا ہے۔ آدمی رتبے اور طاقت میں کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو صرف ایک گولی سے مر جاتا ہے۔ جو ایک آدمی ایک معمولی سے پستول سے بھی چلا سکتا ہے بہ شرط وہ ایسا کرنے کا ارادہ کر لے۔" میں نے کہا۔ "صابر کوئی شریف آدمی نہیں ہے بدمعاشی کے دھندے اس کے لیے نئے نہیں ہیں۔ اگر وہ مرشد کے خلاف ہو جائے تو بہت کچھ کر سکتا ہے۔"

"لیکن یہ ایک مفروضہ ہے کہ مرشد نے صابر کے گھر والوں کے خلاف کچھ کیا ہے؟"

"ہاں ہم مفروضات پر ہی آگے بڑھتے ہیں۔ ہمیں صابر کا اچار تو ڈالنا نہیں ہے اس لیے ایک چانس لینے میں کیا حرج ہے۔ ابھی تک ایسی ضرورت نہیں ہے کہ ہم اسے قتل کر دیں لیکن اگر اس نے وعدہ خلافی کرتے ہوئے مرشد سے رابطے کی کوشش کی تو ہم اسے قتل کرنے کے لیے آزاد ہوں گے۔ اس کے لیے شہلا کے دردناک قتل کا جواز بھی کافی ہوگا۔"

"میں سمجھ گیا۔" وسیم نے سر ہلایا۔ "لیکن ضروری نہیں ہے وہ خود مرشد کے پاس جائے، ہو سکتا ہے وہ اسے فون پر اطلاع دے۔"

"تم نے اس کے گھر کو بگ کیا تھا وہاں لگے بگ اب بھی کام کر رہے ہوں گے؟"

"بالکل... وہ ایک ہفتہ آن رہتے ہیں اس کے بعد ان کی بیٹری ختم ہو جاتی ہے۔" وسیم نے کہا۔

"بس تو اگر اس نے مرشد سے رابطہ کیا تو ہمیں معلوم ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے میں رائڈر ٹیم کو بلا لیتا ہوں۔"

"انتظامات ہونے میں کتنا وقت لگے گا؟"

"تقریباً ایک گھنٹا۔" وسیم نے جواب دیا۔

"میں ٹھیک ایک گھنٹے بعد صابر کو لے کر نکلوں گا۔" میں نے کہا اور اٹھ کر فریج سے ڈبل روٹی اور انڈے نکالے۔ آدھے گھنٹے بعد میں ناشتا کر چکا تھا۔ وسیم نے کہا کہ وہ باہر ہی ناشتا کر لے گا۔ میں نے بیتو کو جگایا۔ "اٹھ جاؤ برخوردار ہمیں جانا ہے۔"

"کہاں شوبی بھائی؟" اس نے واش روم کی طرف جاتے ہوئے پوچھا اور جواب سنے بغیر اندر چلا گیا میں نے سفیر کو اٹھایا۔

"میں صابر کو لے کر جا رہا ہوں۔"

"کہاں؟" اس نے جماہی لے کر پوچھا۔

"اسے چھوڑنے۔" میں نے سفیر کو اپنا پروگرام بتایا۔ اس نے سر ہلایا۔

"یہ اچھا منصوبہ ہے لیکن صابر سے بہت ہوشیار رہنا اس نے ہمیں پہلے بھی چکر دیا تھا۔"

"میں سمجھتا ہوں اگر اس نے دھوکا دیا تو خود بھگتے گا۔ میرا خیال ہے کالی کوٹھی کی تباہی پر مرشد بھی اسے معاف نہیں کرے گا یہ بات وہ بھی جانتا ہے اس لیے وہ شاید ایسی کوئی حماقت نہ کرے۔"

وقت کم تھا اس لیے بیتو ناشتا کیے بغیر صرف ایک کپ چائے پی کر تیار ہو گیا۔ "کھانا ہم آ کر کھائے گا۔" اس نے سفیر سے کہا۔ "آپ کھانا تیار رکھے گا۔"

"تم ساتھ لائے گا تو کھائے گا۔" سفیر نے خبردار کیا۔

"آپ منگوائے گا ہم کھائے گا۔" بیتو نے بھی اسی قافیے میں شاعری جاری رکھی۔ سفیر بھنا گیا۔

"کیا کھانا میرا ذمہ بن گیا ہے۔"

"یار تپتا کیوں ہے کل تک تو ویسے بھی چلا جائے گا۔" میں نے کہا۔ "وہاں حویلی میں مزے سے رہنا۔ مونا اور گھر کی دوسری خواتین کے ہاتھ کے بنے کھانے کھائے گا۔"

"نہیں یاران لوگوں نے میری چڑ بنا لی ہے۔" سفیر نے فریاد کی۔ "کیا میری صورت باورچی جیسی ہو گئی ہے۔"

"نہیں ہے تو ہو جائے گی۔" بیتو نے دانت نکالے۔ "ابھی آپ اباجی بھی بنے گا۔"

"باپ بننے کا اس سے کیا تعلق ہے؟"

"تعلق ہے مونا دیدی آرام کرے گا آپ کھانا بنائے گا تو باورچی ہی بنے گا نا۔"

اس سے پہلے یہ بحث مزید طول کھینچتی میں اوپر آیا۔ پہلے خود نقاب پہنا اور پھر اندر آیا۔ "صابر تیار ہو جاؤ تمہیں چھوڑا جا رہا ہے۔"

"سچ میں..." اس نے شک آمیز خوف کے ساتھ کہا۔ اسے شک تھا کہ شاید ہم اسے کہیں مار کر ڈالنے جا رہے تھے۔ وہ خود بھی اپنے دشمنوں کے ساتھ ایسا ہی کرتا آیا ہوگا۔

"ہاں۔" میں نے کہا اور کچن سے لایا ایک کپڑے کا غلاف اس کے منہ پر چڑھا دیا۔ اس میں کچھ سامان آیا ہوگا۔ اب یہ دوسرے کام آتا۔ اس میں کھینچ کر بند کی جانے والی ڈوری بھی تھی میں نے ڈوری کھینچ دی اب وہ کوشش کرتا تب بھی غلاف آسانی سے نہیں اتر سکتا تھا۔ میں اور بیتو اسے بازوؤں سے پکڑ کر گاڑی تک لائے۔ میں نے سفاری لے جانے کا

WWW.PAKSOCIETY.COM

فیصلہ کیا۔اس میں شیشے تاریک تھے اور اگلی پچھلی نشستوں کے درمیان اتنی جگہ تھی کہ صابر کو اس میں آرام سے فٹ کیا جاسکتا تھا۔ بیتو نے اسے دھکا دے کر لٹایا اور خود سیٹ پر بیٹھ کر اس پر پاؤں رکھ لیے۔ میں نے بیتو سے کہا۔ ''اگر یہ کوئی غلط حرکت کرے یا چیخے چلائے تو اسے بے دریغ شوٹ کر دینا۔ تمہارے پستول پر سائلنسر ہے کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔''

یہ سب میں نے صابر کو ڈرانے کے لیے کہا تھا ورنہ بیتو کے پاس کوئی پستول نہیں تھا۔ میں گاڑی سے ذرا دور گیا اور وسیم کو کال کی۔ ''کیا ہو رہا ہے؟''

''سیٹ اپ ہو گیا ہے...'' ہم صابر کے گھر سے کچھ دور موجود ہیں۔ تین ہائیک والے مختلف اطراف میں موجود ہیں۔ وہ ایک منٹ کے نوٹس پر آسکتے ہیں۔''

''گھر کی کیا رپورٹ ہے؟''

''اندر مکمل خاموشی ہے جیسے اندر کوئی بھی نہ ہو۔''

''آس پاس کی کیا صورتِ حال ہے؟''

''فی الحال تو کوئی مشکوک فرد نظر نہیں آرہا ہے۔''

''ہم آرہے ہیں۔'' میں نے فون بند کیا اور گاڑی کی طرف آیا۔ سفیر نے گیٹ کھولا اور گاڑی کے نکلنے کے بعد بند کر لیا۔ صابر کا گھر اس جگہ سے کوئی نصف گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ میں نے صابر سے پوچھا۔ ''تمہارے آدمی بھی تمہارے لیے پریشان ہو رہے ہوں گے؟''

''ہاں وہ مجھے تلاش کر رہے ہوں گے۔''

''کیا وہ تمہارے گھر والوں کی حفاظت بھی کریں گے؟''

صابر کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے کہا۔ ''نہیں میرے گھر والوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے وہ ان سے دور رہتے ہیں۔''

''گویا تم بزنس اور فیملی کے معاملات الگ الگ رکھتے ہو لیکن تمہیں کبھی خیال نہیں آیا تم جو کچھ کرتے ہو کبھی نہ کبھی اس کا اثر تمہاری فیملی پر بھی آسکتا ہے۔''

''یہ خیال مجھے اکثر آتا تھا۔'' اس نے اعتراف کیا۔ ''لیکن میں اور کیا کر سکتا ہوں۔ میں اپنا پیشہ نہیں بدل سکتا اس کے لیے لازمی ہے میں یہ شہر ہی چھوڑ جاؤں لیکن جو لوگ میرے خوف سے اب تک خاموش ہیں وہ میرے شریف ہوتے ہی میرے پیچھے لگ جاتے اور اس ملک میں مجھے کہیں نہیں چھوڑتے۔''

''تم کو اس ملک سے نکل جانا چاہیے۔'' بیتو نے اسے مشورہ دیا۔ ''اب تم اِدھر نہیں رہ سکتا۔''

''میں یہی کروں گا۔'' اس نے کہا۔

''اگر تمہیں اس کی مہلت ملی تو۔'' میں نے دل میں کہا۔ وسیم کی بات سن کر مجھے اپنا اندیشہ درست ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد ہم صابر کے گھر کے پاس پہنچ گئے تھے۔ میں نے اسے ایک سنسان سڑک پر اتار دیا۔ غلاف اس کے چہرے پر تھا۔ ''دل میں سو تک گنتی گن کر غلاف اتار دینا، اس وقت تم اپنے گھر کے پاس ہی ہو۔ لیکن ہمیں یا گاڑی کو دیکھنے کی کوشش مت کرنا ورنہ مجبوراً ہمیں واپس آکر تمہیں ٹھکانے لگانا پڑے گا۔''

میں نے گاڑی آگے بڑھا دی اور جب تک وہ عقبی آئینے میں نظر آتا رہا اس نے چہرے سے غلاف اتارنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں گاڑی کو مختلف گلیوں میں گھماتا رہا بالآخر صابر والی گلی سے اگلی گلی میں ایک خالی پلاٹ میں وین نظر آگئی۔ میں نے گاڑی اس کے پاس لے جا کر روک دی۔ بیتو کو میں نے صابر والی گلی کے سرے پر چھوڑ دیا جہاں سے وہ اس کے مکان پر نظر رکھ سکتا تھا۔ وین میں وسیم کے ساتھ شہاب تھا۔ شہاب ناشتا کر چکا تھا اور وسیم کر رہا تھا۔ ناشتا بیکری کے تیار کیے ہوئے سینڈوچز اور کسی کیفے سے چائے لے کر کیا جا رہا تھا۔ میں نے اندر آکر دروازہ بند کیا۔ ''کوئی پروگریس؟''

''نہیں۔'' وسیم نے منہ چلاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے گھر کے اندر کی خاموشی معنی خیز لگ رہی ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے گھر والے گھر میں نہیں ہیں یا ہیں تو کوئی حرکت کرنے یا آواز نکالنے کے قابل نہیں ہیں؟''

''جی یہی خیال ہے۔'' وسیم بولا۔ ''اسے چھوڑ دیا آپ نے؟''

''ہاں وہ کچھ دیر میں اپنے مکان تک پہنچ جائے گا۔''

''فرض کریں اس نے مکان کی طرف آنے کے بجائے کہیں اور جانے کا فیصلہ کر لیا؟''

میں چونک گیا۔ یہ خیال تو میرے ذہن میں آیا نہیں تھا۔ میں نے بیتو کو کال کی اس نے کال ریسیو کی۔ ''ہم خود آپ کو کال کرنے والا تھا وہ اپنے گھر میں آگیا ہے۔''

اسی لمحے وین میں کسی کے چلّانے کی آواز آئی۔ ''فریدہ... میرے خدا... شازیہ... فوزیہ... نہیں میرے خدا نہیں۔''

وسیم نے اسپیکر آن کیے ہوئے تھے اس لیے جب صابر نے گھر میں داخل ہو کر چلّانا شروع کیا تو ہم ہل کر رہ گئے تھے۔ وسیم نے جھپٹ کر اسپیکروں کی آواز بند کی اور سسٹم کو ہیڈ سیٹ

پر منتقل کر دیا۔ ہم نے چھوٹے ہیڈ سیٹ کانوں پر چڑھا لیے تھے۔ اب صابر کے دہاڑیں مار کر رونے کی آواز زیادہ واضح لیکن صرف ہمارے کانوں تک محدود تھی۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ اس کے گھر والوں پر کوئی سانحہ گزر گیا تھا اور وہ صابر کی پکاروں کا جواب دینے کے قابل نہیں تھے۔ وہ باری باری یہی تین نام پکار رہا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ اس کی بیوی اور دو بیٹیاں تھیں یہ ان کے ہی نام ہو سکتے تھے۔ میں نے افسوس سے وسیم کی طرف دیکھا۔

''میرا خیال ہے مرشد کے آدمی اپنا کام کر گئے ہیں۔''

''لگ تو ایسا ہی رہا ہے۔'' وسیم بولا۔

بیتو لائن پر تھا میں نے اس سے کہا۔ ''نظر رکھنا جیسے ہی وہ اپنے گھر سے نکلے تو ہمیں بتانا۔''

''میرا خیال ہے ایک ریڈیو اس تک پہنچا دیا جائے کال ملنے میں دیر لگتی ہے۔'' وسیم نے کہا اور شہاب کو ایک ریڈیو سیٹ دے کر روانہ کر دیا۔ صابر اب بھی دہاڑیں مار کر رو رہا تھا اور ساتھ ہی مرشد کو گالیاں دے رہا تھا۔ اسے اپنے ہاتھ سے قتل کرنے کے عزائم کا اعلان کر رہا تھا۔ مگر اس جنونی کیفیت میں وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا اگر مرشد ہاؤس یا اس کے کسی اور ٹھکانے کا رخ کرتا تو خود بھی مارا جاتا۔ رفتہ رفتہ اس کی آواز دبنے لگی اور پھر اس نے کسی کو کال ملائی۔ ''میں بات کر رہا ہوں۔''

''کیا بات ہے استاد؟'' دوسری طرف سے کسی نے محتاط انداز میں پوچھا۔ وسیم نے صابر کے گھر کا فون بھی بگ کر دیا تھا اس لیے دوسرے آدمی کی آواز بھی آرہی تھی۔

صابر دہاڑا۔ ''تم لوگ کہاں مر گئے ہو... میرے گھر والوں پر قیامت گزر گئی ہے۔''

''کیا ہوا استاد؟'' اس شخص نے اسی طرح محتاط انداز میں کہا۔

''تم اور عبدل فوراً یہاں آجاؤ۔''

دوسری طرف موجود شخص کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے کہا۔ ''ہم آرہے ہیں۔''

صابر نے فون بند کر دیا۔ وہ پھر دبی دبی آواز میں رونے لگا تھا۔ میں نے وسیم کی طرف دیکھا۔ ''تم نے کچھ محسوس کیا؟''

''ہاں اگر یہ صابر کا آدمی ہے تو اس کا رویہ نہایت عجیب ہے۔''

میں نے سر ہلایا۔ ''میرا خیال ہے اب وہ صابر کا آدمی نہیں ہے بلکہ مرشد کا آدمی بن چکا ہے۔ صابر نے اسے نہیں اپنی موت کو خود بلایا ہے۔''

کیا آپ
لبوب مقوّی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے۔ اعصابی کمزوری دور کرنے۔ ندامت سے نجات، مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے۔ کستوری، عنبر، زعفران جیسے قیمتی اجزاء سے تیار ہونے والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوّی اعصاب۔ یعنی ایک انتہائی خاص مرکب خدارا۔۔۔ ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوّی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے اور خاص لمحات کو خوشگوار بنانے کیلئے۔ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوّی اعصاب۔ آج ہی صرف ٹیلیفون کر کے بذریعہ ڈاک VP وی پی منگوالیں۔

المسلم دارلحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی طبّی یونانی دواخانہ)
ضلع وشہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0301-6690383
فون صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک کریں

WWW.PAKSOCIETY.COM

"ایسا ہی لگ رہا ہے اس صورت میں ہمیں کیا کرنا چاہیے۔"

"ہمیں صابر کو بچانا ہوگا۔"

"آپ کو اس سے ہمدردی ہے؟"

"نہیں بلکہ مرشد کے عزائم ناکام بنانے ہیں۔ اگر اس کے ساتھی اب مرشد سے مل چکے ہیں تو ان کا بھی خاتمہ کرنا ہے۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "ہمیں مرشد اور اس کے ساتھیوں کے خلاف ہر ممکن قدم اٹھانا ہے۔ اس کی ہر ناکامی ہماری کامیابی ہے اور اس پر دباؤ بڑھے گا۔"

صابر اب اپنے جنون پر قابو پانے میں کامیاب رہا تھا۔ کبھی کبھی اس کے بڑبڑانے کی آواز آتی تھی۔ اچانک کسی کی کراہ سنائی دی اور صابر چلایا۔ "شازیہ...، میری بچی تو زندہ ہے۔"

"بابا...، بابا۔" لڑکی چلائی۔ "بابا انہوں نے سب کو مار دیا۔ ماما کو فوزیہ کو..... مجھے بھی۔" لڑکی اب پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اس کے آنسو بتا رہے تھے کہ اس پر کیا گزری تھی۔ صابر بھی رونے لگا تھا۔

"شازیہ وہ کون تھے؟"

"وہ جو آپ کے ساتھی ہیں عبدل اور اسلم ان کے ساتھ دو آدمی اور تھے انہوں نے..." لڑکی پھر رونے لگی تھی۔ اسی لمحے بیتو کی آواز آئی۔

"شوبی بھائی دو آدمی خاموشی سے مکان میں داخل ہوا ہے۔"

"خاموشی سے کیسے؟"

"وہ بیل یا دروازہ بجائے بغیر اندر گیا ہے۔ ایک آدمی کے پاس پستول بھی ہے شاید... آپ بولے تو میں پاس جا کر دیکھے۔"

"ٹھیک ہے لیکن مکان کے بالکل سامنے جانے کی ضرورت نہیں ہے ہم بھی آ رہے ہیں۔" میں نے کہا اور وسیم اس دوران میں حرکت میں آ چکا تھا۔ اس نے وین کے معاملات شہاب کے سپرد کیے۔ میرے پاس پستول تھا۔ وسیم کے پاس بھی کوئی چھوٹا ہتھیار تھا لیکن اس نے وین کے ایک خانے سے ایک چھوٹی سی مشین گن نکالی۔ یہ اعشاریہ پینتالیس کے پستول سے کچھ ہی بڑی ہوگی اور بہ آسانی وسیم کی جیکٹ میں چھپ گئی۔ میں اور وسیم وین سے نیچے اترے اور تیز قدموں سے صابر کی گلی کی طرف بڑھے۔ وہ ابھی تک شازیہ سے بات کر رہا تھا۔ اسے خبر نہیں تھی کہ موت کے ہرکارے جو اس کے ساتھی ہیں مکان میں داخل ہو چکے ہیں۔ شازیہ کے انکشاف نے اسے پاگل کر دیا تھا۔ وہ جو اس کے ماتحت تھے اور جنہیں وہ اپنا دست و بازو سمجھتا تھا انہوں نے اس کے ساتھ یہ کیا تھا۔ اس کی بیوی اور بیٹیوں کو پامال کر کے قتل کر دیا تھا۔ شازیہ کی قسمت تھی جو وہ بچ گئی۔ صابر کہہ رہا تھا۔

"عبدل... اسلم... میں نہیں کتے کی موت ماروں گا ان کا پورا خاندان ختم کر دوں گا۔"

"نہیں استاد جی۔" ہیڈ سیٹ میں ایک نئی آواز آئی۔ "خاندان تک جانے کی ضرورت نہیں ہے ہم خود یہاں آ گئے ہیں۔"

"اسلم... عبدل... ذلیل، کتو... ..." صابر دیوانہ وار چلانے لگا۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں وہ پاگل ہو کر ان دونوں پر حملہ کر دے اور وہ اسے فوراً مار دیں، وہ اسے مارنے کے لیے آئے تھے۔ اچانک صابر کے کراہنے کی آواز آئی اور شازیہ چلانے لگی۔

"خدا کے لیے... میرے بابا کو چھوڑ دو۔"

"چپ کر کتیا... تو بچ کیسے گئی؟" دوسرے آدمی نے لڑکی کو جھڑکا۔ انہوں نے صابر پر کوئی تشدد کیا تھا۔ "پہلے اس سے نمٹ لیں پھر تجھے بھی دیکھتے ہیں۔"

اس دوران میں ہم گلی میں داخل ہو گئے تھے۔ بیتو بھی ہمارے ساتھ اندر ہونے والی گفتگو سن رہا تھا اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور پھر اندر چلا گیا میں نے تیز لہجے میں کہا۔ "بیتو احتیاط سے وہ مسلح ہیں۔"

"فکر مت کرو۔" وہ بولا۔

"بیتو۔" اس بار میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "باہر آؤ اور جا کر جیپ لے کر آؤ ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔ شہاب تم بھی ہوشیار رہو اگر کوئی آ جائے اور ہم پھنس جائیں تو تم پیچھے سے مدد کرو گے۔"

"میں پوری طرح ہوشیار ہوں۔" شہاب نے کہا۔

بیتو بادلِ ناخواستہ باہر آیا اور جیپ لینے روانہ ہو گیا۔ میں اور وسیم اندر داخل ہوئے۔ وسیم نے مجھے دائیں طرف سے جانے کا اشارہ کیا اور خود بائیں سمت بڑھ گیا۔ صابر کا مکان زیادہ بڑا نہیں تھا یہ شاید نصف کنال پر بنا ہوا تھا اور مکان کے دونوں طرف گلی تھی۔ سامنے پورچ اور ایک چھوٹا سا برآمدہ تھا۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ کیاریاں تھیں جن میں پھولدار پودے تھے اور خوب صورت بیلیں دیواروں پر چڑھی ہوئی تھیں۔ مکان کی حالت بہت اچھی تھی۔ اس پر حال ہی میں کلر ہوا تھا۔

برآمدے میں مکان کا کھلنے والا دروازہ مضبوط لکڑی کا بنا ہوا تھا جس پر ہاتھ سے نقش ابھارے گئے تھے۔ میں دائیں طرف سے دیوار کے ساتھ لگا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اور میرے کان بگ سے آنے والی آوازوں پر مرکوز تھے۔ صابر کے آدمی اس پر تشدد کر رہے تھے اور غلیظ زبان میں اسے بتا رہے تھے کہ انہوں نے اس کی بیوی اور بیٹیوں کے ساتھ کیا کیا تھا۔

صابر کا نہ جانے کیا حال تھا لیکن ان کی بکواس سن کر میرا خون کھول رہا تھا اور مجھے صابر پر بھی غصہ آ رہا تھا جو اپنی آستین میں سانپ پال رہا تھا جنہوں نے بالآخر اسے ہی ڈس لیا۔ افسوس کہ اس نے جو دوسروں کے ساتھ کیا تھا، آج وہی اس کے سامنے آ رہا تھا اور اس کے گھر والوں کو بھگتنا پڑا تھا۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ جو آوازیں میں ہیڈ سیٹ سے سن رہا تھا وہی میرے پاس سے بھی آ رہی تھیں میں نے ہیڈ سیٹ ہٹا کر دیکھا۔ آوازیں اس کمرے کی کھڑکی سے آ رہی تھیں جس کے عین نیچے میں موجود تھا۔ یعنی وہ لوگ اسی کمرے میں موجود تھے۔ میں براہِ راست جھانکنے کا خطرہ مول لے نہیں سکتا تھا اس لیے کلائی سے گھڑی اتار کر اس کے شیشے میں اندر کا منظر دیکھا۔

اندر کا منظر اچھا نہیں تھا۔ یہ بیڈ روم تھا بیڈ پر دو لاشیں پڑی تھیں وہ یقینی طور پر لاشیں تھیں کیونکہ صابر نے ان پر چادر ڈال دی تھی۔ اس چادر پر بھی خون لگ گیا تھا اور بیڈ کی حالت تو بری ہو رہی تھی۔ بیڈ کے سامنے قالین پر صابر کی لڑکی شازیہ پڑی تھی اور اس کے پاس ہی صابر نیم دراز حالت میں بیٹھا تھا۔ ذرا سی دیر میں عبدل اور اسلم نے اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ وہ دونوں اس کے پاس ہی کھڑے تھے۔ وہ دونوں ہی مسلح تھے ایک کے پاس بڑے کیلی بر کا پستول تھا اور دوسرے کے پاس ریوالور تھا۔ مجھے تعجب تھا کہ انہوں نے اب تک اسے مارا کیوں نہیں تھا شاید وہ اس کی بے بسی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اچانک سیاہ شرٹ والے نے جھک کر صابر سے کہا۔ "اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو تو اپنی تجوری کا نمبر بتا دو۔"

مگر صابر پوری طرح ہوش میں نہیں تھا وہ نیم غشی کی حالت میں جھول رہا تھا۔ اس نے شاید ان کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ کمرے کا اچھی طرح جائزہ لے کر میں ذرا پیچھے آیا اور آہستہ سے وسیم سے پوچھا۔ "تم کہاں ہو؟"

"میں اندر آ گیا ہوں۔" اس نے بتایا۔

"انہیں دیکھ لیا ہے؟"

"ہاں۔"

"ایک ساتھ ہینڈ اپ کرنا ہے ان میں سے کم سے کم ایک زندہ ہاتھ آنا چاہیے۔"

"میں سمجھ گیا تب ہینڈز اپ کرانے کے بجائے براہِ راست ہاتھ اور پیر میں گولی ماری جائے۔"

"ٹھیک، میں کھڑکی سے سیاہ شرٹ والے کو نشانہ بناؤں گا۔"

"میں نیلی جرسی والے کو۔" وسیم نے کہا۔ "لیکن کام ایک ساتھ ہونا چاہیے۔"

"ٹھیک تین تک گنتی گنتے ہی ہم حرکت میں آ جائیں گے۔"

میں واپس کمرے تک گیا۔ ایک بار پھر کھڑکی سے اندر موجود لوگوں کی جگہ دیکھی۔ سیاہ شرٹ والا صابر پر جھکا ہوا تھا اور پستول اس کی کن پٹی سے لگا رکھا تھا۔ "تم نے بہت عرصے ہماری گردن پر سواری کی ہے اب تم سے ہمیشہ کے لیے نجات مل جائے گی۔ لیکن تمہاری جان بخشی کی جا سکتی ہے بہ شرط کہ تم تجوری کا نمبر بتا دو۔"

صابر نے جواب میں نفرت سے اس کے منہ پر تھوک دیا اور مجھے معلوم تھا کہ اب کیا ہوگا۔ میں نے تیزی سے کھڑکی میں آتے ہوئے سیاہ شرٹ والے کا نشانہ لیا وہ ذرا پیچھے ہو کر صابر پر گولی چلانے والا تھا لیکن اس سے پہلے میرے پستول سے نکلنے والا شعلہ اس کے شانے میں اتر گیا اور وہ ایک جھٹکے سے صابر پر ہی گرا تھا۔ مجھے ایک دو تین کہنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ مگر وسیم بھی حرکت میں آ گیا تھا۔ کمرے کا دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اس دوران میں نیلی جرسی والا میری طرف متوجہ ہوا تھا اور اس کا پستول والا ہاتھ میری طرف اٹھ رہا تھا لیکن وسیم نے اسے مہلت نہیں دی اور عقب سے اس کے شانے پر گولی ماری میں نے غوطہ لگایا کیونکہ وسیم کھڑکی کی سیدھ میں کھڑا ہوا تھا، گولی نیلی جرسی والے کے بازو کو چھیدتی ہوئی کھڑکی کی طرف آئی تھی۔

نیچے ہوتے ہی میں دوبارہ سیدھا ہوا تو وسیم صورتِ حال کو قابو میں کر چکا تھا۔ اس نے دونوں کے پستول اور ریوالور ان سے دور پھینک دیے تھے۔ فائر کی آواز بیتو تک پہنچی تھی اس نے پریشانی سے پوچھا۔ "شوبی فائر کس نے کیا سب ٹھیک ہے؟"

"ہاں سب ٹھیک ہے ہم نے صورتِ حال پر قابو پا لیا ہے۔" میں نے اسے تسلی دی اور واپس مکان کے سامنے والے حصے میں آیا اور ایک منٹ میں اس کمرے میں پہنچ گیا۔ صابر نیم غشی کی حالت میں قالین پر بیٹھا ہوا جھول رہا تھا۔ اس کی لڑکی نے اسے تھام رکھا تھا۔ وہ بہت پیاری اور دل کش سی کم عمر

WWW.PAKSOCIETY.COM

لڑکی تھی۔ مگر اس وقت وہ تباہ حال لگ رہی تھی۔ اس کا لباس جگہ جگہ سے پھٹا ہوا اور خون آلود تھا۔ چہرے اور جسم کے نظر آنے والے حصوں پر زخموں کے نشانات تھے۔ ان لوگوں نے اس کے ساتھ بہت برا سلوک کیا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''صابر کو پیچھے کرو۔''

''بابا پیچھے آئیں۔'' شازیہ نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

عبدل اور اسلم نے صابر کے سر پر اپنے ہتھیاروں سے ضربیں لگائی تھیں اسی لیے وہ پوری طرح ہوش میں نہیں تھا۔ شازیہ اسے کھینچ کر پیچھے لے گئی تھی۔ میں نے جس پر گولی چلائی تھی وہ تقریباً بے ہوش ہو گیا تھا کیونکہ گولی نے شانے کی ہڈی توڑ دی تھی اور وہ یقیناً سخت تکلیف میں تھا۔ نیلی جرسی والا ہوش میں تھا۔ میں نے اس کے سر پر پستول کا دستہ مارا تو وہ بھی نیچے لڑھک گیا۔ میں نے وسیم سے کہا۔

''ان کی تلاشی لو۔''

وسیم ان کی تلاشی لینے لگا اور میں نے بیتو سے پوچھا۔ ''تم کہاں ہو؟''

''ہم مکان کے سامنے آ گیا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''کیا اندر آ جائے؟''

''تم جیپ سامنے لاؤ میں دروازہ کھول رہا ہوں۔''

''انہیں لے کر جانا ہے۔'' وسیم نے عبدل اور اسلم کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے سر ہلایا۔

''ظاہر ہے یہی تو اس معاملے میں ہمارا نفع ہیں۔''

میں باہر آیا تو بیتو جیپ کو گیٹ کے بالکل سامنے لے آیا تھا گیٹ کھولتے ہی وہ اندر آ گیا۔ اس دوران میں شہاب بھی وین گلی میں لے آیا تھا۔ میں بیتو کے ساتھ اندر آیا اور باری باری عبدل اور اسلم کو جیپ کے پچھلے حصے میں منتقل کیا وہ زخمی تھے اور خون بہہ رہا تھا لیکن ان کے مرنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ میرے پستول پر سائلنسر لگا تھا اور وسیم نے چھوٹا پستول استعمال کیا تھا وہ مکان کے اندر تھا اس لیے آواز بہت کم آئی تھی امید تھی کہ کسی نے اس سنگل فائر کا نوٹس نہیں لیا ہوگا۔ آس پاس ویسا ہی سناٹا اور سکون تھا۔ وسیم کے کہنے پر شازیہ نے باتھ روم میں جا کر کپڑے بدل لیے تھے لیکن وہ بہت خوف زدہ تھی۔ مردوں سے اس کا اعتبار اٹھ گیا تھا اور اسے خوف تھا کہ ہم بھی اس کے حق میں درندے نہ ثابت ہوں۔ اس نے صابر کو پانی پلایا اور کچھ پانی اس کے منہ پر ڈالا تو اسے ہوش آ گیا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ حیران ہوا۔ ''تم لوگ کون ہو اور ہمیں کیوں بچایا؟''

''تم دیکھ پہلی بار رہے ہو لیکن سنتے رہے ہو ہمیں۔'' میں نے کہا تو چونکا۔

''یہ تم ہو؟''

میں نے سر ہلایا۔ ''ہم تمہارے پیچھے تھے کیونکہ ایک تو تم پر اعتبار نہیں تھا کہ تم ہمیں دھوکا دے کر مرشد کے پاس دوڑے جاؤ۔ اس صورت میں تمہیں دوسری دنیا میں ہوش آتا۔''

''مرشد...!'' اس نے اس طرح کہا کہ اس کے چہرے کی وریدیں ابھر آئی تھیں۔ میں نے افسوس سے چادر تلے موجود لاشوں کی طرف دیکھا۔

''دوسرے مجھے اسی بات کا خدشہ تھا۔ مرشد جیسے لوگ اپنے کسی معتوب کو اکیلے سزا نہیں دیتے ہیں اس سزا میں اس کا پورا خاندان شامل ہوتا ہے۔''

اس نے طیش سے کہا۔ ''کاش کہ تم مجھے پہلے چھوڑ دیتے تو میری بیوی اور بیٹی بچ جاتی۔''

''میرا خیال ہے یہ واردات بالکل صبح کسی وقت ہوئی ہے جب تم نے مجھ سے اس خدشے کا اظہار کیا تو اس وقت تک یہ سب ہو چکا تھا۔''

شازیہ ہوش میں آنے کے بعد خود کو سنبھالے ہوئے تھی اور پھر عبدل اور اسلم کے دوبارہ آنے سے بھی اسے جھٹکا لگا تھا لیکن اب وہ صدمہ سہار نہیں پا رہی تھی اچانک ہی فرش پر لڑھک گئی۔ صابر اس کی طرف جھپٹا۔ ''میری بچی... کیا ہوا تجھے؟'' وہ اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔

''میرا خیال ہے یہ صدمے سے بے ہوش ہو گئی ہے۔'' میں نے شازیہ کی نبض دیکھنے کے بعد کہا۔ ''صابر ہمارے پاس وقت کم ہے ہم اسلم اور عبدل کو لے کر جا رہے ہیں۔''

''تم انہیں نہیں لے جا سکتے وہ میرے مجرم ہیں۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ مرشد کے ساتھی ہیں اور ان سے ہمیں بہت کچھ معلوم کرنا ہے انہیں ہم لے جائیں گے۔ دوسرے تم ان کی نہیں اپنی فکر کرو میرا خیال ہے نمبر بنانے کے چکر میں یہ مرشد کو اطلاع دیے بغیر یہاں چلے آئے ہیں۔ لیکن جلد یا بدیر مرشد کے دوسرے آدمی آئیں گے اور تم ان کا مقابلہ نہیں کر سکو گے۔ اللہ نے تمہاری ایک بیٹی کو محفوظ رکھا ہے اسے لو اور کہیں نکل جاؤ۔''

''میں کہیں نہیں جا سکتا۔'' صابر نے مایوسی سے کہا۔

''میرے تمام ٹھکانے ان دو حرامیوں کے علم میں ہیں اور لازمی بات ہے انہوں نے مرشد کو بتا دیا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے ابھی تو تم ہمارے ساتھ چلو۔'' میں نے کہا۔

''بعد میں تم فیصلہ کر سکتے ہو کہ تمہیں کہاں جانا ہے۔''

صابر نے سوچا اور سر ہلایا۔ وہ اٹھا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ وسیم نے آہستہ سے مجھ سے کہا۔ ''اسے لے جانا ضروری ہے؟''

''بالکل ضروری ہے ایک تو یہ مرشد کے خلاف ہمارا ایک گواہ بن سکتا ہے دوسرے اگر اسے چھوڑ گئے تو جلد ہی یہ مرشد کے پتے پر چڑھ جائے گا اور ہمارے بارے میں سب بتا دے گا۔ اس وقت یہ بوکھلایا ہوا اور صدمے میں ہے جب تک یہ سنبھل کر اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے کے قابل نہ ہو جائے اسے اپنی تحویل میں رکھنا ضروری ہے۔''

وسیم سمجھ گیا۔ ''انہیں لے جانا کہاں ہے؟''

''فارم ہاؤس لیکن وین میں تاکہ یہ اس کا محل وقوع نہ دیکھ سکیں۔''

کچھ دیر بعد صابر ایک بڑا سوٹ کیس اٹھائے نمودار ہوا۔ میں نے پوچھا۔ ''اس میں کیا ہے؟''

''میرا کچھ سامان ہے اور رقم ہے۔'' اس نے ٹالنے والے انداز میں کہا لیکن میں متاثر نہیں ہوا۔ میں تحکمانہ انداز میں بولا۔

''صابر اسے کھول کر دکھاؤ۔''

''کیوں؟'' وہ بدک گیا۔ ''اس میں میری ذاتی چیزیں ہیں۔''

''ٹھیک ہے ان ذاتی چیزوں کے ساتھ تم جہاں جانا چاہو جا سکتے ہو ہم جا رہے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

''مطلب یہ کہ ہمارے ساتھ چلنا ہے تو جو میں کہوں وہ کرنا ہوگا۔ مجھے نہیں معلوم کہ تم اس سوٹ کیس میں اسلحہ یا کوئی خطرناک چیز لے جا رہے ہو۔''

بادلِ ناخواستہ صابر نے سوٹ کیس کھول کر دکھایا۔ اس میں اس کے اور شازیہ کے کپڑوں کے علاوہ خاصی تعداد میں نوٹوں کی گڈیاں تھیں، ایک عدد پستول تھا اور ایک چھوٹی شاٹ گن تھی۔ میں نے اسلحے کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ ہمارے حوالے کر دو۔''

''ایسا نہیں ہو سکتا۔'' اس نے مشتعل ہو کر کہا۔ ''کیا تم مجھے گرفتار یا قیدی بنا کر لے جا رہے ہو؟''

''نہیں ہم تمہیں اپنی حفاظت میں لے رہے ہیں لیکن اس کے لیے ضروری ہے تم خود کو پوری طرح ہمارے حوالے کر دو۔ اس صورت میں ہم تمہاری حفاظت کے ذمے دار ہوں گے۔''

''ورنہ تم اپنی حفاظت خود کرنے کے لیے آزاد ہو۔'' وسیم نے کہا۔

صابر کچھ دیر ہونٹ کاٹتا رہا تھا پھر اس نے پستول اور شاٹ گن نکال کر میرے حوالے کر دیں۔ ''گڈ اب تم ہمارے ساتھ چل سکتے ہو ایسا کرو سوٹ کیس مجھے دو اور شازیہ کو تم اٹھا لو۔''

''اسے کسی ڈاکٹر کو دکھانا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے راستے میں تم کسی کلینک میں اسے دکھا سکتے ہو۔'' میں نے کہا اور وسیم کو اشارہ کیا وہ اسے اور شازیہ کو لے گیا۔ شہاب وین بھی اندر لے آیا۔ صابر اور شازیہ کو اس میں منتقل کیا اور میں بیتو کے ساتھ جیپ میں آ گیا۔ ہم فوری طور پر حویلی کی طرف روانہ ہو گئے۔ وسیم کے بائیک سوار میری رہنمائی کر رہے تھے اس نے تین آدمی بلوائے تھے ان میں سے ایک ہمارے ساتھ جا رہا تھا اور دو ابھی وسیم کے پاس رک گئے تھے۔ جب وہ صابر اور شازیہ کو لے کر فارم ہاؤس پہنچ جاتا تب یہ دو بھی حویلی چلے جاتے۔ حویلی پنڈی شہر سے کوئی بیس کلو میٹرز کے فاصلے پر تھی۔ ہم پون گھنٹے میں وہاں پہنچے تھے، اگر جی ٹی روڈ سے جاتے تو فاصلہ بڑھ جاتا لیکن وقت کم لگتا۔ پرانے شہر کے پُر ہجوم اور مختصر راستوں سے گزرنے میں وقت لگا تھا۔

حویلی سچ مچ آئیڈیل قسم کی تھی۔ کسی قدر نشیب میں ہونے کی وجہ سے یہاں زمین میں سیم تھی اور اسی وجہ سے اسے زرعی مقاصد کے لیے استعمال نہیں کیا جا رہا تھا پھر آس پاس اونچے نیچے ٹیلے تھے ہموار زمین بہت کم تھی۔ کسی شوقین نے آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے یہ حویلی تیار کرائی تھی مگر اس کی حالت بتا رہی تھی کہ یہ کم سے کم پندرہ بیس سال سے بے آباد پڑی ہوئی ہے۔ رہنما ہمیں حویلی کے عقبی طرف سے اندر لے گیا وہاں نگرانی کا سسٹم تھا کیونکہ جیسے ہی ہم پھاٹک پر پہنچے فولادی گیٹ کھل گیا اور ہم اندر چلے گئے۔ ایک چھوٹے سے حصے کو صاف کر کے پارکنگ کی صورت دی گئی تھی۔ عمارت میں آمد و رفت کا راستہ بھی پیچھے کی طرف تھا۔ سامنے والے حصے کو بالکل نہیں چھیڑا گیا تھا اور وہ ویسے ہی تھا اگر کوئی سامنے والے حصے میں آ کر دیکھتا تو اسے ذرا بھی شبہ نہیں ہوتا کہ حویلی زیرِ استعمال ہے۔ بائیک سوار تقریباً چالیس برس کا چاق چوبند اور چھریرے جسم والا شخص تھا۔ اس نے ہیلمٹ اتارتے ہوئے کہا۔

''آیئے جناب۔''

''ان دونوں کو اندر پہنچانا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''دیکھو گولیوں کے زخم ہیں، ان کی مرہم پٹی کرنی ہے اور سخت نگرانی

WWW.PAKSOCIETY.COM

کرنی ہے، یہ بہت اہم قیدی ہیں۔"

"آپ بے فکر رہیں جناب یہاں ان کی صحیح سے دیکھ بھال ہوگی۔" اس نے کہا اور دوسروں کو بلانے چلا گیا۔

میں اور بیتو اندر آئے انہوں نے رہائش اور دوسرے کاموں کے لیے حویلی کے پانچ چھ کمرے صاف کر کے انہیں رہائش کے قابل بنا لیا۔ کچن بھی تھا کھانا وہ خود بناتے تھے۔ یہاں بجلی نہیں تھی لیکن انہوں نے مین روڈ سے گزرنے والی لائن سے کنڈا مار لیا تھا۔ پانی زمین سے نکالتے تھے اور اس کے لیے موٹر تھی۔ کھانا بنانے اور دوسرے کاموں کے لیے گیس سلینڈر استعمال کرتے تھے۔ کمروں میں فرنیچر ڈالنے کے بجائے انہوں نے انڈر لے کے ساتھ وال ٹو وال کارپٹ بچھا لیے تھے اور اسی پر سوتے تھے۔ واش روم ٹھیک کرانے کے لیے وہ پنڈی سے پلمبر اور سامان لے آئے تھے اسی طرح الیکٹریشن لا کر بجلی کا سارا کام کرا لیا تھا۔ ایک کمرے میں کنٹرول روم تھا انہوں نے حویلی میں چاروں طرف خفیہ کیمرے لگا دیے تھے جن سے بچ کر کوئی اس طرف چھپ کر نہیں آ سکتا تھا۔

قیدیوں کو رکھنے کے لیے تہ خانہ تھا۔ اس کی سیڑھیوں پر فولادی دروازہ تھا جسے توڑنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ دروازہ بھی انہوں نے خود لگایا تھا۔ تہ خانہ اندر سے بہت بڑا اور کچا تھا۔ اس میں جابہ جا ستون تھے جنہوں نے اوپر کی عمارت کا بوجھ سنبھال رکھا تھا۔ عبدل اور اسلم کو یہیں منتقل کر دیا گیا تھا۔ وسیم کے ایک درجن آدمیوں میں سے دو فرسٹ ایڈ جانتے تھے اور چھوٹا موٹا آپریشن بھی کر لیتے تھے زخمی ان کے سپرد کر دیے گئے میں نے ان سے کہا۔ "خیال رہے یہ مرنے نہ پائیں اور یہاں سے نکلنے بھی نہ پائیں یہ مرشد کے آدمی ہیں۔"

ہم وہاں دو گھنٹے رکے... بیتو نے چھولے کے سالن اور روٹی سے کچھ تناول فرمایا اور بہت حیران ہوا کہ گوشت کے علاوہ بھی کسی چیز میں اتنا ذائقہ ہو سکتا ہے۔ مجھے بھوک نہیں تھی اس لیے میں نے صرف چکھا تھا۔ روٹی کے لیے انہوں نے بنا بنایا تندور لے لیا تھا اس میں بیک وقت درجن روٹیاں لگ جاتی تھیں۔ وہ سب مزے سے اور بے فکری سے رہ رہے تھے۔ کھانا پینا کھلا تھا۔ کھلی فضا تھی۔ تفریح کے لیے انہوں نے ڈش کے ساتھ ٹی وی لگا لیا تھا۔ ایک ڈی وی ڈی پلیئر تھا جس پر وہ مووی دیکھتے تھے۔ اخبارات اور رسائل بھی لے آتے تھے۔ باہر کے کاموں کے علاوہ وسیم نے ان سب کی ڈیوٹی باندھی ہوئی تھی۔ ویرانہ ہونے کے باوجود یہاں موبائل سگنل تھے اس لیے رابطے میں آسانی رہتی تھی۔ جن کے گھر والے تھے اور آس پاس رہتے تھے انہیں ہفتے میں دو دن چھٹی ملتی تھی کہ وہ جا کر گھر والوں سے مل آئیں۔ وسیم نے ان کی باقاعدہ تنخواہیں مقرر کی ہوئی تھیں اور انہیں دو مہینے کی پیشگی تنخواہیں دے دی گئی تھیں۔

دو بجے وسیم کی کال آئی۔ "میں نے انہیں فارم ہاؤس پہنچا دیا ہے۔ لڑکی کو ٹریٹمنٹ مل گئی ہے۔ اس کی حالت بہتر ہے۔ اب ان کے ساتھ کیا کرنا ہے۔"

"نگرانی میں رکھو لیکن اس طرح کہ صابر کو احساس نہ ہو اور اسے کسی سے رابطہ مت کرنے دینا۔ میں اور بیتو شام تک آئیں گے۔" میں نے کہا۔ "میں ذرا ان دونوں سے ابتدائی پوچھ گچھ کر لوں۔"

مرہم پٹی اور جراحی کے ماہر نے دونوں کے زخموں کی پٹی کر دی تھی۔ میرے شکار کے شانے میں گولی اٹکی ہوئی تھی اسے نکالنے کے لیے چھوٹا سا آپریشن کرنا پڑا تھا۔ بہر حال اب وہ دونوں ٹھیک حالت میں تھے۔ میں اور بیتو نیچے تہ خانے میں آئے۔ یہاں وہ ایک طرف دیوار میں نصب زنجیروں سے بندھے ہوئے تھے فولادی کڑے ان کے پیروں میں تھے اور وہ ایک حد سے زیادہ حرکت نہیں کر سکتے تھے۔ زمین پر سوکھی گھاس بچھی تھی جو دبیز اور آرام دہ تھی وہ اسی پر پڑے ہوئے تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھے ان میں سے سیاہ شرٹ والے نے ناک پھلا کر کہا۔ "تم نے اچھا نہیں کیا ہے، تمہیں معلوم نہیں ہے ہم کس کے بندے ہیں۔"

"بندے سب اللہ کے ہوتے ہیں اور جو خود کو اللہ کا بندہ نہیں سمجھتے وہ یقیناً شیطان کے بندے ہوتے ہیں۔ تم کس کے بندے ہو؟"

"ہم مرشد بادشاہ کے آدمی ہیں۔" سیاہ شرٹ والا بولا۔ ابھی اس کا جملہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ میرے جوتے کی نوک اس کے منہ پر لگی اور وہ الٹ کر پیچھے گرا۔

"میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا تم شیطان کے بندے ہو اور تمہیں بھی سمجھ میں آ جانا چاہیے کہ مرشد تمہیں بچانے نہیں آئے گا۔ اس کے نزدیک تمہاری حیثیت باتھ روم کے لوٹے سے زیادہ نہیں ہے۔"

وہ منہ دبائے کراہ رہا تھا یقیناً اس کے کئی دانت ہل گئے تھے یا حلق میں اتر گئے تھے۔ میں نیلی جرسی والے کی طرف متوجہ ہوا جو میرے جارحانہ رویے سے کسی قدر دہشت زدہ نظر آ رہا تھا، میں نے اس سے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"اسلم۔" اس نے جلدی سے کہا۔ "یہ عبدل ہے۔"

"پہلے تم دونوں صابر کے کتے تھے لیکن جب مرشد نے

بڑی بڑی دکھائی تو دم ہلاتے اس کے پاس چلے گئے اور اپنے مربی آقا کے احسانات کا صلہ یوں دیا کہ اس کے پورے گھر کو برباد کر دیا۔ ان عورتوں کا کیا قصور تھا؟" میں غصے میں آ گیا۔

"صابر کا رویہ ہمارے ساتھ اچھا نہیں تھا۔" اسلم نے کہا۔ "وہ مشکل کام ہم سے لیتا تھا اور ہمیں بہت کم معاوضہ دیتا تھا۔ ہمارے ساتھ اس کا رویہ سچ مچ کتوں جیسا تھا۔"

"تم مجبور نہیں تھے اسے چھوڑ کر جا سکتے تھے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ ممکن نہیں ہے اگر ہم اسے چھوڑتے تو وہ ہمیں نہیں چھوڑتا۔"

"ٹھیک ہے لیکن اس کے گھر والوں کا... ان بے گناہ عورتوں کا کوئی قصور نہیں تھا۔ ان کے ساتھ جو ہوا اس میں تم برابر کے شریک ہو۔" میرے لہجے سے اسلم خوف زدہ ہو گیا۔

"دیکھو ان کے ساتھ جو ہوا وہ مرشد کے حکم سے ہوا تھا۔"

"چپ کر کتے..." عبدل نے منہ دبائے دبائے کہا۔

"میرا خیال ہے پہلے تمہارا منہ بند کرنا ہوگا۔" میں نے عبدل کی طرف دیکھا۔ "تمہیں مرشد سے وفاداری کا بخار چڑھا ہوا ہے لیکن جلد یہ بخار اتر جائے گا۔" میں نے اسلم کی طرف دیکھا۔ "تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ صابر کے گھر والوں کے ساتھ جو ہوا اس میں تمہارا قصور نہیں تھا۔"

اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "ہمارا قصور صرف اتنا ہے کہ ہم مرشد کے آدمیوں کو صابر کے گھر لے گئے تھے۔"

اس بار میں نے اسلم کو لات ماری تھی۔ وہ لڑھکا اور جلدی سے سیدھا ہو گیا۔ "میں سچ کہہ رہا ہوں۔"

میں نے دوبارہ لات مار کر اسے لڑھکا دیا۔ صابر اور اس کی لڑکی شازیہ ہمارے پاس ہے ابھی وہ ٹھیک نہیں ہے لیکن جلد اس کی حالت سدھر جائے گی اور وہ تم دونوں کے بارے سب بتائے گی۔"

میری بات سن کر ان کے چہرے زرد پڑ گئے تھے۔ میں نے بات جاری رکھی۔ "جب میں اس لڑکی کے الزامات سن کر آؤں گا تو تم لوگ اپنی صفائی تیار رکھنا دوسری صورت میں اس تہ خانے سے صرف تمہاری روحیں باہر جا سکیں گی جسم یہیں زمین کھود کر دفن کر دیے جائیں گے تم سے پہلے بھی بہت سارے یہیں دفن کیے گئے ہیں۔"

ان کو دھمکی دے کر میں بیتو کے ساتھ باہر آیا۔ ان لوگوں نے چائے تیار کر لی تھی اس لیے اصرار کر کے ہمیں روک لیا۔

چائے پی کر ہم روانہ ہوئے اس دوران میں ان لوگوں نے جیپ کا پچھلا حصہ صاف کر دیا تھا جہاں عبدل اور اسلم کا خون گرا تھا۔ بیتو کو یہ جگہ اچھی لگی تھی وہ ویسے بھی جنگلوں اور ویرانوں کا پروردہ تھا۔ اب شہری زندگی کا عادی ہو گیا تھا لیکن اسے اچھے ویرانے ہی لگتے تھے۔ اس نے راستے میں کہا۔ "شوبی بھائی ہم یہاں آ جاتا ہے دشمن کی نظر سے بھی بچے گا۔"

"یہ جگہ اچھی ہے لیکن شہر سے دور ہے، اگر ہمیں فوری جانا ہو تو دیر لگ سکتی ہے، دوسرے ہمیں کسی ایک ٹھکانے تک محدود نہیں رہنا چاہیے۔ دو تین ٹھکانے تیار رہنے چاہئیں تاکہ کسی ایک جگہ سے بھاگنا پڑے تو دوسری جگہ ہو۔"

"عبداللہ بھائی کی کوٹھی کے ساتھ ایک فارم ہاؤس اور ایک یہ حویلی ہمارے پاس اب تین جگہ ہو گیا ہے۔"

"ایک جگہ ہمیں اور لینی چاہیے جو اسلام آباد اور پنڈی دونوں کے پاس ہو کیونکہ مرشد کے اکثر ٹھکانے ان ہی جگہوں پر ہیں۔ عبداللہ کی کوٹھی اب اس کام کے لیے مناسب نہیں ہے اس کے بارے میں مرشد اور فتح خان سمیت ہمارے تمام دشمن جانتے ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی جگہ ہونی چاہیے۔"

"آپ ٹھیک بولا ایک جگہ اور ہونا چاہیے۔"

ہم ایک گھنٹے بعد فارم ہاؤس پہنچے۔ شام کا وقت تھا۔ سورج غروب ہونے کے قریب تھا۔ سارا دن بادل اور وقفے وقفے سے بارش کے بعد اب مطلع صاف ہو گیا تھا۔ اگر موسم صبح تک ایسا ہی رہتا تو سفیر مونا اور سعدیہ جا سکتے تھے۔ عبداللہ بھی آیا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ "کیا حال ہیں شہباز صاحب، میں نے ابھی بات کی ہے کل صبح اچھے موسم کا امکان ہے اس لیے ہیلی کاپٹر جائے گا۔"

"گڈ! یہ اچھی خبر سنائی ہے تم نے۔" میں نے جوتے اتارتے ہوئے کہا۔ سفیر چپ بیٹھا تھا ظاہر ہے وہ ہم سے دور جانے کے خیال سے غمگین تھا۔ عبداللہ نے کہا۔

"ایک اچھی خبر اور بھی ہے۔ نادر کا سراغ مل گیا ہے۔"

میں چونک کر سیدھا ہو گیا۔ "نادر... کہاں ہے؟"

"سیٹلائیٹ ٹاؤن پنڈی کی ایک کوٹھی میں ہے۔ اتفاق سے میرے آدمیوں نے اسے ایک فزیوتھراپی سینٹر سے روانہ ہوتے دیکھ لیا۔ وہ وہاں اپنا چیک اپ کرانے آیا تھا۔ میرے آدمیوں نے اس کا پیچھا کیا اور اس کے ٹھکانے کا پتا چلا لیا۔"

"کوٹھی کس کی ہے؟"

"کسی حشمت اللہ قادری کی ہے۔" عبداللہ نے بتایا۔ "دیکھنے میں بہ ظاہر عام سی اور بغیر کسی حفاظتی انتظام

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے لگتی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے نادر وہاں چھپ کر رہ رہا ہے۔"

"ہاں فزیوتھراپی سینٹر میں بھی اس کے ساتھ صرف ایک ڈرائیور اور ایک ملازم ٹائپ شخص تھا جو اسے سنبھال رہا تھا۔ ان دونوں میں سے کوئی محافظ نہیں لگ رہا تھا۔"

"کیا نادر کی مالی حالت اتنی خراب ہوگئی ہے کہ اب وہ محافظ بھی نہیں رکھ سکتا ہے۔"

"ممکن ہے اس کے پاس رقم نہ ہو مرشد نے اس سے سب چھین لیا ہو۔" وسیم نے کہا۔ "ہمارے آدمی کوٹھی کی نگرانی کر رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے نگرانی جاری رکھو اور اگر ممکن نظر آئے تو نادر کو ابھی اٹھا کر حویلی کے تہ خانے میں پہنچا دو۔" میں نے کہا اور پھر وسیم سے پوچھا۔ "صابر اور اس کی لڑکی کی حالت کیسی ہے؟"

"ابھی تو ٹھیک ہے۔" وسیم نے افسوس سے سر ہلایا۔ "لیکن اس بے چاری کے ساتھ برا ہوا ہے۔"

"وہ تو میں اسے دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا۔"

"لیڈی ڈاکٹر جس نے اس کا معائنہ کیا ہے اس کا کہنا ہے کہ اسے کئی افراد نے زیادتی کا نشانہ بنایا ہے اور اسے بھرپور توجہ اور نفسیاتی ٹریٹ منٹ کی ضرورت ہے ورنہ وہ خود کشی بھی کر سکتی ہے۔"

"ہم یہ دونوں چیزیں اسے نہیں دے سکتے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ "اس کا باپ ساتھ ہے شاید وہ اسے سنبھال لے۔ لیڈی ڈاکٹر نے کوئی مسئلہ تو کھڑا نہیں کیا؟"

"نہیں وہ سمجھدار تھی اسے معلوم تھا پولیس تک کیس لے جانے کی صورت میں اسے بھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ویسے باپ سے زیادہ ایسے مواقعوں پر ماں کام آتی ہے لیکن وہ بھی دنیا سے جا چکی ہے۔"

"یہ کیسے بچ گئی... جبکہ اس کی ماں اور بہن کو وہ مار کر گئے تھے؟"

وسیم نے وضاحت کی۔ "لڑکی کا کہنا ہے اس پر عبدل نے گولی چلائی تھی لیکن نشانہ خطا گیا اور گولی اس کے پہلو کے پاس سے گزر کر زمین پر لگی تھی۔ عبدل سمجھا گولی نشانے پر لگی ہے اس نے چیک نہیں کیا اور اسی وجہ سے شازیہ کی جان بچ گئی۔ اس کا کہنا ہے کہ اس کی ماں اور چھوٹی بہن کو بھی عبدل نے گولی ماری تھی۔ ان ماں بیٹیوں کی بے حرمتی میں عبدل اور اسلم برابر کے شریک تھے۔"

"ایسا لگتا ہے وہ صابر سے کسی بات پر پہلے سے خار کھائے بیٹھا تھا اسے موقع ملا تو اس نے بدلہ لے لیا۔"

"ہم کو بھی ایسا ہی لگتا ہے۔" بیتو بولا۔ "کیسا اکڑ رہا تھا کتے کا بچہ۔"

"یہ دونوں قاتل اور مجرم ہیں ان کے لیے کوئی معافی نہیں ہے۔" وسیم نے کہا تو میں نے اس کی تائید کی۔

"بالکل ان سے کام کی باتیں اگلوا کر ان کا پارسل بنا کر مرشد کو بھیج دیں گے۔ وہ جیسے چاہے ان کا کریا کرم کرے۔"

عبداللہ اور وسیم کل کے منصوبے کے لیے تبادلہ خیال کرنے لگے اور میں اوپر آیا۔ کئی دن سے میری سویرا سے بات نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اس کا موبائل نمبر ملایا۔ اس نے فوراً کال ریسیو کی اور دھڑکتے لہجے میں بولی۔ "ہیلو... کون؟"

"بوجھو تو جانیں۔" میں نے جان کر آواز بدلی لیکن اس نے پہچان لیا۔

"آپ۔" وہ کھل اٹھی تھی۔ "کتنی لمبی عمر ہے آپ کی، ابھی میں آپ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔"

میں نے شرارت سے کہا۔ "اچھا کبھی ایسا ہوتا ہے کہ میرے بارے میں نہ سوچ رہی ہو؟"

وہ ایک لمحے کو چپ ہوئی۔ "ہاں یہ تو میں نے خیال ہی نہیں کیا میرا شاید ہی کوئی پل آپ کی سوچ سے خالی جاتا ہو۔"

"اور یہاں جب فرصت ملتی ہے صرف تمہارا ہی خیال آتا ہے۔"

"شہباز میں آپ کے بارے میں بہت سوچتی ہوں اور بہت دعا مانگتی ہوں اس کے باوجود میرا دل ڈرتا ہے۔"

"اپنے دل کو سمجھاؤ..." میں نے نرمی سے کہا۔ "جو میرے نصیب میں لکھا ہے اس سے زیادہ یا اس سے کم کچھ نہیں ہوگا۔"

"میں کیا کروں... اندر سے کمزور ہوں۔" وہ رو دی۔ "شہباز کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم دونوں سب چھوڑ کر یہاں سے کہیں دور چلے جائیں۔"

"بس ہم دونوں...؟" میں نے کہا تو وہ چپ ہو گئی کیونکہ وہ سمجھ گئی تھی کہ میرا کیا مطلب ہے۔ اس نے سرد آہ بھری۔

"ٹھیک کہا آپ نے، معاملہ صرف ہم دونوں کا نہیں ہے، میں شاید خود غرض ہو کر سوچنے لگی ہوں۔"

"اس میں تمہارا قصور نہیں ہے، ہم سب ایک ایسی دلدل میں پھنس گئے ہیں جس سے نکلنا چاہتے ہیں لیکن نکلنے کا کوئی راستہ بھائی نہیں دے رہا ہے۔ بس اللہ ہی ہماری مدد

کرنے والا ہے۔"

"مجھے اللہ سے امید ہے وہ ہمارے لیے بہتر کرے گا۔" سویرا بولی۔ اس نے زبردستی لہجہ شگفتہ کر لیا تھا۔ "آپ بھی کیا سوچتے ہوں گے جب مجھ سے بات کرتے ہیں میں رو دیتی ہوں۔"

"میں یہی سوچ کر کال کرتا ہوں کیونکہ تم کسی اور کے سامنے نہیں رو سکتیں صرف میرے سامنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتی ہو۔"

"آپ مجھے اتنا جانتے ہیں؟" اس نے کسی قدر تعجب سے کہا۔

"ہاں ایسے جیسے میں خود کو جانتا ہوں۔" میں نے یقین سے کہا۔ "ایسے ہی تم کو جانتا ہوں۔"

"آپ ٹھیک ہیں نا اپنا خیال رکھتے ہیں؟" اس نے شرما کر موضوع بدل دیا۔ "آپ کی صحت کیسی ہے؟"

"ہاں رکھتا ہوں تمہاری خاطر اور صحت پہلے سے بہتر ہو رہی ہے۔" میں نے کہا۔ "کل حویلی میں دو خواتین یعنی سعدیہ اور مونا کا اضافہ ہو جائے گا، سفیر بھی وہیں آ کر رہے گا۔ سفیر اور مونا کے لیے ایک کمرا سیٹ کر دو۔"

"سچ میں۔" اس نے خوشی سے کہا۔

"ہاں میں نے سوچا ہے کہ ان خواتین کی وہاں زیادہ بہتر حفاظت ہو سکے گی۔ مونا امید سے ہے اسے دیکھ بھال، آرام اور بہترین غذا کی ضرورت ہے۔"

"اچھا اس لیے سفیر بھائی بھی آ رہے ہیں۔"

"ہاں بابا کیا کر رہے ہیں؟"

"بابا آج کل مصروف رہتے ہیں، پیچھے کی طرف جو زمین لی ہے اس کو ہموار کرا لیا ہے اور اس پر چھ کاشت کار بھی بٹھا لیے ہیں وہ اپنے کچے پکے مکان بنا رہے ہیں۔"

"وہ صرف کاشت کار ہیں؟"

"نہیں وہ سب فوج سے ریٹائر ہیں اور ان کے پاس اسلحے کا لائسنس بھی ہے۔ وہ پیچھے کی طرف سے حویلی کی حفاظت بھی کریں گے۔" سویرا نے تفصیل سے ان کے بارے میں بتایا۔ "حویلی کی حفاظت کے لیے اب چھ آدمی ہیں۔"

میرا اندازہ تھا کہ ان سارے انتظامات پر ہر مہینے لاکھ سے زیادہ ہی خرچ آ رہا ہوگا۔ بابا دولت مند تھے لیکن اتنا خرچ کرنا ان کے لیے بھی ذرا مشکل ہی تھا۔ میں نے سویرا سے اس بارے میں پوچھا تو وہ بولی۔ "نہیں بابا کے پاس رقم ہے آپ جانتے ہیں وہ کھل کر خرچ کرتے ہیں لیکن فضول خرچی اور بے جا نمائش سے چڑتے ہیں اس لیے ان کی آمدنی ہمیشہ خرچ سے زیادہ رہی ہے میں نے بھی بابا سے یہی بات کہی تھی۔ اپنی زمین اور دولت بابا کو پیش کی تھی۔"

"پھر جھاڑ کھائی ہوگی؟"

"ایسی ویسی... بیچ میں مزہ آ گیا تھا۔ بابا نے زندگی میں پہلی بار مجھ پر غصہ کیا۔ بہرحال جب ان کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ ان کے پاس رقم ہے۔ انہوں نے بینک اسٹیٹمنٹ بھی دکھائی تھیں۔"

میں نے سکون کا سانس لیا۔ "یہ اچھی بات ہے، میں نے سوچا ہے جہاں میں بزنس کر رہا تھا وہ جگہ بیچ دیتا ہوں بزنس تو ختم ہو گیا لیکن جگہ کی قیمت مل جائے گی۔"

"بالکل نہیں۔" وہ جلدی سے بولی۔ "جب حالات ٹھیک ہوں گے اور ہم دوبارہ نارمل لائف کی طرف آئیں گے تب ہم اسی جگہ سے دوبارہ کام شروع کریں گے۔"

اس نے واضح کیے بغیر بھی واضح کر دیا تھا کہ وہ اس زندگی میں میرا ساتھ دے گی۔ سویرا کے بعد میں نے ماں جی سے بات کی، سردی کم ہونے سے ان کے جوڑوں کا درد بھی کم ہوا تھا۔ بھائی جان ان کے لیے ایک مساج مشین لائے تھے جس سے انہیں بہت فائدہ ہوا تھا اور ان کی یہ سرد یاں سکون سے گزری تھیں۔ ماں جی کے بعد بابا سے بات ہوئی۔ انہوں نے میرے فیصلے سے مکمل اتفاق کیا کہ خواتین کو حویلی منتقل کر دینا چاہیے۔ آپا اور شمی سے مختصر بات کے بعد میں نے فون بند کیا تو اپنی کیفیت پر حیران رہ گیا۔ میں اندر سے بہت خوش اور پُرسکون تھا۔ جبکہ کچھ دیر پہلے میں ایک بڑی کامیابی حاصل کرنے کے باوجود اندر سے ٹینس اور فکرمند تھا۔ آدھے پون گھنٹے کے لیے میرا ماحول بدل گیا تھا اور میں حویلی پہنچ گیا تھا۔ میں نے صابر کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ ان دونوں باپ بیٹی کو ایک کمرا دے دیا گیا تھا۔ صابر نے دروازہ کھولا۔ اس کے سر پر دو جگہ پٹیاں بندھی ہوئی تھیں جہاں عبدل اور اسلم نے ضربیں لگائی تھیں۔ اب نہا دھو کر اور کپڑے بدل کر وہ بہتر لگ رہا تھا۔

"مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔" میں نے کہا تو اس نے بیڈ پر سوتی شازیہ کو دیکھا۔ "اس کی حالت کیسی ہے؟"

"بہتر ہے ڈاکٹر نے اسے چند دن مکمل آرام کرنے اور دواؤں کے اثر میں رکھنے کا مشورہ دیا ہے۔" اس نے کہا اور باہر نکل آیا۔ اوپری منزل پر بھی ایک چھوٹا سا لاؤنج تھا ہم وہیں آ گئے۔ "کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ "مرشد کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس کا چہرہ تن گیا۔ ”اگر مجھے اپنی زندگی دس بار قربان کر کے ایک بار اسے مارنے کا موقع ملے تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔“

”کیا تم اسے اتنا آسان سمجھتے ہو؟“

”نہیں، میں جانتا ہوں وہ درجنوں مسلح اور چوکس محافظوں کے حصار میں رہتا ہے اور کوئی شخص اس کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتا...... لیکن میں اب تک سمجھ نہیں سکا ہوں کہ اس سے تمہاری کیا دشمنی ہے۔“

”پرانی دشمنی نہیں ہے یہ سال پرانا قصہ بھی نہیں ہے۔ میرا نام ملک شہباز ہے۔“

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ”تم... شہباز ہو... میرے خدا... تمہیں مرشد کے سارے دشمن اور دوست جانتے ہیں۔“

”ہاں میں وہی شہباز ہوں۔ وہ مجھے اپنے بھائی نادر کی معذوری کا سبب سمجھتا ہے اور وہ میرے بھائی میجر شاہد کا قاتل ہے لیکن تم مجھے کیسے جانتے ہو؟“

”تم یوں مشہور ہو کہ مرشد تم پر قابو نہیں پا سکا۔ اس نے تمہارے ہاتھوں نقصان اٹھائے ہیں۔ ورنہ اس علاقے میں کوئی اس سے دشمنی کر کے رہ نہیں سکتا ہے۔“

”تمہارے گھر والوں کے ساتھ جو ہوا مجھے اس کا افسوس ہے۔ میں نے تمہارے دو مجرم پکڑ لیے ہیں فی الحال میں ان سے مرشد کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہا ہوں۔“

”تم انہیں میرے حوالے کر سکتے ہو؟“ اس نے بے چینی سے پوچھا۔

”ہاں لیکن بدلے میں مجھے تم سے کیا ملے گا؟“

”دیکھو میں تمہارے کام آ سکتا ہوں جیسے میں نے خانقاہ میں جانے والے خفیہ راستے کے بارے میں بتایا اس طرح میں مرشد کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں۔“

”اس کے بارے میں، میں خود بھی بہت کچھ جانتا ہوں۔ مجھے مہرو کی تلاش میں تمہاری مدد درکار ہے۔“

”اگر تم مرشد کے خلاف میری مدد کرو تو میں اس عورت کی تلاش میں زمین آسمان ایک کر دوں گا۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”بھول جاؤ کہ اب تم کبھی آزادانہ کچھ کر سکو گے، میرا تو مشورہ ہے تم اپنی بیٹی کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ بلکہ ملک سے بھی باہر چلے جاؤ۔“

”تب میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟“

”تمہارے پاس مہرو سے متعلق جو بھی معلومات ہوں وہ مجھے دے دو باقی میں خود دیکھ لوں گا۔“

اس نے کچھ دیر بعد پوچھا۔ ”تمہیں اس عورت کی تلاش کیوں ہے؟“

”یہ میں تمہیں نہیں بتا سکتا ہوں۔“ میں نے صاف گوئی سے کہا۔ ”یوں سمجھ لو کہ میں اسے مرشد کی گرفت میں آنے سے بچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

”میں اس کے بارے میں جو جانتا تھا وہ تمہیں بتا چکا ہوں، ہاں اگر تم چاہو تو میں خود کشمیر تک جا کے اسے تلاش کر سکتا ہوں وہاں میرے روابط ہیں یہ کام میرے لیے آسان ہے۔“

اس کی بات نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اگر وہ مہرو کی تلاش کا ذمہ اٹھا لیتا تو میں اپنی توجہ دوسرے کاموں کی طرف لگا سکتا تھا۔ مگر اس کی شرط تھی کہ میں مرشد کے خلاف اس کا ساتھ دوں۔

”تم مرشد کے خلاف کس قسم کی مدد چاہتے ہو؟“

”میں اسے فنا کر دینا چاہتا ہوں۔“ اس نے شعلہ فشاں لہجے میں کہا۔ ”اس کے لیے مجھے اپنی جان بھی دینا پڑے تو میں اسے سستا سودا سمجھوں گا۔“

”تم جانتے ہو یہ کام آسان نہیں ہے دوسرے میں انتقام برائے انتقام کا قائل نہیں ہوں۔ مرشد میرے بھائی کا قاتل ہے اور ایک بار موقع آیا جب میں دنیا سے اس کا وجود مٹا سکتا تھا لیکن میں نے ایسا کرنے سے گریز کیا۔“

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ ”جب تمہیں موقع ملا تھا تو تم نے اس کا فائدہ کیوں نہیں اٹھایا۔“

”میں نے کہا نا میں صرف انتقام لینے کا قائل نہیں ہوں۔ میں کوئی مجرم یا پیشہ ور قاتل بھی نہیں ہوں جو لوگوں کو قتل کرتا پھروں۔“

اس نے کسی قدر مایوسی سے کہا۔ ”پھر مرشد کے خلاف تمہاری اس جدوجہد کا فائدہ... تم اسے موقع دیتے رہو گے لیکن جب اسے موقع ملا تو وہ ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرے گا۔“

میں مسکرایا۔ ”ایسا نہیں ہے، میں بھی کئی بار مرشد کی گرفت میں آیا لیکن وہ مجھے رعایت دینے پر مجبور ہوا، ہمارے درمیان کچھ اس قسم کی دشمنی ہے کہ ہمیں ایک دوسرے کی جان لینے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ تم اس بات کو نہیں سمجھو گے۔ بہرحال اگر تم مرشد کو خودکش انداز میں ہلاک کر کے اپنے گھر والوں کا بدلہ لینا چاہتے ہو تو میں اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔“

”تب تم مجھے بیکار میں یہاں لائے۔“ وہ مایوسی سے بولا۔

”نہیں بیکار میں تو نہیں لایا میں تمہیں مرشد کے ہاتھوں ... سے بچانا چاہتا ہوں۔ مجھے اندازہ تھا کہ تم جذباتی ہو کر ... کا رخ کرو گے اور انجام کار پکڑے جاؤ گے یا مارے جاؤ ... اگر پکڑے گئے تو میرا نام بھی لے دو گے اس طرح مرشد کو ... چل جائے کہ کالی کوٹھی کی تباہی میرے ہاتھوں ہوئی ہے اور ... میں ایسا نہیں چاہتا۔“

”تم نے کوٹھی کیوں تباہ کی؟“

”وہاں کوئی ایسا ریکارڈنگ سسٹم تھا جو آوازیں ریکارڈ کرتا ہے اور ہمارے پاس وقت نہیں تھا اسے تلاش کرنے کا اس لیے کوٹھی میں آگ لگا دی مگر ہوا یہ کہ کوٹھی میں بڑی مقدار میں ... بارود بھی تھا آگ اس تک پہنچی اور پوری کوٹھی دھماکے سے تباہ ہو گئی۔“

”وہ مرشد کا بہت اہم ٹھکانا تھا اس کی تباہی نے اسے دیوانہ کر دیا ہوگا۔“ اس نے کہا۔ ”میری بیوی اور بیٹی اسی دیوانگی کی بھینٹ چڑھ گئیں۔“

میں اس سے کہہ نہیں سکا کہ یہ مکافاتِ عمل تھا۔ اس نے جو بویا تھا اسے وہی کاٹنا پڑا تھا لیکن میں دل آزاری نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ صابر اس صدمے سے سنبھل گیا ہے اور وہ کسی فکر میں ہے۔ شروع میں اس کے لہجے میں مرشد کے لیے جو آتش فشانی تھی وہ اب باقی نہیں رہی تھی۔ شاید اس نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ مرشد کے مقابلے میں بہت معمولی حیثیت کا بدمعاش تھا جو نقصان ہو چکا تھا وہ اس سے زیادہ نقصان نہیں چاہتا تھا اور اس کی بہترین صورت یہ تھی کہ وہ مرشد سے دور رہے اس سے انتقام کا چکر بھول جائے۔ ابھی وہ مجھ سے مرشد سے بدلہ لینے کے سلسلے میں تعاون کی بات کر رہا تھا تو مجھے اس کا لہجہ مصنوعی لگا تھا۔ اس کے انداز میں تبدیلی نے مجھے چونکا دیا تھا۔

”ابھی تو تم کچھ دن آرام کرو اس کے بعد سوچنا کہ تم نے کیا کرنا ہے۔“

”کیا میں باہر جا سکتا ہوں؟“ اس نے بہ ظاہر سرسری انداز میں پوچھا۔

میں نے انکار کر دیا۔ ”نہیں ابھی مرشد کے آدمی پاگلوں کی طرح پورے شہر میں تمہیں تلاش کر رہے ہوں گے۔ تمہارا اور شازیہ کا باہر جانا ٹھیک نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“

میں کھڑا ہو گیا۔ ”اب تم آرام کرو لیکن بلا ضرورت کمرے سے باہر آنے کی کوشش مت کرنا جس چیز کی ضرورت ہو وہ مہیا کر دی جائے گی۔“

”میں اس پناہ کے لیے تمہارا شکر گزار ہوں۔“ اس نے جیسے سوچ کر کہا۔ ”تم نے میرے لیے جو کیا ہے وہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔“

اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔ میں نے اس کے لیے کیا کیا تھا۔ کیا وہ اپنے گھر کی تباہی کے حوالے سے یہ بات کر رہا تھا مجھے اس کا ذمے دار قرار دے رہا تھا۔ یک لخت میں نے محسوس کیا کہ اسے یہاں لانا میری غلطی تھی۔ اس کے بجائے وسیم اسے شہر سے باہر کہیں چھوڑ آتا جہاں وہ جان بچانے کے لیے مرشد سے دور جا سکتے تھے۔ اب وہ ہمارا یہ ٹھکانا دیکھ چکا تھا۔ بے شک اسے اس کے درست محلِ وقوع کا علم نہیں تھا لیکن ایک بار وہ یہاں سے نکل جاتا تو اس کے لیے فارم ہاؤس کی لوکیشن دیکھنا مشکل نہیں ہوتا۔ میں اسے کمرے تک لایا اور جب اس نے اندر سے دروازہ بند کیا تو میں نے باہر سے بھی کنڈی لگا دی۔ کنڈی میں نے بلند آواز کے ساتھ لگائی تھی تاکہ اسے بھی پتا چل جائے۔ فوراً ہی اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی اور ناکامی پر چلایا۔

”شہباز یہ کیا حرکت ہے؟“

”یہ تمہاری حفاظت کے لیے ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ابھی تمہیں آرام کی ضرورت ہے اس لیے آرام کرو۔“

اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن میں نے بغیر نیچے آ گیا۔ عبداللہ سفیر کو لے کر جا چکا تھا۔ وسیم ٹی وی دیکھ رہا تھا اس نے میری طرف دیکھا۔ ”کیا کہہ رہا ہے صابر...“

میں اس کے پاس صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ ”مجھے اس کی نیت میں فتور نظر آ رہا ہے۔“

”مجھے بھی محسوس ہوا ہے، اپنے گھر میں جب وہ صدمے میں تھا تو سچ مچ مرشد کے خلاف بول رہا تھا لیکن یہاں آنے کے بعد مجھے لگا جیسے اس کا لہجہ مصنوعی ہو گیا ہے اور وہ صرف ہمیں سنانے کے لیے مرشد کے خلاف بات کر رہا ہے۔“

”یہی چیز میں نے بھی محسوس کی اور اسے کمرے میں بند کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ مرشد سے ڈر گیا ہے اور اب اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا لیکن یہ بات ہمیں کہتے ہوئے ڈرتا ہے۔“

”آپ کا مطلب ہے کہ اسے آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہ بیٹی کو لے کر کہیں بھاگ جائے گا؟“

”ہو سکتا ہے لیکن اس کا بھی امکان ہے کہ وہ اسے ہمارا کیا دھرا سمجھ کر مرشد کے پاس دست بستہ حاضر ہو جائے۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

"ہمارا کیا دھرا...؟"

"مطلب کہ ہماری وجہ سے مرشد نے یہ کارروائی کی ہے اس لیے وہ ہمیں قصوروار سمجھ رہا ہے۔"

وسیم نے سر ہلایا۔ "اگر اس نے یہ حماقت کی تو مرشد کا کام آسان ہو جائے گا وہ اس کی بیٹی کو تو زندہ رکھے گا اور اسے اپنے جلادوں کے حوالے کر دے گا۔"

"ابھی اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی ہے۔ ایک خطرہ اور ہے وہ مرشد کو ہمارے بارے میں بھی بتا دے گا تاکہ مرشد اسے معاف کر دے۔"

"تب یہ بات یقینی ہے وہ زیادہ سے زیادہ نمبر بنانے کی کوشش کرے گا۔"

"اس لیے ابھی اسے قید رکھنا ہے کل ان لوگوں کی روانگی کے بعد اس کا فیصلہ کریں گے۔" میں نے کہا۔ "میں نے سوچا ہے کہ ہمیں ایک ایسا ٹھکانا مزید تلاش کرنا چاہیے جو پنڈی اور اسلام آباد کے نزدیک ہو اور ہم وہاں سے بہ آسانی ہر جگہ جا سکیں۔"

"مل جائے گا۔" وسیم نے کہا۔ "کیا اسے مرشد کے خلاف استعمال کریں گے؟"

"ہاں اس کے سارے ٹھکانے ان دونوں شہروں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ صابر نے خانقاہ مرشدیہ کے بارے میں جو معلومات فراہم کی ہیں ہم ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔"

وسیم فکرمند ہو گیا۔ "کیا ہم اتنے بڑے اڈے میں گھس کر کوئی کارروائی کر سکیں گے؟"

"کوشش کی جا سکتی ہے ہمیں اسے سبوتاژ کرنا ہے اس لیے اندر گھس کر مارو اور بھاگو والی پالیسی پر عمل کریں گے۔ مرشد کے لیے یہ بہت بڑا دھچکا ہوگا کیونکہ یہ اڈا اس کا مرکزی مقام ہے۔"

ٹی وی پر ہیڈ لائن آنے لگیں۔ مرشد کا نام آیا تو ہم چونکے تھے۔ خبر کے مطابق مرشد نے حکومت سے علیحدگی کا اعلان کرتے ہوئے ایک سیاسی جماعت میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ وہ ابھی تک آزاد امیدوار کی حیثیت سے سیاست کے میدان میں تھا لیکن اس نے آنے والی سیاست کا رخ بھانپتے ہوئے یہ چال چلی تھی۔ مرشد نے کوئی نیا کام نہیں کیا تھا۔ ہمارے اکثر سیاست دان ساری عمر یہی ڈھائی گھر کی چال چلتے رہتے ہیں تاکہ ان کا سفر اقتدار کی سڑک پر رہے اور وہ اپوزیشن کی صفوں سے بچ سکیں۔ بہرحال یہ ایک اچھی خبر بھی تھی کیونکہ اب مرشد حکومت کی چھتری سے محروم ہو گیا تھا۔

اگرچہ اس سے اس کی ذاتی قوت اور اثر و رسوخ پر کوئی فرق نہیں پڑا تھا کیونکہ یہ سب اس کے پاس جدی پشتی تھا۔ اس نے اس میں مزید اضافہ کیا تھا۔

"یہ حرامزادہ اب پٹڑی بدل کر اس پارٹی میں آ گیا جس کے آنے والے الیکشن میں جیتنے کے امکانات روشن ہیں۔"

"ظاہر سی بات ہے' پارٹی کو بھی جیتنے والے امیدوار چاہئیں اور اپنے علاقے سے مرشد کی سیٹ پکی ہے۔ بلکہ وہ دو صوبائی نشستیں بھی حاصل کر سکتا ہے۔"

وسیم نے میری طرف دیکھا۔ "یہ وقت آنے سے پہلے ہمیں مرشد کے خلاف کچھ کرنا ہوگا ورنہ وہ مزید طاقت ور اور مزید بے لگام ہو جائے گا۔ اس کی کامیابی ہماری ناکامی ہوگی۔"

"وسیم ہمیں مرشد کے خاندان کے دوسرے لوگوں سے بھی رابطہ کرنا چاہیے جو اندر ہی اندر اس کے خلاف ہیں لیکن گدی اس کے قبضے میں ہونے کی وجہ سے اس کے خلاف کچھ کرنے سے قاصر ہیں۔"

"یہ اچھا آئیڈیا ہے۔" وسیم بولا۔ "مرشد کے خاندان کے دوسرے لوگوں تک ہماری رہنمائی کرنے والا فرد بھی ہمارے پاس موجود ہے۔"

"رائٹ۔" میں نے چٹکی بجائی۔ "صابر سے زیادہ اچھی طرح اس خاندان کو اور کون جانتا ہوگا۔"

"لیکن اگر اس کا ذہن پھر چکا ہے تو وہ اتنی آسانی سے نہیں بتائے گا۔ بلکہ ممکن ہے ہمیں گم راہ کرنے کی کوشش کرے۔"

"ہم اتنی آسانی سے گمراہ ہونے والے لوگ نہیں ہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "بہرحال ان سارے مسائل سے سفیر اور خواتین کی روانگی کے بعد نمٹیں گے۔ صبح کا کیا پروگرام ہے؟"

"صبح چھ بجے عبداللہ فلائٹ کا وقت کنفرم کرے گا اور اس کے فوراً بعد وہ کوٹھی سے روانہ ہوگا۔ میں یہاں سے پہلے ہی پہنچ جاؤں گا اور میرے آدمی اس سے بھی پہلے ائرکلب کے آس پاس موجود ہوں گے کوئی مشکوک فرد ان کی نظروں سے بچ نہیں سکے گا۔"

یہ حفاظتی انتظامات ٹھیک تھے لیکن میرا دل مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔ پہلے طے ہوا تھا کہ میں نہیں جاؤں گا۔ دوپہر کا کھانا اچھا خاصا بچا ہوا تھا رات کو بھی وہی گرم کر کے چلا لیا۔ کھانے کے دوران میں نے فیصلہ کر لیا۔ "صبح میں بھی چلوں گا۔"

"مرضی آپ کی لیکن یہاں پیچھے کون رہے گا؟"

"بیتو ہوگا۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو وہ سنبھال لے گا۔ وہ اپنے ساتھ مانی کی حفاظت بھی کر سکتا ہے۔"

"تب ٹھیک ہے۔" وسیم نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ "صبح جلدی اٹھنا ہے اور فریش ہونا ہے اس لیے میری طرف سے گڈ نائٹ۔"

"گڈ نائٹ۔"

کھانے کے بعد میں چہل قدمی کرنے باہر نکل آیا۔ بارش کے بعد سردی میں دوبارہ شدت آ گئی تھی لیکن یہ اچھی لگ رہی تھی۔ بیتو اور مانی اسٹڈی میں گھسے نہ جانے کیا کر رہے تھے انہوں نے کھانا بھی پہلے ہی کھا لیا تھا۔ بیتو نے صابر اور شازیہ کو اوپر کھانا پہنچا دیا تھا سب کو پتا چل گیا تھا کہ اب ان کی حیثیت قیدی کی سی ہے۔ کل مونا اور سعدیہ جو یلی چلی جاتیں اور اس کے بعد نہ جانے ان سے کب ملاقات ہوتی۔ مجھے خیال آیا کہ میں ابھی جا کر ان سے مل لوں لیکن یہ احتیاط کے خلاف ہوتا۔ عبداللہ کی کوٹھی ہمارے تمام دشمنوں کی نگاہ میں آ چکی تھی۔ خود عبداللہ بہت احتیاط سے وہاں آمد و رفت کرتا تھا۔ اگر کوٹھی کی نگرانی ہو رہی تھی تو یقیناً نئے آنے جانے والوں پر نظر رکھی جاتی ہوگی۔ اس کا بھی امکان تھا کہ مرشد یا فتح خان کے آدمی صرف میرے لیے وہاں نظر رکھے ہوئے ہوں جیسے ہی میں نظر میں آؤں وہ حرکت میں آ جائیں۔

کچھ دیر بعد میں اندر آیا وقت گزاری کے لیے ٹی وی کھول لیا مگر اس میں بھی ہر جگہ سے بوریت زدہ پروگرام آ رہے تھے۔ اس لیے ٹی وی بند کر کے اخبار اٹھا لیا۔ سفیر روز باہر سے آتے ہوئے تازہ اخبارات لیتا آتا تھا۔ آج وہ اردو کا ایک معروف اخبار لایا تھا۔ اتفاق سے اتوار کا دن تھا اس لیے ایڈیشن بڑا تھا۔ میں نے ذرا دیر میں سارا اخبار دیکھ لیا۔ پھر اشتہارات والا حصہ دیکھنے لگا۔ اچانک ہی مکانات اور جائیداد والے حصے میں ایک اشتہار نے میری توجہ حاصل کر لی۔ یہ راول چوک سے آگے مین مری روڈ پر کسی مکان کو کرائے پر دینے کا اشتہار تھا۔ مالک باہر جا رہا تھا اور کوٹھی کو مکمل فرنش حالت میں سال بھر کے لیے کرائے پر دے رہا تھا۔ کرایہ پچاس ہزار روپے ماہانہ تھا اور پورے سال کا کرایہ ایڈوانس دینا تھا یعنی چھ لاکھ روپے اور چار لاکھ سیکورٹی تھی یعنی دس لاکھ روپے ادا کرنے تھے۔

ایک کنال پر بنی اس کوٹھی میں دو منزلہ عمارت تھی جس میں اوپر تین بیڈ روم اٹیچ باتھ کے ساتھ۔ نیچے ایک بیڈ روم، ایک ڈرائنگ اور ایک ڈائننگ روم تھا۔ کچن ایک ہی تھا۔ آگے اور پیچھے مختصر لان بھی تھے۔ پورچ میں دو سے تین گاڑیاں کھڑی کرنے کی گنجائش تھی۔ گھر تمام سہولتوں سے آراستہ تھا۔ ٹھنڈے گرم پانی کی لائنیں تھیں۔ مجھے یہ اشتہار دلچسپ لگا۔ ہمیں ایک ٹھکانے کی اور ضرورت تھی۔ میں نے اشتہار میں دیے نمبر پر کال کی۔

"ہیلو۔" دوسری طرف سے مردانہ آواز نے کہا۔ "افنان احمد بات کر رہا ہوں۔"

"شہباز ملک..." آپ نے اخبار میں اشتہار دیا ہے اس سلسلے میں بات کرنی ہے۔"

"فرمائیے جناب۔" آدمی نے پڑھے لکھے اور مہذب لہجے میں کہا۔

"مجھے ایک مکان کرائے پر درکار ہے۔ تقریباً اتنا ہی بڑا جتنا آپ نے اشتہار میں بتایا ہے۔"

"آپ آ کر دیکھ لیں... لیکن خیال رہے کہ یہ رہائشی مکان ہے اسے کسی تجارتی یا معاشی مقصد سے استعمال نہیں کرنا ہے۔"

"مجھے رہائشی مقصد کے لیے ہی درکار ہے۔ میری ایک چھوٹی سی فیملی ہے۔" میں نے غلط بیانی سے کام لیا۔

"ٹھیک ہے آپ آ کر دیکھ لیں اور مناسب سمجھیں تو ایگری منٹ سائن کر لیں۔ اپنا اصل شناختی کارڈ ساتھ لیتے آیئے گا۔"

میرا اصل شناختی کارڈ اور دوسری دستاویزات عبداللہ کے پاس موجود تھیں میں احتیاطاً اپنے پاس نہیں رکھتا کیونکہ میں آئے دن دشمنوں کے ہاتھوں اٹھتا رہتا ہوں۔ اس لیے اب اپنے پاس سوائے موبائل اور نقد رقم کے کچھ نہیں رکھتا ہوں۔

"ٹھیک ہے میں کل آپ سے وقت لے کر حاضر ہو جاؤں گا۔"

"صبح دس سے رات دس بجے تک۔" افنان احمد نے کہا۔ "میں ابھی اسی کوٹھی میں مقیم ہوں۔ ہاں ایک بات اور ہے آپ سوچ کر آیئے گا کہ کرایہ اور دوسری شرائط حتمی ہیں ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔"

"کرایہ اور شرائط مناسب ہیں۔" میں نے کہا اور کال کاٹ دی۔ یہ اچھا ہوا کہ ایک اہم کام بیٹھے بٹھائے ہو گیا۔ میں نے انگڑائی لی اور گھڑی کی طرف دیکھا۔ رات کے بارہ بج گئے تھے۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی لیکن میں نے مناسب سمجھا کہ آرام کر لوں تاکہ صبح فریش اٹھوں۔ جانے سے پہلے میں نے اسٹڈی میں جھانکا تو مانی اور بیتو بڑے سائز کے ایل سی ڈی پر موووی دیکھ رہے تھے۔ دونوں نے وائرلیس ہیڈ فون لگا رکھے تھے اس لیے انہیں کچھ کہنا بیکار تھا۔ وہ سنتے ہی نہیں۔ انہوں نے

WWW.PAKSOCIETY.COM

مخصوص عینکیں بھی لگا رکھی تھیں شاید یہ تھری ڈی ایل سی ڈی تھا اور یقیناً حال ہی میں لیا گیا تھا کیونکہ اس سے پہلے میں نے یہ ایل سی ڈی ٹی وی نہیں دیکھا تھا۔ میں دروازہ بند کر کے اوپر آیا۔ کچھ دیر صابر اور شازیہ والے کمرے کے باہر سن گن لیتا رہا لیکن وہ سو چکے تھے۔ اندر خاموشی طاری تھی۔ وسیم بھی سو چکا تھا۔ میں اپنے کمرے میں آیا۔ کپڑے بدل کر ہلکا نائٹ سوٹ پہنا اور کمبل میں گھس گیا۔ کچھ دیر بعد میں گہری نیند سو چکا تھا۔

صبح پانچ بجے وسیم نے دروازے پر دستک دی۔ میں نے بیدار ہو کر کہا۔ ”آجاؤ یار۔“

اس نے اندر جھانکا۔ ”میں تیار ہو رہا ہوں...“ آپ بھی اٹھ جائیں... میرے ساتھ چلیں گے یا الگ سے جائیں گے؟“

”میں الگ سے جاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے عبداللہ ہیلی کاپٹر کے لیے کال کر چکا ہے۔ ایک گھنٹے بعد کنفرم ہو جائے گا۔“

میں نے اٹھ کر گرم پانی سے غسل کیا۔ دوسرے کپڑے نکالے۔ جوتوں میں لیدر شوز کے بجائے سینتھیٹک ربر کے جاگر منتخب کیے۔ بھاگ دوڑ کے لیے یہ بہترین جوتے تھے۔ نیچے آیا تو وسیم نکل رہا تھا اس نے کافی کا مگ میرے سامنے رکھا۔ ”میرے آدمی ائرکلب کے آس پاس پہنچ رہے ہیں، میں بھی جا رہا ہوں۔“

میں نے مگ اٹھالیا۔ ”میں کچھ دیر میں نکلتا ہوں۔“

وسیم کے جانے کے بعد میں نے گیٹ بند کیا اور واپس اندر آیا۔ صبح کی روشنی پھیل رہی تھی۔ میں نے بیتو کو اٹھایا جو ہمیشہ کی طرح نشست گاہ میں سو رہا تھا۔ مانی اسٹڈی میں پڑی لیدر کاؤچ پر سو جاتا تھا۔ ”بیتو میں ائرکلب جا رہا ہوں۔“

اس نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔ ”شوبی بھائی ہم بھی چلیں گا۔“

”نہیں تمہیں یہیں رکنا ہے اب یہاں صرف تم اور مانی ہو۔ مانی لڑنے بھڑنے والا آدمی نہیں ہے تمہیں اپنے ساتھ اس کی حفاظت بھی کرنی ہوگی۔“

”ٹھیک شوبی بھائی۔“ وہ مستعد ہو گیا۔

”بس تو اٹھ کر گیٹ بند کرو اور کوئی بھی مسئلہ ہو تو ہمیں فوراً کال کرنا... خود اس سے نمٹنے کو کوشش مت کرنا... ٹھیک ہے؟“

”ہم سمجھ گیا شوبی بھائی...“ پر ایسا ہو کہ مہلت نہ ملے تو...؟“

”تب اپنی عقل سے کام لینا اور جو سمجھ میں آئے وہ کرنا...“ پر یاد رکھنا جان سب سے اہم ہے اس کے علاوہ کچھ بھی اہم نہیں ہے۔ اگر خطرہ محسوس کرو تو سب چھوڑ کر نکل جانا۔“

میں نے بائیک لی تھی۔ ہیلمٹ کے ساتھ میں خود کو زیادہ محفوظ سمجھتا تھا۔ میرے پاس پستول اور اس کے دو اضافی میگزین تھے۔ میرے خیال میں اتنا اسلحہ کافی تھا۔ عبداللہ نے مجھے اس نجی ائرکلب کا پتا سمجھا دیا تھا ایک بار کئی سال پہلے میں نے اسے دیکھا بھی تھا جب ایک دولت مند گاہک کے لیے یہاں سے ایک چھوٹا طیارہ چارٹرڈ کرایا تھا۔ جب میں روانہ ہوا تو سورج طلوع ہو رہا تھا۔ دھند نہیں تھی اور آسمان بھی صاف تھا یعنی موسم ہر طرح سے پرواز کے لیے موزوں تھا۔ آدھے گھنٹے بعد میں ائرکلب کے پاس تھا۔ داخلے سے پہلے انٹری گیٹ پر مجھے گارڈز نے روک لیا۔ انہوں نے مہذب لہجے میں مجھ سے کہا۔

”سرشناخت اور پاس کے بغیر آپ اندر نہیں جا سکتے۔“

”میں یہاں کسی کو سی آف کرنے آیا ہوں۔“

گارڈ نے آگاہ کیا۔ ”تب فلائیٹ چارٹرڈ کرانے والا ہی آپ کو اندر لے جا سکتا ہے۔“

میں نے عبداللہ کو کال کی۔ ”میں آ گیا ہوں اندر آنے کے لیے پاس مانگا جا رہا ہے۔“

”آپ چند منٹ رکیں میں آ رہا ہوں۔“ عبداللہ نے کہا اور فون بند کر دیا۔ پانچ منٹ بعد اس کی گاڑی آتی دکھائی دی۔ اس دوران میں مجھے نہ تو وسیم والی وین دکھائی دی تھی اور نہ اس کے آدمی کہیں نظر آئے تھے۔ عبداللہ نے آ کر گارڈز کو پاس دکھایا تو انہوں نے بیریئر اٹھا کر مجھے اندر جانے کی اجازت دی تھی۔ میں بائیک پر ہی رہا۔ عبداللہ آگے میری رہنمائی کر رہا تھا ہم ایک چھوٹی سی ایک منزلہ عمارت کے سامنے رکے جس سے کچھ ہی دور ایک دیوہیکل ہیلی کاپٹر کھڑا تھا اس کے پنکھے ساکت تھے اور دو افراد اس کی دیکھ بھال یا آخری چیکنگ میں مصروف تھے۔ ایک طرف ایک باوردی شخص ہاتھ میں کلپ بورڈ لیے دیکھ رہا تھا۔ میں بائیک سے اترا تو عبداللہ نے کہا۔ ”وہ سب اندر ہیں۔“

میں نے اس کے ساتھ اندر جاتے ہوئے پوچھا۔ ”وسیم اور اس کے ساتھی کہاں ہیں؟“

”وہ اندر نہیں آئے ہیں، آس پاس موجود ہیں، دین بھی یہاں سے کچھ دور موجود ہے اور وہ اسی سے نگرانی کر رہے ہیں۔“

مونا اور سعدیہ سفیر کے ساتھ ایک لاؤنج میں موجود تھے۔ مونا خوش تھی کیونکہ سفیر اس کے ساتھ جا رہا تھا جبکہ سعدیہ کچھ بجھی ہوئی تھی۔ میں نے سلام دعا کے بعد اس سے پوچھا۔

”تمہیں کیا ہوا ہے؟“

”وسیم جو یہاں رہ گیا ہے۔“ سفیر نے کہا۔ ”میں نے تو اس سے کہا تھا کہ وہ میری جگہ چلا جائے لیکن اس نے پتا نہیں کیا کہا؟“

”کیا کہا؟“ سعدیہ نے اشتیاق سے پوچھا۔

”یہی کہ بھائی اتنی مشکل سے تو جان چھوٹ رہی ہے اور تو چاہتا ہے کہ میں اس کے ساتھ چلا جاؤں۔“

”جھوٹ نہ بولیں۔“ سعدیہ نے خفگی سے کہا۔ ”وسیم ایسا نہیں کہہ سکتے۔“

سفیر نے قہقہہ مارا۔ ”لو سنو... وہ ایسا نہیں کہہ سکتے۔“

”تنگ نہ کریار۔“ میں نے سفیر سے کہا اور پھر سعدیہ کو تسلی دی۔ ”تم فکر مت کرو کچھ عرصے بعد وسیم بھی حویلی کا چکر لگا رہے گا۔“

”ہمیں کیوں بھیج رہے ہیں؟“ مونا نے پوچھا۔

”بھئی ایک وجہ تو یہ ہے کہ عبداللہ کی کوٹھی دشمنوں کی نظر میں آ چکی ہے اس کے علاوہ کوئی محفوظ جگہ نہیں ہے جہاں آپ جیسی نازک چیزوں کو رکھا جائے۔ دوسری وجہ ایک ننھا منا ہے جو ابھی اس دنیا...“

”شوبی...“ مونا جھینپ کر چلائی۔ ”شرم نہیں آتی؟“

”پہلے اکثر آتی تھی اب کئی کئی دن نہیں آتی۔“ میں ہنسا اور سعدیہ کی طرف دیکھا۔ ”تم کیوں شرما رہی ہو حالانکہ تمہیں شرم آنی چاہیے مونا تم سے آگے نکل گئی۔“

”شوبی بھائی۔“ سعدیہ نے احتجاج کیا۔ ”آپ واقعی بے لگام ہو گئے ہیں۔“

”ظاہر ہے لگام دینے والی جو دور ہے۔“ مونا بولی۔

”ٹھیک کہا تم نے بی بی... تم دونوں نے تو ٹھیک سے لگام دے رکھی ہے ان بے چاروں کو۔“

عبداللہ ہیلی کاپٹر کے معاملات دیکھنے چلا گیا تھا۔ وہاں صرف میں اور سفیر تھے اس لیے وہ دونوں شرمانے کے ساتھ اس مذاق کو بھی انجوائے کر رہی تھیں۔ سفیر نے بتایا۔ ”یہ کل پینتیس منٹ کی پرواز ہے۔ حویلی میں بات ہو گئی ہے، تیرے ابا جی نے حویلی کے سامنے والے حصے کو صاف کرا کے وہاں عارضی ہیلی پیڈ بنوا دیا ہے۔“

سفیر کے ساتھ جانے کے باوجود مونا بھی اداس تھی اور سعدیہ کا انداز بتا رہا تھا کہ اسے ذرا بھی چھیڑا گیا تو وہ رو دے گی۔ اس لیے میں ہنسنے ہنسانے والی باتیں کر رہا تھا۔ سعدیہ کو چھیڑا کہ مونا اس سے آگے نکل گئی ہے، وہ شرمائی اور جھنجلائی لیکن اس کا موڈ خوشگوار ہو گیا تھا۔ پرواز ٹھیک سات بجے روانہ ہوئی۔ اس کے لیے روٹ اور بلندی کی اجازت لے لی گئی تھی۔ ابھی چھ بج کر پچاس منٹ ہوئے تھے۔ ان لوگوں کا سامان ہیلی کاپٹر میں لاد دیا گیا تھا۔ میں باہر آ گیا۔ ائرکلب کے آس پاس زیادہ تر کھیت تھے اور ہموار زمین تھی صرف شمال کی طرف کچھ چھوٹی پہاڑیاں تھیں جن کے پیچھے دور تک اونچی ہوتی پہاڑیاں چلی گئی تھیں۔ ایک طرح سے یہ میدانی جگہ کی آخری حد اور پہاڑیوں کا آغاز تھا۔

میں نے چاروں طرف معائنہ کیا۔ اتنی صبح کے وقت ائرکلب تقریباً ویران تھا۔ ایک طرف کچھ ہیلی کاپٹرز اور چھوٹے طیارے کھڑے تھے۔ یہاں ائرکنٹرولر کا بندوبست نہیں تھا اس کے لیے اسلام آباد یا اس ریجن کے ائرٹریفک کنٹرولر سے اجازت لینا پڑتی تھی۔ طیاروں کے لیے رن وے بہت سادہ اور بغیر روشنیوں کا تھا یعنی اسے صرف دن میں استعمال کیا جا سکتا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا نجی ائرکلب تھا جس میں دولت مندوں کے ذاتی طیارے اور ہیلی کاپٹر کھڑے تھے یا کرائے پر چارٹرڈ ہونے والے طیارے اور ہیلی کاپٹر موجود تھے۔ طیارے تمام پروں والے اور دو یا چار نشستوں کے تھے۔ اس قسم کے طیاروں اور ہیلی کاپٹروں کے لیے زیادہ جدید مواصلاتی آلات، تنصیبات یا کسی بڑے لمبے چوڑے ائرپورٹ کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ یہ چھوٹی سی جگہ سے بھی پرواز کر سکتے ہیں اور اتر سکتے ہیں۔

میں ہیلی کاپٹر کے پاس آیا جہاں عبداللہ فلائنگ سوٹ میں ملبوس اسی شخص سے بات کر رہا تھا جسے میں نے کلپ بورڈ کو دیکھتے پایا تھا۔ وہ عبداللہ کو ہاتھ میں موجود کلپ بورڈ کی مدد سے کچھ حساب کتاب سمجھا رہا تھا۔ عبداللہ نے بتایا کہ اس فلائیٹ کی ادائیگی چالیس ہزار روپے کی گئی تھی۔ فلائنگ سوٹ والا پائلٹ تھا۔ عبداللہ نے میرا تعارف کرایا تو اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ وہ جوان العمر اور مضبوط جسامت کا لیکن چھوٹے قد کا شخص تھا۔ ”میرا نام شفاعت ہے دو برس پہلے ائرفورس سے نکالا گیا ہوں۔“

”میں وجہ پوچھ سکتا ہوں؟“

اس نے شانے اچکائے۔ ”میں پابند زندگی نہیں گزار سکتا ہوں، پتا نہیں چھ سال ائرفورس میں کیسے رہ لیا بہرحال اب میں آزاد ہوں اور بہت خوش ہوں۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“ میں نے کہا تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

”کیا مطلب؟“

WWW.PAKSOCIETY.COM

"مطلب یہ کہ تمہیں نا اہلی کی وجہ سے نہ نکالا گیا ہو۔" میں نے کہا تو اس کا منہ بن گیا تھا۔ میں نے پروا نہیں کی کیونکہ وہ شخص مجھے پسند نہیں آیا تھا۔ ہمارے ملک میں فورس میں جانا پیشہ نہیں اعزاز اور جنون سمجھا جاتا ہے اور یہ شخص اگر نظم وضبط کا پابند نہیں ہوسکتا تھا تو اسے فورس میں جانا ہی نہیں چاہیے تھا جہاں ایک ایک فرد کی تربیت پر لاکھوں اور کروڑوں خرچ کیے جاتے ہیں تاکہ وہ وقت آنے پر وطن کی حفاظت کر سکے۔ اکثر سپاہی اور افسران ایک بھی جنگ لڑے بغیر ریٹائر ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ ان کا قصور نہیں ہوتا ہے بلکہ ملک اور قوم کی خوش قسمتی ہے کہ اسے کسی جنگ سے واسطہ نہیں پڑا۔ لیکن فورس جوائن کر کے چھوڑ دینا میرے نزدیک اتنا ہی بڑا جرم ہے جتنا کوئی شخص ڈاکٹر کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد دوسرا کوئی پروفیشن اختیار کر کے کرتا ہے۔ وہ اس سیٹ کو ضائع کرتا ہے جس پر کوئی دوسرا ڈاکٹر بن کر بیماروں کا علاج کر سکتا ہے۔

"میں نااہل نہیں ہوں۔" اس نے تلخ انداز میں کہا اور ہیلی کاپٹر میں اپنی سیٹ پر بیٹھ کر..... پینل کے بٹنوں سے چھیڑ کرنے لگا۔ میں عبداللہ کو اس سے ذرا دور لے گیا۔

"تمہیں یقین ہے کہ یہ اچھا پائلٹ ہے؟"

"میں نے اس کے بارے میں چھان بین کرائی ہے یہ واقعی نظم وضبط کا پابند نہیں ہوسکتا ہے لیکن جب یہ فلائنگ سیٹ پر ہوتا ہے تو اس کا شمار بہترین پائلٹوں میں ہوتا ہے۔"

"ٹھیک ہے تم مطمئن ہو تو..." میں بولتے بولتے رک گیا کیونکہ مجھے شمال کی سامنے والی پہاڑی ڈھلان سے کسی چیز کی چمک محسوس ہوئی تھی' یہ چمک بس ایک لمحے کے لیے تھی اور پھر غائب ہوگئی۔ عبداللہ نے میری کیفیت محسوس کر لی۔

"کیا ہوا جناب؟"

"عبداللہ اس طرف پہاڑی سے مجھے کوئی چیز چمکتی دکھائی دی صرف ایک لمحے کے لیے۔"

سورج کی روشنی ذرا ترچھی ہو کر اس پہاڑی پر پڑ رہی تھی عبداللہ نے کہا۔ "ممکن ہے وہاں کوئی چمک دار چیز یا شیشے کا ٹکڑا پڑا ہو۔"

"ہوسکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن اگر وہاں کوئی چیز ساکت ہے تو اس کو بار بار چمکنا چاہیے۔"

میں نے آگے پیچھے ہو کر دیکھا لیکن چمک دوبارہ نہیں دکھائی دی تھی' یہ ایک عام سی بات تھی اور عبداللہ نے اس کی وضاحت بھی کر دی تھی لیکن مجھے اندر سے خلش محسوس ہو رہی تھی اور میں خلش پالنے والا آدمی نہیں ہوں اس لیے میں نے عبداللہ سے کہا۔ "تم ہوشیار رہو... مجھ سے رابطے میں رہو۔"

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"میں ذرا اس پہاڑی کا قریب سے جائزہ لینے جا رہا ہوں۔"

عبداللہ نے میرے موبائل پر کال ملائی۔ میں نے وسیم کو کال ملائی' اب ہم تینوں رابطے میں تھے' میں نے ہینڈ فری موبائل سے لگایا اور بائیک سنبھالی۔ "وسیم وین کس جگہ ہے؟... شمال میں نظر آنے والی پہاڑی کے لحاظ سے بتاؤ۔"

وسیم نے وین کی پوزیشن بتائی۔ "ہم شمالی پہاڑی سے کوئی ایک کلومیٹر دور ٹھیک جنوب میں ہیں۔"

"مجھے وہاں کوئی چیز چمکتی نظر آئی ہے۔"

وسیم ہنسا۔ "بزرگ کہتے ہیں کہ ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی ہے۔"

"بزرگ ٹھیک کہتے ہیں' ممکن ہے یہ چیز کسی دوربین کا شیشہ ہو جو کسی رائفل پر لگی ہو۔" میں نے کہا تو وسیم سنجیدہ ہوگیا۔

"میں چیک کرتا ہوں آپ کہاں ہیں؟"

"میں اسی طرف جا رہا ہوں۔" میں نے کہا اور بائیک اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ یہاں کچھ حصہ تو پختہ تھا جہاں گاڑیوں کی آمد ورفت ہوتی تھی۔ ائرکلب کی عمارتیں تھیں لیکن ان سے آگے سب کچا تھا۔ ضرورت کے تحت اسے ہموار کیا گیا تھا لیکن زمین کچی تھی اور مسلسل بارشوں سے اس میں جابجا گڑھے پڑ گئے تھے' میں ان گڑھوں سے بچتا ہوا جا رہا تھا جن میں پانی بھرا ہوا تھا۔ پانی کی وجہ سے یہ جاننا ناممکن تھا کہ کس گڑھے کی گہرائی کیا ہے۔ بچ کر جانے کی وجہ سے مجھے دیر ہو رہی تھی لیکن یہ اس سے بہتر تھا کہ میں کسی گڑھے میں اتر جاؤں اور بائیک سمیت قلابازیاں کھاؤں۔ پہاڑی میرے اندازے سے زیادہ دور اور بڑی تھی' دوری کی وجہ سے یہ چھوٹی لگ رہی تھی۔

جب میں اس کے دامن میں پہنچا تب مجھے صحیح معنوں میں اس کے وسط اور بلندی کا پتا چلا یہ کوئی ہزار فٹ سے زیادہ اونچی تھی اور شرقاً غرباً ایک کلومیٹر تک چوڑی تھی' اس کی ڈھلان تقریباً ساٹھ درجے زاویے سے اوپر جا رہی تھی اور یہ ڈھلان زیادہ تھی۔ اس پر چڑھنا آسان نہیں تھا۔ جب مجھے چمک محسوس ہوئی تھی تو میں نے اس جگہ کو دیکھ لیا تھا اور پھر ذہن نشین کر لیا تھا جہاں سے چمک محسوس ہوئی تھی۔ یہاں گھنے درخت تھے اور ایک درخت پر سفید رنگ کے بے شمار پھول آئے ہوئے تھے اس لیے وہ سب سے الگ محسوس ہوتا تھا۔ میں نے اوپر جانے سے پہلے عبداللہ سے کہا۔ "سنو کیا فلائیٹ کچھ دیر کے لیے رکی جا سکتی ہے؟"

"اس سے بہت ساری مشکلات ہوسکتی ہیں' فلائیٹ پلان کینسل ہو جائے گا اور دوبارہ سے اے ٹی ایف سے اجازت لینی پڑے گی۔"

"پائلٹ سے بات کرو' پانچ دس منٹ کی تاخیر سے کچھ نہیں ہوتا ہے۔" میں نے کہا اور اوپر چڑھنا شروع کر دیا۔

"میں کوشش کرتا ہوں۔" عبداللہ نے کہا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا یہاں سے ہیلی کاپٹر ایک معمولی کھلونے کی طرح نظر آ رہا تھا۔ اس کے آس پاس حرکت کرتے لوگ بہ مشکل ہی دکھائی دے رہے تھے اور ان میں مرد وعورت کی تمیز کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ میری گھڑی کے مطابق سات بج گئے تھے یعنی پرواز کا وقت ہو گیا تھا۔ نیچے سے ہی دشوار نظر آنے والی پہاڑی چڑھنے میں دشوار تر ثابت ہوئی' بارش سے بھیگ جانے والی مٹی اب پھسل رہی تھی اور اس میں میرے بہترین جوگر بھی پھسل رہے تھے۔ مجھے خود کو واپس جانے سے روکنے کے لیے چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں کا سہارا لینا پڑ رہا تھا۔ اکثر جھاڑیاں گیلی مٹی سے اکھڑ کر میرے ہاتھ میں آ رہی تھیں لیکن میں اس سے پہلے ہی دوسری جھاڑی پکڑ چکا ہوتا تھا اور اس کے اکھڑنے سے پہلے کوئی جھاڑی پکڑ لیتا۔ اس کے علاوہ اوپر جانے کی اور کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔

"جناب۔" عبداللہ کی آواز آئی۔ "پائلٹ کہہ رہا ہے وہ صرف پانچ منٹ رک سکتا ہے۔ اس کے بعد فلائیٹ پلان کینسل ہو جائے گا اور دوبارہ فلائیٹ پلان حاصل کرنے میں دو گھنٹے بھی لگ سکتے ہیں کیونکہ سورج نکلتے ہی فلائیٹس کا رش شروع ہو جاتا ہے۔ آگے سے اجازت مشکل سے ملتی ہے۔"

"ٹھیک' اس سے کہو پانچ منٹ بعد پرواز کرے۔" میں نے کہا اور دوبارہ چڑھنا شروع کر دیا۔ سفید پھولوں والا درخت تقریباً سات سو فٹ کی بلندی پر تھا۔ وہاں پہنچنے میں مجھے پانچ منٹ سے زیادہ کا وقت لگ جاتا۔ عبداللہ کے انداز سے لگ رہا تھا کہ پائلٹ اس سے زیادہ وقت نہیں دے گا ویسے بھی وہ مجھ سے خفا تھا اس لیے رعایت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ممکن ہے وہ اپنی طرف سے کہہ رہا ہو کیونکہ اس قسم کے معاملات میں وقت کی اتنی پابندی کہیں نہیں ہوتی ہے۔ شیڈول ائرلائنوں کی پرواز میں تاخیر عام سی بات ہے۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا پانچ منٹ پورے ہوئے تو عبداللہ نے کہا۔

"اب فرمائیں جناب۔"

"عبداللہ اسے باتوں میں لگاؤ بس دو منٹ اور... میں اس جگہ کے پاس ہی ہوں۔"

"جناب میں دیکھ رہا ہوں۔" وسیم نے کہا۔ "لیکن اس ڈھلان میں مجھے کوئی خاص چیز نظر نہیں آئی ہے۔"

"سفید پھولوں والے درخت کے آس پاس کو فوکس کرو۔" میں نے وسیم سے کہا۔ "مجھے اسی جگہ سے چمک دکھائی دی تھی۔"

"میں اسی کے آس پاس دیکھ رہا ہوں۔"

عبداللہ پائلٹ سے مذاکرات کر رہا تھا لیکن صاف لگ رہا تھا پائلٹ مزید تاخیر کے لیے تیار نہیں تھا اس نے عبداللہ سے کہا۔ "اگر فلائیٹ پلان کینسل ہوتا ہے تو آپ کو تاخیر کے چارجز بھی دینا ہوں گے۔"

"چارجز کس بات کے؟" عبداللہ نے غالباً وقت گزاری کے لیے بحث جاری رکھی۔

"چارجز اس بات کے کہ اگر میری آگے بھی کوئی فلائیٹ ہوئی تو وہ اس تاخیر کی وجہ سے رہ جائے گی اور مجھے نقصان ہوگا۔ تاخیر کی صورت میں آپ مجھے دس ہزار روپے مزید ادا کریں گے۔"

میں ان کی باتیں سنتے ہوئے ہر ممکن تیزی سے اوپر جا رہا تھا۔ مسلسل چڑھنے سے میرا سانس پھول رہا تھا اور اب میں بات کرنے کی کوشش کرتا تو آواز کے بجائے پھونک زیادہ نکلتی۔ بالآخر میں اس ڈھلان تک پہنچ گیا یہاں زمین کسی قدر ہموار ہو گئی تھی اور اسی وجہ سے یہاں بڑے درخت بھی اگ آئے تھے۔ یہ درختوں کا جھنڈ تھا۔ اب تک میں پیروں کے ساتھ ہاتھ بھی استعمال کرتا آیا تھا۔ لیکن ذرا ہموار زمین آئی تو میں دوبارہ دوپایہ بن گیا اور میرے ہاتھ آزاد ہو گئے جن کا میں نے مصرف یوں نکالا کہ پستول نکال لیا اگر میرا خدشہ درست تھا اور یہاں کوئی شخص دور مار رائفل سمیت چھپا بیٹھا تھا تو پستول کا استعمال ناگزیر تھا۔ میں یہاں آتے ہی محتاط ہو گیا۔ اب تک میں آوازیں پیدا کرتا آ رہا تھا۔ مگر یہاں آواز پیدا کرنے کا مطلب اچانک فوتگی بھی ہوسکتا تھا۔

دبے قدموں میں درختوں کے جھنڈ میں داخل ہوا۔ یہاں نیم تاریکی تھی اور شاخوں وپتوں سے چھن کر آتی سورج کی شعاعیں بہت عجیب سے ڈیزائن بنا رہی تھیں۔ درختوں کے نیچے تاریکی کے ساتھ یہ روشنی دھندلکا پیدا کر رہی تھی' مگر ان شعاعوں کی وجہ سے اندر کا منظر واضح نہیں تھا۔ یہاں کوئی نہیں تھا بس خاموشی اور ویرانی تھی۔ عبداللہ وقفے وقفے سے مجھے پکار رہا تھا وہ فلائیٹ کے بارے میں میرا فیصلہ جاننا چاہتا تھا۔ وسیم نے اسے

WWW.PAKSOCIETY.COM

کہا۔ ”یار وہ کسی ایسی جگہ ہیں جہاں بول نہیں سکتے ذرا صبر کرو۔“
”بھائی میں تو صبر کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن یہ پائلٹ بے صبرا ہوا جارہا ہے۔“
وسیم نے کہا۔ ”اس سے کہو اپنا منہ بند رکھے اگر فلائیٹ میں تاخیر ہوئی تو اسے ادائیگی کردی جائے گی۔“
میں ان کی باتیں سن رہا تھا اور یہ گفتگو میرے کان تک محدود تھی اس سے آگے یہاں موجود کوئی فرد اسے نہیں سن سکتا تھا۔ میری نظر اندھیرے سے مانوس ہوگئی تھی اور اب مجھے کسی قدر بہتر دکھائی دے رہا تھا۔ کسی حد تک اطمینان ہو جانے کے باوجود کہ یہاں کوئی نہیں ہے میں محتاط تھا۔ اچانک مجھے ذرا آگے کسی چیز کی چمک دکھائی دی میں تیزی سے زمین پر لیٹ گیا۔ یہاں خشک پتوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا جو گزشتہ سرما میں ٹوٹ کر گرے تھے اور اب زمین کا حصہ بننے والے تھے۔ بارش کی نمی سے وہ گل سڑ رہے تھے اور میرے لباس سے چپک رہے تھے۔ نیچے لیٹنے پر بہت تیز بُو میرے نتھنوں سے ٹکرائی تھی لیکن اس وقت مجھے گندگی اور بدبو کی پروا نہیں تھی میری نگاہ وہاں مرکوز تھی جہاں کوئی چیز چمکی تھی اور یہ جگہ زیادہ دور نہیں تھی مجھ سے مشکل سے دس فٹ دور ہوگی۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ کوئی انسان ہے تو اسے لازمی میری موجودگی کا علم ہو جانا چاہیے تھا کیونکہ میرے پیچھے نہایت روشن پس منظر تھا جس میں بالکل نمایاں تھا۔
مگر دوسری طرف سے کوئی مزاحمت نہیں ہوئی تھی۔ اس کے باوجود میں نے احتیاط سے کام لیا اور زمین پر لیٹے لیٹے آگے بڑھا۔ عبداللہ نے مجھے پکارنا بند کردیا تھا اب وہ صبر سے میرے جواب کا انتظار کررہا تھا۔ پھر میں نے اس چیز کو دیکھ لیا وہ دوبارہ چمکی تھی۔ میں نے گہری سانس لی اور کھڑا ہوگیا یہ کوک کی شیشے کی بوتل تھی جو نصف زمین میں دھنسی ہوئی تھی اور اس کا اوپری حصہ باہر نکلا ہوا تھا۔ نہ جانے کب سے مٹی میں دبی اس بوتل کو گزشتہ روز ہونے والی بارش نے دھو دیا تھا اور اب روشنی پڑنے پر اس کا شیشہ چمک رہا تھا۔ یقیناً میں نے اسی بوتل کے شیشے کی چمک دیکھی تھی۔ میں نے گہری سانس لی۔ مشکل سے تین انچ کی نکلی ہوئی بوتل نے مجھے ڈیڑھ کلومیٹر دور اس پہاڑی پر آنے پر مجبور کردیا۔
”عبداللہ۔“ میں نے درختوں سے باہر آتے ہوئے کہا۔ ”پائلٹ کو کاپٹر اُڑانے کے لیے کہو۔“
عبداللہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ ”یعنی خطرے کی کوئی بات نہیں ہے؟“
”ہاں خطرہ نہیں ہے۔“
”معاملہ کیا تھا جناب؟“ وسیم نے پوچھا۔
”بس یار کوک کی ایک بوتل تھی فساد کی جڑ وہی چمک رہی تھی بار بار۔“
عبداللہ پائلٹ سے بات کررہا تھا۔ وہ چلّا رہا تھا کہ اب بہت تاخیر ہوگئی ہے لیکن عبداللہ نے اسے قائل کرلیا کہ وہ چانس لے اور اے ٹی ایف کو اپنی روانگی کی اطلاع دے۔ میں دیکھ رہا تھا سفیر، مونا اور سعدیہ ہیلی کاپٹر میں بیٹھ رہے تھے۔ اتنی دور سے یہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا کہ خواتین کون سی ہیں اور حضرت کون ہیں۔ ان ہی تینوں نے جانا تھا پہلے عبداللہ کے دو آدمی بھی جارہے تھے لیکن بابا نے حویلی میں حفاظتی انتظامات کرلیے تھے اس لیے ان کی ضرورت نہیں تھی۔ ہیلی کاپٹر کے پنکھے گردش کرنے لگے۔ اس کے انجن کی آواز یہاں تک آرہی تھی۔ عبداللہ اور دوسرے لوگ پیچھے ہٹ گئے تھے۔ اب پوری رفتار سے گھوم رہے تھے اور پھر ہیلی کاپٹر آہستگی سے بلند ہوا۔ ابھی وہ ڈول رہا تھا پھر پائلٹ شفاعت نے پیشہ ورانہ مہارت سے اسے سنبھال لیا ایک ہموار ردھم میں ہیلی کاپٹر اوپر اٹھا اور ساتھ ہی اس نے اپنا رخ جنوب مغرب کی طرف موڑنا شروع کردیا۔
اسی لمحے میرے کانوں نے مسلسل ایسی آوازیں سنیں جیسے لوہے کے ہتھوڑے کو سخت لکڑی پر تواتر سے مارا جائے۔ اس کے ساتھ ہی بلند ہوتے ہیلی کاپٹر نے لڑکھڑانا شروع کر دیا۔ اس کے پچھلے حصے سے دھواں نکلنا شروع ہوگیا تھا۔ چند لمحے کے لیے تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ہوا ہے۔ پھر وسیم کے چلّانے کی آواز آئی۔
”کوئی پہاڑی سے فائرنگ کررہا ہے... دور مار رائفل ہے... شہباز صاحب... آپ سن رہے ہیں...“ میرے خدا اس نے چوپر کو ہٹ کردیا ہے۔“
میں سن رہا تھا لیکن میں کچھ نہیں سن رہا تھا۔ میری نظریں لڑکھڑاتے ہیلی کاپٹر پر مرکوز تھیں۔ فائرنگ نے اس کے کنٹرول سسٹم کو تباہ کردیا تھا۔ اچانک اس نے تیزی سے گھومنا شروع کر دیا وہ شفاعت کے قابو سے باہر ہو رہا تھا اور تیزی سے زمین کی طرف جارہا تھا۔ پھر وہ ایک دھماکے سے زمین پر گرا اور آگ کے گولے میں بدل گیا۔ وسیم چلّا رہا تھا عبداللہ چلّا رہا تھا لیکن میرے کان کچھ نہیں سن رہے تھے۔ زمین و آسمان میرے گرد گھوم رہے تھے اور مجھے لگا میں چکرا کر نیچے گرنے والا ہوں۔

(جاری ہے)

بیت بازی

قارئین

(عزیز احمد، لاہور کا جواب)

نصرت شاہین.....سرگودھا
اس معصوم سے پیار کا تحفہ گھر کے آنگن میں چھایا تھا
اس کو غم کے پاگلپن میں کوٹھے کوٹھے بانٹ دیا ہے

فریحہ ادریس.....لاہور
اس شکل مرقع میں جو افسوں ہے کہاں ہے
کہنے کو تو سو نقشِ حسیں ہے میرے دل میں

رضا احمد توسیفی.....مظفر گڑھ
اب تک تو یہ ہوا ہے کہ توڑے ہیں جس نے دل
ٹوٹے ہوئے دلوں کا وہی آسرا ہوا

فریدالدین عطاری.....شیخوپورہ
اب کوئی کیا میرے قدموں کے نشاں ڈھونڈے گا
تیز آندھیوں میں تو خیمے بھی اکھڑ جاتے ہیں

عتیق احمد.....فیصل آباد
اپنی محبت کے افسانے کب تک راز بناؤ گے
رسوائی سے ڈرنے والو بات تمہی پھیلاؤ گے

سید جلال.....گوجرہ
اب میری زندگی میں آنسو ہیں اور نہ آہیں
لیکن یہ ایک میٹھا سا روگ جی کا ہے

(رقیہ قیصر، سرگودھا کا جواب)

بشیر علی.....سیالکوٹ
یہ عمر ہے تو پھر اس کو بسر بھی کرنا ہے
قیام کرنے سے پہلے سفر بھی کرنا ہے

اشفاق خورشید.....ڈی آئی خان
یہ اعجاز ہے حسنِ آوارگی کا
جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے

(تنویر رفیق، کراچی کا جواب)

اکبر حیات مخدوم.....ملتان
یہ جو ہم کبھی کبھی سوچتے ہیں رات کو
رات کیا سمجھ سکے ان معاملات کو

امداد علی.....ساہیوال
یہ سرد مہر اُجالی یہ جیتی جاگتی رات
ترے خیال سے تصویرِ ماہ جلتی ہے

(سلیم کا مریڈ، کھاتاں کا جواب)

مہناز اسد.....کامونکی
وہ کلی کہاں چلی بیکلی کی چھاؤں میں
سادگی نے چھولیا دامنِ حیات کو

نیاز اکبر نیاز.....گجرات
وہ چہرہ ہاتھوں میں لے کر کتاب کی صورت
ہر ایک لفظ ہر اک نقش کی ادا دیکھوں

ظفر علی معراج.....سیالکوٹ
وہی بے بسی وہی بے کلی وہی بندشیں وہی چاہتیں
میں ابھی تلک نہ سمجھ سکا تو نصیب ہے کہ نصاب ہے

معجز حسین.....نارووال
وقت کہیں پہ رکا ہوا ہو عمرِ رواں کے ساتھ بھی
وہی ہمارے پاس بہت ہیں جن کو لوگوں سے دوری ہے

مرتجس علی.....ایبٹ آباد
واہموں کی گھنی دھند میں وقتِ شب
جس نے معنی کے در وا کیے کون ہے

(طاہر خان، کراچی کا جواب)

شکور حسین.....چنیوٹ
اک راز تھا ہمارے جو درمیاں
وہ اپنے آپ سے بھی چھپائے ہوئے تو ہیں

نوشاد اسلم.....بہاولپور
اب اس قدر بھی نہ موجوں کو سر چڑھا اپنے
سمجھ نہ کھیل اسے کچھ تو ڈر سمندر ہے

ندا فیصل.....کریم نگر (جی بی)
آشیانے کی بات کرتے ہو
کس زمانے کی بات کرتے ہو

جاوید بٹ.....فیصل آباد
ایک نئی خوشبو نے فضا میں کروٹ لی
آنکھوں میں اک خواب پرانا ڈوب گیا

WWW.PAKSOCIETY.COM

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام آپکو تمام ڈائجسٹ
ناولز اور عمران سیریز بالکل مفت پڑھنے کے ساتھ
ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ لنک کے ساتھ
ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے۔
اب آپ کسی بھی ناول پر بننے والا ڈرامہ
آنلائن دیکھنے کے ساتھ ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ
لنک سے ڈاؤنلوڈ بھی کر سکتے ہیں۔
For more details kindly visit
http://www.paksociety.com

فتح علی............میانوالی
ایسے انداز سے رخصت ہوا کوئی مجھ سے
وہی لمحہ وہی منظر ہے نظر میں اب تک

عاصی اختر............ٹھٹھہ
اک روز نظر بھر کے اسے دیکھ لیا تھا
جب سے میری آنکھوں سے اجالا نہیں جاتا

علی شاہ............نگر گلگت
اتنی کاوش بھی نہ کر میری اسیری کے لیے
تو کہیں میرا گرفتار نہ سمجھا جائے

مصطفیٰ............لیہ
آج وہ مرحلے ہیں آنکھوں میں
جن کی تقدیر میں زمانے لگے

اکبر حسن رند............ڈی جی خان
آپ کی یاد بھی آجاتی ہے
اتنی محروم نہیں بزمِ خیال

نوازش مہتاب............ٹنڈو آدم
آفتاب سے چہرے ماہتاب سے مکھڑے
کھو گئے کہاں آخر کیا ہوئے خدا جانے

نصرت ہالانی............سکھر
اپنے ہاتھوں سے تراشا ہو جسے
وہی بت اپنا خدا ہوتا ہے

پروفیسر فوزیہ انصاری............کراچی
اے شکم پرور اے مرے حاکم شہرِ ستم
خاک تربت ہی بھرے گی ایک دن معدہ تیرا

نوید اشرف............وہاڑی
ان کے سینوں میں کبھی جھانک کے دیکھو تو سہی محسن
کتنے افسردہ ہیں اوروں کو ہنسانے والے

شہناز تبسم............جہلم
آہ یہ دیدۂ پُر اشک میں امید کے سوت
خشک ہوتی ہے تو سیلاب فنا بنتی ہے

جیہ روبی............حاصل پور
ابھی تو خشک بہت ہے موسم بارش ہو تو سوچیں گے
ہم نے اپنے ارمانوں کو کس مٹی میں بونا ہے
(ذکا احسن چغتائی، کراچی کا جواب)

خالد یوسفی............لیہ
غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک
(نسرین صدف، کراچی کا جواب)

قاضی شرف مصروف حمیدی............کراچی
یہ فیضِ کرم ہے کہ مکتب کی کرامت ہے
سکھائے کس نے اسماعیل کو آداب فرزندی
(نسرین صدف، کراچی کا جواب)

رانا حبیب الرحمٰن............تحصیل گوجرہ
یہاں کسی کو کچھ بھی حسبِ آرزو نہ ملا
کسی کو ہم نہ ملے اور کسی کو تو نہ ملا
(مقبول خالد، لاڑکانہ کا جواب)

نزہت مقبول جان............جیکب آباد
نظر یہ کس سے ملی ناگہاں کہ یاد آیا
اسی گلی میں کہیں میرا گھر بھی آتا ہے
(ظفر معراج، لندن کا جواب)

منور اکرام طاہر............اوکاڑہ
یہ کس خلش نے پھر دل میں آشیانہ کیا
پھر آج کس نے سخن ہم سے غائبانہ کیا
(فصاحت اللہ، ڈی آئی خان کا جواب)

ابتہال سلیم............حیدرآباد
کچھ اس طرح سے جلایا ہے تپتے سورج نے
کہ اب تو چاند کے نیچے بھی پیاس لگتی ہے

نوشاد علی............میرپور آزاد کشمیر
کب تک گزری باتیں یاد کریں پچھتائیں
آؤ آج ان مست ہواؤں میں بہہ جائیں

فتح علی خان............شنکیاری
کھڑا ہوں خواہشیں اونٹوں پہ لادے
ادھر کھائی ادھر سوئی کا ناکا

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظرانداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

علمی آزمائش۔ 85

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کرکے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''یک صفحی سرگزشت'' کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کرکے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 نومبر 2012ء تک موصول ہوجائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

27 جون 1910ء کو لالہ ہری رام کپور کے گھر ضلع لائل پور میں کمالیہ سے 12 میل دور کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ اردو ادب میں اپنی مثال آپ تھے۔ آج بھی ان کی تحریر ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہے۔ ان کی ہر سطر میں شگفتگی اور ایک پیام ہوتا تھا۔

علمی آزمائش 85 کا جواب

سید محمد مہدی، رئیس امروہوی 1914ء میں امروہہ بھارت میں پیدا ہوئے۔ 1931ء میں ماہنامہ حیات کے ایڈیٹر نامزد ہوئے۔ 1943ء میں روزنامہ جنگ دہلی سے وابستہ ہوئے مگر بعد میں استعفیٰ دے دیا مگر قیام پاکستان کے بعد جب روزنامہ جنگ کراچی سے نکلنے لگا تو اکتوبر 1947ء میں کراچی آکر دوبارہ جنگ سے وابستہ ہوگئے۔ روحانیت سے خاص شغف تھا۔ قطعات نگاری میں خاصہ نام پیدا کیا۔

انعام یافتگان

1-(آصفہ مخدوم، جیکب آباد) 2-(نسرین احمد خان، کراچی) 3- (نوازش حیات، فیصل آباد)

4-(نعمان اشرف، وہاڑی) 5- (امجد شہباز، لاہور)

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

لاہور سے امجد ملک، اسلم ملک، طارق شاہین خواجہ، وائن ولا۔ منظر علی خان، تابش عطاری، ممتاز الحسن، زبیر اسلم، نعمان اشرف، عقیل سندھو، رضا احمد خان، ناصر حسین، انعام الحق، ملک جاوید، نیاز احمد، ارشاد علی، فہیم مرزا، برق ضیائی، برکت مشتاق، نعیم خیرو، نازش خان، نثار اختر، پروین چنا، اکرام صدیق، نعمان بٹ، گل زیبا، خالد تمنا، ملک اظہر، صادق بٹ، ابرار احمد، احمد علی، شرقی، گل زیبا، حدیقہ اشرف، حمیرا خاتون، احمد بشیر بٹ، اشعر حسن، سہیل یوسف زئی، ابرار حیدر، نعمان اشرف، ارباز خان، ممتاز احسن، ہما جبیں، خالد علی، نسرین اکرم، فریدہ مشتاق، قصوری۔ کراچی سے وکیل الرحمن محمد عثمان، مہوش رفیق، سعید احمد چاند، سنبل جبیں، صوفیہ بانو، عمار احمد، فرزانہ پروین، نسیمہ عمر، سید عزیز الدین، شاہد احمد خان، شرف معروف حمیدی، محمد ناصر، سید امجد علی، انصار حسین، ابرار احد، نواز علی شاہ، ملک سرفراز گوندل، عباس گل، فرحت ملک، اسلم خان، لقمان اسد، نور احمد، عنایت مسیح، حکیم اللہ فہمی، ناصر افروز، ارشد، نگار ارشد، تنویر فاروقی، ذیشان ممتاز، نگار ہمانی، کاوش اختر، رجب علی مرزا، وجیہہ الحسن، نصیر ضیائی، ابریز شاہ، فتح خان، نسیم ابوبکر، بختاور شاہ، علی احمد، تنویر حسین زیدی، جاوید علی، ہمایوں صغیر، فراز کوثر، رشید حسن خان، عارفہ سلطان، نجم الدین حیدر، فہیم احمد فہیم، خلش مظفر، عقیل سیال، شعیب بھٹو، سید اظفر حسین، کہکشاں تسنیم، منور علی، نصرت فاروق، شہزادہ حسن، اسما توفیق، حسنین صدیقی، عنایت علی۔ اسلام آباد سے عالیہ فاطمہ، انور یوسف زئی، فیض الرحمن شہریار علی، سید زاہد علی، ممتاز احمد، مسز نیلوفر شاہین، زوہا بخاری، زبیر شاہ اشرفی، زاہد عباسی، سعید محمد تقی، تنویر الحسن، نسرین اشرف، فتح الاسلام خان، نرجس علی، کائنات بانو، خاقان خان، بخت خان، رانا فتح یاب، صفدر شیرازی، ثمین جاوید، انور یوسف زئی، محمد ہزاد، بشریٰ فاروق، شہناز فیضی، شاہین اشفاق۔ راولپنڈی سے ڈاکٹر غلام یاسین، ڈاکٹر سعادت علی خان، چوہدری ذوالفقار علی ایڈووکیٹ، محمد شہزاد، بشیر فاروقی شہناز فیض، شاہین اشفاق احمد، ردا ممتاز، محمد متین، سعید اختر، خضر حیات جلیبسی، فرزانہ تبسم، احمد متین، سعیدہ جلال، رضوانہ احسن، لبنیٰ متین، طیبہ روفی، ہما جبیں، حمیرا سلطان، فرحانہ انصاری، فرح سلطانہ، نسرین گل، شہناز عزیز، عطیہ ارم، ساجد بھٹی، اعظیم بیگ، ثمینہ پروین، سعدیہ شکیب، فریدہ نور، مہر عقیل، عشرت علی، اسما صدیقی، حاکم علی، سفینہ ایوب، آسیہ محبوب، زینب شہزاد، آمنہ حق، بشریٰ، موہنی حمید، گل خامان، کنول شریف، ثمر فیروز، شازیہ منور، نزہت فرید۔ ملتان سے محمد یحییٰ معین، فضل الحق، کوکب جہاں، خالد ڈار، توفیق سلمان، نصیر ممتاز خان، مناف سید، جمیل ملک، بہادر خان، فہیم اللہ فاروقی، جنید ارشد، اشرف علی شیروانی، ہمایوں اسلم، سعید وقار، رشید اشفاق، محمد رمضان صدیقی، محمد ادریس صدیقی، احمد خان، نوشاد ساقی احمد بابا، زریاب احمد، امتیاز تاج، محمد اسحاق، رضوان خان، حسنین بشیر، دلنشین فراز، طاہر حسن خان، عصمت علی، سید عباس حسن زیدی، طاہرہ یاسمین، قمر حسنین، ادریس خان، محمد اسماعیل، نعمان بشیر، ڈاکٹر صفی عمر، فرحت اللہ لغاری، نعمان عابد، منظر حستخان، کاشف خان، مختار خان۔ جہلم سے ظفر حسن بلوچ، نعمان زرولی خان، ہمایوں سید، وسیم رضا، ڈاکٹر اقبال وڑائچ۔ چکوال سے افتخار مدثر، منظور احمد، حبیب الرحمن، محمد قدرت اللہ، جاوید رند، علی بٹ۔ کوئٹہ سے صالح چنگیزی، رحمن ہزاروی، قدیر خان، زہیر بلوچ، سعدیہ خان، عبدالغفور، سید احتشام حسین کاظمی، عاصم اقبال، محمد اسحاق، انجم معزاری، ادریس حسن خان، زینب مرزا، محمود برکات۔ سرگودھا سے امتیاز چودہری، انجم پروانہ، طاہرہ سواتی، خان اسحاق، فریدالدین عطاری۔ شجاع آباد سے ڈاکٹر سید محمد عالمگیر جاوید، سید خضر عباس بخاری، یاسمین فیض، مدثر حسن۔ حیدرآباد سے ابتہال سلیم، مرزا فرحان بیگ، جنید نواز، جعفر حسین، بابر عباس، امجد برکاتی، سہیل انصاری، اقبال حسن خان، ملک شیراز، فہیم اللہ، نصیر حسن، کلیم اللہ چغتائی، سعود حسن خان۔ فیصل آباد سے شوکت علی چاند، فریدہ ممتاز، خاقان جمشید، نگار مصطفی، امجد علی، نوشین ممتاز۔ ساہیوال سے خواہر مدنی، انعم تسلیم، راشد خان۔ حاصل پور سے حبیب تابش، نظیر نازش۔ ڈی جی خان سے سید محمد رضا، احمد خان، توحید اظہر منظور وٹو، ظہیر اکرم، ہمایوں خاقان، اشرف۔ ڈی آئی خان سے یوسف خان، عمران حیدر، ریاض ملک۔ بہاولپور سے حمیرا کوکب واسطی، محمد ظفر اقبال، سید نجم الدین احمد۔ میرپورخاص سے محمد فیضان، غنی عثمانی، ضوریز اختر، نعمان اظہر، ثنا تمنا، ارشد چغتائی، ظہیر قائم خانی۔ جہانیاں سے زبیر خان، نعمت انصاری، اطہر حسین، خضر حیات، خوش خان، وزیر حسن، صالح احمد، نصرت خان، انیق احمد۔ کوٹ ادو سے، مظفر بٹ، سہیل آرائیں، نوشین مصطفیٰ، اطہر حسین، پروین صداقت، نعمت اللہ۔ چوٹالہ سے شباب خان، نثار فاروق، گلشن سہیل، فلک شاہ، ثناء احمد۔ پاک پتن سے مسکین شاہ، سدرہ تحقیق، وین ڈینو۔ جھنگ سے امتیاز حسن، زویار فیق، ارباز مغل، نادر شاہ، ملک سرور، ملک سرفراز، عجب گل، نصرت رضوی، احباب زیدی۔ سکھر سے نعمان شیخ، شاہد حسن، انتصار حسین، ناہید انصاری، وسیم منصوری، فہیم شیخ۔ پشاور سے جویریہ بشیر نواز، ممتاز گل، فردوس اختر، انصار حسین، نسیم فردوس، اطہر نواز، کاشان شاہ، دردانہ شاہ، نسیم نیازی، زبیر اللہ، خضر شاہ، عظیم فاروقی، نوازش حسین طوری، آفتاب گل، ضیاالحق، جمال ناصر حسین، نوید فہیم، محمود اچکزئی۔ اوکاڑہ سے سید احسن محمود، راجا احسن، ملک صفدر، نصیب خان، اظہر الدی، منور اکرام طاہر (میراں پور)۔ سیالکوٹ سے نوید شہزاد خواجہ، نرجس زیدی، اطہر علی خان، فردوس شاہ، مہ جبیں فلک، محمد رضا، فہیم اللہ، ناصر خان، جاوید محمود ملک، انا ملک، فیض الحسن، محمد رضا، احسن خان، اسلام الدین، نصیر اجتہادی، نعمان شیخ، فراست اللہ، محمود حسن، ام حبیبہ، نصرت گل۔ اٹک سے زبیر اللہ خان، ثنا جبران، ابوبکر صدیقی، شبیر حسن، احمد دین حداد، ملک جاوید محمد خان سرکانی (کچھ)۔ نادور سے سلیم کامریڈ۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

اندھیرے اجالے

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم!
انسان میں ازل سے مفاد پرستی رہی ہے۔ وہ اپنے مفاد کی خاطر دوسروں کی زندگی بہ آسانی تباہ کردیتا ہے۔ میرے ساتھ جو کچھ ہوا ہے یہ بھی مفاد پرستی کا شاخسانہ ہے۔ اگر آپ کو بھی میری دکھ بھری کہانی پسند آجائے تو اسے سرگزشت میں ضرور شائع کردیں۔

زرینہ
(لاہور)

میرا نام زرینہ ہے۔ اپنے والدین کے بارے میں، میں ذاتی طور پر کچھ نہیں جانتی۔ ہوش سنبھالنے پر ماموں اور ممانی نیز دوسرے رشتے داروں کی زبانی جو کچھ معلوم ہوا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ میرے ابو ایک سرکاری محکمے میں اچھی پوسٹ پر ملازم تھے۔ جب وہ بی کام میں پڑھ رہے تھے تو ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ انہوں نے اپنی محنت اور قابلیت سے نہ صرف گھر کو سنبھالا بلکہ اپنی تعلیم بھی مکمل کی۔ ایم کام کرنے کے بعد انہیں اچھی ملازمت مل گئی۔ بدقسمتی سے ابھی انہیں سروس کرتے ہوئے ایک سال ہی گزرا تھا کہ ان کی والدہ بھی فوت ہوگئیں۔ ان کی اچھی پوزیشن کی وجہ سے خاندان میں کتنے ہی عزیز ایسے تھے جو اُن سے رشتہ جوڑنا چاہتے تھے لیکن وہ لڑکپن سے ہی اپنے والد کے ایک مرحوم دوست کی بیٹی کو پسند کرتے تھے۔ انہوں نے سارے خاندان کی مخالفت کے باوجود اپنی پسند سے شادی کرلی۔ اس اقدام سے خاندان والوں نے ایک طرح سے ان کا معاشرتی بائیکاٹ کردیا۔ ان سے ملنا جلنا چھوڑ دیا۔

تقدیر کی نیرنگیوں نے اس کے بعد بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ شادی کے تین سال بعد جب بڑی آرزوؤں اور دعاؤں کے بعد میری پیدائش ہوئی تو کیس بگڑ جانے کی وجہ سے میری امی اسپتال سے زندہ گھر واپس نہیں جاسکیں۔ میرے ابو نے کس مشکل سے ماں اور باپ دونوں کی ذمے داریاں نبھاتے ہوئے ایک بن ماں کی نوزائدہ بچی کو پالا، پرورش کی، اس کا اندازہ لگانا کچھ ایسا مشکل نہیں۔ ددھیال کے عزیز تو پہلے ہی ناتا توڑ چکے تھے۔ امی کے صرف ایک ہی بھائی تھے۔ ان کی مالی حالت کچھ اچھی نہیں تھی۔

ایک پنتھ دو کاج کے مصداق ماموں ممانی نے مجھے سنبھالنے میں ابو کا ساتھ دیا اور ہمارے ہی گھر میں آکر رہنے لگے لیکن قسمت کو ابھی ایک اور تیر چلانا تھا۔ میں ابھی چار سال کی بھی نہیں ہوئی تھی کہ ابو جن کی صحت امی کے انتقال کے بعد سے مسلسل گرتی جارہی تھی تپ دق کی نذر ہوگئے۔

ماموں اور ممانی نے بظاہر ایک یتیم و یسیر بچی پر رحم کھا کر لیکن حقیقت میں ہمارے مکان، امی کے زیورات، دفتر سے ملنے والے ابو کے فنڈز وغیرہ پر قبضہ کرنے کے لیے مجھے اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ یوں بھی اب دنیا میں ان کے علاوہ مجھے اپنا کہنے والا اور تھا بھی کون، چنانچہ میری پرورش ان ہی کی ذمے داری بن گئی مگر والدین کے انتقال نے مجھے اکیلا ہی نہیں منحوس بھی بنا دیا تھا۔ یہ خطاب تو مجھے امی کی وفات کے بعد ہی ممانی نے دے دیا تھا لیکن جب ابو کی آنکھیں بھی بند ہوگئیں تو پاس پڑوس اور محلے میں ہی نہیں بلکہ ہر آنے جانے والے کے سامنے اس کی اتنی پبلسٹی کی گئی کہ اس کی آڑ میں ہر وہ سختی جائز اور ہر وہ زیادتی مناسب بن گئی جو ممانی اور ان کی دو بیٹیاں مجھ پر روا رکھتی تھیں۔ ماموں موٹر مکینک تھے، صبح کو کام پر جاتے تھے تو مغرب کے بعد تھکے ہارے گھر لوٹتے تھے۔ گھر میں میرے ساتھ کیا سلوک ہورہا ہے انہیں کبھی اس کا صحیح اندازہ ہی نہیں ہوسکا۔ اس پر ستم یہ کہ ممانی جب بھی موقع ملتا ہے میرے خلاف ان کے کان بھرنے سے باز نہیں آتی تھیں۔ ہر وہ نقصان جو اتفاقاً یا ارادتاً (مجھ پر مزید ستم ڈھانے کے لیے) ہوتا تھا میرے نامۂ اعمال میں لکھ دیا جاتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ماموں کے

دل میں میرے لیے اگر کوئی نرم گوشہ تھا بھی تو وہ رفتہ رفتہ سرد مہری اور بے تعلقی کے دبیز پردوں میں چھپتا چلا گیا۔

ماموں کے تین بچے تھے۔ سب سے بڑا لڑکا جاوید اور اس سے چھوٹی دو لڑکیاں زینت اور عشرت۔ جاوید اور زینت دونوں مجھ سے بڑے تھے جبکہ عشرت دو سال چھوٹی تھی۔ ماموں چونکہ خود بھی زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے اور ان کے پیشے کا بھی تعلیم سے کوئی تعلق نہیں تھا اس لیے بچوں کی تعلیم و تربیت پر بھی کوئی خصوصی توجہ یا دلچسپی نہیں تھی۔ شہروں میں تعلیم کا چرچا کچھ زیادہ عام ہوگیا تھا۔ محلے کے تقریباً سب ہی گھروں کے بچے اسکول جاتے تھے اس لیے ماموں نے بھی وقت آنے پر جاوید، زینت اور عشرت کو اسکول میں داخل کرادیا۔ مجھے پڑھنے کا بے حد شوق تھا مگر کسی کو میرا خیال نہیں آیا۔ خود میں نے ہی زینت کو گھر پر اپنا سبق یاد کرتے اور اسکول کا کام کرتے دیکھ دیکھ کر حروف اور الفاظ کی تھوڑی بہت شُدبُد پیدا کرلی تھی پھر ایک دن محلے کے اسکول کی استانی کسی کام سے ممانی سے ملنے آئیں اور انہوں نے مجھے چھپ کر پڑھتے دیکھ لیا تو میرے شوق اور بغیر اسکول جائے ذاتی کوشش سے حاصل کی ہوئی استعداد سے اتنی متاثر ہوئیں کہ انہوں نے ممانی کو میرا نام بھی اسکول میں لکھانے پر آمادہ کرلیا اور ممانی تیار ہوئیں بھی تو اس شرط پر کہ اسکول کی فیس اور کتابوں وغیرہ سے ان کا کوئی واسطہ نہیں ہوگا۔ استانی صاحبہ کو میرا شوق دیکھ کر اعتماد ہوگیا تھا کہ میں ذہین ثابت ہوں گی اور وہ میرے اچھے تعلیمی ریکارڈ کی بنیاد پر نہ صرف میری فیس معاف کرالیں گی بلکہ ممکن ہے میرا کچھ وظیفہ بھی مقرر کرادیں گی جو حصولِ تعلیم میں مددگار ثابت ہوگا۔

لڑکپن سے نوجوانی تک کے زمانے کی روداد دہرانے کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ میری نحوست کو شہرت دینے کے بعد ممانی کو میرے ساتھ ناروا سلوک کرنے کا حق حاصل ہوگیا تھا۔ گھر کا بیشتر کام، گھر والوں کی ہر زیادتی، بات بات پر برا بھلا سننا روز کے معمولات میں شامل تھا۔ میں نے بھی صبر و ضبط کے ساتھ حالات سے سمجھوتا کرلیا تھا۔ ہر زیادتی و

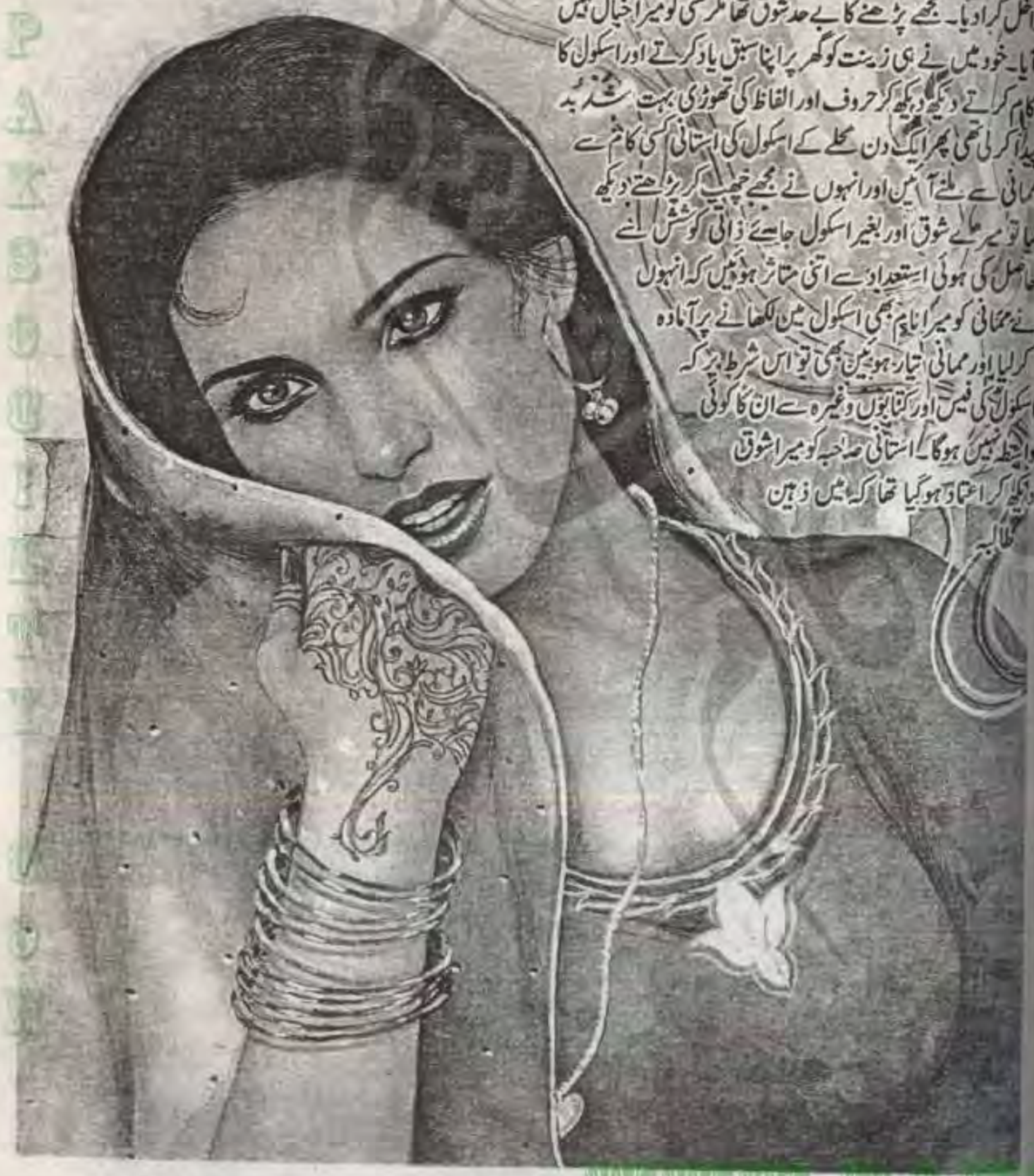

WWW.PAKSOCIETY.COM

ظلم کے جواب میں خاموش رہتی تھی اور نمازیں پڑھ پڑھ کر خدا سے دعائیں مانگتی تھی کہ پروردگار مجھ پر رحم فرما اور کم سے کم میرے مستقبل کو ایسا ضرور بنادے کہ میں زیادہ نہ سہی تو نسبتاً بہتر حالات میں زندگی گزار سکوں۔

اس مدت میں جاوید بھائی نے میٹرک پاس کرنے کے بعد ماموں کے ساتھ شاپ پر جانا شروع کردیا تھا۔ ان کا ذہن بڑا ٹیکنیکل تھا۔ ایک دو برس کے اندر ہی وہ ہر قسم کی کاروں کی نہ صرف مرمت کرنے لگے بلکہ اپنے کام میں اتنے ماہر ہوگئے کہ اسی تجربہ اور مہارت کے بل پر انہیں سعودی عرب میں ایک بڑی موٹر کمپنی کے ورکشاپ میں بہت اچھی ملازمت مل گئی اور وہ ریاض چلے گئے۔ وہ گھر کے ماحول سے اتنے اکتائے ہوئے تھے کہ وہیں ریاض میں ایک شریف پاکستانی گھرانے کی لڑکی سے شادی بھی کرلی اور یوں کم و بیش وہیں کے ہوگئے۔ دو تین سال میں ہفتہ عشرے کے لیے والدین سے ملنے آجاتے تھے اور پھر واپس چلے جاتے تھے لیکن اس علیحدگی کے باوجود انہوں نے گھر سے متعلق اپنی ذمے داریوں کو فراموش نہیں کیا تھا۔ ہر ماہ ایک معقول رقم ماموں کو بھیجنے کے علاوہ زینت کی شادی کے تقریباً تمام اخراجات بھی انہوں نے ہی برداشت کیے تھے۔

زینت نے آٹھویں جماعت سے اسکول چھوڑ دیا تھا۔ خدا نے صورت شکل اچھی دی تھی۔ ابھی وہ سترہ اٹھارہ سال کی ہی ہوئی تھی کہ اس کے لیے رشتے آنا شروع ہوگئے۔ ماموں کو ایک رشتہ پسند آگیا۔ لڑکا شریف خاندان سے تھا۔ میٹرک کے بعد کمپاؤنڈری کا امتحان پاس کرکے ایک بڑے ڈاکٹر کے کلینک میں خاصی معقول تنخواہ پر کام کررہا تھا۔ گھر پر انجکشن یا ڈرپ وغیرہ لگانے جاتا تھا اس کی فیس الگ سے مل جاتی تھی پھر کئی سال کی کمپاؤنڈری میں اتنا تجربہ تو ہو ہی گیا تھا کہ چھوٹی موٹی بیماریوں کا علاج کرسکے اس لیے جو غریب ڈاکٹر کے پاس جانے کی سکت نہیں رکھتے تھے اس سے علاج بھی کراتے تھے۔ غرض خاصی آمدنی ہوجاتی تھی۔ ماموں اپنی موجودہ مالی اور معاشرتی پوزیشن میں اس سے زیادہ بہتر رشتے کی توقع بھی نہیں کرسکتے تھے۔ جاوید کا مشورہ بھی اس کے حق میں تھا چنانچہ ماموں نے ایک لڑکی کے فرض سے سبکدوش ہوجانا ہی بہتر خیال کیا اور یوں زینت کی شادی ہوگئی۔

☆☆☆

میں میٹرک سے آگے بھی پڑھنا چاہتی تھی۔ اس کے لیے وظیفہ بھی مل سکتا تھا لیکن ممانی نے بڑی سختی سے انکار کردیا کہ بس جتنا پڑھ لیا کافی ہے اور ظاہر تھا کہ ان کی نوازشوں کو دیکھتے ہوئے میٹرک تک پڑھ لینا بھی ایک کمال تھا۔ زینت آٹھویں سے آگے نہیں جاسکی تھی۔ عشرت مجھ سے دو سال چھوٹی تھی مگر ابھی تک ساتویں جماعت میں اٹکی ہوئی تھی۔ نظر آرہا تھا کہ اس نے مڈل پاس کرلیا تو اسی کو غنیمت جانے گی۔ ایسی صورت میں یہ کیسے ممکن تھا کہ جس لڑکی کو ممانی نے آج تک ایک ملازمہ سے زیادہ نہ سمجھا ہو وہ علم میں ان کے بچوں پر سبقت لے جائے۔ مزید یہ کہ جب سے جاوید بھائی نے اپنی پسند سے شادی کی تھی میری نحوست کے تذکرے ایک بار پھر تازہ ہوچکے تھے۔ اسے بھی میری بدبختی کا شاخسانہ قرار دے دیا گیا تھا کہ میں نے بیٹے کو ماں باپ سے جدا اور باغی کردیا تھا۔ استانی جی ملازمت سے ریٹائر ہوچکی تھیں اور بیمار رہنے لگی تھیں مگر اب شاید ان کی سفارش بھی کام نہیں آتی۔ میں جس طرح اب تک صبر کرتی آئی تھی اب بھی یہ سوچ کر خاموش ہوگئی کہ آخر کبھی تو بارگاہِ الٰہی میں میری دعائیں شرفِ قبولیت حاصل کریں گی، کبھی تو زندگی کے یہ روز و شب بدلیں گے، کبھی تو مجھے اتنی آزادی حاصل ہوگی کہ اپنی مرضی سے کچھ کرسکوں۔ تب جہاں تک جی چاہے گا پڑھ لوں گی۔

ماموں بوڑھے ہوئے جارہے تھے۔ اب اُن سے زیادہ محنت نہیں ہوتی تھی۔ نظر بھی کمزور ہوگئی تھی اور ہاتھوں میں کچھ رعشہ بھی آگیا تھا۔ جس موٹر ورکشاپ میں وہ کام کرتے تھے اس نے پرانی ملازمت اور خداترسی کے خیال سے انہیں کچھ مدت تک مزید برداشت کیا پھر چھٹی دے دی۔ ہرچند وہاں پنشن کا کوئی دستور نہیں تھا پھر بھی ورکشاپ کے مالک نے تین سو روپیہ ماہانہ بطور امداد دیتے رہنے کا وعدہ کیا اور اسے پابندی سے نبھایا بھی مگر بڑھتی ہوئی گرانی کے دور میں تین سو روپے کی کوئی خاص حقیقت نہیں تھی اور جاوید بھائی نے بھی اپنی بڑھتی ہوئی ذمے داریوں کی وجہ سے بھیجنے والی رقم میں کمی کردی (گویا میری نحوست پر ایک اور فردِ جرم عائد ہوگئی)

میں زندگی کے بیسویں سال میں قدم رکھ چکی تھی۔ عشرت اٹھارہ برس کی تھی۔ دونوں کے لیے حسبِ حال رشتے آرہے تھے مگر گھر میں دو وقت کی روٹی کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ ممانی دن رات مجھے کوس رہی تھیں کہ میری وجہ سے ان کے گھر کی خوش حالی بدحالی میں بدل گئی اور میرے

ہی باعث ان کی لاڈلی بیٹی گھر میں بیٹھے بیٹھے بوڑھی ہوتی جارہی ہے۔ وہ عشرت کی شادی نہیں کرسکتیں۔ دنیا کے طعنے ان کی زندگی دوبھر کردیں گے۔ لوگ کہیں گے کہ یتیم اور بڑی بھانجی سے پہلے چھوٹی بیٹی کی شادی کردی۔ میں ممانی کی باتیں سن سن کر صبر و ضبط کے باوجود اتنی عاجز آچکی تھی کہ کئی بار خودکشی کرنے کے بارے میں سوچ چکی تھی۔

پھر اتفاق سے ایک دن میں استانی صاحبہ کی عیادت کے لیے ان کے گھر گئی تو ان کی بیٹی رضیہ سے بھی ملاقات ہوگئی۔ رضیہ عمر میں مجھ سے چار پانچ سال بڑی تھی۔ اس نے بی ایڈ پاس کرکے اپنا ایک اسکول کھول لیا تھا۔ میرے حالات سے کم و بیش واقف تھی اور طبیعت میں بالکل دوسری استانی جی معلوم ہوتی تھی۔ اس نے ہمدردی سے حال پوچھا تو میری آنکھوں میں ضبط کے باوجود آنسو آگئے۔ دل نہ جانے کب سے کسی غمگسار کے سامنے اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے بے قرار تھا۔ میں نے پوری تفصیل سے اپنی روداد اسے سنادی۔ وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر بولی۔

”تمہاری پریشانیوں میں موجودہ اضافے کی وجہ بنیادی طور پر معاشی ہے۔ یہ کسی نہ کسی حد تک بہتر ہوجائے تو حالات خودبخود نارمل ہوجائیں گے۔ نارمل میں اس اعتبار سے کہہ رہی ہوں کہ معمول کے مطابق ہونے والی زیادتیوں کی تم عادی ہوچکی ہو۔ میرے ذہن میں ایک تجویز آرہی ہے جو انتہائی مفید ثابت ہوسکتی ہے۔“

”وہ کیا؟“ میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

”تم میرے اسکول میں ملازمت کرلو۔“ رضیہ نے جواب دیا۔ ”اگرچہ ابھی تک میں نے بی اے سے کم کوالیفائڈ کوئی استانی نہیں رکھی ہے مگر تمہارے مخصوص حالات کے پیشِ نظر خصوصی رعایت دی جاسکتی ہے پھر مجھے معلوم ہے کہ تم نے میٹرک فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا تھا۔ تمہارا مطالعہ، تمہاری قابلیت ایک عام میٹرک پاس سے کہیں زیادہ ہے۔ میرے اسکول میں کلاسیں تیسری جماعت سے شروع ہوتی ہیں اور مجھے پوری امید ہے تم تیسری، چوتھی جماعت کو بہ آسانی ہر مضمون پڑھا سکتی ہو۔“

”تجویز تو بہت اچھی ہے۔“ میں خوش ہوگئی۔ ”آمدنی بھی ہوگی اور کم سے کم اسکول ہی کے بہانے میں گھر سے چار پانچ گھنٹے باہر گزار سکوں گی مگر کیا ممانی مان جائیں گی۔“

”تم بات کرکے تو دیکھو۔“ رضیہ مسکرائی۔ ”تم ممانی کی بات کررہی ہو میرا دعویٰ ہے کہ وہ بظاہر نہیں تو دل ہی دل

ظرف

فیروز خان نون پاکستان کے وزیراعظم تھے جب سرحدی تنازعات نے پاکستان اور ہندوستان کے درمیان کچھ زیادہ شدت اختیار کرلی۔ ستمبر 1957ء میں ان سارے تنازعات کے تصفیے کے لیے ان کی ملاقات نئی دلی میں پنڈت نہرو سے طے پائی۔ پالم کے ہوائی اڈے پر جہاز رکا۔ فیروز خان نون کے استقبال کے لیے پنڈت نہرو اپنے کچھ رفقاء اور ماتحتوں کے ساتھ وہاں موجود تھے۔ ان سے تھوڑے فاصلے پر فوٹو گرافروں اور پریس رپورٹروں کا ایک ہجوم تھا۔ ہوائی جہاز سے اترنے کے لیے سیڑھی لگائی گئی۔ فیروز خان نون سب سے پہلے ہوائی جہاز سے اترے، ان کے پیچھے ان کی اہلیہ بیگم وقار النساء تھیں۔ بیگم وقار النساء نے ساڑی کے ساتھ سلیپر کی وضع کی جوتی پہنی ہوئی تھیں۔ ایسی جوتی ساڑیوں کے ساتھ مخصوص ہوتی ہیں۔ بیگم وقار النساء نے سیڑھی پر قدم رکھا ہی تھا کہ ان کے ایک پاؤں کی جوتی کھٹاک سے زمین پر آگری۔ پنڈت نہرو نے آگے بڑھ کر یہ جوتی اٹھائی۔ وہ جب نیچے پہنچیں تو پنڈت نہرو نے وہ جوتی ان کے پاؤں کے سامنے رکھ دی۔

فوٹو گرافر اس منظر سے کافی لطف اندوز ہوئے۔ انہوں نے اس کی بہت ساری تصویریں لیں اور ان میں اکثر اگلے روز اخبارات میں چھپیں۔ فیروز خان نون لکھتے ہیں خوش اخلاقی کے اس سلوک سے نہرو کی وجاہت میں کچھ فرق نہیں آیا بلکہ اس میں کسی قدر اضافہ ہی ہوگیا۔ تمام اخبارات نے اپنے اعلیٰ ظرف وزیراعظم کو سراہا۔

اقتباس: دن میں چراغ از عباس خان سے
محمد جاوید شبیر بریرہ، علی پور

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں یہ خبر سن کر اچھل پڑیں گی۔ بھانجی سے یہ فائدہ بھی اٹھایا جاسکتا ہے اس کا تو انہیں خیال بھی نہیں آیا ہوگا۔"

رضیہ کا اندازہ سو فیصد درست تھا۔ یہ بات سن کر کہ رضیہ مجھے اپنے اسکول میں ملازمت دینے پر آمادہ ہے ممانی نے ہر چند اپنے جذبات چھپانے کی بہت کوشش کی مگر چہرے کی بشاشت اور آنکھوں کی چمک دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اگرچہ بظاہر انہوں نے یہ عذر لنگ بھی تراشا کہ لوگ کہیں گے کہ "بھانجی سے ملازمت کرا رہی ہیں۔" مگر دوسری ہی سانس میں یہ بھی کہہ گئیں کہ "بیٹی گھر کی حالت تو تم سے بھی چھپی نہیں ہے۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بھی بہت ہوتا ہے، تم کچھ کما کر لاؤ گی تو گزر بسر میں جو آسانی ہوگی وہ تو ظاہر ہی ہے میں تم دونوں بہنوں کی شادیوں کے لیے بھی کچھ بچا سکوں گی۔ دل تو نہیں چاہتا مگر تمہاری خوشی اسی میں ہے تو میں روکنا بھی نہیں چاہتی۔" اور یوں اگلے ماہ کی پہلی تاریخ سے میں رضیہ کے اسکول میں پڑھانے لگی۔

☆☆☆

ایک طرف یہ حالات تھے تو دوسری جانب تقدیر کچھ نئے گل کھلانے کا انتظام کر رہی تھی۔ ہمارے محلے میں ایک ایسی عورت کا آنا جانا بھی تھا جو پیشہ ورانہ طور پر رشتے طے کرانے کا کام کرتی تھی۔ پتا نہیں اس کا نام کیا تھا مگر سب محلے والے اسے مائی خیراں کہا کرتے تھے۔ یہ عورت ہمارے گھر بھی آتی جاتی رہتی تھی۔ کچھ دنوں سے میں محسوس کر رہی تھی کہ اس کی آمدورفت معمول سے کچھ زیادہ بڑھ گئی ہے اور جب وہ آتی ہے تو ممانی اسے الگ کمرے میں لے جا کر بڑی دیر تک سرگوشیوں جیسے انداز میں باتیں کرتی رہتی ہیں۔ مجھے یہ تو اندازہ تھا کہ گفتگو کا موضوع میری یا عشرت کی شادی ہی ہوسکتا ہے لیکن یہ گمان تک نہیں تھا کہ ممانی شادی کی آڑ میں میرا سودا طے کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔

میں اپنی اسکول کی ملازمت سے بہت خوش تھی۔ نہ صرف اس لیے کہ اس طرح پانچ گھنٹے تک ممانی کی جلی کٹی باتیں سننے سے نجات مل گئی تھی بلکہ اس لیے بھی کہ پانچ سو روپے مہینا کما کر لانے کے صلے میں ممانی کو مجبوراً گھر کے کام کا بیشتر ذمہ خود یا اپنی لاڈلی بیٹی عشرت کے ذمے لینا پڑا تھا اور اس طرح مجھے برا بھلا کہنے کے مواقع بڑی حد تک کم ہوگئے تھے لیکن میری یہ خوشی ایک دوسرے اعتبار سے جلد ہی ایک نئی پریشانی میں تبدیل ہوگئی۔

دور کے رشتے سے رضیہ کا ایک چچا زاد بھائی تھا نصرت۔ وہ گاہے گاہے کسی کام سے یا یونہی رضیہ سے ملنے اسکول آتا تھا۔ دیکھنے میں اچھا تھا بظاہر خوش اخلاق اور مہذب بھی معلوم ہوتا تھا۔ ایک بار رضیہ نے خود ہی مجھ سے اس کا تعارف کروایا۔ اس کے بعد دعا سلام اور خیر و عافیت کے چند جملوں کا تبادلہ ہونے لگا۔ رفتہ رفتہ میں نے محسوس کیا کہ نصرت میری ذات میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لے رہا ہے۔ اسکول بھی زیادہ آنے لگا ہے۔ کار میں آتا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ غالباً دانستہ اسکول کی چھٹی کے وقت آیا اور مجھے میرے گھر تک چھوڑنے کی پیشکش کی۔ مجھے زندگی کے تجربات نے بہت محتاط اور دور اندیش بنا دیا تھا۔ میں نے اس کی بڑھتی ہوئی توجہ کے سلسلے میں بھی خود کو ریزرو رکھا اور اس کی اس پیشکش کو بھی شکریہ کے ساتھ مسترد کر دیا۔ دو تین بار ایسا ہی اتفاق ہوا تو میرے رویے سے بددل ہو کر یا کسی اور وجہ سے نصرت کی آمدورفت بھی کم ہوگئی اور وہ مجھے نظر انداز کرنے لگا۔ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ پریشانی دردِ سر نہ بنی مگر مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ وقتی سکون تقریباً اسی نوعیت کا تھا جو کسی طوفان کی آمد سے قبل محسوس ہوتا ہے۔

گھر میں مائی خیراں کی آمدورفت اور ممانی سے سرگوشیاں رنگ لائیں۔ ایک دن خود ممانی نے ہی مجھے بتایا کہ مائی خیراں میرے لیے بہت ہی اچھا رشتہ لائی ہیں۔ لڑکا شریف خاندان سے ہے۔ مالدار بزنس مین ہے۔ پسندیدہ اطوار اور پاکیزہ اخلاق کا مالک ہے۔ دولت، بنگلا، کار ملازم غرض کہ زندگی کے جملہ سامانِ آسائش موجود ہیں۔ میں نے دبی زبان سے پوچھ لیا کہ جب یہ ساری خوبیاں موجود ہیں تو اسے ہمارے یہاں رشتہ کرنے کی کیا مجبوری ہے۔ اسے تو ایک سے ایک اچھی اور دولت مند گھرانے کی لڑکی مل سکتی ہے۔ اس پر ممانی نے جھجکتے ہوئے بتایا کہ یہ لڑکے کی پہلی نہیں دوسری شادی ہے۔ پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا ہے۔ اس سے تین بچے بھی ہیں۔ میں نے عمر کے بارے میں پوچھا تو کہا کہ پینتیس چھتیس سال سے زیادہ نہیں ہے۔ میں نے کہا اچھی بات ہے سوچ کر جواب دوں گی۔ اس پر ممانی ایک دم بپھر گئیں۔ بولیں کہ فیصلہ تو وہ پہلے ہی کر چکی ہیں۔ انہوں نے رشتہ منظور کر لیا ہے۔ عنقریب شادی کی تاریخ طے ہو جائے گی، مجھ سے تو انہوں نے صرف اطلاعاً یہ بتانے کے لیے ذکر کیا تھا کہ انہوں نے میرا رشتہ کتنی اچھی جگہ طے کیا ہے۔

ماموں سے کچھ کہنا بے سود تھا۔ اول تو وہ گھر کے معاملات میں دخل نہیں دیتے تھے اور اگر کبھی کسی بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے بھی تھے تو ممانی ان کی چلنے نہیں دیتی تھیں۔ ہوتا وہی تھا جو وہ چاہتی تھیں۔ میں نے اس جبریہ فیصلے سے بھی سمجھوتا کرنے کی کوشش میں اس کے مثبت پہلوؤں کو سامنے رکھا۔ دوسری شادی ہے تو کیا ہوا بیوی تو موجود نہیں ہے اور یہ بھی نہیں کہ طلاق دے دی ہو۔ وہ قضائے الٰہی سے مر گئی تو اس میں شوہر کا کیا قصور۔ ایک ساتھی بچھڑ جائے تو دوسرے کو حق پہنچتا ہے کہ تنہائی کی اذیت سے بچنے کے لیے دوسرا ساتھی تلاش کر لے۔ تین بچے ہیں تو شادی کے بعد بچے ہوا ہی کرتے ہیں انہیں ماں کے ساتھ مارا مارا گھر بدر تو نہیں کیا جاسکتا۔ باپ کا فرض ہے کہ وہ ان کی مناسب انداز میں پرورش کرے۔ دوسری بیوی کے لیے انہیں اپنانا مشکل ضرور ہوتا ہے ناممکن نہیں ہوتا (ممانی نے مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ ان بچوں کی صنف یا عمریں کیا ہیں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے) عمر پینتیس چھتیس سال ہے تو وہ بہت زیادہ تو نہیں کہا جاسکتا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ دولت مند آدمی ہے زندگی کے بیشتر مسائل تو دولت ہی حل کر دیتی ہے بلکہ پیدا ہی نہیں ہونے دیتی۔ ایک شادی کے بعد مرد کچھ زیادہ ہی سمجھدار، بردبار اور متحمل ہو جاتا ہے پھر یہ کہ اس گھر سے تو نجات ملے گی۔ ممانی کی کڑوی کسیلی باتیں، جھڑکیاں اور کوسنے تو نہیں سننا پڑیں گے۔ غرض اپنے ذہن کو میں نے ایسے ہی دلائل دے کر کافی حد تک اس رشتے پر آمادہ کر لیا تھا۔

اچانک ایک دن ممانی اور مائی خیراں کی باتیں سننے کا موقع مل گیا۔ ہوا یوں کہ اسکول میں آدھے دن کی چھٹی ہو جانے کی وجہ سے میں تقریباً گیارہ بجے گھر واپس آگئی۔ عشرت ایک دو دن کے لیے اپنی بڑی بہن زینت کے یہاں گئی ہوئی تھی۔ ماموں زیادہ تر اپنے کمرے میں رہتے تھے۔ میں گھر میں داخل ہوئی اور کسی طرف کوئی خاص توجہ دیے بغیر اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ راستے میں وہ کمرا پڑتا تھا جو عموماً مہمانوں کو بٹھانے اور ان کی خاطر تواضع کرنے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ قریب سے گزرتے ہوئے میں نے ممانی اور مائی خیراں کے باتیں کرنے کی آوازیں سنیں چونکہ کسی کے سننے کا اندیشہ نہیں تھا اس لیے وہ دونوں بے فکری سے عام لب و لہجے میں گفتگو کر رہی تھیں۔ کچھ روپے کے لین دین کا ذکر ہو رہا تھا۔ میرے قدم خود بخود رک گئے۔

وہ لوگ

تاریخ میں جن لوگوں نے انسانی ذہن کی آزادی کو برقرار رکھا ان میں ایک برونو بھی تھا۔ برونو اٹلی کا رہنے والا تھا۔ اس کا زمانہ 1548ء سے 1600ء تک ہے۔ وہ فلاسفر، سائنس دان اور ستارہ شناس تھا۔ جان کیسلر اس کو سولہویں صدی کا سقراط کہتا ہے۔ جبکہ بہسار کے مطابق یونانیوں کے مقابلے میں صرف تین دانشور پیش کیے جاسکتے ہیں اور وہ ہیں کانٹ، سپنوز اور برونو۔ آئزن لونی اس کو نیوٹن کے برابر کا سائنس دان اور ڈیکارٹ کے مرتبے کا فلاسفر سمجھتا ہے۔

برونو نے اس نظریے کی تائید کی کہ ہماری اس کائنات کا مرکز سورج ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ یہ کائنات بے شمار جہاں رکھتی ہے۔ ان سب جہانوں میں ذہین ہستیاں رہتی ہیں۔

غیر ضروری مذہبی پابندیوں کے خلاف اس کی جدوجہد نے پادریوں کو سخت ناراض کر رکھا تھا۔ اس کے ان خیالات نے انہیں ناراضی کی انتہا تک پہنچا دیا۔ اس کو گرفتار کر کے اس پر اس کے خلاف مذہبی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا۔ یہ مقدمہ آٹھ سال چلا اس کے فیصلے کے نتیجے میں اس کو سزائے موت سنا دی گئی۔ سزا سنانے کے بعد اس کو کہا گیا کہ برسرِ عام وہ اگر اپنے خیالات سے توبہ کرے تو اس کی زندگی بخش دی جائے گی۔ اس نے توبہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے انکار پر فیصلے پر عملدرآمد کرتے ہوئے روم میں اس کو زندہ جلا دیا گیا۔

انتخاب: دن میں چراغ از عباس خان
مرسلہ: محمد جاوید شبیر ببرہ، علی پور

WWW.PAKSOCIETY.COM

"تم نے پچیس ہزار روپے لانے کا وعدہ کیا تھا۔" ممانی کہہ رہی تھیں۔ "اور صرف دس ہزار لائی ہو۔"

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں پچیس ہزار ہی ملیں گے۔" مائی خیراں نے جواب دیا۔ "ان دس ہزار کو تم پیشگی سمجھو اور باقی پندرہ ہزار نکاح ہونے سے پہلے ادا کردیے جائیں گے۔"

فطری طور پر مجھے شدید حیرت ہوئی، یہ تو گویا ایک طرح سے میرا سودا کیا جارہا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ اور باتیں بھی سنوں مگر اسی وقت ماموں نے کسی کام سے ممانی کو آواز دی اور میں جلدی سے اپنے کمرے میں آگئی لیکن ذہن میں ایک خلش پیدا ہوچکی تھی۔ آخر ایسی کیا ضرورت یا مجبوری تھی کہ شاہنواز (یہ اس آدمی کا نام تھا) مجھ سے شادی کرنے کے لیے اتنی بڑی رقم دینے پر آمادہ تھا۔ اسے مجھ سے کہیں زیادہ بہتر رشتے مل سکتے تھے۔ میں اب تک اس نکتے پر خود کو یہ سوچ کر مطمئن کرلیا کرتی تھی کہ میں بہت خوب صورت ہوں (اور یہ کوئی خودستائی نہیں ہے۔ خاندان بھر میں عزیز و اقارب میری نحوست کے باوجود میری خوب صورتی کے قائل تھے) اور تمام ہی شادی کے امیدوار یا ان کے رشتے دار اگر لڑکی معمول سے زیادہ حسین ہو تو دوسرے کمزور پہلوؤں کو نظرانداز کردیتے ہیں مگر دنیا میں خوب صورت لڑکیوں کا قحط تو نہیں پڑ گیا تھا۔ ضرور کوئی ایسی بات تھی جو دوسری لڑکیوں کے سرپرستوں کو شاہنواز کا رشتہ قبول کرنے میں مانع ہوسکتی تھی اور وہ اس کی دوسری شادی یا تین بچوں کی موجودگی کے علاوہ تھی۔ میں نے بہت دماغ سوزی کی مگر کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی بالآخر میں نے اسے بھی نظرانداز کردیا۔ اگر ممانی کو اس شادی سے کچھ دولت مل رہی ہے تو ملتی رہے مجھے اس سے کیا فرق پڑتا تھا مگر جلد ہی میرے اس تجسس کا جواب ایک المیے کی صورت میں مل گیا۔ شادی میں صرف بیس دن باقی رہ گئے تھے کہ ایک شام شاہنواز کے انتقال کی اطلاع ملی۔ اپنے دفتر میں کام کرتے ہوئے اس پر دل کا دورہ پڑا تھا لوگ اسے فوراً اسپتال لے گئے مگر اس کا وقت پورا ہوچکا تھا اور پھر جو اس اطلاع کے ساتھ انکشافات کا سلسلہ شروع ہوا تو میں جیسے دہرے سکتے میں رہ گئی۔ معلوم ہوا کہ اس کی عمر پچپن سال سے کسی طرح کم نہیں تھی۔ وہ بلڈ پریشر کا مریض تھا۔ ایک دو ہلکے دورے پہلے بھی پڑ چکے تھے اور وہ تین بچے، بچے نہیں جوان تھے جن میں ایک بیٹے اور ایک بیٹی کی شادی بھی ہوچکی تھی۔ سب سے چھوٹا لڑکا ایف اے میں پڑھ رہا تھا۔ تب میری سمجھ میں آیا کہ ممانی کو اس شادی بلکہ بھانجی کی تجارت میں پچیس ہزار کیوں دیے جارہے تھے۔

میرے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ قدرت نے مجھے ایک بڑے المیے سے بچایا ہے یا میری نحوست پر ایک اور مُہر تصدیق ثبت کردی ہے۔ شاہنواز کے حالات کچھ بھی تھے ممانی کو تو یہ پبلسٹی کرنے کا موقع مل گیا تھا کہ یہ لڑکی ضرورت سے زیادہ منحوس ہے اس کی نحوست نے ماں باپ کو ہی نہیں بلکہ اپنے ہونے والے شوہر کو بھی اپنا شکار بنالیا۔

☆☆☆

اب ممانی کی کرم فرمائیاں کچھ اور بڑھ چکی تھیں حالانکہ وہ دس ہزار روپے وصول کرچکی تھیں مگر انہیں ان پندرہ ہزار کا غم تھا جو انہیں نہیں مل سکے تھے اور جس رقم سے وہ اپنی بیٹی عشرت کی شادی دھوم دھام سے کرنے کے خواب دیکھ رہی تھیں۔ میرا گھر میں رہنا مشکل ہوگیا تھا مگر میں اسی صبر و ضبط کے ساتھ ان کی گالیاں اور کوسنے سن رہی تھی اور اسکول کی ملازمت سے ملنے والی تنخواہ بھی ان ہی کے ہاتھوں میں رکھ رہی تھی۔ ممانی کو مزید یہ فکر لگ گئی تھی کہ اگر یہ بدبخت جلد ہی گھر سے نہیں نکالی گئی تو کہیں ان کی پیاری بیٹی کا مستقبل بھی خطرے میں نہ پڑ جائے۔ انہوں نے مائی خیراں سے جلے بھنے لہجے میں صاف کہہ دیا تھا کہ اس منحوس کے لیے جلد ہی کوئی انتظام کردو چاہے وہ جاہل ہو، اندھا یا لولا لنگڑا ہو مگر دو بول پڑھوا کر اس نحوست سے میرا گھر پاک کردو۔

مائی خیراں نے بھی گویا ہتھیلی پر سرسوں جما کر دکھادی۔ وہ ایک رشتہ بقول خود میری نحوست کی دور دور تک پھیلی ہوئی شہرت کے باوجود بڑی دوڑ دھوپ اور منت سماجت کے بعد لڑکے والوں کو آمادہ کرکے لائی تھیں۔ لڑکے کا نام جمال تھا۔ صرف پانچویں جماعت تک پڑھا تھا جس کے بعد اس کے باپ نے اسے ایک لیتھو مشین شاپ پر بٹھادیا جہاں اس نے لیتھو مشین پر کام کرنا سیکھا اور اب ایک کارخانے میں ٹریسر کی حیثیت سے ملازم تھا۔ گھر میں ماں باپ کے علاوہ دو شادی شدہ بھائی اور تین بہنیں بھی رہتی تھیں۔ باپ بوڑھے ہوکر بے کار ہوچکے تھے۔ دونوں بڑے بھائیوں میں سے ایک رنگ و روغن کا کام کرتا تھا اور دوسرا کپڑے سینے کی مشینوں کو درست کرتا تھا۔ ظاہر تھا کہ اس گھر کا ماحول اور عام معمولِ زندگی کیا ہوگا مگر ممانی مجھ سے اتنی تنگ آئی ہوئی تھیں کہ انہوں نے اس شرط پر رشتہ

منظور کرلیا کہ لڑکے والے چار کپڑوں اور شربت کے پیالے پر نکاح پڑھا کر لے جائیں، ان سے کسی بھی قسم کے جہیز کا مطالبہ نہ کریں۔ لڑکے والوں کو ایک حسین، تعلیم یافتہ، کمانے والی لڑکی گویا مفت میں مل رہی تھی۔ انہوں نے یہ شرط تسلیم کرلی۔ شادی کی تاریخ بھی ٹھہر گئی۔ اب ماموں کے گھر سے میرا دل اس قدر اکتا چکا تھا کہ کسی بھی قیمت پر وہاں سے نجات حاصل کرنا چاہتی تھی۔ میں بھی یہ سوچ کر خاموش ہوگئی کہ مشیت نے اگر میری تقدیر میں یہ ہی لکھ دیا ہے تو میں کیا کرسکتی ہوں۔

مگر تقدیر نے جو کچھ لکھا تھا وہ کچھ اور ہی تھا۔ عین شادی کے دن محلے کے دو چار گھروں کی خواتین بچے اور مرد برات کی آمد کا انتظار کررہے تھے کہ دولھا کے بجائے اس کا بڑا بھائی نمودار ہوا اور اس نے بتایا کہ برات گھر سے روانہ ہوئی تو پہلے ہی موڑ پر جس کار میں دولھا اور اس کے چند دوست بیٹھے تھے ایک ٹرک سے ٹکرا گئی۔ کوئی مرا تو نہیں مگر دولھا اور اس کا ایک دوست جو آگے بیٹھے تھے شدید زخمی ہوگئے ہیں۔ وہ لوگ پہلے ہی ایک منحوس لڑکی کو گھر لانے سے ہچکچا رہے تھے مگر اس حادثے کے بعد تو انہیں یقین ہوگیا ہے کہ اگر یہ سبز قدم لڑکی ان کے گھر میں داخل ہوگئی تو اپنی نحوست سے پورے گھر کو تباہ و برباد کردے گی چنانچہ وہ یہ رشتہ ختم کررہے ہیں۔ اب برات کبھی نہیں آئے گی۔

☆☆☆

پے در پے ان دو حادثوں کے بعد دوسرے لوگوں کے خیالات میرے بارے میں جو کچھ ہوں گے وہ تو خیر ہوں گے ہی خود مجھے بھی یقین آنے لگا تھا کہ میں واقعی منحوس ہوں ورنہ قسمت میرے ساتھ ہی یہ کھیل کیوں کھیل رہی ہے لیکن ظاہر تھا کہ میں اپنی بے بسی اور بدقسمتی پر آنسو بہانے کے علاوہ اور کیا کرسکتی تھی۔ ممانی کے ظلم و ستم کا پارا اب خطرناک حد تک بڑھ چکا تھا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ مجھے دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دیں (شاید میری اسکول کی ملازمت سے ہونے والی آمدنی اس ارادے میں مانع تھی) وہ اب گالیاں اور کوسنے دینے کے علاوہ صاف صاف کہنے لگی تھیں کہ بدبخت تو خود ہی اپنا منہ کالا کرکے کہیں کیوں نہیں چلی جاتی کہ تجھ سے ہمارا پیچھا چھوٹے۔

اسی عالم میں نہ جانے کتنی بار میں نے خود اپنے ہاتھوں اپنی زندگی ختم کرنے کے بارے میں سوچا اور عین ممکن تھا کہ کسی ایسے اقدام پر عمل بھی کر بیٹھتی مگر رضیہ کی ہمدردانہ باتیں اور مستقبل کے بارے میں مایوس نہ ہونے کی مخلصانہ تاکید میرا سہارا بنی ہوئی تھی۔ ان دونوں واقعات کی شہرت محلے کے گھر گھر میں پہنچنے کے علاوہ اسکول کے تمام اسٹاف میں بھی عام ہوچکی تھی مگر خوش نصیبی سے تمام استانیوں کا طرزِ عمل بہت ہمدردانہ تھا۔ اول تو وہ یہ موضوع چھیڑنے سے ہی گریز کرتی تھیں اور کبھی کسی بہانے بات ہوتی تھی تو مجھے ہر ممکن کوشش سے سمجھاتی تھیں کہ یہ محض تقدیر کی جانب سے ایک آزمائش ہے اگر میں نے ثابت قدمی سے حالات کا مقابلہ کرلیا تو کون جانے مستقبل میں میرے لیے کیسی کچھ آسائشیں نہ آنے والی ہوں۔

ظاہر تھا کہ نصرت کو بھی ان حالات کا علم ہوچکا تھا اور اس نے ایک بار پھر میری ذات میں دلچسپی لینا شروع کردی تھی۔ فطری طور پر میرا طرزِ عمل بھی اس کے ساتھ بدل چکا تھا۔ میں نے غالباً سوچ لیا تھا کہ اب مجھے ہی اپنی زندگی بنانے کے لیے کچھ کرنا پڑے گا اور اگر نصرت خلوص سے میری طرف بڑھ رہا ہے تو میں کیوں نہ اسے آزمانے کی کوشش کروں۔ میری ہمت افزائی سے اسے مزید حوصلہ ہوا۔

میں نے گھر تک چھوڑنے کی پیشکش تو اب بھی نہیں مانی کہ میں اپنے اور اس کے تعلق کو ممانی کے علم میں نہیں لانا چاہتی تھی مگر اس کے ساتھ کئی مرتبہ اسکول سے چھٹی کے بعد کسی کیفے یا ریسٹورنٹ میں چائے یا کافی پینے ضرور جانے لگی۔

ان تعلقات کو کچھ دن گزرے تو ایک روز نصرت مجھے اپنے گھر لے گیا۔ کہا تو اس نے یہ تھا کہ وہ مجھے اپنی ماں سے ملانا چاہتا ہے مگر گھر پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہاں ایک بوڑھی اور بہری ملازمہ کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ تب نصرت نے اس طرح جیسے کوئی بات اچانک یاد آجائے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"افوہ مجھے یاد ہی نہیں رہا کہ امی آج خالہ جان کے گھر جانے والی تھیں۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں بولی۔ "پھر کبھی مل لوں گی۔ آپ مجھے کسی بس اسٹاپ تک چھوڑ دیں۔"

"اب آہی گئی ہو تو اس گھر کو تو گھوم پھر کر دیکھ لو جہاں تمہیں آنا ہے۔" مگر میں اس کے ساتھ تنہائی کے لمحوں کو طویل کرنا نہیں چاہتی تھی۔

"گھر کہیں بھاگا نہیں جارہا ہے۔" میں نے کہا۔ "دوسری بار آؤں گی تو دیکھ لوں گی۔"

"اتنی جلدی بھی کیا ہے۔" نصرت مسکرایا۔ "کم سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

کم ایک پیالی چائے تو پی لو۔"

"چائے۔!" میں نے کچھ حیرت سے پوچھا۔ "آپ کا مطلب ہے کہ وہ بوڑھی ملازمہ جس کے ہاتھ رعشہ کی وجہ سے اس کے قابو میں نہیں ہمارے لیے چائے بنائے گی پھر تو یقیناً شام ہو جائے گی۔"

"پریشان مت ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تھرماس میں چائے تیار ہوگی۔" نصرت نے جواب دیا۔ "امی جانتی ہیں کہ میں جب بھی باہر سے گھر میں آتا ہوں چائے ضرور پیتا ہوں۔ وہ میرے لیے چائے بنا کر گئی ہوں گی۔"

نصرت مجھے اپنے کمرے میں لے گیا اور وہاں واقعی تھرماس میں گرما گرم چائے موجود تھی۔ میں اتنی سادہ لوح نہیں تھی کہ جو کچھ نظر آ رہا تھا یا نصرت بتا رہا تھا اس پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لیتی۔ مجھے شک تھا کہ اس نے آج مجھے اپنی والدہ سے ملانے کا پروگرام اس لیے رکھا تھا کہ اسے معلوم تھا کہ وہ گھر پر موجود نہیں ہوں گی۔ تھرماس میں چائے کی موجودگی بھی اس کے منصوبے کا حصہ ہو سکتی تھی مگر میں نے اپنے کسی عمل سے اپنے خیالات کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ نصرت نے الماری سے دو پیالیاں نکالیں جن کی وہاں موجودگی میرے شبہے کی مزید تائید کر رہی تھی اور تھرماس سے دونوں پیالیوں میں چائے بھر کر ایک پیالی مجھے پیش کی مگر میں نے اس وقت تک پہلا گھونٹ بھی نہیں بھرا جب تک نصرت اپنی نصف پیالی خالی نہیں کر چکا۔ اس کے پوچھنے پر میں نے جواب دیا کہ میں ذرا ٹھنڈی چائے پینا پسند کرتی ہوں۔ چائے پی کر میں کرسی سے اٹھنے لگی تو نصرت نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"آخر تمہیں جانے کی اتنی جلدی کیوں ہے؟" وہ بولا۔ "یہ تنہائی تو قسمت سے ہی میسر آئی ہے۔ کیا ہم اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔"

"کیسا فائدہ"

"اپنے دل کے ارمان پورے کرنے کا۔"

"نصرت صاحب!" میں نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے جواب دیا۔ "ابھی تک ہمارا تعلق دوستی کی حد تک ہے۔ آپ نے کبھی نہیں بتایا کہ اس تعلق کے حوالے سے آپ کے دل میں کچھ ارمان بھی موجود ہیں۔"

"تو اب بتائے دیتا ہوں کہ مجھے تم سے بے پناہ محبت ہے۔" نصرت پُرجوش لہجہ میں بولا۔ "میں تمہیں اپنا بنانا چاہتا ہوں۔"

"اس نظرِ عنایت کا شکریہ۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "مگر اپنانے کے کچھ طور طریقے ہوتے ہیں۔"

"کیوں نہیں۔ میں تم سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"یہ جاننے کے باوجود کہ مجھے منحوس سمجھا جاتا ہے اور اب تک میرے دو امیدواروں کا کیا حشر ہو چکا ہے۔"

"میں ان بیکار باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔"

"بڑی خوشی کی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن آپ اپنے دعوے میں سچے ہیں تو پھر باقاعدہ پیام دیجیے۔"

"پیام بھی ضرور دوں گا۔" نصرت نے پھر ہاتھ بڑھایا۔ "لیکن جب ہم شادی کا فیصلہ کر ہی چکے ہیں تو پھر تھوڑی سی بے تکلفی میں کیا نقصان ہے۔ میں نہ جانے کب سے تمہارے لیے تڑپ رہا ہوں۔ آج قسمت سے تنہائی کا موقع ملا ہے تو اسے ضائع کرنا نہیں چاہتا۔"

اس نے زبردستی مجھے اپنی آغوش میں لینا چاہا مگر میں تڑپ کر اس کی گرفت سے آزاد ہو گئی۔

"آپ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں تو مجھے بھی کوئی انکار نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں شادی سے قبل ایسی بے تکلفی کی قائل نہیں ہوں۔ آپ واقعی مجھے اپنانا چاہتے ہیں تو اس کے لیے جائز طریقہ اختیار کریں۔"

"جب میں تم سے شادی کا فیصلہ کر ہی چکا ہوں تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کچھ پہلے یا کچھ بعد سے کیا فرق پڑ سکتا ہے۔"

"آپ کے لیے نہ سہی مگر مجھے بہت فرق پڑ سکتا ہے۔"

"تم اس وقت میرے گھر میں ہو۔ میں زبردستی بھی کر سکتا ہوں۔"

"مجھے زبردستی کا جواب دینا آتا ہے مگر میں بات بڑھانا نہیں چاہتی۔ میں جا رہی ہوں۔"

میں نے اپنا پرس اٹھایا اور گھوم کر دروازے کی طرف چلی، نصرت نے میرا راستہ روک لیا۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر میرا بازو پکڑ لیا۔ اسی کے ساتھ میں نے سیدھے ہاتھ سے اس کے منہ پر ایک بھرپور تھپڑ رسید کر دیا۔

"اب اگر آپ نے کوئی اور حرکت کی تو میں چیخ چیخ کر پورے محلے کو اکٹھا کر لوں گی۔"

"اس میں رسوائی کس کی ہوگی؟" نصرت نے غصے سے کہا۔

"مجھے جھوٹی رسوائی کی کوئی پروا نہیں۔" میں نے بھی تیزی سے جواب دیا۔ "میں آپ کے بارے میں سنجیدگی سے

کچھ سوچنے لگی تھی۔ مگر آپ کی اس حرکت نے ثابت کر دیا کہ آپ ایک ہوس کار شیطان کے علاوہ اور کچھ نہیں ہیں۔ آئندہ آپ مجھ سے بات کرنے کی بھی کوشش نہ کریں ورنہ آج جو کچھ ہوا ہے میں اسے رضیہ صاحبہ کے کانوں تک پہنچانے میں کوئی تامل نہیں کروں گی۔ میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں جنہیں بدنامی کے خوف سے ڈرا کر چپ چاپ لوٹ لیا جاتا ہے۔" اتنا کہہ کر میں تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ نصرت کو کسی ایسی لڑکی سے شاید پہلی مرتبہ سابقہ پڑا تھا کہ اس نے پھر میرا راستہ روکنے کی کوشش نہیں کی۔

☆☆☆

ایک مرتبہ پھر نصرت کا اسکول آنا جانا تقریباً بند ہو گیا۔ شاید وہ میری اس دھمکی سے ڈر گیا تھا کہ میں سب کچھ رضیہ کو بتا دوں گی۔ ذاتی طور پر مجھے اس کی اس ذلیل حرکت سے بہت صدمہ ہوا تھا۔ اس کے ظاہری برتاؤ کو دیکھ کر مجھے بڑی آس سی بندھ گئی تھی کہ شاید وہ مجھے ممانی کے گھر سے نجات دلانے کا ذریعہ بن جائے۔ میرے لیے اب اس ماحول میں سانس لینا بھی روز بروز مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا تھا۔ میں بالغ تھی، تعلیم یافتہ تھی۔ ایک طرح سے خود کفیل بھی تھی..... ممانی تو اٹھتے بیٹھتے بار بار طعنے دینے لگی تھیں کہ کسی کو اپنا یار بنا کر اس کے ساتھ بھاگ کیوں نہیں جاتی تاکہ تجھ سے اور تیری نحوست سے ہماری جان چھوٹے۔ مگر مجھ جیسی لڑکی کے لیے ... یہ بات اتنی آسان اور سادہ نہیں تھی۔ کئی مرتبہ میں نے سوچا کہ اخبار میں ضرورتِ رشتہ کے لیے اشتہار دے کر دیکھوں شاید کوئی ایماندار، مخلص اور بااصول آدمی مل جائے۔ مگر مجھے اندازہ تھا کہ میں یہ کام بھی کسی مخلص ہمدرد کے بغیر نہیں کر سکتی۔

ان ہی دنوں جبکہ میں اس گتھی کو سلجھانے میں بری طرح الجھی ہوئی تھی ایک دن رضیہ نے مجھ سے کہا کہ میں آج چھٹی کے بعد دفتر میں اس سے مل لوں، وہ کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتی ہے۔ نصرت والے والے کو مہینا بھر سے زیادہ ہو چکا تھا پھر بھی نہ جانے کیوں مجھے اس کا خیال آ گیا۔ سوچا کہ شاید میرا تھپڑ کھا کر نصرت کے سر چڑھا ہوا بھوت اتر گیا ہو، شاید وہ سچ مچ مجھے پسند کرتا ہو اور اپنی غلطی کا احساس کر کے اس نے مجھے جائز طریقے سے اپنانے کے لیے اپنی والدہ سے بات کی ہو اور پھر شاید اس کی والدہ نے رضیہ سے میری مرضی معلوم کرنے کے لیے کہا ہو۔ اگرچہ اپنی گندی فطرت کا مظاہرہ کر کے نصرت میری نظروں سے گر چکا تھا مگر آپ اس سے میری مجبوری کا اندازہ کر لیں کہ میں نے دل میں سوچ لیا تھا کہ اگر بات کچھ ایسی ہی نکلی تو میں ایک بار پھر سنجیدگی سے اس مسئلے پر غور کروں گی۔

لیکن رضیہ نے تو میری مشکل کا کوئی اور ہی حل تلاش کیا تھا۔ میں اس کے دفتر میں داخل ہوئی تو اس نے ایک ہمدردانہ مسکراہٹ سے میرا استقبال کیا۔

"بیٹھ جاؤ زرینہ" وہ بولی۔ "مجھے آج تم سے ایک بہت ہی اہم موضوع پر بات کرنا ہے اور میں چاہتی ہوں کہ میری تمام باتیں سن کر تم عجلت میں کوئی فیصلہ نہ کرو بلکہ انتہائی ٹھنڈے دل و دماغ سے ہر پہلو پر غور کر کے کوئی رائے قائم کرو۔"

اس آغازِ گفتگو سے مجھے کچھ اور یقین ہو گیا کہ شاید میرا اندازہ درست ہے۔

"آپ فرمائیے۔ میں پوری توجہ سے سن رہی ہوں۔"

"مجھے تمہارے گھر کے حالات کا علم ہے۔" رضیہ نے نرمی سے کہا۔ "اور تمہارے صبر و ہمت کی داد دیتی ہوں کہ اس انتہائی نامناسب بلکہ غیر انسانی سلوک کے باوجود جو اس گھر میں تمہارے ساتھ روا رکھا جا رہا ہے تم ابھی تک اپنے ہوش و حواس بحال رکھنے میں کس طرح کامیاب رہی ہو۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تمہاری کمائی پر قبضہ کرنے کے باوجود تمہاری ممانی ہر قیمت پر تم سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہیں۔ شاید ان کا بس چلے اور قانون سے ملنے والی سزا کا خوف نہ ہو تو وہ تمہیں جان سے مارنے سے بھی گریز نہ کریں۔ ایسی صورت میں کچھ بعید نہیں کہ وہ تمہیں ایک بار پھر کسی اندھے کنوئیں میں دھکا دینے کی کوشش کریں اور تم محض اس ماحول سے جان بچانے کے لیے دانستہ اس کنوئیں میں کود پڑو۔ ان حالات میں میرے نزدیک تمہیں یہ حق ہی نہیں پہنچتا بلکہ تمہارا فرض بن جاتا ہے کہ خود اپنی زندگی کا راستہ متعین کرنے کی کوشش کرو۔ کیا یہاں تک تمہیں میرے خیالات سے اتفاق ہے۔"

"آپ نے بالکل درست اندازہ لگایا ہے۔" یہ ہمدردانہ گفتگو سن کر میری آواز رندھ گئی۔ "مگر میں ایک تنہا اور بے سہارا لڑکی ہوں اپنے طور پر کچھ کرنا بھی چاہوں تو کیا کر سکتی ہوں۔"

"اس لیے میں نے تمہاری مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" رضیہ نے جواب دیا۔ "یہ مت سوچنا کہ میں نے جو حل بہت غور و فکر کے بعد طے کیا ہے وہ تمہاری مجبوری سے فائدہ اٹھانے کی ایک اور کوشش ہے۔ اپنے حالات تم مجھ سے بہتر

WWW.PAKSOCIETY.COM

جانتی اور سمجھتی ہو۔ان حالات میں اگر تم تھوڑے سے ایثار سے کام لوتو خدا نے چاہا تو تمہاری قسمت یکسر بدل سکتی ہے۔"

"آپ کیسی باتیں کررہی ہیں۔ میں آپ کو اس دنیا میں اپنا واحد ہمدرد اور غمگسار خیال کرتی ہوں اگر آپ نے مجھے زندگی سے لڑنے کا حوصلہ اور سہارا نہ دیا ہوتا تو شاید میں اب تک خودکشی کر چکی ہوتی۔ آپ بلا جھجک اپنی بات مکمل کریں۔ رہا ایثار کا سوال تو میں زندگی کے اس دوراہے پر کھڑی ہوئی ہوں کہ ڈوبنے سے بچنے کے لیے کسی تنکے کے سہارے کو بھی غنیمت خیال کروں گی۔ تقدیر نے مجھے اس قابل ہی نہیں رکھا ہے جہاں میں کسی فیصلے کے لیے برابر کی سطح پر معاملہ کرنے کے بارے میں سوچ بھی سکوں۔"

"نہیں اب ایسی بات بھی نہیں ہے۔" رضیہ مسکرائی۔ "اپنے آپ کو اتنا حقیر بنا کر مت سوچو۔ تمہارے اندر وہ خوبیاں ہیں کہ اگر بدقسمتی سے تمہاری نام نہاد نحوست کو اتنی شہرت نہ دی جاتی تو آج ایک سے ایک بہتر امیدوار تمہارے دروازے پر دستک دے رہا ہوتا۔ اور میں نے اپنے طور پر جس شخصیت کا انتخاب کیا ہے وہ بھی انسانی قدروں کے ہر معیار پر پورا اترتا ہے۔"

رضیہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوگئی جیسے سوچ رہی ہو کہ مزید گفتگو کے لیے بہتر آغاز کیا ہوسکتا ہے۔ میں کچھ بڑھتے ہوئے اضطراب کے ساتھ اس کے بولنے کی منتظر تھی۔

"میں ایک بہت ہی شریف اور اعلیٰ اخلاقی قدروں کے مالک خاندان سے واقف ہوں۔" آخر اس نے کہنا شروع کیا۔ "دنیاوی اعتبار سے بھی وہ ایک معزز اور دولت مند خاندان ہے۔ یوں تو دور اور نزدیک کے بہت سے رشتے دار ہیں مگر وہ گھرانا خود صرف چار افراد پر مشتمل ہے۔ ایک ماں، ایک بھائی اور دو بہنیں۔ دونوں بہنوں کی شادیاں ہوچکی ہیں اور وہ اپنے اپنے گھروں میں شاد و آباد ہیں۔ دوسری وسیع جائیداد کے علاوہ ان کی ایک بڑی مشین ساز فیکٹری بھی ہے جس کا انتظام بھائی اپنے جنرل منیجر کی مدد سے سنبھالتا ہے۔ بھائی کا نام ادریس ہے۔ مکینکل انجینئرنگ میں بی اے ہے۔ خوبصورت ہے، اچھی عادات اطوار کا مالک ہے۔ عمر تقریباً پینتیس سال کے لگ بھگ ہے۔ اس کے لیے خاندان میں اور خاندان سے باہر بہت سے لوگ آس لگائے بیٹھے تھے مگر تقدیر کا انقلاب اگر جھونپڑیوں اور کچے مکانوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے تو کوٹھیاں اور بنگلے بھی اس کی زد سے نہیں بچ پاتے۔ دو سال قبل ادریس کی آنکھیں دکھنے لگیں۔ اس نے کوئی خاص پروا نہیں کی۔ تکلیف بڑھی تو ایک ڈاکٹر کو دکھا کر دوا لے لی۔ مگر یا تو ڈاکٹر نے ہی غلط دوا دے دی تھی یا پھر اس دوا میں ہی کوئی خرابی پیدا ہوچکی تھی کہ ایک دو بار کے استعمال سے ادریس اپنی بینائی کھو بیٹھا۔ تب سے اب تک ہر قسم کا علاج کیا جاچکا ہے مگر آنکھوں کی روشنی واپس نہیں آئی۔ کچھ ڈاکٹروں نے آپریشن کا مشورہ بھی دیا مگر وہ بھی کامیابی کے بارے میں پُرامید نہیں تھے۔ تقریباً تمام ہی ماہر امراضِ چشم اس بات پر متفق ہیں کہ غلط دوا نے آنکھ کے عدسے کو ہی ناکارہ نہیں کردیا بلکہ آنکھ اور دماغ سے تعلق رکھنے والی نازک نسوں کو بھی نقصان پہنچایا ہے اور چونکہ اس نقصان کے بارے میں کوئی صحیح اندازہ نہیں لگایا جاسکتا اس لیے آپریشن کی کامیابی بھی مشکوک ہے۔ اب تم سمجھ سکتی ہو کہ اس المناک حادثے نے کس طرح ادریس کی زندگی کو متاثر کیا ہوگا۔ شروع میں تو وہ شادی پر ہی آمادہ نہیں تھا کہ اپنے ساتھ کسی دوسرے فرد کی زندگی کیوں برباد کرے۔ مگر اس کی ماں اور پھر میں نے اسے سمجھا بجھا کر راضی کرلیا ہے۔ اس کے لیے رشتے اب بھی مل سکتے ہیں کیونکہ لوگ دولت کے لالچ میں اس کے اندھے پن کو نظرانداز کردیں گے۔ لیکن ادریس کا کہنا ہے کہ وہ کسی ایسی لڑکی سے شادی کرے گا جسے اس کی دولت کا لالچ نہ ہو جو انسانیت، خلوص، ہمدردی اور غمگساری کے جذبات کے تحت اس کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو۔ اچانک مجھے تمہارا خیال آیا۔ میں نے ادریس اور اس کی ماں کو تمہارے بارے میں سب کچھ بتادیا۔ وہ لوگ رشتہ دینے کے لیے آمادہ ہیں اور میرا اپنا خیال بھی یہی ہے کہ تم دونوں ایک دوسرے کی محرومیوں کا ازالہ بن سکتے ہو مگر ادریس نے اصرار کیا کہ رشتہ دینے سے پہلے میں تمہاری مرضی معلوم کرلوں۔ اب بتاؤ تم کیا کہتی ہو؟"

جیسا کہ میں نے بتایا اور میری آپ بیتی پڑھنے والے بھی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میں اپنا کوئی من پسند انتخاب کرنے کی پوزیشن میں ہی نہیں تھی۔ پیاس سے جاں بہ لب آدمی روح افزا مشروبات کے خواب نہیں دیکھتا اسے تو اپنی جان بچانے کے لیے پانی کے چند گھونٹ درکار ہوتے ہیں چاہے وہ پانی گرم ہی کیوں نہ ہو۔ اور ادریس صاحب تو مجھے اپنے حق میں آبِ حیات محسوس ہورہے تھے۔ رضیہ کا خیال درست تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی محرومیوں کا ازالہ کرسکتے تھے۔ مگر اب نہ جانے کیوں مجھے خود بھی اپنی تقدیر

سے ڈر لگنے لگا تھا۔

"کہیں میری نحوست سے ادریس صاحب کو بھی کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔" بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔

"کیا جاہلوں جیسی بات کرتی ہو۔ اب تک جو کچھ ہوتا رہا ہے وہ محض ایک سوئے اتفاق تھا اور اگر تم ایسی ہی منحوس ہو تو آج تک تمہارے ماموں، ممانی اور ان کے سب بچے کیوں اس نحوست سے محفوظ ہیں۔ خدا نے چاہا تو کچھ نہیں ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ بالآخر تمہاری زندگی ایک خوشگوار انقلاب سے دوچار ہونے ہی والی ہے۔"

☆☆☆

ادریس کی والدہ اور رضیہ باقاعدہ رشتہ لے کر ہمارے گھر آئیں تو ممانی کی حیرت دیکھنے کے قابل تھی۔ انہوں نے پہلے تو یہ کوشش کی کہ میری نحوست کی داستانیں سنا کر انہیں میرے بجائے اپنی بیٹی عشرت کو بہو بنانے پر آمادہ کرلیں۔ لیکن جب ادریس کی والدہ نے صاف کہہ دیا کہ وہ صرف اور صرف زرینہ سے ہی اپنے بیٹے کی شادی کرنا چاہتی ہیں تو ممانی نے بوڑھے شاہنواز کی طرح ادریس کی ماں سے بھی میرا سودا کرنے کی کوشش کی۔ اپنی غربت اور تنگدستی کا رونا رویا کہ وہ بھانجی کو قاعدے کا جہیز بھی نہیں دے سکتیں۔ رضیہ نے جواب دیا کہ ہمیں جہیز کی ضرورت بھی نہیں ہے اس پر ممانی نے اشاروں کنایوں سے یہ جتانے کی کوشش کی کہ وہ مفلسی کے باوجود یتیم و یسیر بھانجی کو سرپرستی میں لے کر اب تک اس کی تعلیم و تربیت اور پرورش پر کتنا کچھ صرف کرچکی ہیں۔ غنیمت یہ ہوا کہ ماموں شاید ان کے عندیہ کو تاڑ گئے اور انہوں نے درمیان میں ہی ٹوکتے ہوئے ادریس کی والدہ کو جواب دے دیا کہ یہ رشتہ انہیں ہر اعتبار سے مناسب و معقول معلوم ہوتا ہے مگر یہ کہ وہ ایک دو دن میں سوچ کر جواب دیں گے۔

☆☆☆

میں دوسرے کمرے میں ممانی کی خودغرضانہ باتیں سن سن کر پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ صبر و ضبط کرنے کے بجائے میرا جی چاہ رہا تھا کہ انہیں ایسا دوٹوک جواب دوں کہ ان کا منہ بند ہوجائے۔ رضیہ اور ادریس کی والدہ رخصت ہوئیں تو میں غصّے سے بپھری ہوئی ممانی کے پاس پہنچی۔

"آپ نے اب تک جو کچھ میرے ساتھ کیا وہ میں نے صبر سے برداشت کرلیا۔" میں بولی "برداشت کی بھی

پیرس کا ہوٹل

ہوٹل مالار کو پیرس کا ملہاری ہوٹل کہہ لیجیے تو مضائقہ نہیں۔ وہی ہیئت، وہی شوکت، وہی شانِ دلآرائی، یہاں ہمیں گھر کا سا آرام میسر ہے۔ اس کے غسل خانے میں ہمارے گھر کی طرح پانی کم کم آتا ہے۔ بلب کی روشنی خاص طور پر اس لیے دھیمی رکھی گئی ہے کہ کوئی راتوں کو پڑھ پڑھ کے اپنی آنکھیں خراب نہ کرے۔ باتھ روم ایسی تنگنائے غزل ہے کہ ہم نے فوارہ کھول تو لیا لیکن بدن پر پانی نہ لگا سکے کیونکہ ہمارے قارئین میں سے جو صاحبان کبھی نہائے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ صابن لگانے کے لیے کہنیوں اور گھٹنوں کو حرکت دینی پڑتی ہے اور اس حمام باد گرد کی دیواریں اس قسم کی عیاشی اور خوش فعلی کی گنجائش نہیں رکھتیں۔ ایک اور بات اس ہوٹل میں ہمارے گھر کی سی ہے کہ یہاں کوئی ہماری بات نہیں سنتا، سنتا ہے تو سمجھتا نہیں اور سمجھتا ہے تو جواب نہیں دیتا۔

اقتباس: ابن انشاء "آوارہ گرد کی ڈائری"

انتخاب: احتشام احسان قریشی

ایک حد ہوتی ہے۔ پچھلے چھ سات ماہ سے آپ نے مجھے عملاً گھر سے نکالنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ اب جبکہ آپ کی دلی خواہش پوری ہورہی ہے تو آپ یہ دیکھ کر کہ وہ لوگ دولت مند ہیں ان سے بھی میری قیمت وصول کرنا چاہتی ہیں۔ مگر اب آپ نے دخل در معقولات کیا تو میں خاموش نہیں رہوں گی، میں دنیا کو بتاؤں گی کہ کس طرح آپ نے شاہنواز سے جھوٹ بول کر مجھے اس کے ہاتھ پچیس ہزار میں فروخت کرنے کی کوشش کی تھی جس میں سے دس ہزار آپ نے وصول بھی کرلیے تھے مگر چونکہ شاہنواز کے عزیزوں کو اس لین دین کا علم نہیں تھا اس لیے کسی نے آپ سے اس رقم کی واپسی کا مطالبہ نہیں کیا۔ آپ نے اب تک سوائے ظلم و زیادتی کرنے کے میرے ساتھ کیا کیا ہے۔ اور یہ جو آپ پالنے پرورش کرنے کا احسان جتاتی ہیں تو ذرا اس کا حساب بھی دیں کہ میرے ابو کے انتقال کے بعد جو اُن کے واجبات اور فنڈ کے ہزاروں روپے ملے تھے وہ کہاں گئے۔ آپ بیس بائیس برس سے جس مکان میں بغیر

WWW.PAKSOCIETY.COM

کسی کرائے کے مقیم ہیں وہ بھی میرے ابو کا ہے اور ان کے بعد اس کی وارث میں ہوں۔ میں چاہوں تو قانونی کارروائی کر کے آپ سے یہ گھر خالی کرا سکتی ہوں۔ میرے صبر کو مزید مت آزمایئے جو کچھ ہو رہا ہے اسے ہونے دیجئے ورنہ اب میں خاموش نہیں رہوں گی۔"

ممانی اس طرح حیرت سے آنکھیں پھاڑے میری طرف دیکھ رہی تھیں جیسے انہیں اپنے کانوں اور آنکھوں پر یقین نہ آ رہا ہو۔ شاہنواز اور پچیس ہزار کے سودے کا ذکر سن کر ان کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ ابو کے فنڈز اور مکان کے تذکرے نے ان کے تمام کس بل ڈھیلے کر دیے۔ وہ ایک گہری سانس لے کر چپ چاپ اٹھ گئیں۔ وہ اس کے علاوہ اور کچھ کر بھی نہیں سکتی تھیں۔ کیونکہ ان کے پاس میرے سوالات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

☆☆☆

خدا کا شکر ہے کہ میری اور ادریس کی شادی بغیر کسی ناخوشگوار واقعہ کے پیش آئے، بہت سادگی اور خوش اسلوبی کے ساتھ ہوگئی.... وہ ہر اعتبار سے ایک محبت کرنے والے ہمدرد مخلص اور غمگسار شوہر ثابت ہوئے۔ زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے احساس ہوا کہ میں اتنی بدبخت بھی نہیں ہوں جتنا اب تک مجھے سمجھا جاتا رہا تھا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے مجھے اب تک اپنے اوپر کی جانے والی زیادتیوں کا صلا مل گیا ہو۔ لیکن ابھی تقدیر میں مزید کچھ آزمائشیں لکھی ہوئی تھیں۔ شادی کو چند ہفتے ہی گزرے تھے کہ ایک شام دفتر سے واپسی پر میں نے ادریس کے ساتھ نصرت کو بھی گھر میں داخل ہوتے دیکھا۔

"ان سے ملو زرینہ" ادریس نے کہا۔ "یہ نصرت صاحب ہیں میرے چند عزیز دوستوں میں سے ایک۔"

نصرت میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھ رہا تھا اور اس کے ہونٹوں پر ایک عیارانہ مسکراہٹ رقصاں تھی۔

"اس تعارف کی چنداں ضرورت نہیں ہے ادریس صاحب۔" وہ بولا۔ "میں اور زرینہ صاحبہ ایک دوسرے سے بہ خوبی واقف ہیں۔ اور اس میں تعجب کی بھی کوئی بات نہیں۔ آپ جانتے ہوں گے کہ زرینہ میری بہن رضیہ کے اسکول میں پڑھاتی رہی ہیں۔ ہماری پہلی ملاقات وہیں ہوئی تھی۔"

"اوہ..... واقعی، مجھے تو اس کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔" ادریس نے جواب دیا۔ "زرینہ ذرا ملازمہ سے چائے کے لیے کہہ دو اور تم لوگ بیٹھ کر باتیں کرو، میں لباس تبدیل کر کے ابھی آتا ہوں۔"

"ٹھہریے میں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔" میں نے کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔ میں اپنے کمرے تک کسی کی مدد کے بغیر بھی جا سکتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تم نے اپنے معمول کے مطابق میرے کپڑے نکال کر پلنگ پر رکھ دیے ہوں گے۔"

وہ چلے گئے۔ میں ملازمہ سے چائے کے لیے کہہ کر واپس آئی تو نصرت بڑی ڈھٹائی سے میرے برابر ہی صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔

"مجھے تمہاری اور ادریس کی شادی کا علم تھا۔" وہ بولا۔ "اور میں چاہتا تو ادریس کو اپنے اور تمہارے تعلقات کے بارے میں بتا کر یہ شادی رکوا سکتا تھا مگر میں نے دانستہ ایسا نہیں کیا۔ جانتی ہو کیوں، صرف اس لیے کہ تمہیں اپنانے کے لیے مجھے ایک آڑ کی ضرورت تھی۔ میں اب بھی تمہیں چاہتا ہوں، تمہیں حاصل کرنے کی خواہش اب بھی میرے دل میں مچل رہی ہے۔ مجھے امید ہے کہ اب تمہیں بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا کیونکہ ایک شوہر کی موجودگی میں ہمارے تعلقات کا کوئی نتیجہ رسوائی کا باعث نہیں بن سکتا۔"

"بکواس بند کرو۔" میں نے غصے سے کہا۔ "مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ تم اس قدر گندی ذہنیت کے مالک ہو سکتے ہو۔ میرے اور تمہارے درمیان اگر کبھی کوئی واجبی سا تعلق تھا بھی تو میں تمہاری ذلیل فطرت سے آگاہ ہونے کے بعد اسے ختم کر چکی ہوں۔"

"اتنی جلدی کوئی فیصلہ مت کرو۔" نصرت نے جواب دیا۔ "میں چاہوں تو اب بھی تمہیں ادریس کی نظروں سے گرا سکتا ہوں بس ذرا رنگ آمیزی کے ساتھ اسے تمہارے کچھ جھوٹے رومان سنانا کافی ہوں گے۔ ملازمت کرنے والی لڑکیوں کے بارے میں یوں بھی کوئی اچھی رائے نہیں رکھتا۔ پر تم تو میرے ساتھ باقاعدہ کیفوں اور ریستورانوں میں جاتی رہی ہو۔ وہاں کے بیروں اور ویٹروں نے تمہیں میرے ساتھ دیکھا ہے۔ ضرورت پڑنے پر میں ادریس کے سامنے ان کی گواہی بھی پیش کر سکتا ہوں۔ تھوڑی سی بخشش ان کی زبان سے یہ کہلوا سکتی ہے کہ تمہارے ساتھ آنے والے مختلف اوقات میں مختلف ہوتے تھے۔ وہ میں ہرگز نہیں تھا۔"

میں خوفزدہ ہوگئی۔ نصرت جیسے آدمی سے کچھ بھی بعید

WWW.PAKSOCIETY.COM

نہیں تھا۔ ممکن ہے ابھی وہ صرف دھمکی دے رہا ہو لیکن جو کچھ اس نے کہا تھا وہ اس کے لیے عملاً کر گزرنا کچھ ایسا زیادہ مشکل بھی نہیں تھا۔

''آخر تم کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔ مجھے برباد کر کے تمہیں کیا ملے گا۔'' میں نے بے بسی سے کہا۔

''تم اور تمہارا حسن و شباب۔'' نصرت ایک شیطانی مسکراہٹ سے بولا۔

''اس خام خیالی کو ذہن سے نکال دو'' میں نے مضبوط لہجے میں جواب دیا ''میں تمہاری چیرہ دستیوں سے نمٹنے کے لیے اپنی جان بھی دے سکتی ہوں اور اسے محض دھمکی مت سمجھنا۔''

''میں انتہائی صبر سے مناسب وقت کا انتظار بھی کر سکتا ہوں۔'' نصرت نے دفعتاً سنجیدگی سے کہا۔ ''ابھی تمہارے خیالات یہ ہیں تو کوئی بات نہیں، تم ایک دوسرے انداز سے میرے کام آسکتی ہو۔''

''وہ کیا؟''

''اگر تم چاہتی ہو کہ تمہاری گھریلو اور ازدواجی زندگی خوشگوار بنی رہے اور میں ادریس کو تمہاری طرف سے بدگمان نہ کروں تو تمہیں میری زبان بند رکھنے کے لیے کم سے کم پانچ ہزار روپیہ ماہانہ ادا کرنا ہوں گے۔''

میں کچھ جواب نہیں دینے پائی تھی کہ ادریس لباس تبدیل کر کے واپس آگئے۔ کچھ ہی دیر میں ملازمہ چائے بھی لے آئی۔ نصرت نے اِدھر اُدھر کی باتیں چھیڑ دیں مگر اس کی ہوس ناک نظریں مستقل مجھ پر گڑھی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر کے بعد وہ چلا گیا لیکن دوسرے ہی دن جبکہ ادریس آفس گئے ہوئے تھے مجھے اس کا فون ملا۔ گزشتہ شام سے میں مسلسل اس کے مطالبہ پر غور کر رہی تھی۔ مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ چاہے تو اپنی لچھے دار باتوں اور نام نہاد جھوٹے گواہ پیش کر کے ادریس کو مجھ سے بدگمان کر کے میری زندگی میں زہر گھول سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ جب تک میں اس کی چالبازیوں کا کوئی توڑ نہ سوچ لوں اس کا منہ بند رکھنا ضروری ہے۔ شادی کے سلسلے میں سلامی اور منہ دکھائی وغیرہ کی کافی رقم میرے پاس بھی پھر ادریس بھی دو ہزار روپے صرف میرے جیب خرچ کے نام سے مجھے دے رہے تھے۔ میں چند ماہ تک تو اس مصیبت کو ٹال ہی سکتی تھی۔ چنانچہ میں نے فون پر نصرت سے کہہ دیا کہ میں اسے پانچ ہزار روپے ماہانہ دینے پر تیار ہوں۔

☆☆☆

یہ سلسلہ تین ماہ تک چلتا رہا۔ اس دوران نصرت دو تین مرتبہ ادریس کے ساتھ گھر بھی آیا۔ میں نے اسے کئی سے منع کر دیا تھا کہ وہ بھی ادریس کی عدم موجودگی میں نہ آئے اس لیے رقم کی ادائیگی بھی ان ہی مواقع پر ہوتی رہی۔ پھر ایسا اتفاق ہوا کہ ادریس کو اپنی فیکٹری کے سلسلے میں کسی ضروری کام سے باہر جانا پڑا۔ یا یوں کہنا چاہئے کہ انہوں نے مجھے یہی بتایا تھا کہ اپنے جنرل منیجر کے ہمراہ فیکٹری کے ایک ضروری کام سے باہر جا رہے ہیں اور تقریباً پندرہ دن میں واپس آئیں گے۔ شادی کے بعد گھر کا جملہ انتظام رفتہ رفتہ میرے سپرد کر کے ادریس کی ماں یا تو اپنے کمرے میں آرام کرتی رہتی تھیں (وہ ہائی بلڈ پریشر اور جوڑوں کے درد کی مریض بھی تھیں) یا ہفتہ عشرے کے لیے اپنی بیٹیوں کے گھر چلی جاتی تھیں۔

نصرت نے اس تنہائی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے ایک دو مرتبہ خود کو جبراً مجھ پر مسلط کرنے کی کوشش کی مگر اب میں اپنا دفاع کرنا سیکھ گئی تھی۔ میں نے ہر وقت اپنے ہینڈ بیگ میں ادریس کا ریوالور رکھنا شروع کر دیا تھا ایک مرتبہ نصرت کی پیش دستی میری مزاحمت کے مقابلے میں زیادہ طاقتور ثابت ہونے لگی تو میں نے جھپٹ کر اپنے بیگ سے ریوالور نکال کر نصرت پر تان لیا اور وہ کسی خوفزدہ خرگوش کی طرح سہم کر رہ گیا۔

''اگر تم فوراً ہی دفع نہیں ہو گئے تو میں اسے استعمال کرنے سے نہیں ہچکچاؤں گی پھر چاہے مجھے پھانسی کے تختے پر ہی کیوں نہ چڑھنا پڑے۔''

نصرت چپ چاپ چلا گیا۔ دوسری مرتبہ بدقسمتی سے وہ اس وقت آدھمکا جب میں غسل کر کے باتھ روم سے باہر آرہی تھی اور میرا بیگ دوسرے کمرے میں رکھا تھا۔ مگر حسنِ اتفاق سے اسی وقت ملازمہ کمرے میں داخل ہوئی، وہ مجھ سے دوپہر کے کھانے کے سلسلے میں ہدایات لینے آئی تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور اس کے ساتھ ہی کچن میں چلی گئی۔ تیسرا موقع نصرت کو نہیں مل سکا کیونکہ پھر ادریس اپنے سفر سے واپس آگئے۔

ان ہی دنوں اتفاق سے میری بڑی نند کے یہاں بچہ پیدا ہونے والا تھا۔ ادریس کی والدہ اپنے اب تک کے معمول کے مطابق بیٹی کے گھر چلی گئیں۔ دوسری طرف میرے پاس جو نقد رقم موجود تھی وہ میں پچھلے چار ماہ میں

نصرت کے حوالے کر چکی تھی۔ اس نے اگلی قسط کے لیے فون کیا تو میں نے اپنی مجبوری بتائی۔ اس نے کہا کہ ابھی تو میرے پاس زیورات موجود ہیں انہیں فروخت کر دوں۔ ورنہ وہ اپنی دھمکی پر عمل کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ میں نصرت کی چیرہ دستیوں سے تنگ آچکی تھی۔ غصہ اور جھلاہٹ میں کہہ دیا کہ جو کچھ اس کا جی چاہے کرے مگر اب میں مزید بلیک میل ہونے کے لیے تیار نہیں ہوں۔

کئی دن گزر گئے نہ ہی نصرت نے کوئی دوسرا فون کیا اور نہ وہ رقم وصول کرنے گھر آیا۔ ادریس کا طرزِ عمل جب سے وہ سفر سے واپس آئے تھے کچھ بدلا بدلا سا تھا۔ اب وہ آفس میں زیادہ دیر تک بیٹھنے لگے تھے۔ گھر آتے تو کھانا کھاتے ہی بیڈ روم میں چلے جاتے کہ وہ تھکے ہوئے ہیں آرام کرنا چاہتے ہیں۔ ناشتے اور کھانے کی میز پر بھی بہت کم بات کرتے تھے۔ میں نے کچھ پوچھا تو اس کا مختصر سا جواب دے دیا۔ فطری طور پر مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں نصرت انہیں میرے خلاف بھڑکانے کی کوشش تو نہیں کر رہا ہے اس دوران کئی مرتبہ سوچا کہ میں از خود نصرت کے بارے میں سب کچھ بتا دوں۔ لیکن یہ سوچ کر رک گئی کہ اگر ادریس پوچھ بیٹھے کہ اب تک کیوں خاموش رہی تھیں تو میرا جواب کیا ہوگا۔ مردوں کے بارے میں سنا بھی تھا اور پڑھا بھی تھا کہ وہ عام طور پر شکی مزاج ہوتے ہیں۔ ادریس اپنی بہت سی باتوں میں عام مردوں سے بہت مختلف تھے مگر مجھے کچھ اندازہ نہیں کہ اس معاملے میں بھی وہ دوسروں سے مختلف ثابت ہوں گے یا نہیں۔ اب ان کے گھر کے علاوہ میرا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ خدا خدا کر کے ممانی کے ظلم و ستم سے نجات ملی تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میری کوئی بھی غلطی زندگی کو دوبارہ جہنم بنا دے۔

ایک دن نصرت صبح گیارہ بجے آدھمکا۔ ادریس دفتر جا چکے تھے۔ ملازمہ روزانہ کے لیے گوشت سبزی لینے بازار گئی ہوئی تھی۔ میں گھر میں بالکل اکیلی تھی۔ میرا اندازہ ہے کہ نصرت کو اس معمول کا علم تھا اس لیے اس نے اپنی آمد کے لیے یہی وقت زیادہ مناسب سمجھا تھا۔ میں کمرے میں داخل ہوئی تو وہ کرسی پر بیٹھا مسکرا رہا تھا۔

''اس وقت تم گھر میں بالکل تنہا ہو۔'' وہ بولا۔ ''آج تو اپنی پیاس بجھا کر ہی جاؤں گا۔''

میں نے اپنے بیگ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ نصرت نے ایک قہقہہ لگایا۔

''آج تمہارا ریوالور بھی تمہیں مجھ سے نہیں بچا سکے گا۔'' اس نے کہا۔ ''جب تم باتھ روم گئی تھیں تب ہی میں نے بیگ سے اسے نکال لیا تھا۔''

''میں شور مچا کر لوگوں کو جمع کر لوں گی۔''

''ضرور.. مگر رسوائی تمہاری ہوگی۔ میں محلے والوں کے آنے سے پہلے بھاگ جاؤں گا۔ پھر تم انہیں سمجھاتی رہنا کہ تم کیوں چیخی تھیں۔ ممکن ہے وہ تمہارے کسی بہانے سے مطمئن ہو جائیں مگر ادریس کبھی نہیں مانے گا۔ میں اسے گمنام فون کر کے پہلے ہی تم سے بدگمان کرتا رہا ہوں۔ اور اور ادریس نے تمہیں دھتکار دیا تو تم خود اندازہ لگا سکتی ہو کہ تمہارا کیا حشر ہوگا۔''

یہ کہتے ہی اس نے جھپٹ کر مجھے پکڑنا چاہا مگر میں بچ نکلی۔ کافی دیر تک کمرے میں یہ اچھل کود ہوتی رہی، میں ہانپنے لگی تھی۔ زیادہ دیر تک خود کو اس کی گرفت سے نہیں بچا سکی۔ اس نے مجھے دبوچ کر فرش پر گرایا ہی تھا کہ کمرے کے دروازے پر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے اور نصرت نے بہ یک وقت چونک کر دیکھا ادریس کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی نصرت مجھے اسی طرح فرش پر گرائے ہوئے چیخا۔

''یہ آپ کیا کر رہی ہیں زرینہ بھابی، چھوڑیے مجھے۔ آپ میرے عزیز دوست کی بیوی ہیں۔ آپ کی یہ اوچھی اور عامیانہ حرکات زیب نہیں دیتیں۔ ذرا سوچئے اور ادریس کو معلوم ہو جائے کہ اس کی پیاری بیوی کی جوانی اتنی دیوانی ہو گئی ہے کہ ہر کس و ناکس کو بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کی دعوت دیتی ہے تو اس کے دل پر کیا گزرے گی۔''

''کون ہے، کمرے میں کون ہے؟'' ادریس تیز لہجے میں بولے۔

''اوہ ادریس بھائی تم۔'' نصرت نے ابھی تک مجھے نہیں چھوڑا تھا۔ ''خدا کا شکر ہے کہ تم عین وقت پر آگئے۔ ورنہ آج غضب ہو جاتا۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا۔''

''میں کس زبان سے کہوں کہ زرینہ مجھے دعوتِ گناہ دے رہی تھی۔'' نصرت نے جواب دیا۔ ''شادی سے قبل ہم ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے مگر اس کی شادی تم سے ہو گئی تو میں نے اس کا خیال بھی دل سے نکال دیا مگر جب بھی میں آتا زرینہ مجھے اپنی جانب مائل کرنے کی کوشش کرتی.. اور آج تو اس نے انتہا کر دی۔ آتے ہی میرے گلے میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

بانہیں ڈال دیں اور پیار کرنے لگی۔ میں بھی آدمی ہوں فرشتہ نہیں۔ ممکن تھا بہک جاتا مگر تمہاری بروقت آمد نے مجھے گناہ اور شرمندگی دونوں سے بچالیا۔"

"یہ جھوٹ بک رہا ہے ادریس" میں نصرت کی گرفت سے خود کو آزاد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے چلائی۔ "ذلیل انسان مجھے بے عزت کرنا چاہتا تھا۔ اس نے شادی سے پہلے بھی کوشش کی تھی مگر میں نے اس کا جواب تھپڑ سے دیا تھا۔ اب یہ اپنی اسی ناکامی کا انتقام لے رہا ہے، خدا نے آپ کو عین وقت پر بھیج دیا۔ مجھے اس سے بچایئے اس نے اب بھی مجھے پکڑ رکھا ہے۔"

"میں نے تمہیں پکڑ رکھا ہے یا تم نے مجھے۔" نصرت نے مجھے چھوڑ دیا۔ "جھوٹ بولنے کی بھی حد ہوگئی۔"

"واقعی حد ہوگئی۔" ادریس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "اور قدم بڑھا کر نصرت کے منہ پر ایک تھپڑ رسید کردیا۔

نصرت کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ میں بھی تعجب سے منہ پھاڑے ادریس کو دیکھتی رہ گئی۔ آخر انہیں کیسے معلوم ہوا کہ نصرت کہاں کھڑا ہے... اور کھڑا ہے تو اس کا منہ کس طرف ہے۔

"کیوں حیرت ہوئی نا کہ ایک اندھا تمہیں تھپڑ کس طرح مار سکتا ہے۔" ادریس کی بات جاری تھی۔ "مگر اب میں اندھا نہیں ہوں، سب کچھ دیکھ سکتا ہوں۔ ابھی پچھلے دنوں میں بظاہر جو آفس کے کام سے پندرہ دن کے لیے باہر گیا تھا تو وہ کام آفس کا نہیں میرا ذاتی تھا۔ میں آنکھوں کا آپریشن کرانے گیا تھا جو خدا کا شکر ہے کہ کامیاب ہوا.... آج میں نے کمرے میں تمہاری صرف آوازیں ہی نہیں سنیں بلکہ ذلیل حرکات بھی دیکھ لیں۔ تم نے ہر چند گمنام رہ کر فون کیے تھے مگر میں تمہاری آواز پہچان گیا تھا۔ جس کے بعد سے میرا ایک آدمی مستقل تمہاری نگرانی کررہا تھا۔ تمہاری بکواس کے باوجود مجھے زرینہ کی بے گناہی کا یقین تھا۔ کیونکہ زرینہ کا تھپڑ کھانے کے بعد تم نے رضیہ سے کہہ کر اسے اسکول سے نکلوانے کی کوشش کی تھی۔ پچھلے ایک دو تجربوں کی وجہ سے رضیہ کو شک تھا کہ تم ان ہی استانیوں کی شکایت کرتے ہو جو تمہارے دام میں نہیں آتیں۔ اس نے الٹا تمہیں ڈانٹ کر اسکول آنے سے منع کردیا۔ پھر یہ جانتے ہوئے کہ میری تم سے دوستی ہے اس نے شادی سے پہلے ہی مجھے آگاہ کردیا تھا کہ کہیں تم اپنا انتقام لینے کی کوشش نہ کرو۔ چنانچہ تمہاری نگرانی میں اسی مقصد سے کرارہا تھا کہ تم زرینہ کو کوئی نقصان نہ پہنچاسکو اور اپنی آنکھوں کے آپریشن کے بارے میں بھی اسی لیے حقیقت چھپائی کہ ممکن ہے تم مجھے حسبِ سابق اندھا خیال کرتے ہوئے میرے سامنے کوئی ایسی حرکت کرجاؤ جو میرے لیے تمہاری ذلالت کا ثبوت بن جائے۔ آج تم خلافِ معمول صبح کے وقت اپنے گھر سے نکلے تو میرے آدمی نے مجھے فون کردیا۔ میں صرف ازراہِ احتیاط ہی گھر واپس آیا تھا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ آج کل زرینہ صبح کے وقت گھنٹہ دو گھنٹے کے لیے بالکل اکیلی ہوتی ہے اور مجھے شبہ تھا کہ کہیں تم اس تنہائی سے فائدہ اٹھانے نہ جارہے ہو۔ میرا اندازہ ٹھیک نکلا... اور میں نے اپنی آنکھوں سے تمہاری ذلیل فطرت کو بے نقاب ہوتے دیکھ لیا۔ اب اگر اپنی مزید مرمت کروانا نہیں چاہتے تو دفع ہوجاؤ اور آیندہ کبھی میرے یا زرینہ کے سامنے آنے کی کوشش مت کرنا۔"

نصرت کسی مار کھائے ہوئے کتے کی طرح سر جھکائے کمرے سے نکل گیا اور میں..... میری مسرت کا کیا ٹھکانا تھا۔ میرے خدا نے نہ صرف مجھے بے عزت ہونے سے بچایا بلکہ .... ادریس کی نگاہوں میں مجھے بے قصور ثابت کردیا اور ان کی آنکھوں کو روشنی دے کر میری زندگی میں ہر طرف اجالا ہی اجالا بکھیر دیا تھا۔

"کون کہتا ہے کہ تم منحوس ہو۔" ادریس نے مجھے اپنی آغوش میں سمیٹتے ہوئے کہا۔ "دیکھ لو تمہارے آنے سے میری بینائی بھی واپس آگئی اور میں اسے خدا کی رحمت کے علاوہ تمہاری محبت کی برکت بھی سمجھتا ہوں۔"

بعد میں معلوم ہوا کہ ادریس کا کچھ بدلا بدلا سا طرزِ عمل اس احتیاط کے پیشِ نظر تھا کہ کہیں میں ان کے کامیاب آپریشن کی حقیقت سے واقف نہ ہوجاؤں ... وہ چاہتے تھے کہ جب تک وہ نصرت کو رنگے ہاتھوں نہ پکڑ لیں اس خوش خبری کا انکشاف نہ کریں۔ ان دنوں اتفاق سے ان کے ایک ماہر امراضِ چشم دوست انگلینڈ سے چھٹیاں گزارنے آئے تھے انہوں نے ادریس کی آنکھوں کا معائنہ کیا تو فوراً آپریشن کی رائے دی اور خود آپریشن بھی کیا اور جیسا کہ انہیں توقع تھی آپریشن کامیاب ثابت ہوا۔ آخر میں یہ بتانے کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کہ میری زندگی کا آزمائشی کا دور ختم ہوچکا تھا اور اس کے بعد سے رحمت و برکت کا جو دور شروع ہوا وہ خدا کے فضل و کرم سے تاحال جاری ہے۔

ردّی والا

جناب ایڈیٹر سرگزشت

السلام علیکم!

ایک چشم کشا تحریر پیش خدمت ہے یہ شخص میرے لیے بہت بڑا محرک ہے لیکن ہم اسی تنزلی کا شکار معاشرے کا حصہ ہیں ناں! اس لیے اسے دیکھتے ہیں، اس کے کام کو سراہتے ہیں اور نظر انداز کردیتے ہیں۔ یہ ہماری وہ غلطی ہے جسے ہم اجتماعی غلطی کہہ سکتے ہیں، آپ بھی ملاحظہ کریں۔

ش۔فرحت خان

(کراچی)

میں آج خلافِ معمول دوپہر دو بجے کے قریب کالج سے واپسی میں اپنے گھر سے تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر موجود بس اسٹاپ پر اترا تو گرمی کی شدت کا احساس کچھ اور زیادہ محسوس ہوا کیونکہ کراچی میں مارچ کے آخری ہفتے میں گرمی نصف رنگ جما چکی ہوتی ہے اور پھر میں شاید اپنی بیتیس سالہ نوکری میں پہلی دفعہ اتنی جلدی دفتر سے واپس آیا تھا۔ یوں بھی یہ میری نوکری کا آخری دن تھا۔ کالج کے انچارج صاحب نے مجھے خود یہ آفر دی تھی کیونکہ آج مجھے اپنی جگہ متعین کردہ ایک جونیئر پروفیسر کو چارج دینا تھا۔ کالج سے روانگی کے بعد سے ہی میں آنے والے دنوں کے مسائل اور ان کے حل کے لیے ذہن میں بننے والے مختلف آئیڈیاز میں گم تھا اس لیے وقت کا اندازہ نہ ہوسکا لیکن جیسے ہی بس سے اترا ایک جانی پہچانی آواز نے اپنی طرف متوجہ کرلی۔

"لیا بھوسی ٹکڑے لیا، لیا ردّی پیپر لیا۔" یہ آواز روز میں صبح گھر سے نکلتے ہوئے سنتا تھا لیکن آج پہلی دفعہ مختلف ٹائم میں اور دن میں دوسری دفعہ سن رہا تھا یہ آواز جب میرے کانوں میں پہنچی تو میرے خیالاتِ پریشاں کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور بے اختیار روڈ پار اس شخص تک نظر اٹھ گئی وہی روزانہ کی طرح استری سے مبرّا سلوٹ شدہ کرتہ پاجامہ پہنے ہوئے تھا۔

لباس ہلکا میلا لیکن پاک ضرور ہوتا تھا کیونکہ اسے میں روزانہ پچھلے تقریباً پانچ سال سے انہی کپڑوں میں مسجد کے اندر فجر کی نماز ادا کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ سر پر چارخانوں والا بڑا رومال جو نماز کے دوران عمامہ کی طرح سر پر موجود ہوتا اور صبح جب میں اپنی ڈیوٹی پر نکلتا تو وہ عموماً کندھے پر اور سردیوں میں سر اور کانوں کو ڈھانپے اپنی مخصوص آواز کے ساتھ دکھائی دیتا۔ ماتھے پر نماز کا خدا کی طرف سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

دیا ہوا عطیہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ شخص پانچ وقت کی نماز باقاعدگی سے ادا کرتا ہے کیونکہ مجھے تو وہ فجر اور عشا میں مسجد میں نظر آتا تھا کیونکہ میں یہ دو وقت ہی مسجد میں نماز ادا کر پاتا تھا۔ ظہر کالج کی مسجد میں، عصر اور مغرب گھر میں ادا کرتا تھا وجہ دن بھر کی تھکن تھی جبکہ مسجد گھر سے بہت زیادہ دور بھی نہیں تھی اور اگر تھی بھی تو اس شخص کا گھر بھی تو میرے گھر کے سامنے کی سڑک کے دوسری طرف تھا بظاہر کچی آبادی جن میں ساٹھ گز سے زیادہ کوئی مکان نہیں تھا اور سب ٹینوں کی چھت کے تھے۔ میں نے خود یہ مکان اپنی نوکری کے بعد مشکل بچت کر کے قسطوں پر لیا تھا جس میں تین کمرے مع اٹیچ باتھ، کچن اور چھوٹا سا صحن بھی موجود تھا جہاں میری بچیاں شوقِ باغبانی کو حتی المقدور پورا کرتی تھیں۔ میرے اس چھوٹے سے آشیانے کو حسین بناتی تھیں لیکن ابھی مکان کی قسطیں ... باقی تھیں تقریباً ڈیڑھ سال کی جو کہ ڈھائی ہزار مہینا پڑتی تھیں لیکن اپنی چھت و زمین ہونے کا تصور ہی نہایت خوش کن تھا۔ میں نے چند سال اور نوکری کو وسعت دینے کی کوشش کی تھی لیکن کوئی شنوائی نہ ہونے کی وجہ سے میرے اچھے ریکارڈ کے باوجود پروانۂ رخصت تھما دیا گیا تھا۔ خیر بات کر رہا تھا میں بھوسی ٹکڑے والے کی۔ میں نے اس کے چہرے پر ہمیشہ ایک نامعلوم اطمینان ہی دیکھا تھا اور پھر مجھے کسی سے یہ بھی پتا چلا تھا کہ یہ شخص اکیلا ہی اس دنیا میں وقت گزار رہا ہے اور جس چھوٹے سے مکان میں وہ رہائش پذیر تھا وہ بھی کرائے کا تھا، تو پھر اس کے چہرے کا اطمینان اور ہر دم چہرے پر ایسا تاثر جیسے وہ اپنے خدا کا ہر ہر لمحہ شکر گزار ہو، مجھے بہت عجیب لگتا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ میں تین عدد جوان بیٹیوں کا باپ تھا اور جن میں سے ایک کا رشتہ اپنے ایک عزیز کے ہونہار بیٹے سے طے بھی کیا تھا لیکن میری نصف بہتر نے جو کچھ اس کے لیے جوڑا تھا وہ آج کل کے حساب سے میں نہیں سمجھتا تھا کہ کچھ ہے۔ ہاں اب گریجویٹی و دیگر واجبات کی مد میں تقریباً دس لاکھ مجھے ملنا تھے تو کیا وہ میں اپنی تینوں بیٹیوں کو اچھے اور مناسب طریقے سے اپنے گھر کا کرنے میں لگاؤں تو بہت تھے؟ نہیں مشکل تھا کیونکہ ابھی دو بیٹیاں تو زیرِ تعلیم بھی تھیں اور ان کا تو کوئی رشتہ بھی نہیں آیا تھا پھر اس کے بعد میں گھر کے خرچ کے لیے جو لگی بندھی تنخواہ سے محروم ہو رہا تھا وہ کیسے پورا کروں گا۔ یہ سب پریشانیاں گھر کی قسطوں کے علاوہ تھیں پھر چند مہینوں سے یوٹیلٹی بلز خاص طور پر بجلی اور گیس کے ہی مل کر تقریباً ڈیڑھ ہزار بن جاتے تھے۔ محلے اور خاندان کے کچھ لوگوں سے ادھار لے کر کوئی کاروبار کرنا بھی دشوار تھا۔ کسی کاروبار کا تجربہ نہیں تھا۔ ساری عمر کالج میں پڑھاتے ہوئے گزری تھی۔ اس کے علاوہ اب ادھار کون دیتا جب روزی کے آمد و ذرائع ہی اختتام پذیر ہو گئے تھے پھر آج کل ٹیوشن سینٹر اتنے کھل گئے تھے کہ مجھ جیسے ایک گورنمنٹ کالج کے ریٹائرڈ پروفیسر کو یہ نئی جنریشن کے اگر چند طالب علم مل بھی جاتے تو وہ کتنی فیس دیتے؟ اس سے اچھا وہ چند سو زیادہ دے کر نامی گرامی ایجوکیشن سینٹرز میں داخلہ لینا پسند فرماتے۔ اور بھی بہت سی مشکلات تھیں۔ غنیمت یہ تھا کہ میری بچیاں اب مقابلے کے امتحانات کی تیاریاں کر رہی تھیں کہ اس میں کامیابی کی بدولت حاصل کردہ وظیفے سے اپنی تعلیم کا بوجھ خود اٹھا لیں لیکن وہ ایک عام سے ریٹائرڈ پروفیسر کی اولاد تھیں اور وظیفے کے امتحان میں عموماً کامیابیاں ان لوگوں کی اولادوں کو ملتی ہیں جن کے والدین ان کی تعلیم کا بوجھ آسانی سے اٹھا سکتے ہیں اور اعلیٰ عہدوں پر بیٹھے ہوتے ہیں۔ خیر میری سوچوں کا رخ آج نہ جانے کیوں اس شخص کی طرف ہو کر پریشان کن سوچوں سے چھٹکارے کا سبب بن گئی تھیں۔ میں آج پہلی دفعہ تو اس کو دیکھ رہا نہیں رہا تھا لیکن مجھے کچھ حسد سی محسوس ہونے لگی کہ یہ شخص سارا دن ردی کاغذ، بھوسی ٹکڑے خرید کر چند روپے اوپر منافع کے عوض شام کو بڑے کباڑی کو دے کر کتنا کما لیتا ہوگا کہ اس کے چہرے پر ہمیشہ ایک اطمینان اور عجیب طرح کی آسودگی ہی دیکھی تھی۔ ایک میں کہ اس سے کہیں ہزار نہیں تو سو گنا زیادہ بہتر گھر کا تقریباً مالک اور اہم اور عزت دار نوکری جس کی مہینے کی تنخواہ شاید وہ چھ ماہ میں بھی نہ حاصل کر سکتا ہو یقیناً یہ شخص کوئی اور کام بھی کرتا ہوگا اور ظاہر ہے کہ وہ غیر قانونی ہوگا جبھی تو وہ سارا دن ٹھیلے کو کھینچنے کے بعد اور کہیں جاتا بھی نہیں تھا اور نہ ہی محلے میں زیادہ فارغ نظر آتا تھا حتیٰ کہ وہ تو اتوار والے دن بھی اپنے کام پر جاتا تھا۔ ہاں یہ مجھے پتا تھا کہ جمعے کے دن وہ دوپہر بارہ بجے کے بعد اپنا کام بند کر دیتا تھا اور پھر نماز جمعہ کے بعد سے مغرب تک مسجد میں وقت گزارتا تھا جس میں کبھی کبھار مسجد کے صحن کی جھاڑو، وضو خانے کی صفائی اس کے علاوہ مسجد کے چھوٹے موٹے الیکٹرک یا پلمبر کے کام بلا معاوضہ کرتا تھا۔ ارے دنیا کے سامنے تو نیک ہی ظاہر کرتا ہوتا ہے، میرے اندر سے آواز آئی کیونکہ میں تو مسجد کے امام سے بھی صرف سلام دعا کے علاوہ ہفتہ وار... چندہ جو کہ دس یا بیس روپے ہوتا تھا تک ہی تعلق رکھتا تھا۔ نماز کے علاوہ کیونکہ ڈیوٹی سے واپس آ کر دنیا کے جھمیلے

ہی وقت نہیں نکالنے دیتے تھے۔ مجھے تو یہ بھی یاد نہیں تھا کہ میرے اس محلے کی مسجد کا نیا موذن کب سے اس ڈیوٹی پر آیا ہے اور اس سے پہلے والا موذن کب اور کیوں چلا گیا۔ ہاں امام صاحب جو کہ محلے سے ہی تعلق رکھتے تھے وہ کافی پرانے تھے۔ ان سے میری سلام دعا کے علاوہ بہت کم بات چیت ہوئی تھی اور اب تو شاید ان سے بھی ... مسجد کے علاوہ کوئی تفصیلی بات چیت ہوئے کافی عرصہ گزر گیا تھا۔ آج .... بھی عصر تو نہیں لیکن مغرب میں مسجد پہنچ ہی گیا۔ پریشانی جو سر پر آتے محسوس ہو رہی تھی اللہ تو یاد آنا تھا۔ اتوار کے علاوہ آج کے دن محلے کے نمازیوں نے بھی جو بات محسوس کی ... وہ تھی میری مغرب میں موجودگی۔ میں حسبِ معمول اپنی سوچوں میں گم دنیا کے خیالات اور نئی پریشانیاں جو اوپر بیان کی ہیں ان میں الجھا ہوا تھا۔ کون سی سورۃ کس رکعت میں پڑھی پتا ہی نہیں۔ نفل کے بعد جب دعا کے لیے بیٹھا تو نہ جانے کیوں آج میری دعا کچھ طویل ہو گئی اور اس کا سبب آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ پھر ارد گرد سے بے نیاز دل بھر آیا۔ بے ساختہ آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ خیر یہ کیفیت زیادہ دیر نہیں رہی۔ دل اب گھر پر پڑا ہوا تھا۔ جب اٹھ کر گھر جانے کے لیے مسجد کے برآمدے کی طرف رخ کیا تو بے اختیار چونک گیا کیونکہ وہاں امام صاحب نئے موذن اور کچھ محلے کے پرانے نمازیوں کے ساتھ کھڑے ہوئے تھے اور ان کا انداز ایسا تھا جیسے وہ لوگ میرے فارغ ہونے کا انتظار کر رہے ہوں۔ میں نے بھی ہونٹوں پر زبردستی کی مسکراہٹ سجائی اور ان کی طرف بڑھا۔ خیال یہی تھا کہ شاید ہفتے وار مسجد کا چندہ اس دفعہ دینا بھول گیا ہوں گا۔ میرے قریب پہنچتے ہی امام صاحب نے آگے بڑھ کر کہا۔ "ارے نعیم صاحب خیریت تو ہے آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"ہاں نعیم صاحب ہم لوگ بہت عرصے بعد یا شاید کچھ عرصے بعد آپ کو اتوار کے علاوہ مغرب میں دیکھ کر پریشان ہو گئے۔" یہ شاکر صاحب تھے جن کی محلے میں پرچون کی دکان تھی اور ٹھیک ٹھاک چلتی تھی۔

میں چند لمحے خاموش رہا جیسے کوئی مجرم پکڑا گیا ہو کیونکہ سب لوگ عصر سے کچھ دیر پہلے مجھے ڈیوٹی سے واپس آتے ہوئے روزانہ ہی دیکھتے تھے۔ میرے دل میں خیال آیا کہ شاید یہ لوگ طنز کر رہے ہیں لیکن پھر فوراً اپنے لہجے میں شائستگی لاتے ہوئے کہا۔ "ہاں جناب اور اب تو انشاء اللہ روزانہ ہی آپ کو مغرب میں ہی نہیں ظہر میں اور عصر میں بھی ملوں گا کیونکہ میں آج اپنی نوکری سے ریٹائر ہو گیا ہوں۔"

"ارے بھئی نعیم صاحب مبارک ہو پھر تو بچیوں کے فرض سے جلد ہی نمٹ کر اللہ کے گھر جانے کی نیت کر لیں کیونکہ ہم تو صرف نیت کر سکتے ہیں بھیجنے والی ذات تو وہ ہے جس کے ہاتھ میں پوری کائنات کا دارومدار ہے۔" یہ آواز سن کر میں چونک پڑا کیونکہ یہ آواز خلیل نامی اسی بھوسی ٹکڑے والے کی تھی جس سے میری آج تیسری ملاقات یا سامنا ہو رہا تھا۔

"ہاں ہاں میرے دوست تم بتاؤ کہ تم نے بھی نیت کی ہے اور تم اس پر بڑے پُریقین ہو، اللہ ہم سب کو ایسا ہی یقین نصیب کرے۔"

"پتا ہے نعیم صاحب۔" امام صاحب نے مجھے مخاطب کیا۔ "یہ خلیل ہے جسے آپ جانتے ہوں گے، عجیب قسم کا سمجھتے ہیں لوگ اسے کیونکہ یہ جو کام کرتا ہے وہ آپ کو بھی پتا ہے کہ اس کام کرنے والے کو عموماً کباڑی کہتے ہیں لیکن یہ صرف ردی کاغذ اور بھوسی ٹکڑے ہی لیتا ہے اور کسی بھی دھات کا کوئی بھی سامان نہیں خریدتا۔ اس لیے یہ اپنے آپ کو بھوسی ٹکڑے والا کہلانا پسند کرتا ہے۔ بتاؤ صرف اس کام میں جس میں منافع کا مارجن بھی کم ہے بقول شاکر صاحب کے لیکن پھر بھی خلیل میاں نے اللہ کے گھر جانے کے لیے گورنمنٹ کی پالیسی کے مطابق حج کی درخواست جمع کروائی ہے اور سب سے دعاؤں کا طلب گار ہے۔"

"اور تو اور خلیل بھائی کو پورا یقین ہے کہ اللہ ان کی آرزو ضرور پوری کرے گا۔" یہ جملہ چھوٹے سے قد پر مشتمل شخص جس کے چہرے پر گھنی داڑھی تھی اس نے ادا کیا تھا۔ کمزور وجود کے باوجود اس کی آواز میں کافی مٹھاس

شمارہ اکتوبر 2012ء کی منتخب سچ بیانیاں

ہماری پیش کش.....آپ کا انتخاب

☆ اول: خالی ہاتھ.....الف شین (اسلام آباد)
☆ دوم: عورت ایک پہیلی...شاہد (کراچی)
☆ سوم: خواہشات ناآسودہ...صائمہ اعجاز (کراچی)

پہلے، دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ بیتی منتخب کیجیے
ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے

WWW.PAKSOCIETY.COM

بھری تھی جس کی عمر بہ مشکل تیس پینتیس برس کی تھی۔ میں پہچان گیا کہ یہ ہی نیا موذن ہے، جس کی اذان کے الفاظ دل میں اترتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اور ظاہر ہے وہ جمعے کے دن خلیل کے ساتھ مسجد کی صفائی ستھرائی کرتا ہے تو اس طرح ہفتے میں ایک دن اس کو اس کام کے لیے ایک ساتھی کا میسر آنا دلی وابستگی کا سبب ہی بنتا تھا۔

میں نے پھر کچھ دیر خاموشی طاری دیکھ کر کہا۔ ”اللہ اس کی تمنا پوری کرے، ہاں بھئی تمہارا نام مجھے شاید یاد نہیں رہا۔“ میرا اشارہ موذن کی طرف تھا۔

”ارے حافظ قاری طارق میاں کا نام آپ کو کیسے معلوم ہوگا یہ تقریباً ایک مہینے پہلے قاری عالم (سابقہ موذن) صاحب کے اپنے گاؤں لوٹ جانے کے بعد آیا ہے۔ آپ بھی مسجد میں ٹھہرے ہی نہیں اور یہ آپ سے ہم کلامی سے محروم ہی رہا۔“

میں نے بظاہر خوش دلی سے اس کو مسکرا کر دیکھا اور ستائشی لہجے میں بولا ”واقعی تمہاری اذان کی آواز تمہارے قاری ہونے کا کھلا ثبوت ہے۔ اچھا امام صاحب و دیگر حضرات اب کچھ گھریلو امور نمٹانے ہیں پھر عشا میں ملاقات ہوگی، دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔“ یہ کہتے ہوئے فرداً فرداً میں نے ان سب سے ہاتھ ملایا اور پھر سب کی طرف سے دعائیں لیتا ہوا گھر کی طرف روانہ ہوا تو میرے ساتھ ساتھ شاکر صاحب بھی تھے کیونکہ ان کا گھر میرے گھر کے نزدیک پڑتا تھا جبکہ خلیل اپنے ٹھیلے سمیت مسجد آیا تھا اس لیے وہ ٹھیلا لے کر بڑے کباڑی کی طرف حساب کتاب کرنے چل دیا۔

”شاکر صاحب یہ خلیل کیا کوئی اور کام بھی کرتا ہے؟“ میں نے چہل قدمی کے انداز میں چلتے ہوئے پوچھا۔

”ارے نہیں بھئی سچی بات تو یہ ہے کہ میں تو اس شخص کی باتیں سن کر اور پھر بہت کچھ دیکھ کر خود حیران ہوں کہ صرف ردی پیپر اور بھوسی ٹکڑے گھر گھر گلی گلی گھوم کر، گرمی ہو یا سردی برسات ہو یا خشک موسم روزانہ صرف جمعے کے آدھے دن کے علاوہ صرف یہی کام کرتا ہے اور ابھی تین مہینے پہلے حج کی درخواست جمع کروائی خود میرے ساتھ جا کر کیونکہ اسے اس کی کارروائیوں کا علم نہیں تھا۔ پاسپورٹ اس کا پہلے سے بنا ہوا ہے اور پتا ہے اس پاسپورٹ پر متعدد ممالک کے ویزے لگے ہوئے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ وہ ان ممالک میں گیا ہے۔“

”کن کن ممالک کے؟“ میں نے بے صبری سے پوچھا۔

”لندن، کینیڈا، سنگاپور، تھائی لینڈ، جنوبی افریقا کے شہر جوہانسبرگ و کیپ ٹاؤن وغیرہ وغیرہ۔“

میں ہونقوں کی طرح ان کا منہ تکتے ہوئے ان کے بولے ہوئے شہروں و ملکوں کے نام زیرِ لب دہرا رہا تھا پھر ایک دم یہ احساس ہوتے ہی کہ میرے قدم جس طرح چلتے چلتے رک گئے ہیں شاکر صاحب بھی اب بولتے بولتے چپ ہوگئے تھے اور چہرے پر یہ تاثر سجائے میری طرف دیکھ رہے تھے کہ دیکھا کر دیا نا حیران، واقعی میں تو یہ سوچ کر کہ شاکر صاحب اگر دروغ گوئی سے کام نہیں لے رہے تو ضرور میرا شک درست ہے۔ یہ شخص کوئی دو نمبر کا کام کرتا ہوگا اور ہوسکتا ہے کہ اس کا تعلق مافیا سے ہو۔ میرے چہرے کے بدلتے تاثرات پر شاکر صاحب پھر گویا ہوئے۔

”بھائی نعیم کیا کوئی اور بات یاد آگئی۔“

میں جو کافی دیر سے گم صم کھڑا تھا جھینپی ہوئی مسکراہٹ اپنے چہرے پر لاتے ہوئے ایک دم حال میں پہنچا اور بولا۔ ”وہ دراصل اپنا کیا نام بتاتا ہے۔“

”ارے خلیل خانزادہ اپنا پورا نام بتاتا ہے۔“ شاکر صاحب میرے سوال کرنے پر فوراً بولے۔ اب ہم دونوں نے پھر چلنا شروع کر دیا تھا۔

”ہاں میں یہ سوچ کر حیران ہو رہا ہوں کہ جب سے یہ ہمارے محلے میں آیا ہے میں نے تو اسے ٹھیلا چلاتے ہوئے ہی دیکھا ہے۔“ اور پھر امام صاحب کی بات یاد آتے ہوئے اپنی بات میں اضافہ کیا کہ ”... محض چند چیزیں ہی لیتا ہے یعنی ردی اور باسی روٹی تو پھر اس سے پہلے یہ کیا کرتا تھا، کہاں رہتا تھا، کیا یہ کسی کو پتا ہے؟“

میرے چپ ہوتے ہی شاکر صاحب گویا ہوئے۔

”میاں میں نے ایک دو دفعہ پوچھنے کی کوشش کی تو بولا شاکر صاحب میں اس محلے میں آنے سے پہلے... تو ان ممالک اور پاکستان کے درمیان گھن چکر بنا رہتا تھا۔ تفصیل پھر کبھی بتاؤں گا۔ کیا خیال ہے مجھ سے زیادہ مانوس بھی ہوگیا ہے کیونکہ عموماً ظہر کے بعد اپنے ٹھیلے سمیت میری دکان پر آ کر بیٹھ جاتا ہے۔ آدھ گھنٹے کے لیے۔ اس وقت گاہک بھی کم ہی ہوتے ہیں تو میری اس سے بے تکلفی بھی ہوگئی ہے۔ اب تو آپ بھی سمجھیں فارغ ہی ہیں کسی دن تفصیل معلوم کر لیتے ہیں۔ ویسے بندہ بہت ایماندار ہے اکیلی جان ہے اپنے لیے تھوڑا بہت سودا لیتا اور کرایہ بھی مہینے کی... پانچ تاریخ کو

ادا مجھے آ کر دیتا ہے۔“

ہوں...... اب مجھے یاد آیا کہ جس کوارٹر میں وہ رہتا ہے وہ کوارٹر اور اس کے ساتھ ساتھ چار عدد کوارٹر شاکر صاحب کے ہی تو ہیں جو انہوں نے کرائے پر اٹھائے ہوئے ہیں اور خود سڑک کے اس طرف جدھر میرا مکان ہے اپنا 120 گز پر دو منزلہ مکان بنوا کر اپنے بیوی بچوں سمیت رہائش پذیر ہیں۔ تھوڑا سا رشک اور حسد سا دل میں آیا کہ مجھ سے اچھے تو شاکر صاحب ہیں۔ پرچون کی دکان چلاتے ہیں لیکن اس سے ہی انہوں نے کتنا بنا لیا۔ چاہے خود میٹرک بھی نہ کیا ہو لیکن ان کے چاروں بچے تین عدد لڑکے اور سب سے چھوٹی بیٹی شازیہ اچھے اور مہنگے پرائیوٹ تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور ایک میں ہوں اعلیٰ تعلیم یافتہ پروفیسر جس کے ادب میں پوری کلاس خاموشی اختیار کر لیتی تھی۔ جس کے شاگرد بڑی بڑی پوسٹوں پر ہیں۔ انجینئرز، ڈاکٹرز، ادیب بنے ہیں اور آگے بھی بنتے رہیں گے اور لاکھوں روپے کمائیں گے۔ اب یہ ہر ایک کے ایمان پر موقوف ہے کہ وہ روپیا کمانے کے لیے اپنے اندر کے سچے آدمی کو ساتھ لے کر چلتا ہے یا کہ گلا دبا دیتا ہے۔ میں اور مجھ جیسے کتنے ہی ٹیچرز نے انہیں ایمانداری کا سبق پڑھایا ہوگا لیکن اس پر عمل کون کرتا ہے؟

”ارے نعیم صاحب کیا بات ہے۔ آج آپ بار بار کہیں کھو سے جاتے ہیں۔“ شاکر صاحب جو نہ جانے کتنی دیر سے میرے جواب کے منتظر تھے آخر اپنی دکان تک پہنچ کر صبر نہ کر سکے اور بول ہی پڑے۔

”ہاں...... ہاں۔“ میں بے اختیار بول اٹھا۔ ”کل ظہر پڑھنے کے بعد آپ کی دکان پر رک جاؤں گا پھر پوچھیے گا اس سے کہ وہ ان ممالک کے چکر کس لیے لگاتا تھا اور اب اس کا یہ ذریعۂ روزگار اس کے لیے کتنا سود مند ہے۔“

”تو پھر ٹھیک ہے آپ اسی بہانے میری دکان و مکان پر آ تو جائیں گے۔“

میں بھی ان کی تکلفاً دعوت کو کل پر ٹالتے ہوئے گویا ہوا۔ ”ہاں اب تو وقت ہی وقت ہے۔“ پھر میرے قدم اپنے گھر کی طرف بڑھ گئے لیکن دوسرے دن بھی میں اپنے پنشن کے کارڈ اور دیگر کاغذی کارروائیوں کی وجہ سے بعد نماز ظہر گھر پہنچا تو اس کے بعد عصر میں ہی میری ملاقات ان لوگوں سے ہوسکی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ شاکر صاحب نے خلیل بھوسی ٹکڑے والے سے میری اور اپنی خواہش کا اظہار کر دیا تھا لیکن میری عدم موجودگی کی وجہ سے اس بات کو اب پھر دوسرے دن دوپہر میں رکھ لیا گیا۔ یہ بات مجھے خلیل نے ہی شاکر صاحب کی موجودگی میں بتائی۔

اگلے دن کی بات ہے میں فجر کی جماعت میں موجود تھا۔ نماز کے بعد ہم لوگ امام صاحب کے ساتھ بیٹھ گئے۔ دینی مسائل پر گفتگو شروع ہوگئی۔ جب میں وہاں سے اٹھا تو امام صاحب بولے۔ ”اسی طرح اگر آپ سب فجر کے بعد کہیں تو میں دس پندرہ منٹ یا آدھا گھنٹے روز درس دینے کے لیے تیار ہوں تاکہ آپ لوگوں کو دینی باتیں بتائی جاسکیں۔“ لیکن میں خاموش ہوگیا۔

یہ بات سب لوگ جانتے تھے کہ میں دوسرے فرقے سے تھا۔ اس مسجد میں تو قریب ہونے کی وجہ سے آتا تھا ورنہ ہمارے فرقے کی مسجد کافی دور تھی پھر میں اس موضوع پر بات کرنا مناسب نہیں سمجھتا تھا کیونکہ تقریباً دو سال قبل اس محلے میں دو نوجوان سرِعام چھوٹی سی دینی بحث میں قتل ہوگئے تھے۔ میرا دل ان دنوں بہت رویا تھا بعد میں ان میں سے ایک لڑکے کے نام پر وہ چوک کر دیا گیا تھا جس کی ابتدا میری گلی کے اختتام پر تھی اور دوسرے لڑکے کے نام پر مسجد کی دیواریں رنگی ہوئی تھیں جبکہ میری نظر میں ہمارا فرقہ کوئی الگ نہیں تھا۔ اِک چھوٹی سی بات کو بڑا ابنا کر مسجدوں کو بھی اِس کی اور اُس کی بنا دیا گیا تھا۔ میں نے کبھی الفاظوں میں اپنا موقف ظاہر نہیں کیا تھا اور نہ ہی میں اس معاملے میں بولا تھا اس لیے دونوں جانب کے افراد مجھے مخالف ہی سمجھتے تھے لیکن میں ان باتوں سے دور ہی رہتا تھا۔ اس لیے بولا۔ ”امام صاحب میں پابندی سے آنے کا تو وعدہ نہیں کرسکتا کیونکہ میں کاروبار کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ ہاں دین کی باتیں تو جب وقت ہو کر لینی چاہئیں۔ خیر اس بارے میں آپ دوسرے لوگوں سے پوچھ لیں جیسا یہ کہیں گے ویسا ہی میری طرف سے سمجھیں۔“ یہ کہہ کر میں گھر لوٹ آیا۔

بات آئی گئی ہوگئی، دوپہر کا کھانا بھی جلدی کھا لیا اور ظہر پڑھنے مسجد کی طرف چل دیا۔ مسجد سے تھوڑی دور تھا کہ ایسا لگا جیسے بہت سارے افراد قریب ہی کہیں کسی قسم کے نعرے بازی کر رہے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے نظر سڑک کے اس طرف گئی جدھر سے عموماً گاڑیاں مستقل آتی جاتی دکھائی دیتی ہیں لیکن اُدھر سے اس وقت کوئی گاڑی نمودار نہیں ہو رہی تھی ہاں وہ منی بسیں جن کا روٹ اور اسٹاپ اس سڑک پر تھا ایک عجیب افراتفری میں اپنے اصل روڈ سے ہٹ

WWW.PAKSOCIETY.COM

کر رہائشی چوڑی گلیوں میں سے نمودار ہو کر اپنی سمت درست رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھیں۔ ان کے ساتھ ساتھ کئی موٹر سائیکل سوار اور کچھ پرائیوٹ گاڑیاں، رکشے وغیرہ بھی آرہے تھے۔ منی بسوں میں سوار افراد جو کھڑکیوں سے جھانک رہے تھے ان کے چہروں پر خوف و اضطراب صاف محسوس کیا جارہا تھا۔ میں ابھی اس صورتِ حال سے آگاہی کے لیے کسی سے پوچھنے والا ہی تھا کہ شاکر صاحب کی آواز سنائی دی۔ ”ارے نعیم صاحب مسجد کی طرف چلیں، کچھ دیر میں سب صحیح ہو جائے گا۔“

”مگر یہ کیا وجہ ہے کیا آگے سے روڈ بند ہے؟“ میرے استفسار پر وہ مزید گویا ہوئے۔

”ارے بھئی کچھ لوگ کسی دینی جماعت کے ساتھ اگلے مین چوک پر احتجاجی جلوس نکال رہے ہیں اس ملعون کے خلاف جس نے کل پھر اپنے میں ملک میں گستاخی رسولؐ کی جرات کی ہے۔ اس وجہ سے سیکیورٹی کے نام پر پولیس نے وہ روڈ بلاک کر دیا ہے اور آنے والی گاڑیوں کو متبادل راستے کے طور پر گلیاں ہی استعمال کرنی پڑ رہی ہیں۔ اس ملعون کو تو سرِ عام قتل کرنا واجب ہو گیا ہے۔“

”لیکن وہ تو اپنے ملک میں آرام سے بیٹھا ہوگا اور عموماً اس قسم کے گستاخانہ عمل کے خلاف ملکی سطح پر بین الاقوامی عدالت میں آواز اٹھانی چاہیے یا اس طرح اپنے ملک کے اندر ہی اپنی عوام کو تکلیف دینا یا اپنی ہی پراپرٹی وغیرہ کا نقصان کرنا؟“ میں پوری بات سمجھ کر بولا۔

شاکر صاحب کے چہرے کے تاثرات میں تھوڑی سی تبدیلی آگئی۔ میں نے ان کے ساتھ مسجد کی طرف قدم بڑھا دیے۔ اب نعروں کی آواز قریب آتی جارہی تھیں لیکن شکر ہے جب ہم نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے باہر آئے تو صورتِ حال کافی معمول پر آچکی تھی کیونکہ احتجاجی جلوس ہمارے محلے سے آگے نکل چکا تھا اور ٹریفک بھی مزکورہ سڑک پر رواں ہو چکی تھی۔

واپسی میں ہمارے ساتھ خلیل بھی تھا۔ شاکر صاحب نے مسجد میں داخل ہونے سے پہلے کے میرے کمنٹس پر کوئی بات نہیں کی، ہاں مجھ سے بولے۔ ”بھئی چلیں میرے غریب خانے پر آج خلیل میاں کے ماضی کے بارے میں کچھ باتیں ہو جائیں۔ کیوں خلیل صاحب؟“ صاحب پر زور دیتے ہوئے وہ جب بولے تو میرا دل چاہا کہ آج کوئی بہانہ کر دوں لیکن اتنے میں خلیل کی آواز سنائی دی۔

”بالکل آج میں اپنا ٹھیلا بند کر کے ہی آیا ہوں تاکہ میں.... آپ کو اپنی وہ داستان سناؤں جسے سننے کے لیے آپ لوگ بے چین ہیں۔“ میں نے نوٹ کیا کہ وہ ہماری اس کرید کو آج اطمینان بخش باتوں سے لاجواب کرنے کے موڈ میں ہے۔

”ٹھیک ہے جیسا آپ لوگ کہیں۔“ یہ کہہ کر میں بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔ شاکر صاحب کی دکان تک پہنچنے تک خلیل خاموش رہا البتہ شاکر صاحب نے مجھے مطلع کر دیا کہ دکان پر اپنے بڑے صاحبزادے کو بٹھا دیا ہے اور گھر کی بیٹھک میں اس نشست کا انتظام کیا ہے تاکہ دکان داری کی وجہ سے بات چیت کے دوران کوئی حرج نہ ہو۔ کچھ دیر بعد ہم تینوں شاکر صاحب کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے جہاں اس سے پہلے میں ایک آدھ دفعہ ہی کسی اہم کام کی وجہ سے آیا ہوں گا اور ہمیشہ اس کمرے کی آرائش سے نظریں چراتا تھا کیونکہ قیمتی فرنیچر اور مہنگے شوپیس وغیرہ کو دیکھ کر مجھے احساسِ کمتری کا احساس ہوتا تھا۔

”نعیم صاحب بات یہ ہے کہ آپ کو شاکر بھائی نے میرے پاسپورٹ کا بھی بتایا ہوگا اور اگر آپ اسے دیکھ لیں تو اپنی قابلیت کی وجہ سے بہت کچھ خود ہی سمجھ جائیں گے۔“ یہ کہتے ہوئے خلیل نے اپنی قمیص کی جیب سے ایک تھوڑا سا بوسیدہ پاسپورٹ نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ میں نے اسے اٹھاتے ہوئے کہا۔

”ارے خلیل جو بات ہے آپ بتا دیں۔ دراصل پڑوسی ہونے کے ناتے فطری تجسس کی بنا پر میں آپ کی پچھلی زندگی کے بارے میں جاننا چاہ رہا تھا۔“

”بہت بہت شکریہ نعیم صاحب، یہ بات میں بھی سمجھ سکتا ہوں لیکن میری کوئی ایسی بات نہیں جس کی وجہ سے میں شرمندہ ہوں۔“

ابھی وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ گھر کے اندرونی دروازے پر پہلے دستک ہوئی پھر شاکر صاحب کا منجھلا بیٹا کمرے میں ٹرے لیے داخل ہوا۔ شاکر صاحب نے لپک کر اس سے ٹرے لی اور کچھ ہدایات دے کر اسے واپس کر دیا پھر ہماری طرف متوجہ ہوئے اور کہا ”بھئی غریب خانے پہ چائے کے ساتھ ساتھ باتیں چلیں تو کیا ہی بات ہے۔“

میں نے خلیل کو مخاطب کیا۔ ”بھائی آپ تو بزنس ٹور پر اتنے ممالک میں جا چکے ہیں اور آج یہ ردی پیپر کا کاروبار؟“

خلیل چائے اور نمکو اپنی طرف بڑھاتے ہوئے گویا ہوا۔ ”نعیم بھائی پہلے میری کہانی سن لیں، سارا جواب آپ کو خود مل جائے گا۔ میں نے راولپنڈی کے نواح میں آباد ایک قصبے سے میٹرک کیا۔ والد صاحب میری پیدائش سے ایک سال پہلے پولیس مقابلے میں ڈاکوؤں کی گولی کا نشانہ بن گئے تھے۔ والدہ اور نانی میرے ماموں کے ساتھ رہتی تھیں۔ ددھیال کا مجھے پتا نہیں کیونکہ میری والدہ نے ان سے اس لیے تعلق ختم کر لیا تھا کہ میرے والد کی موت کے بعد ان کے بھائیوں نے میرے باپ کی کچھ زمین جو وراثت میں ان کو ملتی اس پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ نانا زندہ نہیں تھے اکلوتے ماموں تھے۔ وہ میرے چچاؤں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ میری ماں کو گورنمنٹ کی طرف سے ماہانہ وظیفہ ملتا تھا جو کہ میری تعلیم کا ذریعہ تھا اور مجھے سن کوٹے پر پولیس میں ملازمت بھی مل سکتی تھی لیکن میں پیدائشی طور پر پولیس کی نوکری سے الرجک تھا۔ خیر میٹرک کے بعد لاہور کے ایک اچھے کالج میں داخلہ لینے کے لیے میں اپنے ماموں کے ساتھ جو کہ کپڑے کا کام کرتے تھے گیا تو اندازہ ہوا کہ آگے تعلیم کے لیے ماموں کی مالیت کا حاصل اور میری ماں کا وظیفہ بھی ناکافی ہے۔ پڑھائی میں میں کوئی خاص نہیں تھا لیکن بالکل بودا بھی نہیں تھا۔ میرا دل ایک دم کام کرنے کی طرف ہو گیا۔ ماموں میرے ساتھ ہفتے میں ایک چکر پشاور، چترال، گلگت وغیرہ میں سے کسی ایک جگہ کا لگاتے تھے اور وہاں سے کچھ سامان لا کر راولپنڈی و اسلام آباد جو کہ نیا نیا دارالحکومت بنا تھا، کی مارکیٹ میں فروخت کر دیا کرتے، اس سے ہم چاروں کی گزر بسر ہوتی تھی۔ ماموں ایک سیدھے سادے اور ڈرپوک قسم کے فرد تھے لیکن میری رگوں میں ایک دلیر راجپوت سب انسپکٹر یعنی میرے والد جن کا نام ابراہیم تھا کا خون دوڑ رہا تھا۔ میں نے بھی یہی لائن اپنانے کا فیصلہ کر لیا جس کے لیے والدہ نے اپنا زیور بیچ کر مجھے رقم فراہم کی اور میں اس لائن میں چند سالوں میں اتنا ماہر ہو گیا کہ ماموں تو ماموں، ماں بھی حیران رہ گئیں۔ اس دوران نانی کا انتقال ہو گیا اور کچھ مہینوں بعد ماموں نے بھی شادی کر لی لیکن والدہ کو ساتھ ہی رکھا۔ مجھے یاد ہے کہ پہلی دفعہ گلگت کی مارکیٹ میں موجود کامل آغا نامی تاجر.... جس سے میری اچھی دعا سلام ہو گئی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا، ”ارے خلیل کیا اسی جگہ رکا رہے گا یا آگے بڑھ کر اپنا قد بڑھائے گا۔“

”کیا مطلب آغا صاحب؟“ میں بولا تو اس نے مجھے بتایا کہ... جو مال ہم ان لوگوں سے خریدتے ہیں وہ کیسے غیر ممالک سے قانونی و غیر قانونی طریقوں سے آتا ہے۔ اس طرح کم وقت میں زیادہ کمائی ہوتی ہے۔ بس مجھے دھن سوار ہو گئی اور اس ٹور سے واپسی پر میں نے اپنا پاسپورٹ وغیرہ بنوایا۔ اس عرصے میں میری ماں نے کچھ پیسا میری شادی کے نام پر جمع کر لیا تھا اور کچھ میں نے آغا جیسے دوستوں سے ادھار کے طور پر لیا اور پہلی دفعہ اپنے وطن سے باہر نکلا۔ ماں کی دعائیں ساتھ تھیں پہلا قیام ہی میرا چین تھا وہاں سے واپسی کے بعد ایران اس کے بعد چین پھر ایران پھر تھائی لینڈ بعد میں ہانگ کانگ، سنگاپور وغیرہ وغیرہ۔

اللہ نے ایسا ہاتھ پکڑا کہ ادھار کی رقم اتارنے کے بعد تقریباً پانچ سال میں، میں نے اپنی ماں کو ذاتی گھر کا تحفہ بھی دیا جو میں نے اسلام آباد کے پوش علاقے میں خریدا تھا لیکن میری ماں کی قسمت کے جب اس کے بیٹے نے دنیا کی ہر شے اس کے قدموں تلے ڈھیر کرنا شروع کیں وہ صرف تین دن بیمار رہ کر اور میرے سر پر سہرے کی تمنا لیے مجھے اس دنیا میں اکیلا چھوڑ کر چلی گئیں۔ مجھے زندگی میں کوئی بڑا دکھ پہلی دفعہ ملا تھا۔ شادی سے زیادہ میری تمنا تھی کہ بس کسی بھی طرح پیسا کماؤ۔ وقت ہر قسم کے زخم کا مرہم ہے۔ کچھ عرصے بعد میں پھر زندگی کی طرف لوٹا اور پاکستان کے ہر بڑے شہر کی بڑی مارکیٹوں میں جہاں میرے تعلقات پھیل چکے تھے ان کے اور دیارِ غیر کے درمیان گھن چکر بن گیا اور بینک بیلنس بڑھتا رہا۔ ماموں اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ اپنی جگہ مطمئن تھے۔ مذہب سے میرا تعلق کم یا کبھی کبھار جمعے کی نماز تھی۔ ہاں شاید آج جو میں آپ لوگوں کے پاس بیٹھا ہوا ہوں اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ میں نے غیر ممالک میں بھی حرام چیز حلق سے نہیں اتاری۔ شراب سے ہمیشہ پرہیز کیا اور کبھی کوئی غیر قانونی شے اسمگل نہیں کی۔“

وہ حسبِ عادت سانس لینے کے لیے رکا تو میں نے کہا۔ ”تو پھر وہ تمام دولت، وہ پچھلی زندگی سے ردی پیپر والا بننے کا سلسلہ کیا ہے؟“

”نعیم صاحب یہ اب سے چند سال پہلے کی بات ہے، میں شادی کے لیے سوچنے پر مجبور ہو گیا کیونکہ صنفِ نازک کی طرف مواقع ہونے کے باوجود کبھی بھی راغب نہیں ہوا تھا لیکن اس دن میں دبئی میں ایک فائیو اسٹار ہوٹل سے باہر آرہا تھا۔ اس شام سنگاپور کے لیے میری فلائٹ تھی۔ ہوٹل میں ایک پارٹی سے لیدر کے جیکٹس اور شوز کے سودے کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

سلسلے میں میٹنگ تھی۔ دیگر کام میں نمٹا چکا تھا۔ دبئی میں میرا دو دن کا قیام تھا اس لیے میں نے رینٹ پر گاڑی لی ہوئی تھی۔ سیل فون نئے نئے پاکستان میں آئے تھے لیکن انٹرنیشنل مارکیٹ میں تیزی سے جگہ بنا چکے تھے اور میرے جیسے لوگ اسے افورڈ کر سکتے تھے۔ میں جیسے ہی گاڑی میں بیٹھا الٹے ہاتھ کے اگلے دروازے پر دستک سنائی دی۔ میں نے دیکھا تو ایک لڑکی تھی وہ مجھے دروازہ کھولنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ میں نے کھول دیا۔ وہ میرے برابر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''پلیز آپ جس ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں مجھے بھی وہیں تک جانا ہے کیونکہ میں نے صبح ریسپشن پر آپ کو چابیاں دیتے ہوئے دیکھا تھا۔''

دبئی میں غیر ملکیوں کی بہتات کی وجہ سے وہاں ایسی باتیں عام ہو چکی تھیں۔ ان میں پیشہ ور بھی ہوتی تھیں لیکن وہ بائیس تئیس سالہ لڑکی جو اپنے لہجے سے امریکن معلوم ہوتی تھی اس میں کوئی ایسی بات تھی کہ میں نے چند ثانیے سوچ کر گاڑی آگے بڑھا دی۔ تھوڑا سا آگے جا کر وہ بولی۔ ''میں اپنے مہربان کا نام معلوم کر سکتی ہوں۔ ویسے مجھے کرسٹی کہتے ہیں۔ کرسٹینا اسٹیورڈ میرا پورا نام ہے۔ واشنگٹن سٹی سے تعلق ہے۔ یہ جو چھوٹے چھوٹے چلتے پھرتے فون ایجاد ہو گئے ہیں اس کی کمپنی ہے جس کے کام کی وجہ سے میں یہاں موجود ہوں۔ آج شام روانگی ہے اور مجھے آپ نظر آ گئے چند گھنٹوں بعد کی فلائٹ ہے۔''

میں نے جواباً کہا۔ ''مجھے خلیل ابراہیم کہتے ہیں۔ ایکسپورٹ امپورٹ کا کاروبار ہے۔ میٹنگ کے لیے یہاں آیا تھا۔ آپ کی فلائٹ کا نمبر کیا ہے کیونکہ مجھے بھی آج شام کی فلائٹ سے سنگاپور جانا ہے۔'' میں نے جس فلائٹ کا نام و نمبر بتایا اسی ملک کی ائر کمپنی کی اسی فلائٹ سے اسے بھی سنگاپور جانا تھا۔''

وہ چونک گئی اور بولی۔ ''خوب ایک ہی ہوٹل میں ٹھہرے ہیں اور ایک ہی فلائٹ ہے۔'' پھر تھوڑا سا رک کر بولی۔ ''میری ریزرویشن ہوٹل کے کمرے میں ہے کہیں آپ مجھے ایسی ویسی لڑکی تو نہیں سمجھ رہے ہیں۔''

میں ہنس کر بولا۔ ''اگر ویسی لڑکی سمجھتا تو آپ کو وہیں واپس اتار دیتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میں نے صنفِ مخالف سے دوستی کبھی رکھی ہی نہیں ہے لیکن آپ سے باتیں کر کے اچھا لگ رہا ہے۔''

''تھینک یو۔'' وہ بولی۔ سچ بتا رہا ہوں شاکر صاحب وہ کوئی اپسرا نہیں تھی لیکن کھڑی ناک، ڈائنا جیسا قد اور بڑی بڑی روشن آنکھیں جن پر بات کرتے ہوئے اس کے موتیوں کے سے چمکتے دانت۔ وہ گوری چمڑی والی لڑکی پتا نہیں کیوں میرا دل کھینچ رہی تھی۔ خیر اتنے میں ہوٹل آ گیا۔ ہوٹل کی پارکنگ سے نکلتے ہوئے وہ میرے ساتھ تھی۔ اس نے پوچھا۔

''کیا آپ مسلم ہیں۔''

میں نے فطری طور پر کالر کھڑا کرتے ہوئے کہا۔ ''الحمد للہ یس آئی ایم پاکستانی مسلم۔'' تو نہ جانے کیوں اس کے چہرے کے رنگ کچھ بدل سے گئے۔ جیسے کسی کی کوئی امید ٹوٹ جائے پھر وہ بولی۔

''آپ کا بہت شکریہ لفٹ دینے کا، کہیں تو میں آپ کو کافی پلاؤں؟'' اس کا انداز ایک دم ایسا ہو گیا تھا جیسے وہ کافی..... لفٹ کے معاوضے کے طور پر پلانے کا کہہ رہی ہو۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا ' کاؤنٹر سے چابی لی اور اپنے کمرے میں جانے کے لیے لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔

تبھی میں نے محسوس کیا کہ وہ دانستہ مجھ سے پیچھے رہ گئی ہے۔ زندگی کا یہ تجربہ مجھے بہت انوکھا لگا لیکن حد تو جب ہو گئی جب میں شام کو ہوٹل سے فارغ ہو کر مقررہ وقت پر ائرپورٹ پہنچا اور پلین میں جب اپنی سیٹ کی طرف گیا تو میرے برابر والی سیٹ پر وہ آنکھیں بند کیے براجمان تھی۔ تھوڑی دیر حیرت میں رہ کر میں نے اسے ہلکے سے مخاطب کیا تو اس نے فوراً چونک کر پلکیں اٹھائیں اور مجھے سامنے دیکھ کر مجھ سے زیادہ حیرت زدہ ہو کر بولی۔ ''مسٹر خلیل پلیز' یہ جہاز ہے آپ اپنی سیٹ چھوڑ کر ادھر کیوں آ گئے؟''

اب میں نے تھوڑا تلخ لہجے میں جواب دیا۔ ''ائر ہوسٹس کو بلوائیں اور اپنی سیٹ چینج کروالیں۔ مجھے کیا پتا تھا امریکن اتنے خود غرض ہوتے ہیں کہ اپنی غرض پر میری گاڑی میں میرے برابر بیٹھ گئیں اور پلین پر اتفاقیہ سیٹ برابر ہونے پر آپ کو توہین محسوس ہو رہی ہے۔''

وہ کچھ دیر چپ رہی پھر آہستہ سے بولی۔ ''سوری خلیل صاحب میں سمجھی آپ مجھے دیکھ کر ادھر آئے ہیں۔ میں آپ سے اپنے رویے کی معذرت چاہتی ہوں۔''

''اوکے۔'' میں بولا اور اپنے رویے کو سرد ہی رکھنا بہتر سمجھا۔ جہاز جب فضاؤں میں تھا تو مجھے یاد ہے کہ ہم دونوں کچھ گھنٹے قبل کی سرد مہری بھول کر چہک رہے تھے اور آپ لوگ یقین کریں میں نے اسے پرپوز کر دیا۔ یہ جتا کر کہ وہ

میرے بارے میں انکوائری کروالے۔ میں غیر شادی شدہ اور خود مختار بزنس مین ہوں اور تم واحد لڑکی ہو جسے دیکھ کر میرے دل میں شادی کی خواہش جاگی ہے۔ وہ یہ سن کر کچھ دیر سُن سی رہ گئی اور پھر جب بولی تو اس نے مجھے ایک بہت بڑے امتحان میں ڈال دیا۔

وہ بولی۔ ''مسٹر خلیل آپ کا لہجہ آپ کی سچائی کی گواہی ہے لیکن میری آپ سے شرط میرج کے لیے یہ ہو گی کہ آپ اپنا مذہب چھوڑ دیں۔''

''یہ کیا کہہ رہی ہو؟''

وہ پھر بولی۔ ''مسٹر خلیل آپ بھی مجھے پسند آئے ہیں اور ہمارا معاشرہ تو بغیر شادی کے بھی ساتھ رہ لیتا ہے۔ کیا آپ میرے دو بچوں کے باپ بننے تک بغیر شادی کے رہ لیں گے۔''

''بس'' میں نے احتجاجاً کہا۔ ''صحیح ہے میں بہت مذہبی نہیں ہوں لیکن اپنے مذہب سے ہٹ کر حرام کام آج تک نہیں کیا۔''

''تو پھر اس کا حل یہ ہے کہ اگر آپ کو میری شرط منظور ہو تو اس نمبر پر کال کر کے مجھے بتا دیجیے گا۔ میں آپ کا چھ مہینے انتظار کروں گی۔'' اس کے بعد ہم دونوں میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ میں اسے چپ چاپ دیکھتا ہوا سنگاپور ائرپورٹ سے باہر آ گیا۔ وہ دو دن میں نے کیسے کاروباری میٹنگز اٹینڈ کیں مجھے صحیح یاد نہیں۔ ہاں، جس دن میں پاکستان کے لیے فلائی کرنے والا تھا تو میں نے اس کی محبت میں ایک بہت غلط فیصلہ کر لیا تھا کہ پاکستان پہنچتے ہی کرسٹی کو فون کر کے کہوں گا مجھے تمہارے دو بچوں کا باپ بننے کی اور وہ بھی بغیر نکاح شرط قبول ہے۔ یہ فیصلہ کر کے بظاہر تو میں مطمئن تھا لیکن میرے اندر ایک بے چینی سی تھی کہ آخر میں دنیا کے آگے ہار گیا۔ ہمیشہ لذیز ڈشوں کے آگے صرف ہلال ڈش کو کیوں ترجیح دی۔ کیا جسمانی قربت کے لیے اللہ نے حرام ہلال نہیں رکھا؟ سنگاپور میں میرے ہوٹل سے ائرپورٹ کا راستہ پیدل ہی کا تھا اس شام میں ہوٹل سے سب تیاریاں کر کے اپنے سامان سمیت جو ایک شولڈر بیگ تھا ائرپورٹ کی طرف چلا تو عجیب مخمصے میں تھا کہ اللہ نے مجھے مدد بھیجی۔ میں سڑک کے دائیں سمت فٹ پاتھ پر چل رہا تھا آگے پیچھے کافی لوگ تھے لیکن میں سب سے بے خبر چلا جا رہا تھا کہ اچانک گولیاں چلنے لگیں میں چونک کر دیوار سے چپک گیا اور حیرت سے ادھر ادھر دیکھا تو سمجھ میں آ گیا۔ سامنے بینک سے تین عدد ڈاکو واردات کر کے نکل رہے تھے لیکن کسی خفیہ الارم کی وجہ سے عین وقت پر پولیس پہنچ گئی' ان میں سے دو ڈاکو بینک سے باہر تھے اور ایک اندر اور ظاہر ہے کہ پوری طرح مسلح۔ اب پچویشن یہ تھی کہ باہر والے دونوں ایک کار کی آڑ لے کر فائر کر رہے تھے اور پولیس ہچکچا رہی تھی کیونکہ پبلک میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ دو خواتین اور ایک لڑکا جو عام فرد تھے ان کے گولیاں لگی تھیں۔ وہ میرے سامنے تڑپ رہے تھے۔ مجھ سے قریب جو گلی تھی وہ محض دس پندرہ قدم دور تھی۔ میرا یہاں کھڑا رہنا خطرناک تھا۔ میں جیسے ہی گلی کی طرف بھاگا تو پیروں سے لوگوں کی گری ہوئی چیزیں ٹکرائیں۔ میں رکا نہیں بھاگتا رہا۔ گلی سے چند قدم دور تھا کہ اچانک زمین نے میرے پیر پکڑ لیے، ایک آٹھ دس سالہ بچہ نیچے گرا ہوا تھا۔ رکنا خطرناک تھا لیکن نہ جانے کیوں ایک قدم آگے جانے کے بعد میں پلٹا اس بچے کو گود میں لیا۔ وہ تڑپ کر میرے ہاتھوں سے نکل گیا۔ اس کے سینے میں دو گولیاں لگی تھیں۔ وہ عالمِ نزع میں تھا۔ میں پھر اپنے قدم گلی کی طرف بڑھانے والا تھا کہ میری نگاہ اس گرے ہوئے بچے کے ہاتھ پر پڑی۔ اس کے ہاتھ میں قرآن کریم کا ایک بوسیدہ سا صفحہ تھا۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں مجھے اس بچے کی آنکھوں سے یہ احساس ہوا کہ اس پاکیزہ ورق کو زمین پر گرنے سے بچا لو میری جان جانے دو۔'' یہ کہہ کر خلیل نے بے اختیار اپنی آنکھوں میں آنے والی نمی اپنے کندھے پر پڑے ہوئے رومال سے صاف کی اور قریب تپائی پر رکھا ہوا پانی کا گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔

ہم دونوں بھی جو اس وقت محوِ حیرت بنے گم تھے اچانک حال میں آ گئے اور پھر شاکر صاحب نے کچھ سوچ کر ایک ایک کپ چائے تینوں کے لیے نکالی لیکن میں بے چین تھا کہ خلیل اپنی زندگی کا اگلا احوال پھر شروع کرے اور شاید میری بے چینی محسوس کرتے ہوئے اس..... نے چائے کا کپ ہاتھ میں لیتے ہوئے سلسلہ وہیں سے جوڑا۔

''میں نے لپک کر وہ صفحہ اس کے ہاتھ سے لیا اور اپنی شرٹ کی جیب میں ڈال دیا۔ اس دوران جیسے اس بچے کو اطمینان مل گیا اور اس نے آخری ہچکی لے لی۔ میں نے گلی کی طرف قدم بڑھائے ہی تھے کہ اچانک وہ گلی فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔ آوازیں بہت شدید تھیں اور میں ذہنی طور پر اتنا تھک گیا تھا کہ وہیں پر گر گیا اور پھر مجھے ہوش نہیں رہا۔ اس دوران ڈاکوؤں کو گرفتار کر لیا گیا اور مرنے والے اور زخمیوں

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے ساتھ مجھے بھی ایک ایمبولینس میں اسپتال منتقل کیا گیا۔ ایک گھنٹے بعد جب مجھے صحیح طور پر ہوش آیا تو مجھے اسپتال سے تھوڑی سی پوچھ گچھ کے بعد فارغ کردیا گیا۔ بعد میں جو اطلاع موصول ہوئی وہ یہ تھی کہ ان دو ڈاکوؤں میں سے جو باہر تھے ان میں سے ایک پچھلی طرف سے اس گلی میں گھس کر اس طرف آرہا تھا جس طرف سے میں داخل ہوتا جب میں بچے میں مصروف تھا اسی وقت ایک لڑکا اور ایک عورت بھی مخالف سمت سے آکر اس گلی میں پناہ کے لیے جانا چاہتے تھے جنہیں دیکھ کر اس ڈاکو نے پورا برسٹ ان پر خالی کردیا۔ یہ سمجھ کر کہ پولیس یہاں آگئی ہے لیکن پولیس نے اس کی اس غلطی کی وجہ سے منظم انداز میں اسے اور پھر اس کے دیگر ساتھیوں کو گھیر کر زخمی حالت میں گرفتار کرلیا۔

اسپتال سے نکل کر مجھے جیسے کچھ یاد آیا اور بے اختیار میرا ہاتھ شرٹ کی جیب میں گیا اور وہ قرآنی ورق نکالا، بچپن میں پڑھا ہوا قرآن کام آیا۔ اس آدھ صفحے پر شروع ہی کی آیت تھی ''اور تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔'' پس میں کانپ اٹھا ذہن میں جھماکا ہوا۔ اگر یہ صفحہ لینے کے لیے میں نہیں رکتا تو گلی میں ان دونوں سے پہلے داخل ہوتا اور شاید گولیاں میرا مقدر ہوتیں۔ روزگار کے سلسلے میں قدم رکھے ہوئے تیرہ سال ہوگئے تھے کبھی کسی ناکامی کا منہ نہیں دیکھا۔ اللہ نے نیک نامی اور بے انتہا دولت سے نوازا تھا اور میں ایک کافر حسینہ کے لیے حرام کاری کا فیصلہ کرنے چلا تھا۔ میرا رواں رواں کانپ رہا تھا اور پھر میں نے فیصلہ کرلیا میری فلائٹ تو مس ہوہی گئی تھی لیکن خوش قسمتی سے چار گھنٹے کے بعد کی فلائٹ میں مجھے سیٹ مل گئی۔ یہ چار گھنٹے میں نے مقامی مسجد میں جاکر نماز و نوافل شکرانے کے ادا کیے جس دوران میرا چہرہ آنسوؤں سے تر ہوگیا جب مسجد سے باہر آیا تو جیسے میرے چاروں طرف سکون ہی سکون تھا۔ خیر دستیاب فلائٹ سے پاکستان آیا نمازوں کی پابندی کی، کاروبار کی وسعت میں کمی کی، ماموں اور ممانی کے توسط سے ایک اچھے گھرانے کی لڑکی سے شادی کی لیکن اب اللہ میرا امتحان لینا شروع کرچکا تھا۔ میری بیوی شادی کے چھ مہینے بعد ٹریفک حادثے میں میرے اور اپنے تین ماہ کے بچے کو پیٹ میں لیے اس دنیا سے چلی گئی۔ یہ بھی میری زندگی کا بڑا سانحہ تھا۔ پاکستان میں رہتے ہوئے میں نے ایک بات شدت سے محسوس کی کہ عوام میں بالکل شعور نہیں کہ مقدس اوراق کا تقدس بحال رکھیں وہ انہیں بھی عام ردی میں بیچ دیتے ہیں۔ میں نے ایک دن کراچی کے ایک مشہور ہوٹل سے تافتان خریدے گھر آکر کھولے تو شاپر کے اندر جس کاغذ میں وہ لپٹے ہوئے تھے اس پر ایک انڈین اداکارہ کی واہیات تصویر تھی۔ جب پورا کاغذ کھولا تو اندر کی جانب چھوٹی سی جگہ پر وہی آیت ترجمے کے ساتھ درج تھی کہ ''اور تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔'' میرا دل دولت سے اچاٹ ہوچکا تھا۔ میں نے اس ملک میں جو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے وہاں پر سیکیورٹی میں نمازیں ادا کرتے ہوئے دیکھا۔ مسلمانوں کو مسلمانوں کا خون بہاتے ہوئے دیکھا، مسلک اور فرقہ پر الگ الگ مسجدوں کا قیام نظر آیا۔ بس دل بہت میلا ہوا۔ اسلام آباد اور لاہور کی رہائش گاہیں بیچیں اور گردے ویکسنر کے لیے کام کرنے والے اسپتالوں کو عطیہ دیا۔ کراچی کی رہائش گاہ کرائے پر اٹھائی اور خود کراچی کی اس نواحی بستی میں آگیا۔ ایک ٹھیلا لے کر صرف ردی اور بھوسی ٹکڑے خریدتا ہوں۔ بھوسی ٹکڑے ہاتھوں ہاتھ آگے بڑھادیتا ہوں۔ ردی پیپر گھر لے کر چلا جاتا ہوں اور ان میں سے مقدس اوراق الگ کرتا ہوں پھر باقی آگے بیچ دیتا ہوں۔ آپ حیران ہوں گے کہ یہ مقدس اوراق جن کی توہین کوئی غیر مسلم کرے یا غیر مسلم ملک سے ہونے کی خبر آجائے تو ہم لوگ اپنی ہی املاک احتجاج کے نام پر جلا ڈالتے ہیں۔ عام عوام کو پریشان کرتے ہیں اور یقین کریں سات دن میں، میں اپنی خریدی ہوئی ردی سے تقریباً دس کلو تک یہ اوراق نکالتا ہوں اور رات کے اندھیرے میں قبرستان جاکر اس کام کے لیے مخصوص کنویں میں ڈال آتا ہوں۔ کراچی کے گھر کا کرایہ اچھا خاصا ہے جس کے توسط سے میں حج کی درخواست دے بیٹھا ہوں ورنہ پاکستان سے زیادہ تو غیر اسلامی ممالک اپنے رہائشی مسلمانوں کے لیے کافی کم کرنسی میں یہ سہولت مہیا کرتے ہیں جس کی مثال پڑوسی ملک انڈیا ہے۔ بس جناب اس ردی پیپر والے کی یہ آپ بیتی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے کراچی کے پوش علاقے کے ایک بنگلے کے کاغذات بھی دکھائے جو اس کے نام تھا۔ اس کے چپ ہونے پر سکوت ٹوٹا جو شاکر صاحب اور مجھ پر چھایا ہوا تھا۔ اس وقت وہ مجھے اتنا بڑا انسان لگا جس کے آگے میں ایک بونا تھا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ریٹائرڈ پروفیسر ایک بونا اور صرف میٹرک پاس ایک عظیم انسان ردی پیپر و بھوسی ٹکڑے والا۔

*

WWW.PAKSOCIETY.COM

لغزش

محترم معراج رسول
السلام وعلیکم!
یہ روداد مجھے میرے ایک دوست نے سنائی تھی۔ میں نے اسی کے انداز میں یہ کتھا لکھی ہے۔ اس میں ایک بہت بڑا پیغام ہے، سبق ہے، اس لیے اسے ضرور شاملِ اشاعت کریں۔

ڈاکٹر ممتاز عمر
(کراچی)

میں صبح سویرے ڈیوٹی پر پہنچا تو غیر متوقع طور پر تھانے میں کچھ زیادہ ہی چہل پہل تھی جو میرے لیے اچنبھے کی بات تھی کیونکہ پولیس اسٹیشنوں کی رونق بالعموم شام کے وقت سے شروع ہوکر رات گئے تک جاری رہتی ہے۔ اسی دوران ملزمان کی گرفتاری کے لیے چھاپے مارے جاتے ہیں اور جو پہلے سے لاک اپ میں موجود ہوتے ہیں ان سے پوچھ گچھ کی جاتی ہے۔ ابھی صبح کے آٹھ بھی نہ بجے ہوں گے کہ میرے کمرے کے باہر آٹھ دس افراد میری آمد کے منتظر تھے

جو مجھے دیکھتے ہی کھڑے ہوگئے۔ میں اپنی نشست پر جا بیٹھا۔ ابھی پوری طرح روزنامچہ اور فائلوں وغیرہ کو درست نہ کر پایا تھا کہ یہ سب لوگ کمرے میں آگئے۔ کمرے میں محض چند نشستیں تھیں اس لیے چند تو ان پر بیٹھ گئے اور باقی پیچھے کھڑے ہوکر کارروائی کا مشاہدہ کرنے لگے۔ میں نے پوچھا" خیر تو ہے؟"

یکدم کئی لوگ ایک ساتھ بولنے لگے۔

میں نے کہا" پہلے ایک صاحب بات کریں اس طرح کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔"

وہ سب خاموش ہوگئے پھر ان میں سے ایک بولا۔

"ہم البدر ٹاؤن میں رہتے ہیں۔ گلی نمبر گیارہ کے مکان نمبر سترہ میں ڈکیتی اور قتل کی ایک واردات ہوگئی ہے۔ ڈاکو جو کچھ لینا تھا لے جاتے مگر وہ تو صاحبِ خانہ کو بھی موت کی نیند سلا گئے۔"

وہ کچھ اور کہتا کہ دوسرا بولا۔" میرا خیال ہے ڈکیتی کی واردات نہیں کوئی دشمنی معلوم ہوتی ہے کیونکہ میری بیوی بتاتی ہے کہ زیورات یا نقدی نہیں لے گئے۔"

تیسرا بولا۔" بڑی الجھی کیفیت ہے۔"

بقیہ بھی کچھ کہنا چاہتے تھے کہ میں نے کہا۔" آپ سب پرچہ کٹوانے آئے ہیں یا اطلاع دینے؟"

وہ بولے" ہم تو صرف اطلاع دینے آئے ہیں، پرچہ تو ان کے خاندان کا کوئی فرد ہی کٹوائے گا۔"

میں نے گھر کا پتا نوٹ کیا اور فوری طور پر جائے وقوعہ پر پہنچنے کا وعدہ کرکے ان سب کو فارغ کیا۔

بحیثیت ہیڈ محرر میں اس پولیس اسٹیشن میں پانچ سال سے مقیم تھا۔ یہ علاقہ متوسط اور غریب آبادی پر مشتمل ہے۔ پُرامن لوگ یہاں کے باسی ہیں۔ جیب کٹنے یا چھوٹی موٹی چوری سے بڑھ کر وارداتوں کا ارتکاب یہاں کا معمول نہیں۔ میری دانست میں گزشتہ پانچ سال میں قتل کی کوئی واردات اس تھانے کی حدود میں نہیں ہوئی، ہاں ایکسیڈنٹ کے واقعات ضرور ہوئے جن میں انسانی جانوں کا نقصان ہوتا رہا ہے۔ ان لوگوں کے چلے جانے کے بعد میں نے ڈیوٹی افسر.... ایس آئی فیاض کو جا کر تمام واقعے سے باخبر کیا جس پر وہ پولیس موبائل لے کر جائے وقوعہ کی طرف روانہ ہونے لگا تو بولا" آؤ تم بھی چلو ابھی اور کون سا ایسا معاملہ آئے گا جسے تمہیں دیکھنا ہے۔"

میں بھی وہاں جانے کے لیے موبائل میں بیٹھ گیا۔

ہمارے ہمراہ تین سپاہی بھی تھے۔ ہم جائے وقوعہ پر پہنچے تو گلی میں لوگوں کی بھیڑ لگی تھی۔ پولیس آتی دیکھ کر بھیڑ چھٹنے لگی۔

گھر میں داخل ہونا خاصا مشکل تھا کیونکہ خواتین اس واقعے کی خبر پا کر بے تحاشا دوڑی آرہی تھیں۔ ہم نے بمشکل خواتین کو باہر نکالا اور کہا" گھر کے ہر حصے کا معائنہ کرنا ہے۔ قریبی رشتے داروں کے علاوہ سب ہٹ جائیں تاکہ تفتیش میں آسانی رہے۔"

گھر کے ایک حصے میں مقتول کی لاش ایک چارپائی پر پڑی تھی جسے چادر سے ڈھانپا گیا تھا۔ انسپکٹر فیاض اور میں نے لاش کا معائنہ کیا تو اندازہ ہوا کہ اسے گلا گھونٹ کر مارا گیا ہے جس سے قبل اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے گئے تھے۔ فیاض نے پوچھا" رسیاں کس نے کھولیں؟"

قریب ہی کھڑے ایک شخص نے بتایا" جب بی بی کی چیخ و پکار سن کر اہلِ محلہ دروازے پر آئے تو اس نے چلاتے ہوئے بتایا کہ دروازہ توڑ کر یا دیوار پھاند کر آجائیں میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہیں۔ کسی نے اندر کود کر دروازہ کھولا پھر ہم سب اندر آئے۔ پہلے خاتونِ خانہ کے ہاتھ پیر کھولے پھر اس کی نشاندہی پر دوسرے کمرے میں مقتول کی رسیاں کاٹیں۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ زندہ ہوں گے مگر بے سدھ اور بے جان جسم ٹھنڈا پڑا تھا۔ انہیں چارپائی پر لٹایا۔ بی بی اسی وقت سے دھاڑیں مار مار کر رو رہی ہیں۔ غش کھا کر بے ہوش ہو جاتی ہیں۔ ان کے میکے اور سسرال والوں کو اطلاع دے دی ہے۔ مقتول کی ماں اور بہن تو آچکی ہیں اور......" ابھی اس کا جملہ پورا نہ ہوا تھا کہ چند مرد اور خواتین آہ و زاری کرتے گھر میں داخل ہوئے۔ یہ سب مقتول کے سسرالی رشتے دار تھے۔

فیاض نے کہا۔" آپ لوگوں کو رسیاں نہیں کاٹنی چاہیے تھیں اب ہاتھ کے وہ نشانات حاصل کرنا مشکل ہو جائیں گے جن سے قاتل کی شناخت میں سہولت ہو پاتی، خیر......" فیاض نے کہا۔" چند قریبی رشتے دار آجائیں۔"

چند ایک نزدیک آکر کھڑے ہوگئے انہیں لے کر ہم ایک پڑوسی کے گھر جا بیٹھے۔ شوہر اور بیوی کے تعلقات، موجودہ مکان میں قیام کی مدت، ملازمت کی نوعیت اور کچھ دیگر ضروری معلومات حاصل کیں جن کے مطابق ان دونوں کی شادی کو چھ سات برس ہوگئے تھے۔ ان کے تین بچے تھے۔ مقتول بینک میں ملازم تھا۔ چار بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ شادی کے دو تین سال تک وہ ماں باپ کے ساتھ رہے

پھر ناچاقیاں بڑھیں تو چار سال قبل یہاں مکان لے کر رہنے لگے۔ سسرال والے تو آتے جاتے تھے مگر مقتول کے والدین یا بہنوں میں سے کوئی شاذ و نادر ہی آتا تھا البتہ مقتول ریحان ہر ہفتے اپنے والدین سے ملنے جاتا تھا۔ وہ اپنے ہمراہ بچوں کو بھی لے جاتا۔ بیوی ساس سسر کے گھر جانا اپنی شان کے خلاف سمجھتی تھی۔

ان معلومات کے حصول کے بعد ہم دوبارہ جائے وقوعہ پر آئے۔ گھر کے ہر حصے کا جائزہ لیا۔ ٹوائلٹ، کچن، اسٹور اور دوسرے کمرے کا جہاں ریحان کو قتل کیا گیا پھر اس کمرے کا جہاں چند گھنٹے قبل بیوہ ہونے والی اپنے بچوں کے ہمراہ سو رہی تھی۔ فیاض نے کچن اور اسٹور کا بغور جائزہ لیا پھر" ہوں۔" کہہ کر معنی خیز انداز میں میری طرف دیکھا اور ان دونوں حصوں کو تالا لگانے کا حکم دے کر بیوہ سے کچھ سوالات کرنا چاہے مگر اس کی حالت تو غیر ہو رہی تھی۔ وہ روئے جا رہی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ جیسے اس نے سوال سنے ہی نہیں جس کے بعد ہم نے لاش کو پوسٹ مارٹم کی غرض سے اسپتال روانہ کیا اور چند ایسے پڑوسیوں کو مزید معلومات کی غرض سے تھانے چلنے پر آمادہ کیا جو سب سے پہلے جائے وقوعہ پر پہنچے تھے۔ تھانے جانے کے نام پر محلے دار پیچھے ہٹنے لگے تھے کیونکہ ہر ایک تھانے اور عدالت کی پیشیوں اور گواہیوں میں الجھنے سے بچنا چاہتا ہے مگر اس یقین دہانی پر کہ کچھ سوالات کے بعد آپ کو چھوڑ دیا جائے گا اور شاملِ تفتیش نہیں کیا جائے گا وہ لوگ مان گئے۔ تین پڑوسی فہیم، نعمان اور سعادت تیار ہوئے۔ ان کے ساتھ مقتول کے بہنوئی اور برادرِ نسبتی کو بھی ہم تھانے لے آئے تاکہ ان کی معیت میں قتل کی رپورٹ لکھی جائے۔ ابتدائی تفتیش سے یہ قیاس یقین میں بدل چکا تھا کہ یہ ڈکیتی کی واردات نہیں محض قتل کی واردات ہے مگر یہ کیوں رونما ہوئی اس نکتے پر خاصا الجھاؤ تھا کیونکہ شوہر اور بیوی کے تعلقات خاصے خوشگوار تھے۔ رہی سسرال سے تعلقات کی بات تو حالیہ کوئی واقعہ ایسا نہ تھا جو اتنے بڑے سانحے کی بنیاد بنتا۔

تھانے پہنچ کر پڑوسیوں سے پوچھ گچھ شروع ہوئی، فیاض نے پوچھا۔ گھر میں پہلے کون داخل ہوا؟"

نعمان نے گھبراتے ہوئے کہا۔" سب نے کہا تم چڑھ کر اندر سے دروازہ کھول دو تو میں نے اندر کود کر دروازہ کھول دیا تھا پھر سعادت، فہیم اور دوسرے پڑوسی بھی اندر داخل ہوئے۔"

مشہور مصنف الگزینڈر ڈوما، رسالوں کے لیے اپنے مضامین گلابی کاغذ پر، اپنی شاعری پیلے کاغذ پر اور اپنے ناول نیلے کاغذ پر لکھتا تھا۔

☆☆☆

مختصر افسانے کا بانی ایڈگر ایلن پو...... لکھتے وقت اکثر اپنی بلی کو اپنے کندھے پر بٹھا لیتا تھا۔

مرسلہ: کرن ناز...... نارتھ کراچی

فیاض نے کہا" جتنا پوچھوں اتنا بتاؤ۔" جس پر وہ خاموش ہو رہا۔ فیاض نے پوچھا" جب تم صحن میں داخل ہوئے تو کمرے کا دروازہ کھلا تھا؟"

جس پر وہ بولے۔" ہاں بھڑا ہوا تھا مگر کنڈی نہیں لگی تھی۔"

" اچھا جب تم کمرے میں داخل ہوئے تو خاتونِ خانہ کس حال میں تھیں۔ کیا چاروں ہاتھ پاؤں بندھے تھے؟"

" کمرے کا دروازہ کھلتے ہی شاید انہوں نے اپنا ہاتھ رسیوں میں کیا تھا۔" سعادت بولا۔

فہیم نے بھی اس کی تائید کی جس پر نعمان نے کہا۔" میرا خیال ہے ہم نے پہلے پیر کی رسیاں کاٹی تھیں اور اس دوران میں ان کے ہاتھ رسیوں سے جدا ہو چکے تھے۔"

فیاض نے پوچھا" اور ان کی حالت کیسی تھی؟"

جس پر تینوں ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے پھر سعادت بولا۔" کچھ پریشان تو تھیں۔"

" میں پوچھ رہا ہوں وہ رو رہی تھیں یا نہیں؟" فیاض بولا۔

تینوں نے یک زبان کہا۔" رونا پیٹنا تو انہوں نے ہاتھ پیر کھلنے کے بعد شروع کیا تھا۔"

" ہوں۔" پھر فیاض نے پوچھا۔" مقتول کے کمرے کا دروازہ؟"

نعمان بولا۔" وہ باہر سے بند تھا۔"

اس سوال و جواب کے دوران خاتونِ خانہ کا بھائی غصے سے پھٹ پڑا۔" انسپکٹر صاحب! آپ کیس کو غلط رخ

WWW.PAKSOCIETY.COM

دے رہے ہیں۔"

"ابھی تو ابتدائی تفتیش ہو رہی ہے آپ بلاوجہ پریشان ہو رہے ہیں۔ ہم تو ہر پہلو کو مدنظر رکھتے ہیں۔ ہماری کسی سے رشتے داری تو ہے نہیں جو بلاوجہ طرف داری کریں۔ چلیں اسے چھوڑیں آپ کے پاس کوئی ایسی معلومات ہیں جو معما حل کر سکتی ہوں تو بتا دیں۔" فیاض نے کہا۔

وہ ہونٹ کاٹ کر خاموش ہو رہا۔

سوال و جواب کا یہ سلسلہ کچھ اور دیر جاری رہا پھر فیاض نے مقتول ریحان کے بہنوئی سے پوچھا۔ "آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟"

وہ بڑے دل گرفتہ لہجے میں بولا۔ "کچھ نہیں کہنا، جانے والا تو جا چکا۔"

فیاض نے فون کر کے علاقہ ڈی ایس پی سے دو لیڈی پولیس انسپکٹر کی خدمات حاصل کیں تاکہ تفتیش کے دائرے کو بڑھایا جا سکے۔ ان کی آمد کے بعد پولیس پارٹی دوبارہ جائے وقوعہ پر پہنچی۔ اب شامیانہ لگ چکا تھا۔ مرد گلی میں اور خواتین گھر کے صحن میں بین کر رہی تھیں۔ میت کے آنے کا انتظار تھا کہ غسل کے بعد تجہیز و تکفین کی جا سکے۔ میں، فیاض اور دونوں خواتین انسپکٹر بمشکل راستہ بناتے گھر میں داخل ہوئے۔ کچن کا تالا کھولا اور ارد گرد کھڑے ہونے والوں کو وہاں سے ہٹا کر اندر جا کر اپنی ساتھی لیڈی تفتیشی افسر کی توجہ اس جانب مبذول کروائی کہ ٹرے میں چار پرچ پیالیاں رکھی ہیں، بسکٹ اور پھلوں کے چھلکے ہیں، چائے کی رنگت بتاتی ہے کہ یہ رات کی نہیں بلکہ صبح سویرے بنائی گئی ہے پھر فیاض نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔ "تم سمجھ رہی ہو نا؟"

"ہاں مگر کچھ اور بھی ہے کیا؟" وہ بولی۔

"ایک اور ثبوت ہو سکتا ہے جو اسٹور میں ہے۔" فیاض بولا۔

کچن دوبارہ مقفل کیا گیا پھر اسٹور کا دروازہ کھولا جہاں ایک چادر موجود تھی جسے کھول کر دیکھتے ہوئے معنی خیز مسکراہٹ لیڈی انسپکٹر کے چہرے پر نمایاں ہوئی۔ اسٹور کو بھی تالا لگا دیا گیا پھر میں اور فیاض باہر آ گئے بقیہ کام لیڈی انسپکٹرز نے پورا کیا۔ وہ اندر گئیں اور خاتون خانہ نگہت کو لے کر دوسرے کمرے میں دروازہ بند کر کے تفتیش کرنے لگیں۔

محض پندرہ منٹ بعد دونوں پولیس افسران نگہت کو ہمراہ لیے باہر آئیں تو اس کا بھائی بولا۔ "آپ انہیں کہاں لے جا رہی ہیں؟"

"ابتدائی رپورٹ کے لیے ان کا بیان لینا ہے۔ واقعے کی محض یہی عینی گواہ ہیں، فوری طور پر جو معلومات حاصل ہوں گی وہ بعد میں ذہن سے محو ہو سکتی ہیں۔ آپ چاہیں تو ساتھ چلیں۔" وہ بولیں۔ نگہت کا بھائی اور مقتول کی ایک بہن بھی ساتھ ہو لیے۔

تھانے پہنچنے تک نگہت کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ اس نے چلتی گاڑی سے کودنے کی کوشش کی مگر دونوں انسپکٹرز نے بہت جلد اسے قابو کر لیا جس پر اس کا بھائی پولیس کو لعن طعن کرنے لگا "تم سب پتھر ہو چکے ہو۔ تم کو ذرا بھی لحاظ نہیں کہ میت کے گھر سے بیوہ کو لے آئے ہو۔ ابھی تدفین بھی نہیں ہوئی اور میری بہن کو ڈرا دھمکا رہے ہو۔"

"برادر! آپ بلاوجہ مشتعل ہو رہے ہیں۔ ہماری آپ کی بہن سے کوئی دشمنی تو ہے نہیں جو بلاوجہ الزام تراشی پر اتر آئے ہیں۔ مجھے تو خود معلوم نہیں کہ انسپکٹر صاحبہ سے ان کی کیا بات ہوئی ہے۔ تھانے میں بیٹھ کر آپ کے سامنے ہی بات ہو گی۔ آپ خوامخواہ پریشان ہوئے جاتے ہیں۔" فیاض نے کہا۔

تھانے پہنچ کر ہم تفتیشی کمرے میں پہنچے جہاں میں، فیاض، دونوں لیڈی انسپکٹرز، مقتول کی بیوہ، اس کا بھائی، مقتول کی بہن موجود تھے۔ ابھی سب بیٹھے ہی تھے کہ ایس ایچ او صاحب بھی آ گئے۔ وہ روزنامچہ پڑھ چکے تھے اس لیے ایک طرف بیٹھتے ہوئے بولے۔ "آپ تفتیش کریں میں بیٹھا ہوں۔"

"تفتیش وفتیش کیسی، میری بہن کا گھر اجڑا ہے اب اسی کو اس میں پھنسانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ یہاں انصاف کیا ملے گا۔" نگہت کا بھائی بولا۔

یہ کہتے ہوئے اس کی آواز خاصی بلند ہو گئی تھی جس پر ایس ایچ او نے گرج دار آواز میں کہا۔ "خاموش ہو جاؤ، ہمیں اپنا کام کرنے دو۔"

چند لمحے خاموشی طاری رہی پھر لیڈی انسپکٹر نے نگہت کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔ "رات آپ کے گھر مہمان آئے تھے؟"

"مجھے یاد نہیں۔" وہ بولی۔

انسپکٹر فیاض نے مداخلت کی "تو پھر آپ کے کچن میں چار پرچ پیالیاں، فروٹ کے چھلکے اور بسکٹ کے ٹکڑے کیوں رکھے ہیں؟"

یہ سنتے ہی نگہت کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اس نے

WWW.PAKSOCIETY.COM

کچھ کہنا چاہا اور پھر دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر رونے لگی۔

''میں پوچھتی ہوں مہمان آئے تھے یا نہیں؟ کیونکہ تمہیں معلوم نہیں تمہارے ان تینوں یاروں میں سے دو پکڑے جا چکے ہیں جنہیں تم نے خود بلایا تھا۔'' انسپکٹر کا جملہ پورا ہونے سے قبل ہی نگہت رونا بھول کر آنکھیں پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی جس پر لیڈی انسپکٹر نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''فیاض صاحب! مجھے لگتا ہے یہ خود تو بتائیں گی نہیں آپ ان دونوں کو سامنے لے آئیں تاکہ ان کے غیرت مند بھائی کو بھی بہن کے کرتوت کا پتا چل جائے۔''

اچانک نگہت اٹھی اور سامنے کی دیوار میں ٹکریں مارنے لگی جتنی دیر میں اسے پکڑتے اس نے اپنا چہرہ لہولہان کرلیا تھا۔ اس کا بھائی بے حس و حرکت بیٹھا غیر متوقع حالات کا سامنا کر رہا تھا۔ نگہت کو پکڑ کر دوسرے کمرے میں لے جایا گیا جہاں اس کی مرہم پٹی کے بعد دونوں لیڈی انسپکٹرز اس سے مزید تفتیش میں مصروف ہوگئیں۔

دوپہر دو بجے کے قریب میں اسپتال پہنچا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ تیار تھی جس کے مطابق موت بے ہوشی کے بعد گلے میں پھندا ڈالنے کی بنا پر ہوئی تھی۔ میت وارثین کے حوالے کی گئی۔ جب میں تھانے لوٹا تو یہاں عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ ایمبولینس مریضہ کو لے جانے کے لیے تیار کھڑی تھی معلوم ہوا کہ کچھ دیر سے نگہت سو رہی تھی مگر اب اندازہ ہوا کہ وہ بے ہوش ہے۔ میں پھر اسپتال پہنچا جہاں کچھ دیر بعد نگہت ابدی نیند سو چکی تھی۔ ایک بار پھر پوسٹ مارٹم کا مرحلہ درپیش تھا جو شام ہو جانے کی وجہ سے اگلے دن پر موقوف ہوا۔

جب میں ان واقعات کی مکمل رپورٹ تیار کر رہا تھا تو مجھ پر لیڈی تفتیشی افسران کی رپورٹ سے منکشف ہوا کہ یہ سب کچھ محض چند ہزار روپے کی وجہ سے رونما ہوا۔ نگہت نے اپنی سہیلی کی شادی میں انگوٹھی دینے کی خواہش ظاہر کی جسے اس کے شوہر ریحان نے رد کر دیا مگر وہ نہ مانی اور کسی سود خور سے قرض حاصل کر کے انگوٹھی بطور تحفہ دے دی۔ ریحان کو اپنی ہتک کا احساس ہوا کہ اس کی بیوی نے اس کا کہنا کیوں نہیں مانا جس کے بعد گھر کا خرچ ریحان نے سنبھال لیا۔ یوں نگہت کے لیے قرض کی ادائیگی مشکل سے مشکل تر ہوتی گئی۔ چند مہینوں میں اصل رقم کے برابر سود چڑھ گیا جسے اتارنے کی کوشش میں وہ پریشان رہنے لگی۔ ایک غلطی پر دوسری یہ کی کہ اس نے اپنے ایک پرانے کلاس فیلو اسلم سے اس کا ذکر کیا جس نے تمام رقم دے دی مگر اس کے بدلے آسودگی کا خواہش مند ہوا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی نگہت اس پر آمادہ ہوگئی۔ پہلی لغزش بڑی مصیبت کا باعث بنی۔ ریحان کے دفتر اور دونوں بڑے بچوں کے اسکول چلے جانے کے بعد کم و بیش ہر روز اسلم نگہت کے گھر آجاتا اور کچھ ردّوکد کے بعد اختلاط کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ نگہت کے لیے اس سے پیچھا چھڑانے کی کوئی صورت نہ تھی کیونکہ اب وہ بلیک میلنگ پر اتر آیا تھا۔ پہلے سود خور سے جان چھوٹی تو دوسرے نے اپنے پنجے گاڑ لیے۔ یہ سلسلہ اتنا بڑھا کہ اسلم اپنے ہمراہ دو دوستوں کو بھی لانے لگا۔ وہ کھانے پینے کی اشیا ساتھ لاتے اور کبھی کبھی پرفیوم، سوٹ اور میک اپ کا سامان جو بھوک مٹانے کے عوض اسے تحفے میں دیتے۔ یہ سلسلہ بڑھتے بڑھتے اتنا دراز ہوا کہ نگہت شوہر سے چھٹکارا حاصل کر کے ان تینوں کی آغوش میں پناہ تلاش کرنے لگی۔ ریحان کو راہ سے ہٹانے کے لیے منصوبہ تیار ہوا۔ واردات کی شب اسلم کے دوست کی لائی ہوئی دوا نگہت نے اپنے شوہر کو سونگھائی جس کے بعد ان تینوں نے اسے دوسرے کمرے میں منتقل کر کے ہاتھ پیر رسیوں سے جکڑ دیے پھر گلے میں پھندا ڈال کر اس کا کام تمام کر دیا۔ رات ڈیڑھ بجے اس کام سے فارغ ہو کر وہ تینوں اور نگہت رنگ رلیاں مناتے رہے۔ جس کے بعد نگہت نے ان کے لیے چائے بنائی جس کے ساتھ فروٹ اور بسکٹ بھی پیش کیے پھر وہ تینوں رخصت ہوئے۔ نگہت نے اندر سے دروازہ بند کیا اور اپنے بستر پر لیٹ کر ہاتھ پاؤں رسیوں میں الجھا لیے۔ کچھ توقف کے بعد اس نے بے تحاشا چیخنا چلّانا شروع کر دیا۔

اب تک تین میں سے دو ملزمان پکڑے جا چکے تھے مگر مقتول کے ساتھ اصل قاتل بھی اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔ میں مزید معلومات کی غرض سے جب ریحان کے گھر پہنچا تو اس کی بوڑھی ماں تینوں پوتے پوتیوں کو لیے کچھ سامان کے ساتھ وہاں سے جانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ میں نے سلام کیا اور پوچھا ''ماں جی۔''

اتنا سنتے ہی وہ سسکیاں لینے لگیں اور بڑی ہمت کے ساتھ بولیں۔ ''بیٹا! گھر تو اجڑ گیا۔ بے ماں باپ کے بچوں کو پالنے کی ذمے داری بڑھاپے میں مجھ پر آن پڑی ہے۔ دعا کرنا یہ کسی لائق ہو جائیں۔''

میں سوالات پوچھے بغیر تھانے کی طرف چل دیا۔

آسیب

مکرمی مدیر اعلیٰ
سلام تہنیت!
مکان اینٹ پتھر اور گارے سے کھڑی کی گئی دیواروں کا نام ہے مگر اس مکان کو گھر کا درجہ دینے کے لیے ضروری ہے کہ مرد اپنے اندر تھوڑی لچک پیدا کرے۔ میں نے یہی تو کیا تھا جس کی وجہ سے آج میرا مکان ایک اعلیٰ درجے کا گھر ہے۔

ارشد محمود
(سیالکوٹ)

میں نے ایک آسیب سے سمجھوتا کرلیا ہے۔

جب ریحانہ سے میری شادی ہوئی تو خواب گاہ میں اس آسیب کی ایک بڑی سی تصویر لگی ہوئی تھی۔ ٹھیک میرے سر کے اوپر اور اس تصویر کو دیکھ دیکھ کر میری رگوں میں چیونٹیاں رینگنے لگتی تھیں۔ میرے اعصاب کشیدہ ہو جاتے۔

میں نے ایک بار ریحانہ سے کہا۔ ''ریحانہ پلیز یہ تصویر یہاں سے ہٹا دو۔''

اتنا کہنا تھا کہ ریحانہ کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ اس نے اتنا شور کیا کہ میں خاموش ہو کر رہ گیا۔

مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ میں جس سے شادی کر رہا ہوں اس کے ساتھ ایک آسیب لگا ہوا ہے، یہ شادی میری پسند کی نہیں تھی بلکہ یہ ایک مجبوری کی شادی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں ان دنوں بے روزگار تھا اور اپنی زندگی کے بدترین کرائسس سے گزر رہا تھا۔ اس وقت میرے رشتے کی ایک خالہ نے مجھے پیغام دیا۔ ''ارشد میں تمہارے لیے ایک رشتہ لے کر آئی ہوں۔''

''کس کا ہے؟''

''ریحانہ نام ہے اس کا۔ اس کی شادی ہو چکی ہے۔ شوہر کا انتقال ہو گیا ہے' بہت خوبصورت اور دولت مند عورت ہے۔''

''کیا بات کر دی تم نے۔'' میری اماں بول پڑیں۔ ''اب کیا میرے ارشد کی شادی بیوہ سے ہوگی۔''

''تو کیا ہوا۔ ارشد کی عمر بھی تو دیکھو۔'' وہ رشتے دار جل کر بولیں۔ ''اڑتیس چالیس کے قریب ہونے والا ہے۔ بالوں میں سفیدی اتر آئی ہے، اس کے علاوہ بہت دنوں سے بے روزگار بھی ہے۔ ریحانہ کا اپنا بزنس ہے۔ یہ بزنس سنبھال لے گا تو اس گھر کے حالات بدل جائیں گے۔''

یہ ہم پر ایک کاری ضرب تھی۔

مفلسی نے ہماری کمر ہی توڑ کر رکھ دی تھی۔ والد صاحب کی معمولی سی پینشن کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔ میری دو بہنیں تھیں۔ میں بی اے کرنے کے بعد ان بہنوں کی شادی کے چکر میں بوڑھا ہو چلا تھا۔

یہ درست ہے کہ میری شخصیت بہت اچھی تھی۔ اچھی خاصی مردانہ وجاہت تھی مجھ میں لیکن ان سب سے کیا ہوتا ہے۔ مفلسی سب بہار کھوتی ہے۔ مرد کا اعتبار کھوتی ہے۔

خواب دیکھتے دیکھتے وقت کا بہت خوبصورت حصہ بیت گیا تھا اور ابھی بھی صرف امیدیں تھیں' ہم جیسوں کے ساتھ اگر یہ امیدیں بھی نہ ہوں تو نہ جانے کس طرح ہم دم توڑ دیں۔

رشتے دار خاتون کے جانے کے بعد ہم سب سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ یہ ایک بے رحم حقیقت سہی لیکن سچائی یہی تھی کہ میرے لیے آسمان سے کوئی حور نہیں اتر سکتی تھی۔ کوئی کنواری لڑکی میرے لیے بیٹھی ہوئی نہیں ہو سکتی تھی۔

بہت سوچ بچار کے بعد میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ مجھے اس عورت سے شادی کر لینی چاہیے۔ میں نے جب اپنی اماں اور ابا سے تذکرہ کیا تو وہ بھی خاموش رہے' شاید انہیں یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ میں نے ایسا فیصلہ کیوں کیا ہے؟

لیکن میں نے ان رشتے دار خاتون کے سامنے ایک شرط رکھ دی۔ ''خالہ' میں پہلے ان سے ملوں گا پھر کوئی فیصلہ کروں گا۔''

''ہاں ہاں' کیوں نہیں'' خالہ خوش ہو گئی تھیں۔ ''جب چاہو مل لو۔''

ایک شام میں اُن خاتون کے ساتھ ریحانہ سے ملنے اس کے گھر پہنچ گیا اور گھر کو دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ واقعی بہت دولت مند ہے۔ بہت بڑا گھر شہر کے ایک پوش علاقے میں ہے۔ انتہائی قیمتی اور نفیس فرنیچر غرضیکہ آسائش کی ہر چیز میسر تھی۔

خود ریحانہ بھی چھبیس ستائیس سال کی ایک خوبصورت اور باوقار عورت تھی۔ اس کی دولت نے اس کے لہجے اور اس کے چہرے پر خود اعتمادی پیدا کر دی تھی۔

ہمارے اس انٹرویو کے دوران وہ رشتے دار خاتون ڈرائنگ روم سے باہر چلی گئی تھیں۔

''تم مجھ سے شادی کیوں کرنا چاہتے ہو؟'' ریحانہ نے براہِ راست بہت ہی تیکھے لہجے میں سوال کیا۔

''میرا مسئلہ شادی ہے تم ہو یا کوئی اور ہو۔'' میں نے بھی اسی کے انداز سے جواب دیا تھا۔

''کہیں ایسا تو نہیں کہ تم میری دولت کے چکر میں مجھ سے شادی کر رہے ہو۔''

''معاف کرنا میں تو تمہیں جانتا بھی نہیں تھا۔'' مجھے اب غصہ آنے لگا تھا۔ ''اور مجھے یہاں تک لانے والی نے تمہارے مزاج کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا ورنہ میں یہاں تک بھی نہیں آتا۔''

''اچھا اچھا بیٹھ جاؤ۔'' اس نے کہا۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ میں ایک بیوہ عورت ہوں۔ میں نے مرحوم سے بہت محبت کی تھی لیکن قسمت نے مجھے اس سے جدا کر دیا۔ میں تو اس کی یادوں کے سہارے زندگی گزار لیتی۔ لیکن یہ بدبخت معاشرہ ایسا ہے کہ عورت کو کسی مرد کے سہارے کی ضرورت ہوا کرتی ہے میں اسی لیے دوسری شادی کر رہی ہوں ورنہ مجھے ایسا کوئی شوق نہیں ہے۔''

اس وقت ریحانہ مجھے ایک ٹوٹی ہوئی عورت دکھائی دی تھی۔ ایسی عورت جس نے کسی سے محبت کی تھی۔ اس سے اس کی شادی ہو گئی تھی پھر قسمت نے اس کی محبت کو موت کی نیند سلا دیا تھا اور اب وہ ایک سہارے ایک پناہ گاہ کی تلاش میں تھی۔ اسی لیے وہ ایک بار پھر اپنے آپ کو آباد کرنے کا فیصلہ کر رہی تھی۔

''میری طرف سے تم بالکل اوکے ہو۔'' اس نے کہا۔

''میرا بہت بڑا بزنس ہے۔ تم اس بزنس کو سنبھالو گے لیکن میری ایک شرط ہے۔''

''وہ شرط بھی بتا دو۔''

''وہ شرط یہ ہے کہ تمہیں یہاں میرے ساتھ رہنا ہوگا۔'' اس نے کہا۔ ''میں وہ نہیں ہوں جو رخصت ہو کر تمہارے ساتھ جاؤں۔''

''یہ تو بہت عجیب شرط ہے۔''

''یہ شرط تو ماننی ہوگی۔'' وہ مسکرا کر بولی۔ ''تم خود سوچو میں اتنے بڑے گھر، اتنے ساز و سامان اور اتنے بڑے بزنس کو چھوڑ کر کہاں جا سکتی ہوں اسی لیے تمہیں یہاں آنا ہوگا۔''

میں نے واپس آ کر اپنے گھر والوں کو جب یہ بتایا تو وہ بھی کچھ سوچنے لگے تھے پھر والد صاحب نے کہا۔ ''دیکھو بیٹا یہ تو طے ہے کہ تم نے اس سے شادی کر لی تو وہ کبھی بھی یہاں نہیں رہے گی اس کے علاوہ دوسری بات یہ ہے کہ اس سے تمہاری شادی تمہارے بہتر مستقبل کے لیے ہوگی، اگر تم نے اس کا کاروبار ہوشیاری سے سنبھال لیا تو پھر نہ صرف تمہاری زندگی بن جائے گی بلکہ تمہاری دونوں چھوٹی بہنوں کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔''

''تو یہ تھی وہ مجبوری اور اسی مجبوری نے میری شادی ریحانہ سے کروا دی تھی۔

میں اس کے گھر شفٹ ہو گیا تھا۔ بظاہر سب کچھ ٹھیک ہی تھا لیکن مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ ریحانہ کے ساتھ ایک آسیب لگا ہوا ہے اور وہ آسیب میری زندگی تلخ کر کے رکھ دے گا۔

شادی کی پہلی رات جب میں خواب گاہ میں داخل ہوا تو میں نے اس آسیب کی تصویر دیکھ لی۔ وہ بڑی سی تصویر دیوار پر ٹھیک ہماری نگاہوں کے سامنے لگی ہوئی تھی۔

''یہ تصویر کس کی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میرے مرحوم شوہر عامر کی۔'' ریحانہ نے بتایا۔ ''تم خود دیکھ لو عامر کتنے خوبصورت تھے۔''

عامر واقعی ایک وجیہہ نوجوان تھا لیکن وہ تصویر مجھے بے چین کر رہی تھی۔ مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے ریحانہ سے کہا۔ ''ریحانہ کیوں نہ اس تصویر کو ہم کہیں اور لگا دیں۔''

''خبردار۔'' ریحانہ بھڑک اٹھی تھی۔ ''تم نے پہلی بار یہ بات کہی ہے آئندہ ایسی بات مت کرنا۔ میں اپنی زندگی کے کسی بھی لمحے عامر کی یادوں سے جدا نہیں ہو سکتی سمجھے۔''

اور میں نے سمجھ لیا کہ عامر کا آسیب ریحانہ پر مسلط ہے۔

کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا جیسے اس گھر میں میری کوئی اہمیت نہیں ہے بلکہ جو کچھ ہے وہ عامر ہی ہے۔ وہ اپنی موت کے بعد بھی مسلط ہو گیا تھا۔ ریحانہ ہر وقت میرا اُس سے موازنہ کرتی رہتی تھی۔ ''یہ تم کس طرح چلتے ہو۔ عامر کی تو چال بھی پُرکشش تھی۔ تمہیں ٹھیک سے کھانا بھی نہیں آتا یا تمہیں عامر کی طرح لباس کی میچنگ بھی نہیں آتی۔''

میں جھلا کر رہ جاتا تھا۔ ہر وقت عامر عامر۔ ریحانہ ہر بات میں اس کی مثالیں دے کر مجھے احساسِ کمتری میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔ ایک دن میں نے جھلا کر کہہ ہی دیا۔ ''اگر تمہارے لیے عامر ہی سب کچھ تھا تو مجھ سے شادی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ عامر ہی کی یادوں کے ساتھ زندگی گزار لیتیں۔ خوامخواہ مجھے اذیت میں کیوں مبتلا کرتی رہتی ہو۔''

''مرد کی فطرت ہی ایسی ہوتی ہے۔'' وہ ہنس پڑی۔ ''مرد اپنے رقیب کو کبھی برداشت نہیں کرتا، چاہے وہ بے چارہ رقیب مرا ہی کیوں نہ گیا ہو۔''

''تو پھر تم ہی بتاؤ میں کب تک عامر عامر کی رٹ سنتا رہوں۔'' میں نے کہا۔ ''ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔''

''یہ تو تمہیں برداشت کرنا ہی پڑے گا۔''

اس ایک بات کے سوا ریحانہ سے مجھے اور کوئی شکایت نہیں تھی۔ وہ خیال رکھنے والی عورت تھی۔ اس نے اپنا کاروبار میرے حوالے کر دیا تھا۔ کاروبار کی نوعیت کچھ یوں تھی کہ اس کی پوری ایک مارکیٹ تھی جس میں کم از کم پچاس دکانیں تھیں۔ ان دکانوں کی مینجمنٹ، کرائے وصول کرنا، مارکیٹ کی مینٹی نینس کا خیال رکھنا یہ ساری ذمے داریاں تھیں۔

اور یہ کوئی بڑی ذمے داریاں نہیں تھیں پھر بھی اچھی خاصی مصروفیت رہا کرتی۔ وہ سارے پیسے ریحانہ کے اکاؤنٹ میں چلے جاتے۔ ریحانہ مجھے ہر ماہ چالیس ہزار روپے دیا کرتی تھی۔ میں بیس ہزار اپنے گھر والوں کو دے دیتا۔

بس کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں نے اپنے آپ کو فروخت کر دیا ہو۔ میں اپنی بیوی کے روپے پر گزارہ کر رہا ہوں۔ ریحانہ کے سامنے شرمندگی بھی محسوس ہوا کرتی اور خاص طور پر اس وقت جب وہ عامر کے حوالے دیا کرتی۔

مجھے عامر زندہ محسوس ہوتا تھا اپنے اردگرد' پورے گھر میں چلتا پھرتا ہوا۔ اس کے آسیب نے پورے گھر کو گھیر رکھا تھا۔ ہر چیز سے اس کی یادیں وابستہ تھیں اور مصیبت یہ تھی کہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

ریحانہ کو وہ یادیں بہت عزیز تھیں۔ وہ ان سے جدائی کبھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

میں نے اپنے طور پر ریحانہ کو سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی لیکن وہ صرف ایک ہی بات کہا کرتی۔ ''ارشد بس صرف اس معاملے میں کمپرومائز نہیں ہوگا میرے لیے عامر کی یادوں کی بہت اہمیت ہے اور تمہارا کیا نقصان ہو رہا ہے وہ بے چارہ اب اس دنیا میں تو نہیں رہا۔''

''وہ تو نہیں رہا لیکن اس کا آسیب تو تم پر سوار ہے نا۔''

''وہ تو زندگی بھر کا ساتھ ہے۔''

ایک وقت ایسا بھی آیا کہ میرے لیے عامر کی یادوں کا آسیب عذاب بن کر رہ گیا۔ حالانکہ مجھے کسی قسم کی پریشانی نہیں تھی اس کے باوجود میں نے یہ ارادہ کر لیا تھا کہ میں ریحانہ سے علیحدگی اختیار کر لوں گا۔ اب جا کر احساس ہوا تھا کہ کسی عورت کا پہلا شوہر اس کے لیے کتنی اہمیت رکھتا ہے۔

ریحانہ کی ایک دوست تھی صوفیہ موتی والا۔ وہ بھی بزنس کمیونٹی سے تعلق رکھنے والی عورت تھی اور بہت سلجھی ہوئی۔ ایک بار ریحانہ کی غیر موجودگی میں، میں نے اپنا یہ مسئلہ اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔

''ارشد یہ تو ہونا تھا۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''ان دونوں کی محبت میرے سامنے پروان چڑھی ہے۔ میرے سامنے شادی ہوئی اور ایک سال تک میں ان دونوں کو ہنستے بولتے ہوئے دیکھتی رہی ہوں۔''

''تو پھر آپ بتائیں۔ میں ریحانہ کو ان یادوں سے کیسے نجات دلواؤں؟''

''دیکھو' مسئلہ یہی ہے کہ اس ایک سال کے دوران ان دونوں نے زندگی کو ہر رنگ میں ایک ساتھ دیکھا ہے۔ شاپنگ، پارک، بارش کا لطف، سنیما، ہوٹلنگ، سیر، ڈانس، میوزک، غرضیکہ زندگی کے ہر لمحے اور ہر موقع پر وہ دونوں چونکہ ایک ساتھ رہے تھے اسی لیے ریحانہ کے پاس یادوں کا ذخیرہ ہے۔''

''اور زندگی کے ہر پہلو کی یادیں عامر کے حوالے سے موجود ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ہاں۔'' صوفیہ موتی والا نے اپنی گردن ہلائی۔ ''اب کوئی ایسی بات سوچو جس کا تجربہ ریحانہ کو عامر کے ساتھ نہ ہوا ہو اور اس تجربے میں اس کے ساتھ تم رہو۔ تو پھر ممکن ہے کہ وہ موقع اور وہ لمحہ صرف تمہارا ہو جائے اور اگر ایک بار ایسا ہو گیا تو پھر آہستہ آہستہ تم بھی اس کی یادوں پر چھاتے چلے جاؤ گے۔''

''تو پھر آپ ہی بتائیں کہ ایسا کون سا تجربہ ہو؟'' میں نے پوچھا۔ ''ایسا کیا ہو جو سب سے الگ ہو۔''

''ہاں ایک بات تو ہے۔'' صوفیہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''اور وہ ہے بیماری' اس ایک سال کے دوران ریحانہ بیمار نہیں پڑی، اب اگر وہ بیمار ہو جائے اور تم اس کی تیمارداری کرو' اس کی خدمت کرو تو پھر یہ بازی تمہارے ہاتھ آ سکتی ہے۔''

بہت ہی عجیب لیکن شاید بہت ہی اچھا مشورہ دیا تھا اس نے۔ ریحانہ کی بیماری کے دوران میں اس کی خدمت کرتا اور ریحانہ کے پاس اس خدمت کا عامر کے حوالے سے کوئی رابطہ نہیں ہوتا تو پھر شاید میں اس کی یادوں اور اس کے تصورات پر بھی قابو پا سکتا تھا۔

یہ صورتِ حال بھی بہت مضحکہ خیز تھی کہ میں ریحانہ کی بیماری کی دعائیں مانگنے لگا تھا۔ وہ بیمار ہو جائے شدید بیمار' میری ساری دعائیں اس کی بیماری کے لیے وقف ہو گئی تھیں۔

لیکن وہ ماشاءاللہ ایک صحت مند عورت تھی' اپنی فٹنس کا بھی خیال رکھا کرتی۔

اس لیے بظاہر اس کی بیماری کے کوئی امکانات نہیں تھے۔

ایک دن میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ ایکسیڈنٹ بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے' ایسا ایکسیڈنٹ جس میں جان کا زیاں نہ ہو، ریحانہ زخمی ہو کر بستر پر پڑ جائے دس بارہ دنوں ہی کے لیے سہی اور میں ان دس بارہ دنوں میں اس کے سر سے عامر کا آسیب اتار دوں۔

میں جیسے جیسے سوچتا رہا یہ خیال جڑ پکڑتا گیا کہ مجھے ایکسیڈنٹ کا سہارا لینا ہے اس کے علاوہ فی الحال اور کوئی راستہ نہیں ہو سکتا تھا اور ایکسیڈنٹ بھی ایسا جو کہ نیچرل محسوس ہو۔ ایسا نہ ہو کہ ریحانہ کو پتا چل جائے اور وہ میری طرف سے غلط فہمی میں مبتلا ہو جائے۔

اور ایک دن ایسا ہو ہی گیا۔

یہ بالکل اچانک ہوا تھا۔ اس میں میرے منصوبے اور میری سوچ کا کوئی دخل نہیں تھا بلکہ شاید قدرت نے مجھے موقع فراہم کر دیا تھا۔ ریحانہ گھر کی سیڑھیوں سے نیچے گر گئی تھی۔ اس کی ایک ٹانگ فریکچر ہو گیا تھا۔

میں اسے اسپتال لے گیا جہاں اس کی ٹانگ پر پلاسٹر کر دیا گیا۔ اس کے بعد وہ گھر واپس آ گئی۔ اب میرے منصوبے کا حصہ شروع ہو گیا۔ میں نے اس کی دیکھ بھال اور خدمت شروع کر دی۔

اس کا یہ کہنا تھا کہ کسی نرس کو رکھ لیا جائے لیکن میں نے

بہت پیار سے منع کر دیا۔ اس کے سارے کام میں خود اپنے ہاتھوں سے کرنا چاہتا تھا۔ اس کی تیمارداری کے دوران اس سے واقعی بہت محبت ہو گئی تھی۔ اور وہ بھی محبت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھتی رہتی۔

ایک ہفتے کے بعد اس نے بالآخر بول ہی دیا جو میں سننا چاہتا تھا۔ اس نے کہا تھا۔ ''ارشد ایسا لگتا ہے جیسے مجھے دوسرا عامر مل گیا ہو۔ تم شاید اس کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ محبت کرنے والے ہو۔''

یہ میری پہلی کامیابی تھی۔ صوفیہ موتی والا کا نسخہ میرے کام آ رہا تھا۔ واقعی عورت کا دل جیتنے کی یہی ترکیبیں ہو سکتی ہیں۔ پندرہ دنوں کے بعد اس کا پلاسٹر اتر گیا تھا اس کے باوجود میں پھول کی طرح اس کی حفاظت کرتا۔ اس کا خیال رکھتا۔

سچ تو یہ ہے کہ میرے دل میں اس کی طرف سے کوئی منفی بات نہیں تھی۔ بس مجھے عامر کے آسیب سے چڑ ہو گئی تھی اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں تھی۔

ایک مہینے بعد وہ پوری طرح صحت مند ہو گئی تھی۔

ہم پھر زندگی کی طرف لوٹ آئے تھے۔

سیر و تفریح، ہوٹلنگ وہ سب کچھ جو وہ عامر کے ساتھ کیا کرتی تھی اور اب میں اس کے ساتھ تھا۔

ایک دن شام کے وقت اس نے مجھ سے ایک عجیب بات کی۔ ''ارشد، میں نے یہ محسوس کر لیا ہے کہ اب تم میرے ہو اور تم شاید میرے لیے عامر سے بھی زیادہ اہمیت اختیار کر گئے ہو۔''

''چلو یہ اچھی بات ہے کہ تم نے مان لیا۔''

''لیکن میں چاہتی ہوں کہ میں پوری طرح عامر کو بھولنے کی کوشش کروں۔'' اس نے کہا۔ ''کیونکہ مجھے یہ احساس ہونے لگا ہے کہ میں شاید پوری طرح تمہاری نہیں ہو سکی ہوں اور یہ تمہارے ساتھ زیادتی ہے۔ اسی لیے میں اس کی یادوں سے چھٹکارا چاہتی ہوں۔ اب تم بتاؤ کہ میں کیا کروں۔''

''بہت آسان ہے' اس سے وابستہ ہر چیز کو اپنے گھر سے ہٹا دو۔'' میں نے مشورہ دیا۔ ''اس کے بعد اس خاکسار کو اپنا سمجھ لو۔''

''اوکے۔'' اس نے رضامندی ظاہر کر دی۔

سب سے پہلے عامر کی تصویر ہٹائی گئی پھر اس کے کپڑے، موزے، جوتے وغیرہ وغیرہ غرضیکہ ایسی کوئی بھی چیز اس گھر میں باقی نہیں رہی تھی جو عامر کی یادوں کے حوالے سے ہو۔

میں نے یہ محسوس کیا کہ میں اس کے اندر سے عامر کو کھرچ نہیں پایا ہوں۔ بظاہر تو اس نے وہی کیا جو میں نے کہا تھا لیکن سامان کو اِدھر سے اُدھر کرتے ہوئے اور اس گھر سے ہٹاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں عامر کی یادوں کے سائے بسے ہوئے تھے۔ ویسے یہ بڑی بات تھی کہ اس نے یہاں تک میری بات مان لی تھی۔

سب کچھ ہٹ گیا۔ عامر کے حوالے سے اب اس گھر میں کچھ بھی نہیں رہا تھا کہ ایک شام اچانک اس نے کہا۔ ''ارشد اگر تم برا نہ مانو تو میرے ساتھ ذرا بازار چلو' مجھے ایک کیک خرید کر کسی کو دینا ہے۔''

''کس کو دینا ہے کیک خرید کر۔''

''کسی بھی غریب کو۔'' اس نے بتایا۔

''خیریت!''

پھر اس نے جھجکتے ہوئے بتایا۔ ''آج عامر کی سالگرہ ہوتی تھی نا مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا۔''

اور اس وقت میں نے محسوس کیا کہ میں شاید ناکام ہو چکا ہوں۔ عامر کی یادوں کو فراموش کروانا میرے بس کی بات نہیں ہے اور مجھے اب اس پر دباؤ نہیں ڈالنا چاہیے۔ میرے لیے یہی بہت ہے کہ وہ اس لمحے میرے ساتھ ہے۔''

اور اس طرح میں نے ایک آسیب سے سمجھوتا کر لیا۔ اب اس گھر میں ریحانہ کا ایک شوہر ہے یعنی میں اور ایک اس کی یادوں کا آسیب ہے۔ میں نے مرحوم کی تصویر دوبارہ خوابگاہ میں لگوا لی ہے اور اس آسیب کے ساتھ گزارہ کیے جا رہا ہوں۔

میری اس کہانی کا مقصد ان تمام لوگوں کو سمجھانا ہے جنہوں نے کسی ایسی عورت سے شادی کی ہے جو بیوہ یا مطلقہ ہو کہ خدا کے لیے اپنی بیوی کے ذہن سے اس کی پرانی یادوں کو کھرچنے کی کوشش نہ کریں۔ اور اگر وہ اپنے سابقہ یا مرحوم شوہر کا تذکرہ کرتی ہے تو کھلے دل و دماغ سے اسے قبول کر لیں کیونکہ یہ ایک بالکل فطری صورتِ حال ہے۔

اور اگر وہ ایسا نہ کرتی ہو تو یہ سمجھ لیں کہ کل اگر خدانخواستہ کرے آپ بھی اس کے ساتھ نہ ہوں تو وہ آپ کو بھی فراموش کر دے گی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

انصاف

محترم مدیر اعلیٰ
السلام علیکم!
میں اپنی آپ بیتی بھیج رہی ہوں۔ اس آپ بیتی میں، میں نے تمام نام اور شہر کے نام بدل دیئے ہیں لیکن یقین کریں تمام واقعات سچے ہیں، میری اپنی آپ بیتی ہے۔ اگر شائع کرسکتے ہیں تو کردیں۔
گل ناز
(مقام نامعلوم)

سوات کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں میرا گھر تھا۔ میرا باپ چرواہا تھا اور تھوڑی زمین تھی جس پر اس نے خوبانی اور سیب کے باغ لگا رکھے تھے۔ گھر میں میری ماں تھی۔ مجھ سے بڑے چار بھائی بہن تھے اور مجھ سے چھوٹے بھی تین تھے۔ ہم پانچ بہنیں اور تین بھائی تھے۔ یہ زیادہ بڑا گاؤں نہیں تھا اور نہ یہاں شہر والی سہولیات تھیں۔ بلکہ شاید اب بھی نہیں ہیں کیونکہ اب تو شہروں میں بھی سہولیات ختم ہو رہی ہیں۔ ہمارے پاس بجلی، گیس اور فون کچھ بھی نہیں تھا۔

گاؤں میں صرف ایک پرائمری اسکول تھا جہاں لڑکے اور لڑکیاں مل کر پڑھتے تھے۔ پرائمری اسکول مفت تھا اس لیے لوگ اپنی بچیوں کو پڑھنے کے لیے بھیج دیتے تھے۔ میں اور میرے بہن بھائی بھی اس اسکول میں پڑھنے جاتے تھے۔ جو پانچویں پاس کرلیتا وہ تعلیم چھوڑ کر کاموں میں لگ جاتا تھا۔ مجھ سے بڑے دو بھائی بابا کے ساتھ جانور چرانے جاتے تھے اور بہنیں گھر اور باغ میں کام کرتی تھیں۔ میں نے بارہ سال کی عمر میں پرائمری پاس کرلی اور پھر میں بھی گھر میں کام کرنے لگی۔

ویسے تو اماں اور بابا ہم سے محبت کرتے تھے۔ ہر ممکن حد تک ہمارا خیال بھی رکھتے تھے۔ انہوں نے ہم تمام بہنوں کو ممکنہ حد تک تعلیم دلوائی۔ کھانے پینے اور لباس کا خیال بھی رکھتے تھے جب کہ میں دوسرے گھروں میں دیکھتی تھی کہ لڑکیوں کو بھیڑ بکریوں سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔

تعلیم تو ایک طرف رہی ان کی خوراک اور لباس پر خرچ بھی رقم کا ضیاع سمجھا جاتا تھا۔ بس انہیں مجبوراً پالا جاتا تھا اور جیسے ہی وہ بالغ ہوتیں ''ونی'' کے نام پر ان سے جان چھڑا لی جاتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ پندرہ سال کی عمر میں لڑکی کی شادی کردی جاتی تھی۔ نکاح کرنے والا شوہر قیمت ادا کرکے اسے لے جاتا تھا۔ اس کے بعد وہ لڑکی کے ساتھ جو چاہے کرے۔ چاہے تو اسے مار ڈالے یا ساری عمر کے لیے قیدی بنا کر گھر میں بند کردے۔ لڑکی کے ماں باپ کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہوتا تھا۔

یہ ہمارے علاقے کا رواج ہے اور اسے کوئی برا نہیں سمجھتا ہے۔ کسی کے ذہن میں نہیں آتا کہ لڑکی جو اللہ کی رحمت ہے اس سے جانوروں کی طرح سلوک کرنا کتنا بڑا گناہ ہے۔ یہ رواج اتنا شدید ہے کہ گاؤں میں پندرہ سال سے اوپر کی کوئی کنواری لڑکی نظر نہیں آتی ہے۔ بلکہ لڑکیوں کی کمی ہے کیونکہ گاؤں میں تقریباً سارے غریب لوگ تھے۔ خوب صورت لڑکیوں کی شادی باہر کرادی جاتی تھی اور گاؤں کے لڑکوں کو کم صورت اور بچی ہوئی لڑکیاں ملتی تھیں۔ یہ بھی پوری نہیں پڑتی تھیں۔ اسی لیے گاؤں کے اکثر لڑکے نوجوانی میں ہی محنت مزدوری کرنے شہروں کی طرف چلے جاتے تھے۔ وہ وہاں رقم بھی کماتے تھے اور ایسا بھی ہوتا کہ انہیں وہیں کوئی لڑکی مل جاتی تو وہ اس سے شادی کرکے وہیں بس جاتے تھے۔ یوں گاؤں کی آبادی ہجرت کرتی رہتی ہے اور آبادی اگر کم نہیں ہوتی ہے تو بڑھتی بھی نہیں ہے۔

بارہ سال کی عمر تک میں نے اپنی دو بہنوں کو دوسرے شہروں میں بیاہتے دیکھا تھا۔ سب سے بڑی بہن کی شادی صرف چودہ سال کی تھی جب بابا نے اس کے لیے ایک چالیس سالہ غلیظ قسم کے شخص کو ہاں کردی۔ صرف اس لیے کہ وہ میری بہن کے عوض چالیس ہزار روپے دینے کو تیار تھا۔ وہ صورت سے گھناؤنا نظر آتا تھا۔ جس دن میری بہن کا اس سے نکاح تھا اس دن وہ گھٹ گھٹ کر روتی رہی اور پھر روتی ہوئی اس شخص کے ساتھ رخصت ہوگئی۔ اس دن ہمارے گھر میں موت کا سا سناٹا تھا سوائے بابا کے سب دکھی تھے۔ بھائی بھی دکھی تھے کیونکہ ابھی ان پر رسم و رواج کی بے حسی غالب نہیں آئی تھی۔ جب دوسری بہن کی شادی بھی اسی طرح ہوئی اور اسے بھی خود سے تقریباً تین گنا بڑا شوہر ملا تو میں اس وقت بارہ سال کی ہوچکی تھی اور اتنی عقل آگئی تھی کہ اپنے لیے خطرہ محسوس کرتی۔ میں جانتی تھی اب میری باری ہے۔

یہ تمام حقائق جوانی سے پہلے میرے علم میں آچکے تھے۔ پھر تعلیم نے بھی شعور اور سمجھ دی تھی۔ میرے اندر سے اس نظام کے خلاف بغاوت ابھرنے لگی اور میں نے اپنی دوسری بہن کی شادی پر ماں سے کہا۔ ''میں اس طرح فروخت نہیں ہوں گی۔''

''تو کیا کرے گی.... یہ یہاں کا رواج ہے اسے تو مرد بھی نہیں بدل سکتے۔''

''میں خودکشی کرلوں گی۔''

''تو خودکشی کرسکتی ہے لیکن اس رواج کو نہیں بدل سکتی۔'' ماں نے دکھ سے کہا۔ ''تیرا باپ تو بے تابی سے انتظار کررہا ہے کہ تو جوان ہو۔''

میں نے ماں سے نہیں کہا لیکن دل میں عزم کرلیا تھا کہ میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ لیکن یہ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ میں اپنے باپ کو ایسا کرنے سے کیسے روک سکتی ہوں۔ میں واقعی سوائے خودکشی کے اور کچھ نہیں کرسکتی تھی۔ میں نے خودکشی کرنے کا کہہ تو دیا تھا مگر میں ایسا کر نہیں سکتی تھی، مجھے موت سے خوف آتا تھا اور زندگی سے پیار تھا۔ میں جینا چاہتی تھی اور اپنی مرضی سے جینا چاہتی تھی۔ یہ اور بات تھی کہ اپنی مرضی سے جینے کا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا۔ وقت گزرتا گیا۔ میں تیرہ سال کی ہوئی۔ جسمانی لحاظ سے جوانی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ میں ویسے بھی خوب صورت اور اپنی عمر سے بڑی ہی دکھائی دیتی تھی۔ روکھی سوکھی

WWW.PAKSOCIETY.COM

کھا کر بھی چہرہ شاداب اور جسم بھرا بھرا تھا۔ اپنا آپ کسے اچھا نہیں لگتا ہے مجھے بھی لگتا تھا مگر ساتھ ہی مجھے اپنی خوب صورتی سے خوف بھی آتا تھا کیونکہ مجھے اس کا انجام معلوم تھا۔

جیسے ہی میرے باپ کو پتا چلا کہ میں شادی کے قابل ہو گئی ہوں اس نے میرے لیے شوہر نما گاہک تلاش کرنا شروع کر دیا۔ میں اسے گاہک ہی کہوں گی جو رقم دے کر چیز حاصل کرے وہ گاہک ہی ہوتا ہے۔ شوہر تو وہ ہوتا ہے جو عزت اور پیار سے بیاہ کر لے جائے بغیر کسی لین دین کے۔ پھر وہی ہوا جس سے میں ڈر رہی تھی۔ ایک دن میرا باپ گھر آیا تو اس کے ساتھ سفید ہوتے بالوں والا ایک سوکھا چمرخ آدمی تھا۔ اس کے چہرے کی ہڈیاں بھی نمایاں تھیں مگر اس کی جیب میں نوٹ تھے اور وہ مجھے خرید سکتا تھا۔ وہ کراچی سے آیا تھا اور اس نے یہ رقم کچرا چن کر جمع کی تھی۔ بے شک وہ جنت سے کیوں نہ آیا ہوتا مجھے اس کا ساتھ منظور نہیں تھا۔ بابا نے کسی کو بتایا نہیں تھا کہ وہ کیوں آیا ہے لیکن اسے گھر میں دیکھتے ہی میں سمجھ گئی تھی پھر رہی سہی کسر بابا کے بار بار بلانے سے پوری ہو گئی۔ عام طور سے گھر کی عورتیں کسی اجنبی کے سامنے نہیں جاتی ہیں لیکن بابا کام کے لیے مجھے ہی آواز دیتا تھا مقصد یہی تھا کہ وہ مجھے اچھی طرح دیکھ لے اور وہ جب مجھے دیکھتا تو اس کی آنکھوں میں چمک آجاتی تھی۔ جب وہ جانے لگا تو میں نے چھپ کر دیکھا وہ بابا کو شادی کی تیاری کے لیے نوٹوں کی ایک گڈی دے رہا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا آگیا تھا گویا میرا سودا پکا ہو گیا تھا اور یہ بیعانے کی رقم تھی۔ اس کے جانے کے بعد بابا نے یہ رقم بھی اس دھاتی ٹرنک میں رکھ دی جس میں وہ اپنی رقم اور قیمتی چیزیں رکھتا تھا۔ اس ٹرنک کی حفاظت کے لیے اس نے اسے زمین میں گڑھا کھود کر..... سیمنٹ کی مدد سے پکا گاڑ دیا تھا صرف اس کا ڈھکن باہر تھا اور اس میں بابا دو مضبوط تالے لگاتا تھا۔

اس شخص کے جاتے ہی میں نے سوچ لیا کہ میں اس کی بیوی نہیں بنوں گی۔ میں گھر سے بھاگ جاؤں گی چاہے میرا انجام جو بھی ہو۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کتنے عرصے بعد دوبارہ آنے کا کہہ کر گیا تھا۔ بابا نے اس بارے میں گھر میں کسی کو ایک لفظ بھی نہیں بتایا تھا۔ وہ پہلے دو بیٹیوں کی شادیاں بھی اسی طرح کر چکا تھا۔ ظاہر ہے بابا جیسے مردوں کے ذہن میں بھی ہوتا ہو گا کہ اگر فیصلے کا پہلے سے اعلان کر دیا تو لڑکیاں بھاگ بھی سکتی ہیں اور خودکشی بھی کر سکتی ہیں اس لیے وہ عین موقع پر اعلان کرتا تھا جب لڑکی لینے والا آجاتا تھا پھر فوراً نکاح پڑھا کر لڑکی اس کے حوالے کی جاتی تھی اور اس کے بعد باپ یا گھر والوں کی ذمے داری ختم ہو جاتی تھی۔ ان کی بلا سے لڑکی بھاگے یا خودکشی کر لے۔ میں جانتی تھی میرے پاس وقت کم تھا وہ شخص جو میرا بیعانہ دے گیا جلد باقی رقم لے کر آتا اور مجھے لے جاتا اور اس کے بعد ساری عمر مجھے اس سودے کو بھگتنا پڑتا۔

پھر میں نے سوچ لیا مجھے کیا کرنا تھا۔ اسکول کے بعد میں نے بہت عرصے بکریاں چرائی تھیں اور بابا نے مجھے سمجھایا تھا کہ بکریوں کو کن پودوں کے پاس نہیں جانے دینا ہے۔ وہ نقصان دہ ... اور زہریلے ہوتے ہیں ان کے پتے یا پھول بوٹیاں کھا کر بکریاں بیمار پڑ سکتی تھیں۔ ان میں سے ایک پودے کے پھولوں کا زیرہ نشہ آور تھا۔ یہ پودا بس ہمارے علاقے میں پایا جاتا ہے، بابا کا یہی کہنا تھا۔ ایک بار بکریاں غلطی سے اس کے پھول کھا گئیں تو کچھ دیر بعد بے ہوش ہو گئیں اور کئی گھنٹوں تک اسی طرح بے ہوش پڑی رہی تھیں انہیں اٹھا کر گھر لانا پڑا تھا۔ ہمارے گھر میں کھانا اماں بناتی تھی۔ رات کا کھانا سب ایک ساتھ کھاتے اور اس کے بعد سب ہی سونے کے لیے لیٹ جاتے تھے۔ کھانا سورج ڈوبتے ہی کھا لیا جاتا تھا۔ ہمارے گاؤں میں آج بھی جلدی سو جانے اور صبح سورج نکلنے سے پہلے اٹھنے کا رواج ہے۔

اس واقعے کے کوئی دس دن بعد مجھے موقع ملا۔ میں بکریاں چرانے کے لیے نزدیکی جنگل میں گئی اور وہاں سے نشہ آور پھول کا زیرہ جمع کر کے لے آئی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کی کتنی مقدار کتنا اثر کرے گی۔ میں تو کوشش کر رہی تھی۔ رات کے کھانے کی ہانڈی میں موقع پاتے ہی میں نے یہ زیرہ ملا دیا۔ پھر کھانا لگا تو میں نے طبیعت خرابی کا بہانہ کر کے کھانے سے انکار کر دیا۔ اماں حیران ہوئی تھی کہ سارا دن چستی سے کام کرنے کے بعد اچانک کھانے کے وقت میری طبیعت خراب ہو گئی۔ لیکن وہ سادہ سی عورت تھی اس نے شک نہیں کیا۔ میرے سوا سب نے کھانا کھایا اور پھر جلدی سونے کے لیے لیٹ گئے۔ آدھے گھنٹے بعد سب بے ہوشی کی نیند سو رہے تھے میں نے پہلے اپنی چھوٹی بہنوں کو ہلا کر دیکھا پھر بھائیوں کو دیکھا۔ کسی کی نیند نہیں ٹوٹی تھی۔ آخر میں میں نے ڈرتے ڈرتے اماں اور بابا کو بھی ہلا کر دیکھا۔ وہ بھی بے سدھ سو رہے تھے۔

میں نے بابا کی شلوار کے ازار بند سے بندھا چابیوں کا گچھا نکالا۔ یہ کام کرتے ہوئے میرے ہاتھ کانپ رہے تھے اور مجھے لگ رہا تھا کہ ابھی بابا جاگ جائے گا اور مجھے رنگے ہاتھوں پکڑ لے گا مگر بابا کو پتا بھی نہیں چلا۔ میں نے ٹرنک میں لگے تالے کھولے۔ بچپن سے دیکھتی آئی تھی اور مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ کون سے تالے کی کون سی چابی ہے۔ تالے کھول کر میں نے ٹرنک کھولا۔ اندر رقم ایک لفافے میں لپٹی رکھی تھی۔ یہ لاکھ سے اوپر کی رقم تھی۔ میں نے انتقاماً یہ ساری رقم نکالی اور لفافہ اس پوٹلی میں رکھا جس میں میرے کپڑے اور دوسری چیزیں تھیں۔

اب مجھے انتظار تھا صبح کا۔ مجھے روشنی ہونے سے پہلے یہاں سے نکلنا تھا کیونکہ پکی سڑک جس سے گاڑیاں گزرتی تھیں گاؤں سے کوئی دس میل دور تھی اور وہاں پہنچتے پہنچتے روشنی ہو جاتی۔ لیکن گاڑیاں بھی روشنی ہونے کے بعد چلتی تھیں۔ اس میں خطرہ یہ تھا کہ کوئی گاؤں والا مل جاتا تو مجھے پہچان جاتا اور اگر کوئی نہ بھی ملتا تو اس علاقے میں عورت اکیلے سفر نہیں کرتی ہے۔ گاڑی والے مجھ پر شک کر سکتے تھے۔ ایک امید تھی کہ وہ مجھے روک نہیں سکتے ایک بار میں کسی بس میں سوار ہو جاتی تو یہاں سے دور جا سکتی تھی۔ یہ گرمیوں کے دن تھے اور چھ بجے تک اچھی خاصی روشنی ہو جاتی تھی۔ چار بجتے ہی میں گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔ گاؤں کے لوگ اس وقت تک جاگنا شروع ہو جاتے تھے اور رفع حاجت کے لیے باہر جاتے تھے۔ پہلے مرد جاتے تھے اور پھر عورتیں جاتی تھیں۔

میں چھپتی چھپاتی گاؤں سے باہر آئی۔ میرے سامنے کئی گھروں سے مرد باہر آئے تھے اور جنگل کی طرف جا رہے تھے۔ میں اس کے مخالف سمت جا رہی تھی اس لیے کسی نے دیکھا نہیں۔ گاؤں سے باہر آتے ہی میں تیز قدموں سے سڑک کی طرف جانے لگی۔ میرے گھر والوں کو سوتے ہوئے بہت دیر ہو چکی تھی اور اب اس بوٹی کا اثر بھی ختم ہونے والا ہو گا۔ جاگتے ہی بابا کو پتا چل جائے گا کہ اس کی ایک بیٹی غائب ہے اور جیسے ہی اسے رقم کی گم شدگی کا پتا چلے گا وہ میرے پیچھے آئے گا۔ اس کے اٹھنے سے پہلے میں سڑک تک پہنچ جانا چاہتی تھی۔ اس سے پہلے میں صرف ایک بار سڑک تک گئی تھی جب بابا پہلی اور آخری بار ہمیں اپنے گاؤں سے باہر لے گیا تھا۔ اس وقت میں دس سال کی تھی اور راستہ مجھے یاد تھا۔

جب میں سڑک تک پہنچی تو اس کی سنسانی دیکھ کر ڈر گئی۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ حالانکہ مجھے انسانوں سے ڈرنا چاہیے تھا سڑک اور سناٹا بھلا مجھے کیا کہہ رہا تھا بعد کے تجربات نے مجھے بتا دیا کہ دنیا میں انسان سے زیادہ خطرناک چیز کوئی اور نہیں ہے۔ میں روشنی اور بس کے انتظار میں ایک چٹان کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئی۔ گرمیوں کا موسم تھا لیکن رات اچھی خاصی سرد ہو جاتی تھی اور اس وقت تو سردی عروج پر ہوتی تھی۔ میں گھر کے کپڑوں میں ٹھٹھر رہی تھی۔ چھ بجے روشنی ہونے لگی تو سردی کسی قدر کم ہوئی تھی۔ اس کے کچھ دیر بعد شمال کی طرف سے ایک بس نمودار ہوئی۔ مگر میں نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ مجھے خیال آیا کہ اس طرح بالکل صبح سویرے مجھے دیکھ کر ڈرائیور اور مسافر مشکوک ہو سکتے تھے۔

میں اپنی جگہ بیٹھی دوسری بس کا انتظار کرتی رہی۔ وہ خاصی روشنی ہونے کے بعد آئی تھی جیسے ہی بس قریب آئی میں سڑک پر آگئی۔ مجھے دیکھتے ہی ڈرائیور نے بس روک دی اور میں سوار ہو گئی۔ اندر پہلے ہی لوگ بھرے ہوئے تھے ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی تھیں میں ایک عورت کے پاس کھڑی ہو گئی۔ نشستیں ساری پُر تھیں بہت سارے لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے سکون کا سانس لیا جب کسی نے میری طرف توجہ نہیں دی اور نہ کسی نے اکیلے سفر کرنے پر سوال کیا۔ بس چلنے کے کچھ دیر بعد کنڈیکٹر آیا اور اس نے مجھ سے منزل کا پوچھا۔ میں نے سوچے سمجھے بغیر کہا۔ ”مجھے پشاور جانا ہے۔“

”یہ بس سوات شہر تک جا رہی ہے۔“ کنڈیکٹر بولا۔ ”وہاں سے تمہیں پشاور کی بس مل جائے گی۔“

میں نے سوات تک کا ٹکٹ لے لیا۔ بابا کی رقم سے کچھ نوٹ میں نے پہلے ہی الگ کر لیے تھے تاکہ راستے میں خرچ کے لیے مجھے سب کے سامنے گڈیوں سے رقم نہ نکالنی پڑے۔ میں نے چادر کو اس طرح لپیٹ رکھا تھا کہ میرا چہرہ نظر نہ آئے۔ میں ذرا کمر جھکا کر کھڑی تھی جیسے بڑی عمر کی یا بوڑھی عورتیں کھڑی ہوتی ہیں۔ یہ میری ناتجربے کاری تھی بھلا اس طرح میں کسی کو کیسے دھوکا دے سکتی تھی جب کہ میرے ہاتھ پکار پکار کر میری کمسنی کا راز فاش کر رہے تھے۔ مگر شکر ہے کسی نے توجہ ہی نہیں دی۔ جب میں سوات میں بس سے اتری تو کچھ دیر مجھے یقین ہی نہیں آیا تھا کہ میں اتنی آسانی سے اپنے گھر سے نکل آئی تھی اور اب تک مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ میں نے ایک دکان سے حلوا

WWW.PAKSOCIETY.COM

پوری لے کر ناشتا کیا۔

میں فٹ پاتھ پر بیٹھی تھی اس لیے آتے جاتے لوگ مجھے گھور رہے تھے۔ سوات شہر ہے لیکن یہاں بھی عورتیں دکھائی نہیں دے رہی تھیں اور جو دکھائی دے رہی تھیں وہ باہر سے آئی تھیں مگر وہ الگ سے پہچانی جاتی ہیں۔ میں حلیے اور لباس سے مقامی لگ رہی تھی۔ ناشتا کر کے میں جلدی سے بس کے اڈے تک آئی۔ میں نے جان بوجھ کر دو فقیروں سے راستہ پوچھا اور ان کو ایک ایک نوٹ دیا تو وہ خوش ہو گئے تھے۔ اڈے پر کئی بسیں تھیں اور ان کے کنڈیکٹر خود چیخ چیخ کر اعلان کر رہے تھے جو بس پشاور جا رہی تھی میں نے اس کا انتخاب کیا۔ ٹکٹ کنڈیکٹر نے دیا اور مجھے عورتوں والے حصے میں سیٹ مل گئی۔ یہاں بھی میں نے چہرہ چھپایا ہوا تھا تاکہ میری کمسنی چھپ جائے۔ آدھے گھنٹے بعد بس روانہ وہ گئی۔ یہ سفر بہت طویل تھا بس راستے میں کئی جگہ رکی جہاں مسافروں نے دوپہر اور رات کا کھانا کھایا تھا۔ مجھے پتا چلا کہ بس صبح کے وقت پشاور پہنچے گی۔ شکر ہے یہ... کوچ تھی اور اس میں سیٹ کے حساب سے لوگوں کو بٹھایا گیا تھا۔ میرے ساتھ عورتیں تھیں ان میں سب اپنے کام سے کام رکھے ہوئے تھیں لیکن ایک بڑی بی میرے پیچھے پڑ گئی' اس نے پہلے میرا نام پوچھا اور میں نے نام بتا کر غلطی کی تھی اس کے بعد تو اس نے میرا دماغ کھا لیا۔ تنگ آ کر میں نے اس کے سوالوں کے جواب میں چپ سادھ لی۔ تب کہیں جا کر اس نے پیچھا چھوڑا۔

میں نے گھر سے نکلتے ہوئے سوچ لیا تھا کہ میں پشاور جاؤں گی کیونکہ میرے خیال میں پشاور وہ شہر تھا جہاں میں اپنے باپ اور بھائیوں سے محفوظ رہ سکتی تھی۔ میرے بڑے بھائی اب اتنے بڑے ہو گئے تھے کہ وہ بابا سے میرے سودے کی رقم میں سے حصہ مانگ سکتے تھے۔ یقیناً وہ بھی بابا کی طرح بے تاب ہو کر مجھے تلاش کرتے۔ میرے بھائیوں نے بھی شادیاں کرنی تھیں اور اس کے لیے انہیں بھی رقم کی ضرورت تھی۔ اسی لیے میں نے گھر سے زیادہ سے زیادہ دور جانے کا سوچا اور یہ دور پشاور تھا۔ یہ تو مجھے بعد میں پتا چلا کہ پشاور تو بالکل پاس ہے۔ مگر ایک ناتجربے کار لڑکی کی سوچ اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی تھی۔ گھر سے نکلنے سے پہلے میں نے سوچا تھا کہ مجھے پشاور جانا ہے لیکن جب پشاور میں اتری تو تب مجھے خیال آیا کہ اب میں کہاں جاؤں گی۔

یہاں... کوئی جاننے والا نہ تھا اور اکیلی لڑکی کا کوئی واقف کار نہ ہو تو وہ کہاں جا سکتی ہے؟ ابھی میں حیران پریشان بس اڈے پر کھڑی تھی کہ دو لڑکے میرے پاس آئے۔ وہ صورت سے ہی خراب لگ رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے خراب لہجے میں کہا۔ ''کون ہے تو یہاں کیوں کھڑی ہے؟''

ہماری زبان پشتو سے ذرا مختلف ہے لیکن میں اس کی بات سمجھ گئی۔ میں نے کہا۔ ''تمہیں کیا ہے میں کون ہوں اور یہاں کیوں کھڑی ہوں؟''

''بکواس نہ کر۔'' ان میں سے ایک بگڑ کر بولا۔ اس نے میرا بازو پکڑنا چاہا لیکن میں تڑپ کر پیچھے ہٹ گئی۔

''خبردار مجھے ہاتھ مت لگانا۔''

اتنے میں ایک لڑکا پاس آیا اور تیز لہجے میں بولا۔ ''کیا بات ہے لڑکی کو کیوں چھیڑتا ہے؟''

ان تینوں میں تلخ کلامی ہوئی اور پھر دونوں بدمعاش اس لڑکے پر پل پڑے۔ وہ اسے بے دریغ مارنے لگے اور ذرا دیر میں وہاں ہجوم جمع ہو گیا۔ لوگوں نے ان تینوں کو الگ کیا۔ اگرچہ دونوں نے اس اکیلے کو زیادہ مارا تھا لیکن اس نے بھی ان کی خوب پٹائی کی تھی' وہ ہاتھ پاؤں کا تیز تھا۔ اس نے لوگوں سے کہا۔ ''یہ بدمعاش اس لڑکی کو چھیڑ رہے تھے' میں نے روکا تو مجھ سے لڑنے لگے۔''

''یہ اس لڑکی کو بھگا کر لایا ہے۔'' ان میں سے ایک نے الٹا لڑکے پر الزام لگایا تو وہ دنگ رہ گیا تھا۔

''بکواس کرتے ہو....''

اس موقع پر مجھ میں اتنی جرات اور عقل نہ جانے کیسے آئی کہ میں نے بے ساختہ کہا۔ ''ہاں بکواس کرتا ہے، یہ میری خالہ کا بیٹا ہے مجھے یہاں لینے آیا ہے' ان دونوں نے مجھ سے بدتمیزی کی ہے۔''

لڑکا اور وہ دونوں حیران رہ گئے تھے پھر ہجوم کے تاثرات خراب ہوتے دیکھ دونوں بدمعاشوں نے بہتر سمجھا کہ وہاں سے کھسک جائیں۔ لوگ بہت سے تھے' میں ان کے سامنے نہیں کہہ سکتی تھی اس لیے لڑکے سے بولی۔ ''گھر چلو خالہ انتظار کر رہی ہوگی۔''

لڑکے نے بھی بہتر یہی سمجھا کہ مجھے وہاں سے لے جائے ورنہ کوئی الزام کی تحقیق شروع کر دیتا تو معاملہ بگڑ جاتا۔ پشاور شہر میں بھی قبائلیت کا راج ہے اور عورت سے متعلق کوئی بات ہوا سے آخر تک پہنچا کر دم لیا جاتا ہے۔ کچھ دور آنے کے بعد لڑکے نے میری طرف دیکھا۔ ''تم نے جھوٹ

کیوں بولا؟''

''اگر میں جھوٹ نہ بولتی تو وہ لوگ ہمیں اتنی آسانی سے جانے نہیں دیتے۔''

لڑکا اب پریشان لگ رہا تھا۔ وہ تقریباً بیس بائیس سال کا دبلے نقوش اور درمیانی جسم والا لڑکا تھا۔ ''تم سچ مچ گھر سے بھاگ کر آئی ہو؟''

''ہاں۔'' میں نے اعتراف کر لیا۔ ''میرا باپ پیسے لے کر میری شادی ایسے شخص سے کر رہا تھا جو عمر میں مجھ سے تین گنا بڑا ہے۔''

''تو کیا ہوا یہ رواج ہے۔''

''وہ تو ہے لیکن میں نے فیصلہ کر لیا تھا اگر میرے باپ نے مجھے بیچا تو میں گھر سے بھاگ جاؤں گی۔''

''اب تم کہاں جاؤ گی، ویسے تم کدھر سے آ رہی ہو؟''

''سوات سے۔'' میں نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔ ''مجھے نہیں معلوم میں کہاں جاؤں گی۔ میں نے بس پشاور تک آنے کا سوچا تھا۔''

لڑکے کو مجھ پر رحم آ گیا۔ ''اچھا میرے ساتھ چلو' میرے گھر پر میری ماں ہے۔''

اس شہر میں وہی پہلا مہربان نظر آیا تھا اس لیے میں اس کے ساتھ چل پڑی۔ وہ نہ جانے کن راستوں سے گزارتا ہوا مجھے پشاور کی ایک نواحی بستی میں لایا۔ مجھے بعد میں پتا چلا کہ کبھی یہ افغان مہاجرین کا کیمپ ہوتا تھا لیکن اب یہ باقاعدہ بستی بن گئی تھی۔ اس میں زیادہ تر افغانی تھے لیکن دوسرے لوگ بھی خاصی تعداد میں تھے۔ یہیں اس لڑکے سہیل شاہ کا گھر تھا۔ اس کا باپ بھی افغانستان سے آیا تھا اور پھر اس نے یہیں ڈیرا ڈال لیا۔ اس نے افغانستان سے مال لا کر یہاں بیچنا شروع کیا اور اس سے اچھی خاصی رقم کما لی تھی۔ سہیل اس کا ایک ہی بیٹا تھا۔ بیوی سے اس کی کبھی نہیں بنی تھی وہ اسے پاؤں کی جوتی سمجھتا تھا اور اس کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتا تھا۔ عمار جب تک بچہ رہا برداشت کرتا رہا لیکن جب بڑا ہوا تو ایک بار ماں کو مارنے پر وہ باپ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ باپ نے اسے بھی مارا اور اس کے بعد شاید سزا دینے کے لیے اچانک غائب ہو گیا۔ اس کے بارے میں سنا تھا کہ وہ افغانستان واپس چلا گیا ہے یا پھر کراچی چلا گیا ہے۔ درحقیقت کسی کو اس کے بارے میں نہیں معلوم تھا۔ سہیل کی ماں زرتاشہ بانو ایک صابر اور چپ رہنے والی عورت تھی۔ سہیل نے اسے میرے بارے میں بتایا تو اس نے میرے سر پر ہاتھ رکھا۔

''بیٹی فکر نہ کر تو یہاں بالکل محفوظ ہے۔''

اس کے لہجے کی شفقت پر بے اختیار میرے آنسو نکل آئے تھے اور میں اس کے شانے پر سر رکھ کر رو دی تھی۔ سہیل مجھے گھر لا کر اور ماں کا رویہ دیکھ کر کبھی پریشان تھا۔ اس نے کہا۔ ''پر ماں ہم محلے والوں سے کیا کہیں گے؟''

''یہی کہ گل ناز میری بہن کی بیٹی ہے۔ افغانستان میں میری بہن مر گئی ہے اور اس کے باپ نے گل ناز کو میرے پاس بھیج دیا ہے۔'' زرتاشہ نے بہت آسان سی وضاحت کر دی۔ سہیل مطمئن ہو گیا۔ اس نے لوگوں اور محلے والوں سے میرے بارے میں یہی کہا بلکہ زرتاشہ نے محلے کی عورتوں کو خود بلا کر میری رونمائی کرا دی۔ یہ زیادہ اچھا ثابت ہوا۔ سب مطمئن ہو گئے بس ایک عورت ذرا کھٹکی تھی۔ ''لڑکی تیری زبان کیسی ہے جیسے سوات والے بولتے ہیں۔''

''اس کا باپ سواتی ہی ہے۔'' زرتاشہ نے فوراً بات سنبھال لی۔ ''وہ افغانستان میں جا کر بس گیا تھا۔''

یوں میں زرتاشہ کی بھانجی بن کر اس کے گھر میں رہنے لگی۔ مجھے دیکھنے کے لیے آنے والی عورتوں میں سے ایک نے کہا۔ ''اس کا سہیل سے بیاہ کر دو اچھا ہے تمہارے ساتھ رہے گی۔''

''اس کے باپ کی مرضی کے بغیر نہیں کر سکتی۔''

سچی بات ہے اس کے جواب سے مجھے مایوسی ہوئی تھی۔ سہیل مجھے اچھا لگا تھا۔ اگرچہ دیکھنے میں وہ عام سا لڑکا لگتا تھا لیکن وہ سوچ اور کردار کا اچھا تھا۔ وہ عورت کی عزت کرنا جانتا تھا یہ اس کی ماں نے سکھایا تھا۔ اس نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی۔ پھر اس کا باپ انہیں چھوڑ کر چلا گیا تو اس نے محنت مزدوری شروع کر دی اور اب ایک ہوٹل پر بیرا گیری کا کام کرتا تھا۔ تنخواہ اور ٹپ سے اسے جو ملتا تھا اس سے یہ ماں بیٹے گزارہ کرتے تھے۔ مکان ان کا اپنا تھا اس کے باوجود وہ مشکل سے گزارہ کرتے تھے۔ آج سے دس سال پہلے بھی مہنگائی کم نہیں تھی۔ میں بھی آ گئی تو اور تنگی آ گئی تھی اس کے باوجود ان ماں بیٹے نے کبھی مجھے نہیں جتایا تھا کہ میرے آنے سے انہیں کیا مشکل ہو رہی ہے۔ انہوں نے مجھے اپنی محدود روٹی میں شریک کر لیا تھا۔ اس کے بدلے مجھ سے کچھ نہیں چاہا تھا۔ میں گھر کے کام کرتی تو زرتاشہ مجھے اس سے بھی منع کرتی تھی۔

میں اپنے باپ کے ٹرنک سے جو رقم چرا کر لائی تھی وہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

ابھی تک ویسے ہی رکھی تھی۔ رزتاشہ نے ایک چھوٹا سا دھاتی صندوق میرے حوالے کردیا تھا کہ میں اس میں اپنی چیزیں رکھوں۔ میں نے رقم اس میں سب سے نیچے اخبار کی تہ بچھا کر اس کے بھی نیچے رکھی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس رقم کا کیا کروں۔ ایک مہینا ان ماں بیٹے کے ساتھ رہتے ہوئے مجھے یہ خدشہ تو نہیں رہا تھا کہ وہ مجھ سے رقم چھین لیں گے لیکن یہ خطرہ ضرور تھا کہ وہ مجھے چور سمجھیں گے۔ دیکھا جائے تو میں نے یہ رقم چرائی ہی تھی بے شک میرے باپ کی تھی لیکن میں نے اس کی اجازت کے بغیر لی تھی۔ سہیل صبح سے شام تک اتنی محنت کرتا تھا اور اسے صلہ کیا ملتا تھا؟ ایک دن میں نے اس سے کہا۔

”تم اپنا کام کیوں نہیں کرتے ہو؟“

”اس کے لیے بہت سارے پیسے چاہئیں۔“ وہ بولا۔

”کتنے پیسے؟“

”پچاس ساٹھ ہزار روپے۔“ وہ بولا۔ ”میرے پاس اتنی رقم آجائے تو میں اپنا ہوٹل کھول لوں۔“

میرے پاس اس سے زیادہ ہی رقم تھی۔ میں سوچ میں پڑ گئی۔ یہ رقم ایسے ہی پڑی تھی اور اب تک میرے کام نہیں آئی تھی۔ میرے کام یہ دونوں بے غرض ماں بیٹے آئے تھے۔ مجھے زرتاشہ سے ڈر تھا اگر اسے اس رقم کا پتا چلے گا تو وہ مجھ سے بدظن ہوجائے گی۔ بہت سوچنے کے بعد ایک دن میں نے چپکے سے سہیل کو یہ رقم دکھائی تو وہ پریشان ہو گیا۔ ”گل تیرے پاس اتنی رقم کہاں سے آئی؟“

”یہ میرے باپ کی ہے جو اس نے تین بیٹیاں بیچ کر جمع کی ہے۔“

”تو چرا کر لائی ہے؟“

”اگر تو چاہے تو اسے چوری بھی کہہ سکتا ہے۔ یہ چوری میں نے کی ہے۔ میں چاہتی ہوں تو اس رقم سے کوئی کام کرلے اور اس غلامی سے نجات حاصل کرلے۔“

سہیل کو تعجب ہوا۔ ”یہ تیری رقم ہے تو مجھے دے رہی ہے؟“

”ہاں تو نے مجھ پر احسان کیا ہے۔ میں اس کا صلہ تو نہیں اتار سکتی لیکن میرے پاس یہ رقم ایسے ہی پڑی ہے اگر تیرے کام آجائے۔“

سہیل یہ رقم نہیں لینا چاہتا تھا لیکن میں نے اصرار کرکے اسے لینے پر مجبور کردیا۔ ساتھ ہی میں نے اسے راضی کرلیا کہ وہ اپنی ماں کو یہ بات نہیں بتائے گا کہ رقم میں نے دی ہے۔ وہ ماں سے کہہ سکتا ہے کہ اس نے کسی سے ادھار لی ہے اور جب کام چل جائے گا تو وہ ادھار چکا دے گا۔ سہیل خوددار شخص تھا لیکن وہ میری بات ماننے پر مجبور تھا کیونکہ میں جانتی تھی میں اس سے اپنی بات منوا سکتی تھی۔ وہ مجھے پسند کرنے لگا تھا اور آدمی جس عورت کو پسند کرتا ہے وہ اس سے ہر بات منوا سکتی ہے۔ میں نے بھی اس سے منوالیا۔ اس نے مجھ سے لاکھ روپے لیے۔ ہوٹل کے لیے ایک جگہ دیکھی اور اپنا کام کرنے لگا۔ برسوں سے ہوٹل کی نوکری کرکے اسے اس کاروبار کی سمجھ آگئی تھی اس لیے اسے اپنا کام جمانے میں چند مہینے بھی نہیں لگے اور وہ پہلے سے کہیں اچھا کمانے لگا تھا۔

زرتاشہ نے اندازہ لگا لیا تھا کہ سہیل اور میں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے ہیں۔ وہ بیٹے کی خوشی میں خوش ہونے والی عورت تھی۔ اس نے سہیل سے بات کی اور وہ راضی ہوگیا پھر اس نے مجھ سے بات کی تو میں نے بھی سر جھکا دیا۔ میں بہت خوش تھی میری خواہش پوری ہو رہی تھی۔ سہیل میری پسند بھی تھی۔ شادی کے لیے طے ہوا کہ سہیل چند مہینے میں کچھ رقم بچالے تو یہ مکان بیچ کر اور کچھ مزید رقم لگا کر کسی اچھی آبادی میں چھوٹا موٹا مکان لے لیں۔ یہ آبادی سہولیات سے تو عاری تھی ساتھ ہی بدنام بھی تھی۔ آئے دن یہاں جرائم پیشہ افراد کے درمیان لڑائیاں ہوتی تھیں اور پولیس آتی تھی۔ فائرنگ ہوتی تو لاشیں بھی گرتی تھیں۔ یہاں بہت بچ بچا کر رہنا پڑتا تھا۔ اس وجہ سے سہیل اور زرتاشہ یہاں سے نکلنا چاہتے تھے لیکن اب تک دو وقت کا کھانا ہی مشکل سے ہو رہا تھا کہیں اور جا کر کیسے رہتے۔ اب سہیل نے اپنا کام کیا تو امید بندھی تھی۔

دو مہینے میں سہیل نے مزید کچھ رقم جمع کرلی تھی اور مکان فروخت کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر پتا نہیں کیا ہوا کہ جو میں نے اور سہیل نے سوچا تھا وہ نہیں ہوا۔ ہمارے خواب کی تعبیر اتنی بھیانک ہوگی میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ سہیل نے مکان کا سودا کرلیا اور سودا کسی پولیس والے سے کیا تھا۔ اس نے بیعانہ لے لیا تھا اور پولیس والے نے وعدہ کیا تھا کہ دس دن میں باقی رقم دے کر قبضہ لے لے گا۔ سہیل نے عارضی طور پر کرائے کا ایک مکان بھی تلاش کرلیا تھا۔ لیکن اس سے پہلے ہی ایک رات پولیس نے اچانک چھاپا مارا اور سہیل کو اٹھا کر لے گئی۔ میں اور زرتاشہ روتے رہ گئے تھے۔ زرتاشہ بے

چاری پولیس والوں کی منت کر رہی تھی کہ وہ سہیل کو نہ لے جائیں مگر انہوں نے اس کا کوئی قصور بھی نہیں بتایا اور اسے مارتے ہوئے لے گئے۔

ہم ہراساں تھے کہ ہمارے ساتھ یہ کیوں ہو رہا تھا۔ سہیل نے کچھ نہیں کیا تھا پھر بھی پولیس نے اسے گرفتار کرلیا تھا۔ اگلے روز پولیس والے صبح سویرے آئے اور اس بار انہوں نے مجھے گرفتار کرلیا۔ زرتاشہ نے مجھے بچانے کی کوشش کی تو بے رحم پولیس والوں نے اسے بھی مارا اور لہولہان کردیا۔ مجھے وہ پہلے ہی کھینچتے ہوئے لے جا کر موبائل میں ڈال چکے تھے۔ میرے ساتھ ایسی بے ہودہ حرکتیں اور باتیں کر رہے تھے کہ میں شرم سے پانی پانی ہو رہی تھی۔ مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ آگے میرے ساتھ کیا ہونا ہے ورنہ شاید میں چلتی گاڑی سے کود جاتی۔ ایک درمیانے درجے کا افسر موبائل میں میرے ساتھ تھا اور مسلسل مجھے گالیاں دیتے ہوئے فحش باتیں کر رہا تھا میں نے روتے ہوئے کہا۔

”مجھے کیوں پکڑا ہے میرا قصور کیا ہے؟“

”چپ کر کنجری۔“ اس نے مجھے تھپڑ مارا۔ ”تھانے پہنچ کر تجھے سب معلوم ہو جائے گا۔ تیرے یار کا تو ہم نے حشر کردیا ہے شادی کے بغیر اس کے ساتھ رہ رہی تھی تو.....“

میں لرز گئی۔ ”یہ جھوٹ ہے..... کسی نے غلط کہا ہے۔“

”تیرے یار نے کہا ہے۔“ اس نے دوسرا تھپڑ مارا۔ ”تو چوری کرکے گھر سے بھاگی ہے۔ پولیس کو سب معلوم ہوگیا ہے کیا پتا ماں باپ کو قتل بھی کردیا ہو۔“

مجھ پر بجلی گری تھی۔ سہیل کو پولیس نے پتا نہیں کیوں گرفتار کیا تھا لیکن اس نے پولیس کے سامنے میری حقیقت کھول دی تھی اور اسی وجہ سے پولیس مجھے بھی گرفتار کرکے لے جا رہی تھی۔ پولیس افسر نے راستے میں ہی مجھ پر تشدد شروع کردیا تھا کہ باقی رقم کہاں ہے۔ میں نے روتے ہوئے کہا۔ ”رقم میں ساری سہیل کو دے چکی ہوں۔“

”بکواس نہ کر وہ صرف پچاس ہزار مان رہا ہے باقی رقم کہاں ہے تو دو تین لاکھ تو لائی ہوگی۔“

میں خدا رسول ﷺ کی قسمیں کھانے لگی کہ میں گھر سے صرف ایک لاکھ روپے لائی تھی اور وہ میں نے سہیل کو دے دیے تھے۔ مگر پولیس والے اتنی آسانی سے کہاں یقین کرتے تھے۔ پولیس افسر نے رائفل کے بٹ سے میرے جسم کے ایک نازک حصے کو دباتے ہوئے کہا۔ ”بس ذرا تھانے پہنچ جا اس کے بعد تو سب بتائے گی۔“

میں لرزنے لگی۔ جب سرِعام راستے میں میرے ساتھ یہ سلوک ہو رہا تھا تو تھانے لے جا کر پولیس والے میرے ساتھ نہ جانے کیا کرتے۔ میں اپنی ذلت فراموش کرکے اس افسر کے قدموں میں گر گئی۔ ”خدا گواہ ہے میں بے گناہ ہوں، مجھے تھانے مت لے جاؤ۔“

”اچھا تو بے گناہ..... چل تیری بے گناہی اندر باہر سے اچھی طرح دیکھیں گے۔“

تھانے میں پولیس موبائل سامنے نہیں رکی بلکہ پیچھے کی طرف جا کر رکی اور دو سپاہی مجھے بازو سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے تھانے کے ایک عقبی حصے میں لائے اور یہاں ایک کمرے میں بند کردیا۔ دن کا وقت تھا اور وہ کچھ مجبور تھے اس کے باوجود راستے میں انہوں نے میرے ساتھ جو شرمناک حرکتیں اور باتیں کیں وہ میں آج بھی نہیں بتا سکتی۔ وہ مجھے بند کرکے چلے گئے تو میں ایک کونے میں منہ چھپا کر رونے اور خدا سے اپنی عافیت کی دعا مانگنے لگی۔ میں سچ کہتی ہوں اس وقت میں شدت سے پچھتائی تھی کہ کاش نام نہاد عزت سے۔ لیکن رخصت ہو کر اپنے باپ کی عمر کے برابر شخص کے ساتھ چلی جاتی تو یہ ذلت نہ دیکھنی پڑتی۔ مگر ابھی ذلت دیکھی کہاں تھی، یہ تو صرف ایک جھلک تھی۔

میں سارا دن بھوکی پیاسی اسی کمرے میں بند پڑی رہی اور ڈر کے مارے کسی سے ایک گلاس پانی بھی نہیں مانگا کہ پتا نہیں پانی کے ساتھ مزید کیا کچھ ملے۔ میرا حال کبوتر کی طرح ہوگیا تھا جو آنکھیں بند کرکے سمجھتا ہے کہ بلی اسے نہیں دیکھ پا رہی ہے۔ میں سوچ رہی تھی کہ شاید وہ مجھے بھول گئے ہیں لیکن پولیس والے بھولے نہیں تھے بس رات کا انتظار کر رہے تھے کہ جب تھانے میں آمد و رفت بند ہو جائے اور وہ کھل کر من مانی کرسکیں۔ کسی وقت اچانک دروازہ کھلا اور وہی دو پولیس والے اندر آئے۔ ان میں سے ایک نے مجھے بازو سے پکڑ کر اٹھایا۔ ”چل شہزادی تیرا وقت آگیا ہے۔“

مجھے جس کمرے میں لے جایا گیا وہاں سہیل چھت کے کنڈے سے بندھی رسی سے الٹا لٹکا ہوا جھول رہا تھا۔ ایک دن میں اس کا جسم زخم زخم ہوگیا تھا اور پہلی نظر میں یوں لگا جیسے وہ مر گیا ہو۔ میں چیخ مار کر اس کی طرف لپکی تو ساتھ آنے والے سپاہی نے بے دردی سے مجھے دوسری طرف دھکیل دیا۔ میں فرش پر جا گری تھی۔ ”ادھر کہاں جا رہی ہے اس کی نہیں اپنی فکر کر۔“

میں سہیل کو دیکھ کر دہشت زدہ ہوگئی تھی۔ سچ ہے کہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

مجھے اپنی فکر پڑ گئی تھی۔ جب وہ افسر آیا جو مجھے گرفتار کر کے لایا تھا تو میں اس کے قدموں میں گر گئی اور گڑگڑانے لگی کہ میں بے گناہ ہوں اور میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔ رقم بھی ساری سہیل کو دے دی تھی۔ اس نے مجھے ٹھوکریں ماریں "بکواس کرتی ہے.... تیری تو.... اپنے یار کا حال دیکھ.... اس کی داشتہ ہے نا تو۔"

"نہیں خدا کی قسم میں کنواری ہوں۔"

"اچھا۔" وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ "ابھی پتا چل جائے گا۔"

اس کے بعد تھانے کے اس کمرے میں میرے ساتھ وہ انسانیت سوز کھیل ہوا جو شاید اس تھانے والوں کے لیے تو معمول کی بات ہے لیکن میری جیسی لڑکی جو سوات کے ایک چھوٹے سے گاؤں سے آئی تھی اور جس کے نزدیک لڑکی کو رقم لے کر کسی بڑی عمر کے مرد سے بیاہ دینا ہی دنیا کا سب سے بڑا ظلم تھا۔ یہ سب کسی جہنم کی سزا سے کم نہیں تھا۔ وہ پانچ پولیس والے تھے جو باری باری آ کر میری آبرو سے کھیلتے رہے۔ انہوں نے مجھے باندھ دیا تھا اور میرا منہ بھی بند کر دیا تھا تاکہ میں شور نہ مچا سکوں۔ کچھ دیر بعد مجھے ہوش ہی نہیں رہا تھا لیکن وہ لوگ اس کی پروا کیے اپنا کام کرتے رہے۔ یہ سب سہیل کے سامنے ہو رہا تھا اور وہ درمیان میں ہوش میں آ گیا تھا جب مجھے ہوش نہیں رہا تھا۔ صبح مجھے ہوش آیا تو میں اسی کمرے میں صاف ستھری حالت میں اور دوسرے لباس میں پڑی تھی میرے جسم میں درد کا نام و نشان نہیں تھا جس سے میں رات بھر دوچار رہی تھی اس کے بجائے ایک سکون آمیز کیفیت تھی۔ ان لوگوں نے کسی ڈاکٹر کو بلا کر میرا علاج کرایا تھا۔ اس نے مجھے درد کے ساتھ طاقت کے انجکشن بھی دیے تھے۔

پولیس والے یہ سب میری ہمدردی میں نہیں کر رہے تھے۔ وہ مجھے آنے والی رات کا عذاب بھگتنے کے لیے تیار کر رہے تھے اس لیے انہوں نے میرا علاج بھی کرایا تھا اور مجھے کوئی ایسی نشہ آور شے دی تھی جس کے اثر سے میں سارا دن مدہوش پڑی رہی اور شور کرنے یا ان کو تنگ کرنے کے قابل ہی نہیں رہی تھی۔ رات ہوتے ہی وہ پانچوں شیطان پھر آ گئے۔ وہ سہیل کو اب وہاں سے لے گئے تھے۔ وہ مجھ پر تشدد بھی کر رہے تھے لیکن ایسا تشدد کہ میرے جسم پر کوئی نشان باقی نہ رہے۔ پوچھ گچھ تو انہوں نے مجھ سے پہلی رات ہی کر لی تھی۔ انہیں یقین آ گیا تھا کیونکہ میں نے جو سہا تھا اس کے بعد میرے لیے جھوٹ بولنا ممکن ہی نہیں تھا۔ اب وہ مجھے مال مفت سمجھ رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا میرا کوئی والی وارث نہیں ہے۔ میرا سہیل اور اس کی ماں سے کوئی تعلق نہیں تھا اور جو میرے اصل گھر والے تھے وہ خود میرے خون کے پیاسے ہو رہے ہوں گے۔ اس لیے میں اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کی فریاد لے کر کہاں جاؤں گی۔

چار دن اور چار راتیں میں تھانے میں رہی اور ہر رات میرے ساتھ ایک ہی کھیل کھیلا گیا۔ ان چار راتوں میں میں بھول گئی تھی کہ میں ایک عورت ہوں اور میری کوئی عزت ہے۔ میں شاید ذہنی اذیت کی انتہا سے گزر کر پاگل ہو گئی تھی۔ کیونکہ پانچویں روز انہوں نے مجھے رات کے وقت سہیل کے گھر کے پاس اتار دیا۔ مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔ زرتاشہ کا کہنا ہے کہ میں نے دروازہ بجایا تو وہ سمجھی کہ پولیس پھر سہیل کو اٹھانے آ گئی ہے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا تو مجھے دیکھ کر حیران ہوئی۔ پھر مجھے اندر لے آئی۔ میری حالت اور کیفیت دیکھ کر اسے سمجھنے میں دشواری نہیں ہوئی تھی کہ مجھ پر کیا گزری تھی۔ میں اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھی۔ اس نیک عورت نے مجھے نہلا دھلا کر دوسرے کپڑے پہنائے کیونکہ تھانے میں مجھے جو لباس دیا گیا تھا وہ میرا نہیں تھا۔ اس نے زبردستی مجھے کچھ دودھ دیا اور پھر نیند کی دوا دے کر سلا دیا۔

سہیل دو دن پہلے چھوٹ کر آ گیا تھا۔ پولیس نے اس سے ہوٹل چھین لیا تھا۔ اصل میں سارا مسئلہ ہوٹل کا تھا وہ بڑی موقع کی جگہ تھی اور اس پولیس افسر کے بھائی کی اس پر نظر تھی۔ انہوں نے پہلے سہیل سے ہوٹل خریدنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے پھر انہیں پتا چلا کہ سہیل مکان... بیچ رہا ہے تو انہوں نے جعلی پارٹی کی مدد سے مکان کا سودا کیا اور پھر سہیل کو اٹھا لیا۔ تھانے میں اس نے مکان کے بیعانے کو ہوٹل کی قیمت سمجھ لیا۔ وہ مجبور تھا ورنہ پولیس والے اسے تشدد سے مار دیتے اور اس پر دہشت گردی کا الزام لگا دیتے۔ انہیں پوچھنے والا کوئی نہیں ہے۔ سہیل نے تشدد کی وجہ سے بتا دیا کہ اس کے پاس ہوٹل کھولنے کے لیے رقم کہاں سے آئی تھی۔ اس نے پچاس ہزار بتائے تھے اور جب میں نے ایک لاکھ بتائے تو اس سے پولیس والوں کا شک اور بڑھ گیا تھا۔ انہوں نے مجھ سے حقیقت معلوم کرنے کے لیے مجھ پر جنسی تشدد کیا اور جب ان کو حقیقت پتا چل گئی تب بھی وہ اپنی ہوس کی تسکین کرتے رہے جب تک ان کا جی نہیں بھر گیا تھا۔

سہیل کی حالت بھی کم بری نہیں تھی۔ دو دن ہونے کے باوجود وہ بستر سے اٹھنے کے قابل نہیں تھا۔ زرتاشہ بے چاری اس کی دیکھ بھال کر رہی تھی اور ایک مقامی ڈاکٹر سے اس کا علاج کرا رہی تھی۔ اب میں بھی اس کے سر آ گئی تھی اور مجھے تو اپنا ہوش بھی نہیں تھا۔ وہ بیٹے کے ساتھ مجھے بھی دیکھنے لگی۔ جب سے پولیس نے چھاپا مارا تھا تب سے محلے والوں نے ان سے ملنا جلنا بند کر دیا۔ کوئی مصیبت کی اس گھڑی میں پوچھنے بھی نہیں آیا تھا۔ میں تین دن تک ہوش و حواس سے بیگانہ رہی تھی جب نیند کی دوا کا اثر ختم ہو جاتا تب بھی میں ایسے ہی بیٹھی رہتی تھی نہ کھاتی تھی اور نہ بولتی تھی۔ زرتاشہ میرا سب کام کر رہی تھی۔ چوتھے دن مجھے کسی قدر ہوش آیا تب میں نے سہیل کی آواز سنی۔

"ماں تم نے اسے کیوں رکھا ہے دھکے دے کر باہر نکال دو۔"

"سہیل وہ بے چاری کہاں جائے گی، اس کا ہمارے سوا اور کون ہے؟" زرتاشہ نے دبے لہجے میں کہا۔

"جہنم میں جائے۔" سہیل بے زاری سے بولا۔ "اس کی وجہ سے ہم پر یہ مصیبت آئی ہے۔"

"سہیل اللہ سے ڈر تیری وجہ سے وہ پکڑی گئی اور اس کے ساتھ اتنا برا ہوا، تو نے تھانے میں اس کا نام کیوں لیا تھا۔"

"تو اور کس کا نام لیتا، اسی نے تو مجھے ہوٹل کھولنے کے لیے رقم دی تھی۔"

زرتاشہ حیران ہوئی۔ "گل ناز نے.... اس کے پاس رقم کہاں سے آئی؟"

"اس نے اپنے باپ کے پیسے چرائے تھے۔ وہ اس کی شادی اپنی عمر کے کسی شخص سے کرنا چاہتا تھا۔ یہ گھر سے باپ کے پیسے لے کر بھاگ آئی۔"

زرتاشہ کو یہ تو معلوم تھا کہ میں کس طرح گھر سے بھاگ آئی ہوں اور اس حوالے سے اسے مجھ سے ہمدردی بھی تھی لیکن اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ میں اپنے باپ کی رقم چرا کر لائی ہوں۔ اس نے کسی قدر بدلے لہجے میں کہا۔ "اچھا تو یہ باپ کی رقم چرا کر لائی ہے.... سہیل یہ بات تجھے معلوم تھی؟"

"ہاں ماں اس نے بتائی تھی لیکن ساتھ ہی منع کر دیا تھا کہ تمہیں نہ بتاؤں ورنہ تم مجھے رقم لینے نہیں دو گی۔"

"اس نے ٹھیک کہا تھا۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ "یہ لڑکی رقم چرا کر لائی اور تو نے اس رقم سے ہوٹل کھولا۔ یہ عذاب تو آنا ہی تھا۔ حرام کبھی حلال نہیں ہوتا ہے۔"

"ماں میں نے سوچا تھا جب کاروبار کر کے رقم جمع کر لوں گا تو اس کی رقم واپس دیدوں گا۔" سہیل نے دبے لہجے میں کہا۔

زرتاشہ کو غصہ آ گیا۔ "بکواس نہ کر حرام کی رقم سے جو کمائے گا وہ بھی حرام ہی ہو گا۔ تیرے باپ سے یہی اختلاف تھا، وہ حرام کی کمائی گھر لاتا تھا۔ وہ چلا گیا تو اسی کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔"

"مجھے معاف کر دو ماں تم ٹھیک کہہ رہی ہو یہ سب اسی حرام کی رقم کی وجہ سے ہوا ہے ہوٹل بھی ہاتھ سے گیا اور مجھے مار الگ پڑی۔ وہ بہت ظالم لوگ ہیں۔"

"تو مرد ہے اس بے چاری کو دیکھ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اس کو تو زندگی بھر کا روگ لگ گیا۔" زرتاشہ نے افسوس سے کہا۔

"یہ کہو اس کا کیا ہوا اس کے سامنے آیا۔ اچھا تھا باپ کی عمر کے آدمی سے شادی کر لیتی تو اس ذلت سے بچ جاتی۔"

"سہیل میرا مشورہ مان تو اس سے شادی...."

"نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔" وہ بولا۔ "میں ایسی لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا۔" وہ جلدی سے بولا۔ "تم نے ایسی بات سوچی بھی کیوں ماں؟"

"سہیل یہ مظلوم ہے اس کا تو قصور نہیں ہے۔"

"میں اس سے شادی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ اب دوبارہ یہ بات مت کہنا۔" سہیل بولا۔ میں اس کی کیفیت سمجھ رہی تھی، وہ اس لڑکی سے کیسے شادی کر سکتا تھا جس کی عزت اس کے سامنے کئی بار لٹی ہو۔ وہ یہ بات اپنی ماں سے کہہ نہیں سکتا تھا۔

"تب اس کا کیا ہو گا؟"

"ہمیں کیا ماں.... میں تو کہتا ہوں ہاتھ پکڑ کر باہر نکال دو۔"

"پاگل ہوا ہے وہ اپنے ہوش میں کب ہے ایسے نکالا تو دوسرے بھیڑیے اسے لے جائیں گے۔"

سہیل مجھ سے نفرت کرنے لگا تھا۔ اس نے آسانی سے کہہ دیا۔ "لے جائیں۔"

"نہیں جب تک وہ ٹھیک نہیں ہو جاتی میں اسے یہاں سے نہیں نکال سکتی اور تو ایک بات بھول رہا ہے تو نے اس سے ایک لاکھ روپے لیے تھے تو اس کا مقروض ہے۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

"وہ لاکھ روپے بھی وہی پولیس والے لے گئے جنہوں نے اس کو برباد کیا ہے اگر ان سے اپنی بربادی کا معاوضہ لے سکتی ہے تو لاکھ روپے بھی لے لے۔"

"سہیل اس نے یہ رقم پولیس والوں کو نہیں تجھے دی تھی اور محبت سے دی تھی ورنہ آج کے دور میں کوئی کسی کو ایک روپیا بھی نہیں دیتا ہے۔"

"میرے پاس نہیں ہیں اور تم نے اس کا جو کرنا ہے کرو لیکن مجھ سے اس کا ذکر بھی نہ کیا کرو۔" سہیل نفرت آمیز بے زاری سے بولا۔

میں ہوش میں آگئی تھی اور میں نے اپنے اوپر گزرنے والے سانحے کو بھی قبول کرلیا تھا اس حقیقت کے ساتھ کہ اب میں کسی شریف شخص کی بیوی نہیں بن سکتی تھی کم سے کم.... کسی کو دھوکا نہیں دے سکتی تھی۔ ہاں کوئی خود سب جانتے ہوئے مجھے قبول کرلے تو الگ بات ہے لیکن سہیل اب مجھ سے نفرت کرنے لگا تھا اس کا رویہ بتا رہا تھا اب ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔ میرے لیے کسی شریف گھر میں کوئی جگہ باقی نہیں رہی تھی۔ زرتاشہ مجھے ہوش میں دیکھ کر خوش ہوئی تھی اس نے میری خدمت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ حالانکہ اس کے گھر تنگ دستی لوٹ آئی تھی۔ سہیل کا ہوٹل اور آمدنی کا ذریعہ چھن گیا تھا مکان کا جو بیعانہ لیا تھا فی الحال اسی سے گزارہ چل رہا تھا۔ اس کے باوجود زرتاشہ نے میری صحت بحال کرنے کے لیے مجھے اچھا کھلایا پلایا پھر وہ مجھے ایک لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے گئی تاکہ ایسی ویسی کوئی بات ہو تو سامنے آجائے اور اس سے نمٹا جاسکے لیکن شکر ہے ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میری ذات کے ساتھ جو گناہ ہوا تھا اللہ نے اسے چھپا لیا تھا۔

سہیل روز ماں کو مجبور کرتا تھا کہ وہ مجھے گھر سے نکال دے اور وہ نیک عورت اسے ٹھنڈا کرتی تھی لیکن میں دیکھ رہی تھی کہ وہ بیٹے کے سامنے مجبور ہوتی جارہی تھی اور میں اسے ایک حد سے زیادہ مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے ایک دن جب ماں بیٹے میں بحث جاری تھی تو میں نے اپنے کپڑوں کی پوٹلی اٹھائی۔ سہیل کو لاکھ روپے دے کر بھی میرے پاس کچھ ہزار روپے بچ گئے تھے۔ میں سامان لے کر سہیل کے کمرے میں آئی تو وہ مجھے دیکھ کر چپ ہوگئے۔ میں نے اتنے عرصے بعد سہیل کو دیکھا تھا۔ وہ اب ٹھیک ہو رہا تھا اور چلنے پھرنے کے قابل بھی ہوگیا تھا لیکن ابھی وہ کوئی کام نہیں کرسکتا تھا۔ زرتاشہ نے پوٹلی دیکھ کر کہا۔

"یہ کیا ہے گل ناز؟"

"میں یہاں سے جا رہی ہوں۔" میں نے کہا۔ "تمہاری مہربانی کا شکریہ ادا نہیں کرسکتی، اللہ ہی تمہیں صلہ دے گا۔"

"ایسا نہ کہہ میں نے کیا کیا ہے؟" وہ شرمندہ ہوگئی۔ اس کے مقابلے میں سہیل ڈھٹائی سے منہ بنائے بیٹھا تھا میں نے اس سے کہا۔

"میں نے تم کو لاکھ روپے دیے لیکن وہ میں تم سے نہیں مانگتی ان روپوں کو میں اپنی عزت کی طرح بھول چکی ہوں اس لیے تم فکر مت کرو۔"

"میں تجھے ایسے نہیں جانے دوں گی۔" زرتاشہ بے قرار ہوگئی۔

"نہیں مجھے چلے جانا چاہیے تم جتنی مہربانی کرچکی ہو وہی بہت ہے اب میں تمہیں اور تنگ کرنا نہیں چاہتی۔"

"تو کہاں جائے گی؟" زرتاشہ اب پریشان ہوگئی۔

"کہیں نہ کہیں ٹھکانا مل جائے گا۔" میں نے جواب دیا۔ "جیسے یہاں مل گیا تھا۔"

سہیل اب کچھ شرمندہ دکھائی دے رہا تھا لیکن اس نے کچھ کہنے کی کوشش نہیں کی۔ زرتاشہ نے مجھے روکنے کی کوشش کی پر میں فیصلہ کرچکی تھی۔ میں نے دل پر جبر کرکے کہا۔ "مجھے مت روکو میرا چلا جانا ہی ٹھیک ہے۔"

میں سہیل کے گھر سے اسی طرح نکلی جیسے اپنے گھر سے نکلی تھی سوچے سمجھے بغیر کہ مجھے کہاں جانا ہے۔ صنم جان کے کوٹھے تک پہنچنے کے لیے مجھے کئی مراحل سے گزرنا پڑا تھا۔ یہ مراحل تھانے کی ان راتوں سے کم کرب ناک نہیں تھے۔ صنم جان کے کوٹھے پر آکر مجھے کچھ سکون ملا کیونکہ یہاں کوئی میرے ساتھ زبردستی نہیں کرسکتا اور سب سے بڑی بات ہے میں اب ہوس کے ماروں سے اپنی پوری قیمت لے سکتی ہوں۔ یہاں میں نے اپنی ایک رات کی اس سے زیادہ قیمت وصول کی جتنی ایک شخص مجھے ساری عمر اپنا غلام رکھنے کے لیے ادا کررہا تھا۔ صنم جان ہائی کلاس طوائف تھی۔ اس کے کوٹھے پر عام لوگ پھٹک بھی نہیں سکتے ہیں۔ کوٹھے کا لفظ تو میں عام فہم معنوں میں لے رہی ہوں ورنہ اصل میں یہ ایک پوش علاقے میں ایک شاندار بنگلا ہے۔ اس کے گیٹ پر کلاشنکوف بردار دو خونخوار قسم کے گارڈز ہمہ وقت موجود رہتے ہیں — ان کے ہوتے ہوئے کسی کی مجال نہیں ہے یہاں پھٹک سکے۔

اعلیٰ سرکاری حکام، سیاست دان اور وہ دولت مند جو یہاں رہنے والی کال گرلز کی ایک رات کی قیمت ادا کرتے

ہوئے ماتھے پر شکن نہ لائیں صرف وہی یہاں آنے کی جرات کرسکتے ہیں۔ علاقے کے لوگ اس کوٹھے سے واقف ہیں۔ کئی بار صنم جان کی شکایت بھی کی جاچکی ہے لیکن جو اُن کی شکایت سنتے ہیں وہی رات کی تاریکی میں صنم جان کے سامنے حاضری دیتے ہیں۔ ایسی شکایتیں ردی کی ٹوکری میں ڈال دی جاتی ہیں لیکن اگر کوئی سر پھرا زیادہ ہی شور کرے تو پولیس یا صنم جان کے گارڈز اس کا دماغ درست کردیتے ہیں، صنم جان صرف کوٹھا نہیں چلاتی ہے وہ شراب بھی سپلائی کرتی ہے اور اسی کوٹھی کے ایک تہ خانے میں جوا بھی کھلایا جاتا ہے۔ صنم جان جیتنے والے سے دس فیصد لیتی ہے۔

حیرت کی بات ہے صنم جان کا تعلق میری طرح ایک پہاڑی گاؤں سے ہے اور وہ تقریباً ان ہی حالات سے گزری تھی جن سے میں گزری۔ اب وہ اس مقام پر ہے۔ اس نے چن چن کر ایسی لڑکیاں تلاش کرکے اپنے کوٹھے کی زینت بنائیں جو اچھے گھرانوں سے تھیں اور اب طوائف کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ صنم جان نے ہماری تربیت کی اور ہمیں تعلیم بھی دلائی۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ میں نے صنم جان کے پاس آنے کے بعد میٹرک، انٹر اور بی اے کا امتحان اپنی محنت اور قابلیت سے پاس کیا۔ اب میں ماسٹر کی تیاری کررہی ہوں۔ صنم جان لڑکیوں سے صرف کماتی نہیں ہے بلکہ وہ ان پر خرچ بھی کرتی ہے۔ ہر لڑکی جو کماتی ہے اس کا نصف اس کے نام کے بینک اکاؤنٹ میں جاتا ہے۔ صنم جان کسی بھی لڑکی سے پانچ سال کا معاہدہ کرتی ہے۔ پانچ سال بعد وہ آزاد ہو جاتی ہے چاہے تو کہیں بھی جائے اور اپنی مرضی سے زندگی گزارے۔ اگر لڑکی پانچ سال سے پہلے اسے چھوڑ کر جانا چاہے تو صنم جان اس کی جمع شدہ رقم اس کے حوالے نہیں کرتی ہے۔ پانچ سال بعد اسے یہ رقم مل جاتی ہے اس کے بعد لڑکی چاہے تو دو دو سال کے معاہدے کے تحت صنم جان کے لیے کام کرتی رہے۔

صنم جان نے اپنے کوٹھے کے اصول رکھے ہیں۔ اول اس کی لڑکی کہیں باہر نہیں جاتی ہے چاہے اس کے بدلے کتنی بھی رقم پیش کی جائے۔ دوسرے سوائے رات کے ان چند گھنٹوں کے جو انہیں کسی مرد کے ساتھ گزارنے پڑتے تھے اس کے علاوہ ان کے معمولات لگے بندھے تھے۔ تمام لڑکیاں چاہے رات کو چار پانچ بجے سوئیں صبح سات بجے اٹھ جانا لازمی تھا۔ پھر کوٹھی میں بنے جم میں ورزش کی جاتی تھی اور مساج کرایا جاتا تھا پھر ہاٹ ٹب کے

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 7,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 6,000 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کردیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہوسکتا ہے
بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔
رابطہ: شمع عباس (فون نمبر: 0301-2454188)
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

WWW.PAKSOCIETY.COM

غسل کے بعد سب ناشتا کرتی تھیں ایک ہی میز پر۔ صنم جان اس دوران سب کو ان کا حساب کتاب بتاتی تھی۔ دس سے دو بجے تک لڑکیاں پڑھتی تھیں یا اپنی مرضی سے وقت گزارتی تھیں۔ دو بجے دوپہر کے کھانے کے بعد سب کو دو گھنٹے آرام کے لیے دیے جاتے تھے۔ شام چار سے چھ بجے تک سوئمنگ کرنا ہوتی تھی۔ اس کے بعد سب آٹھ بجے تک اپنی مرضی سے وقت گزارتی تھیں۔ اس دوران میں جن کے گاہک آجاتے تھے انہیں گاہک کی پسند کے مطابق تیار ہو کر اس کے پاس جانا ہوتا تھا اور باقی دس بجے تک اپنے کمروں میں سونے چلی جاتی تھیں۔ صنم جان خود تمام کاموں کی نگرانی کرتی تھی اور معمولات کی خلاف ورزی کرنے والی لڑکیوں کو جرمانہ ہوتا تھا۔ صنم جان جسمانی سزا کی قائل نہیں تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ جو کام ہم کرتے ہیں عورت کے لیے اس سے بڑھ کر جسمانی سزا اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی ہے۔

اس نے لڑکیوں کے لیے لازم رکھا تھا کہ وہ پڑھتی رہیں۔ اگر تعلیم حاصل نہیں کر رہی ہیں تو مطالعہ کریں۔ زیادہ تر لڑکیوں نے اس کی بات مان لی تھی وہ پڑھ رہی ہیں اور اپنا کام بھی کرتی ہیں۔ صنم جان نے ہمارے لیے جو روٹین بنائی ہے وہ ہمیں ذہنی اور جسمانی طور پر فٹ رکھتی ہے۔ ہاں اس نے ہم پر ایک پابندی لگا رکھی ہے کہ ہم جو کام کرتے ہیں آپس میں اس کے بارے میں ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کریں گے۔ صنم جان کا کہنا تھا اس کام میں آدمی کے جسم سے زیادہ اس کا ذہن گندہ ہوتا ہے۔ جسم کی گندگی مجبوری ہے اس کے بغیر گزارہ نہیں ہے لیکن ہم اپنے ذہن کو گندہ ہونے سے بچانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ لڑکیوں کو ایک دوسرے کے کمرے میں جانے کی اجازت نہیں تھی ہم صرف مشترکہ جگہوں پر ایک دوسرے سے مل سکتے تھے۔ تفریح کے تمام تر لوازمات تھے اور یہ بھی مشترکہ تھے۔

کوٹھی کا جو حصہ ہمارے لیے مخصوص تھا اس میں اکثر کام ہم خود کرتے تھے۔ یہ ذمے داری صنم جان کی طرف سے نہیں تھی اس نے تو ہر کام کے لیے ملازم رکھے تھے۔ لیکن ہمیں اجازت تھی کہ ہم چاہیں تو کام بھی کر سکتے ہیں۔ اس لیے تقریباً تمام لڑکیاں اپنے کمرے خود صاف کرتی تھیں اور اپنے عام کپڑے خود دھوتی تھیں۔ اس طرح بعض اپنے لیے کھانے کی کوئی چیز بنانا چاہتیں تو اس کی بھی اجازت تھی۔ ہمیں اپنے طور پر تفریح کرنے اور باہر جانے کی اجازت بھی تھی۔ مہینے میں ایک بار ہم سب کہیں پکنک منانے جاتے تھے۔ گویا تفریح کی کوئی کمی نہیں تھی۔

اس کے باوجود یہ زندگی گزارنا بہت مشکل کام ہے۔ روز ایک نئے مرد کو دیکھنا اور اس کے ساتھ رات گزارنا آسان نہیں ہے۔ ہم میں سے بہت ساری بہ مشکل ہی اس عذاب کو برداشت کرتی ہیں۔ اکثر جو پہلی بار پانچ سال کا معاہدہ کرتی ہیں۔ وہ پانچ سال بعد ہی اپنا حصہ لے کر ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جاتی ہیں۔ صنم جان خود انہیں کہیں سیٹل کراتی ہے۔ وہ ان کے لیے نوکری کا بندوبست کرتی ہے اور ان کے لیے ایک شریفانہ ماحول بناتی ہے جس میں وہ اپنی اگلی زندگی ایک عام عورت کے طور پر گزار سکتی ہیں۔ انہیں رشتہ مل جاتا ہے تو وہ شادی بھی کر لیتی ہیں۔ ورنہ اپنی پسند کے مرد سے دوستی کر کے بسر کرتی ہیں۔ دولت کی ان کی پاس کمی نہیں ہوتی ہے۔

صنم جان کی وجہ سے ہمیں بہت اچھا معاوضہ ملتا ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مجھے اس کے پاس ساتواں سال ہونے والا ہے اور میرے اکاؤنٹ میں اب اتنی رقم ہے کہ میں ساری عمر آسائش سے زندگی بسر کروں تب بھی ختم نہیں ہوگی۔ میرا ارادہ ہے کہ ماسٹر کرتے ہی میں ... کراچی یا دبئی چلی جاؤں گی۔ کراچی کے حالات ٹھیک نہیں ہیں اس لیے زیادہ امکان یہی ہے کہ میں دبئی چلی جاؤں گی وہاں مستقل رہائش کا ویزا حاصل کرلوں گی اور پھر کوئی ملازمت ..... کرنا بھی دشوار نہیں ہے۔ دبئی میں ایک اکیلی عورت بھی آرام سے رہ سکتی ہے اور کسی کی مجال نہیں ہے کہ اسے ہاتھ لگائے۔ صنم جان سے میرا دو سال کا معاہدہ ختم ہونے والا ہے۔ اس کے بعد میں آزاد ہوں گی۔

اس دن صبح ناشتے کے بعد لاؤنج میں اخبار دیکھتے ہوئے میں نے ان بہادر پولیس والوں کے بارے پڑھا جن کی موت کو شہادت قرار دیا جا رہا تھا اور جنہیں پولیس فورس کے قابل، بہادر اور ایماندار لوگ قرار دیا جا رہا تھا۔ جب کہ میں جانتی تھی کہ وہ کیا تھے۔ میں ان لوگوں کے چہرے کیسے بھول سکتی ہوں جنہوں نے چار راتیں مجھے پامال کیا اور مجھے ایک شریف لڑکی سے ایک کال گرل بنا دیا۔ وہ یہ سب کر کے بھی تعریف کے مستحق ٹھہرے تھے اور میں صرف ملامت کے قابل ہوں۔ لیکن وہ اللہ جو سب کا ہے وہ سب دیکھ رہا ہے اور وہی سب سے اچھا فیصلہ کرنے والا ہے، مجھے یقین ہے آخرت میں مجھے میرے گناہوں کی سزا ملے گی لیکن ساتھ ہی جن لوگوں نے مجھ پر ظلم کیا مجھے ان سے انصاف بھی دلایا جائے گا۔

انسان

قابلِ احترام معراج رسول صاحب

السلام علیکم!

انسانیت کی معراج قربانی ہے۔ اس شخص نے کیسی اور کس طرح کی قربانی پیش کی اسے ملاحظہ کریں، اس کی زبانی یہ سب سن کر میں سکتے میں آگیا تھا۔ آپ خود بھی پڑھ لیں کہ وہ کتنا بڑا انسان تھا۔ ایسے ہی لوگوں کی وجہ سے یہ دنیا قائم ہے۔

سلطان احمد

(کراچی)

میں اس دلچسپ واقعے کا عینی شاہد ہوں۔ اس دن میں بس میں سفر کر رہا تھا۔ آپ تو کراچی کی بسوں کے حالات سے واقف ہی ہوں گے۔ اگر یہ چلنے پر آئیں تو سامنے کی ہر چیز کو روندتی ہوئی آگے بڑھتی رہتی ہیں اور اگر کسی اسٹاپ پر رک جائیں تو اس وقت تک رکی رہتی ہیں جب تک بس کے مسافر توڑ پھوڑ نہ شروع کر دیں۔

تو وہ بس بھی اسٹاپ پر رکی ہوئی تھی۔ حالانکہ بس اچھی خاصی بھر چکی تھی لیکن اس بس کو شاید اسی روٹ کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

دوسری بس کا انتظار تھا۔ اس لیے وہ بالکل رک گئی تھی اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ جب بس رکی ہوئی ہو تو اس میں کیسے کیسے لوگ کیا کیا چیزیں فروخت کرنے کے لیے آجاتے ہیں۔

ناریل بسکٹ، چائنا کے آٹھوٗ سرمہ، دانتوں کے لیے بے مثال منجن۔ سر میں لگانے کا تیل، خوشبو اور نہ جانے کیا کچھ۔ ان کے علاوہ چندے مانگنے اور بھیک مانگنے والے۔ غرض یہ کہ وہ بس ایک طرح کا جمعہ بازار بن کر رہ جاتی ہے۔

بہرحال میں ایسی ہی ایک بس میں تھا کہ ایک بھکاری بس میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ پاؤں بالکل سلامت تھے۔ صرف اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی اور کپڑے بہت میلے اور شکن آلود ہورہے تھے۔ وہ یہ بتا رہا تھا کہ وہ کن پریشانیوں کا شکار ہے۔

اس دوران میں ایک صاحب کو نہ جانے کیا سوجھی کہ وہ اس بھکاری سے الجھ پڑے۔ ''ارے بھائی، تو اچھا خاصا ہٹا کٹا انسان ہے۔ کوئی ڈھنگ کا کام کیوں نہیں کرتا۔''

آپ نے بھی اس قسم کے جملے سیکڑوں بار سنے ہوں گے۔ لوگ بھکاریوں سے بولتے ہیں اور بھکاری سنی ان سنی کرکے آگے بڑھ جاتے ہیں لیکن وہ بھکاری تو اس آدمی کی جان کو عذاب ہوگیا تھا۔ ''اچھا تو یہ سمجھتا ہے کہ میں جو کچھ کرتا ہوں یہ کوئی کام نہیں ہے، کیوں۔ اگر ایسا ہی ہے تو میں یہیں بیٹھ جاتا ہوں تو بھیک مانگ کر دکھادے۔ اس بس کے لوگوں سے بھیک مانگ کر بتا۔ پھر پتا چلے گا کہ یہ کیسا کام ہے۔''

عالم یہ تھا کہ پوری بس کے لوگ اس انوکھی چویشن پر ہنس رہے تھے اور وہ بولنے والا شرمندہ ہوا جارہا تھا۔ پھر اس بھکاری نے لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''بھائیو! کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا کس کو اچھا لگتا ہے لیکن نصیحت کرنے والوں کو یہ کیا معلوم کہ جو ہاتھ پھیلا رہا ہے اس کے اوپر کیا گزر رہی ہے۔ وہ کتنا مجبور ہے۔ لوگ تو صرف اوپر کا حال دیکھتے ہیں۔ اندر کا دکھ کس کو معلوم ہے۔ اگر دیکھنا ہے تو پھر میرے گھر چل کر دیکھ لو۔ پھر یہ معلوم ہوجائے گا کہ یہ ہٹا کٹا انسان کتنا مجبور ہے۔'' بولتے بولتے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

اس دوران میں وہ نصیحت کرنے والا شاید شرمندگی سے بس سے اتر کر کہیں چلا گیا تھا۔ اس کی تقریر سن کر لوگوں نے اسے پیسے دینے شروع کردیے۔ شاید انہیں یہ احساس ہوگیا تھا کہ واقعی کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کا مطلب مجبوری ہے اور مجبوری بھی ایسی جس نے اسے نہ جانے کتنوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور کردیا تھا۔

زندگی کے اس پہلو کو دیکھ کر بہت عجیب سا محسوس ہوا تھا۔

کئی دنوں کے بعد مجھے کسی کام سے شہر کے ایک دور دراز علاقے کی طرف جانا پڑا۔ میرے پاس اتفاق سے اتنے پیسے نہیں تھے کہ رکشا یا ٹیکسی کرسکتا۔ اس لیے میں نے بس پکڑلی۔

اس بس میں وہ سب کچھ ہوا جو بسوں میں ہوتا آیا ہے۔ یعنی وہ بس رکی ہوئی تھی کہ وہی فقیر بس میں سوار ہوگیا۔

میں نے اس لیے اسے پہچان لیا تھا کہ اسے میں ایک بار تقریر کرتے ہوئے دیکھ اور سن چکا تھا اور اس کے ساتھ ایک دلچسپ واقعہ بھی منسلک تھا اس لیے میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔

اور یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ وہ بھکاری تھا وہ شہر کے کسی بھی حصے میں جاکر بھیک مانگ سکتا تھا۔ اس پر کوئی پابندی تو نہیں ہوسکتی تھی۔

لیکن کمال یہ ہوا کہ پھر کسی کی آواز سنائی دی۔ ''ارے بھئی، تم اتنے ہٹے کٹے ہو کر کوئی کام کیوں نہیں کرتے؟''

میں نے چونک کر اس آدمی کی طرف دیکھا جس نے یہ بات کی تھی اور بلاشبہ یہ وہی آدمی تھا، بالکل وہی کسی قسم کے شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

ذرا سی دیر میں سب کچھ سمجھ میں آگیا تھا۔

یہ سب ڈراما تھا۔ وہ بھکاری اور وہ آدمی دونوں ایک تھے۔ وہ آدمی بھکاری سے اسی قسم کی بات کرتا اور بھکاری پھر پورا ناٹک کرجاتا تھا اور لوگ پیسے دینے شروع کردیتے تھے۔

میرے اندازے کے عین مطابق سب کچھ اسی طرح ہوا جس طرح پچھلی بس میں ہوا تھا۔ مجھے ان دونوں کے اس ناٹک پر غصہ بھی آرہا تھا اور ہنسی بھی آرہی تھی۔ کچھ بھی ہو دونوں فنکار تھے۔

میں اس بس سے اتر گیا اب میں اپنے طور پر اس ڈرامے کو اس کے انجام تک پہنچانا چاہتا تھا۔ چار پانچ منٹ کے بعد وہ شخص بس سے اتر آیا۔ یعنی ظاہر ہے وہ شرمندہ ہو کر بس سے اترا تھا اور ایک طرف چل پڑا۔ اب میں نے ایک مناسب فاصلے سے اس کا تعاقب شروع کردیا۔

وہ آدمی ایک چھوٹے سے ہوٹل میں جاکر بیٹھ گیا۔ وہ ہوٹل گرچہ اس قابل تو نہیں تھا کہ وہاں بیٹھا جاسکتا۔ میں ان دونوں کو ان کے انجام تک پہنچانے کے لیے خود بھی اس ہوٹل میں داخل ہوگیا۔

مجھے اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ وہ آدمی دیکھنے میں خاصا معقول دکھائی دیتا تھا۔ اس کا لباس گرچہ قیمتی نہیں تھا لیکن صاف ستھرا اور سلیقے کا تھا۔ پتا نہیں لوگوں نے کیسے کیسے روپ دھار رکھے ہیں۔ اب کس پر بھروسا کیا جائے۔

ذرا سی دیر کے بعد وہ بھکاری بھی ہوٹل میں داخل ہوا اور اس آدمی کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ ظاہر ہے کہ وہ دونوں مجھے نہیں جانتے تھے۔ میں ان کی میز کے بالکل ساتھ ہی بیٹھا تھا۔

بھکاری نے اپنی جیبوں سے سکے اور نوٹ نکالنے شروع کردیے پھر دونوں نے گنتی شروع کردی۔ ''دو سو چالیس روپے ہیں۔'' اس آدمی نے بتایا۔

''اس میں سے ۔ مجھے دے دو باقی تم رکھ لو۔'' بھکاری نے کہا۔

میں یہ سب حیران ہو کر دیکھ رہا تھا۔ کیسی زبردست پالیسی تھی دونوں کی۔ دو سو چالیس اگر ذرا سی دیر میں مل گئے تھے تو دن بھر میں کتنا ہوجاتا ہوگا۔

بھکاری کچھ دیر بعد اٹھ کر چلا گیا تھا۔

پہلے تو میں نے یہ سوچا تھا کہ میں اسی وقت ان دونوں کو پکڑلوں گا پھر یہ خیال آیا کہ اس.... وقت میری بات نہیں مانی جائے گی وہ یہ کہہ سکتے تھے کہ تم کیوں ہمارے ٹھیکے دار بنے ہوئے ہو۔

لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اس معقول صورت یعنی دوسرے آدمی کو شرمندہ کیا جائے۔

اس کا موقع اس طرح ملا کہ وہ بھکاری اٹھ کر چلا گیا تھا اور وہ آدمی وہیں بیٹھا رہا تھا۔

میں اپنی کرسی سے اٹھ کر اس کے پاس آگیا اور سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا تھا پھر اپنی چائے کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''بھائی مجھے تم سے ایک بات کہنی ہے۔'' میں نے اسے مخاطب کیا۔

اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ ''کیا کہنا ہے؟''

''وہی بات جو تم کہتے ہو یعنی اتنے ہٹے کٹے ہو کر کوئی

اردو میں سب سے پہلے غزل کس نے کہی؟ اس سلسلے میں پنڈت کیفی رقمطراز ہیں کہ سب سے پہلی غزل چندر بھانی برہمن نے کہی ہے۔ جو کہ شاہجہانی عہد میں پیدا ہوا جبکہ صفیر بلگرامی، سعدی دکنی کو پہلا غزل گو شاعر ثابت کرتے ہیں۔ بہرحال یہ بات وثوق سے نہیں کہی جاسکتی کہ اردو کا سب سے پہلا غزل گو شاعر کون ہے تاہم ادب کے مطالعے سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ غزل کا آغاز عربی سے ہوا عربی سے فارسی اور فارسی سے اردو میں منتقل ہوا۔ اردو غزل عربی آمیز فارسی کے زیر اثر آئی اور اس کے ابتدائی نقوش ریختہ (قدیم اردو) کی صورت میں محفوظ ہیں جن کا اکثر مصرعہ فارسی اور اکثر ہندی کا ہے اور یہ بھی مان لیا جائے جیسے کہ موجود مواد کا تقاضا ہے کہ قدیم ترین تختہ جو غزل کی ہیئت پر پورا اترتا ہے وہی ہے جو امیر خسرو سے منسوب ہے تو برصغیر میں غزل کے آغاز کا زمانہ 1255ء سے 1324ء تک کے درمیان قرار پائے گا۔ اکثر محققین اور ناقدین اس بات پر متفق ہیں کہ آج تک سب سے پہلی اور مکمل غزل جو دریافت ہوئی ہے وہ امیر خسرو کی ہے۔

مرسلہ: اختر صباز بنوں

کام کیوں نہیں کرتے؟'' میں نے کہا۔

اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ وہ پریشان ہو کر میری طرف دیکھے جارہا تھا پھر اس نے خوفزدہ ہو کر پوچھا۔ ''تم کون ہو؟''

''میں تم دونوں فنکاروں اور بہروپیوں کا ستایا ہوا ایک بندہ ہوں یہ اور بات ہے کہ میرا تعلق ایک خفیہ ایجنسی سے ہے اگر کہو تو اپنا کارڈ دکھادوں۔''

اب وہ واضح طور پر خوفزدہ تھا اس کے ہاتھ کی پیالی لرزنے لگی تھی جو اس نے میز پر رکھ دی۔

''صاحب معاف کردیں ہمیں۔''

''تم لوگوں کو دھوکا دیتے ہوئے شرم نہیں آتی۔'' میں نے کہا۔ ''اور اس بھکاری کی تو فنکاری دو منٹ میں نکل جائے گی۔'' میں اس وقت خود بھی فنکاری دکھا رہا تھا ورنہ میں ان دونوں کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔

''وہ بہت اچھا آدمی ہے صاحب۔'' وہ دھیرے سے بولا۔ ''آپ کو جو سزا دلوانی ہو اس کے لیے میں حاضر ہوں لیکن اسے کچھ نہ کہیں۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

"وہ اچھا آدمی ہے۔" میں مسکرا دیا۔ "تم دونوں مل کر دھوکا دیتے پھر رہے ہو اور کہہ رہے ہو وہ بہت اچھا آدمی ہے۔"

"جی ہاں صاحب آپ کو نہیں معلوم۔ اگر آپ کے پاس وقت ہو تو میں آپ کو بتا دوں۔" اس نے کہا۔ "پھر آپ کی مرضی، آپ چاہیں یقین کریں یا نہ کریں۔"

"چلو بتاؤ، کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"صاحب یہ بات اب سے ایک مہینے پہلے کی ہے۔" اس نے بتانا شروع کیا۔ "میں یہ بتا دوں کہ میں ایک دفتر میں کام کیا کرتا تھا۔ ڈسپیچر تھا، ڈاکومنٹس بھیجنے اور رجسٹر پر نوٹ کرنے کی ذمے داری تھی میری۔ چار ہزار روپے تنخواہ ملتی تھی، میں کسی نہ کسی طرح صبر و شکر کے ساتھ گزارہ کر لیا کرتا تھا۔"

"اور تمہاری بیوی بچے!"

"بیوی ہے صاحب اور دو بچے ہیں۔" اس نے بتایا۔ "کرائے کے مکان میں رہتا ہوں۔ زندگی گزار رہا تھا کہ ایک دن اچانک بائیں ٹانگ میں تکلیف محسوس ہوئی۔ ایسی تکلیف کہ میں بتا نہیں سکتا، چلنا پھرنا دشوار ہو گیا۔ اس لیے اس دن دفتر سے چھٹی لے لی اور ایک ڈاکٹر کے پاس چلا گیا۔ وہ ڈاکٹر پڑوس میں ہے صاحب۔ اس نے بہت دیر تک معائنہ کیا اور کچھ دوائیں لکھ کر دے دیں۔ اس نے کہا کہ میں کچھ دنوں تک استعمال کر کے دیکھوں۔

خیر صاحب میں نے دوائیں استعمال کیں لیکن فائدہ کچھ نہیں ہوا۔ درد بڑھتا ہی چلا گیا۔ اس درد نے پاگل کر کے رکھ دیا تھا صاحب۔ دوسری طرف دفتر میں بھی چھٹیاں ہونے لگی تھیں، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں پھر اس ڈاکٹر کے پاس پہنچا اس نے پھر دیکھا اور لکھ کر دیا کہ میں فلاں فلاں ٹیسٹ کرواؤں۔

میں نے پوچھا ڈاکٹر صاحب کیا ہوا ہے اس نے بتایا کہ اسے کچھ شبہ ہے۔ ٹیسٹ وغیرہ ہو جائے تو پھر پتا چلے گا۔ میرے بہت پوچھنے پر اس نے بتایا کہ اسے کینسر کا شبہ ہے۔

صاحب یہ سن کر میری تو جان نکل گئی۔ اس لیے نہیں کہ مجھے موت کا ڈر تھا بلکہ اس لیے کہ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو میری بیوی اور بچوں کا کیا ہوگا۔ آدمی تو ان ہی باتوں سے ڈرتا ہے صاحب، کیوں ٹھیک ہے نا۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔۔ پھر کیا ہوا اور اس بھکاری سے تمہارا کیا تعلق؟"

"بتا رہا ہوں صاحب۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ "خیر صاحب میں نے ٹیسٹ وغیرہ کروائے تو پتا چلا کہ ڈاکٹر کا اندیشہ درست تھا، مجھے کینسر کا مرض ہو چکا تھا اور گھٹنے سے نیچے اس مرض نے حملہ کر دیا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ اس مرض کا خوف ہی کتنا ہوتا ہے۔ میں بکھر کر رہ گیا، یا خدا اب کیا ہوگا میرے پاس تو اپنے علاج کے پیسے بھی نہیں ہیں۔

پھر یہ ہوا کہ بیوی کے پاس کچھ زیورات تھے وہ اس نے میرے علاج کے لیے بیچ دیے۔ ہاں ایک بات اور دفتر والوں نے مجھ پر ترس کھا کر پانچ ہزار روپے بھجوائے تھے اور اس کے ساتھ ہی اس دفتر سے میری چھٹی کر دی گئی تھی۔"

"اوہ یہ تو واقعی بہت برا ہوا۔" مجھے اب اس سے ہمدردی محسوس ہونے لگی تھی۔

"یہ تو ہوتا ہے صاحب، بیمار کا کون ساتھ دیتا ہے اور کیوں دے گا۔ دفتر کا کام تو چلتے رہنا چاہیے تھا انہوں نے میری جگہ کسی اور کو رکھ لیا اور میں اپنے مقدر پر آنسو بہاتا رہ گیا۔ کیا کر سکتا تھا صاحب اتنا ہی بہت تھا کہ انہوں نے پانچ ہزار روپے بھجوا دیے تھے۔

پھر ایک دن اس بھکاری سے ملاقات ہو گئی۔" اس نے مزید بتایا۔ "وہ بہت جان لیوا دن تھا۔ میں اپنے کسی عزیز سے مدد کی درخواست کرنے گیا تھا۔ پیسے والا آدمی ہے صاحب لیکن اس نے جب بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہا تو مدد کہاں سے کرتا اور اس دن میرے پاس واپسی کا کرایہ بھی نہیں تھا۔ بڑی امیدیں لے کر اس عزیز کے پاس گیا تھا۔

ٹانگ کی تکلیف، جیب خالی، طویل سفر اور آیندہ کا خیال۔ ان سب نے مل کر مجھے توڑ دیا صاحب۔ میں ایک جگہ بیٹھ کر رونے لگا۔ ایک درخت کی چھاؤں سہارا دینے کے لیے مل گئی تھی میں وہیں بیٹھ گیا۔ اپنی بے بسی پر آنسو نکل رہے تھے پھر کسی طرف سے یہ بھکاری بھی آ نکلا اور میرے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے جب مجھے اس حال میں دیکھا تو مجھ سے پوچھنے لگا کہ مجھے کیا پریشانی ہے۔ اس وقت میری کیفیت ایسی تھی کہ میں نے یہ بھی خیال نہیں کیا کہ میں کسی بھکاری کو اپنی کہانی سنا رہا ہوں۔

"بہر حال میں نے اس کو سب کچھ بتا دیا۔ میری بات سن کر وہ بے چارہ خود بھی پریشان ہو گیا تھا۔"

"اور اس نے وہ ترکیب بتائی جس پر تم عمل کر رہے ہو۔"

"جی ہاں صاحب، میں اس پر تیار نہیں ہو رہا تھا لیکن اس نے کہا کہ مجھے تو کچھ نہیں کرنا ہے، میں تو صرف بھکاری

WWW.PAKSOCIETY.COM

کو ڈانٹ ڈپٹ کر کے بس سے اتر آؤں گا اس کے بعد وہ جانے اور اس کا کام جانے۔"

"میرے خدا! گویا وہ اس طرح تمہاری مدد کر رہا ہے۔"

"جی صاحب، یہ بھکاری ہزاروں لاکھوں سے بہتر ہے۔" اس نے کہا۔ "یہ اپنی کمائی آدھی مجھے دے دیتا ہے حالانکہ اس کا کیا ہے اگر چاہے تو نہ دے لیکن پابندی کے ساتھ اپنا وعدہ نبھائے جا رہا ہے۔ کیا آپ اپنے معاشرے سے ایسی کوئی مثال لا سکتے ہیں۔"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔" میں نے اقرار کیا۔ "وہ واقعی ایک عظیم انسان ہے۔"

وہ آدمی خاموش ہو گیا اس نے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ دو کرداروں کی زبردست کہانی تھی جس میں سے ایک انتہائی مجبور تھا اور جب کہ دوسرا ایک عظیم آدمی تھا جو بھیک مانگ کر اس مجبور کی مدد کیے جا رہا تھا۔

"میں اس بھکاری سے ملنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "ایسے آدمی سے ملنا بھی بہت بڑی بات ہے۔ میری نظر میں اب وہ معمولی سا بھکاری نہیں ہے بلکہ صحیح معنوں میں انسان ہے۔"

"خود اس کی بیوی سخت بیمار ہے صاحب۔" اس آدمی نے بتایا۔ "وہ اپنے گھر پیسے اور دوائی دینے کے لیے گیا ہے، ابھی کچھ دیر میں آ جائے گا آپ چاہیں تو اس کا انتظار کر سکتے ہیں۔"

میں نے اپنے اور اس کے لیے چائے اور بسکٹ وغیرہ منگوائے۔

ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ اس نے اپنا نام اکرم بتایا تھا جب کہ اس بھکاری کا نام سوہا تھا اور شاید وہ مسلمان بھی نہیں تھا کیونکہ خود اکرم کو اس کی ذات اور مذہب وغیرہ کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔

اس بھکاری کی واپسی آدھ گھنٹے کے بعد ہوئی تھی۔ وہ اکرم کے پاس ایک اجنبی کو دیکھ کر کچھ پریشان سا ہو گیا تھا۔ اکرم نے اشارے سے اسے بلا لیا اور میرا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ "یہ بابو صاحب کسی ایجنسی کے ہیں۔ انہیں میں نے اپنے اور تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔"

وہ بھکاری ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

"تم ایک عظیم کام کر رہے ہو سوہا۔" میں نے اس کی تعریف کی۔ "اتنا ایثار تو کوئی بھی کسی کے لیے نہیں کرتا۔"

"ارے نہیں صاحب، میں تو ایک معمولی سا آدمی ہوں۔"

"نہیں تم معمولی نہیں ہو۔" میں نے کہا۔ "کاش میرے بس میں ہوتا تو میں تم دونوں کے لیے کچھ کر سکتا۔"

وہ شرمندہ ہوتا رہا اور میں اس کی تعریف کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد میں نے چائے اور بسکٹ کے پیسے دیے اور اس ہوٹل سے باہر آ گیا۔ میرے دل کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔

کبھی کبھی جب انسان اور انسانیت پر سے اعتماد ختم ہونے لگتا ہے تو پھر اسی قسم کے لوگ دوبارہ اعتماد قائم کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد یہ ہوتا رہا کہ بہت دنوں تک بس میں سفر کا موقع نہیں مل سکا۔

کئی مہینوں کے بعد بس میں سوار ہوا تو وہی بھکاری سوہا دکھائی دے گیا لیکن اسے ٹوکنے والا اکرم دکھائی نہیں دے رہا تھا اور نہ ہی اس کی آواز سنائی دی تھی۔

سوہا نے مجھے پہچان لیا تھا اس نے کچھ نہیں کہا اور نہ ہی میں نے کچھ کہا لیکن میں بس سے اتر آیا تھا، سوہا نے شاید میرا یہ اشارہ سمجھ لیا تھا اس لیے وہ بھی بس سے نیچے آ گیا۔

اسے دیکھ کر میں آگے آگے چلنے لگا۔ سوہا میرے پیچھے ہی آ رہا تھا، کچھ دور آ کر میں ایک سنسان سی جگہ پر رک گیا..... وہ میرے پاس آ گیا..... "کیسے ہو سوہا؟" میں نے پوچھا۔

"آپ کو میرا نام بھی یاد ہے صاحب۔"

"کیوں نہیں۔ تمہارا نام کیسے بھول سکتا ہوں اور وہ کہاں ہے اکرم۔"

"اس بے چارے کا تو انتقال ہو گیا ہے صاحب۔" اس نے بتایا۔ "اس کا کینسر اچانک زیادہ ہونے لگا تھا، پھیلنے لگا تھا اور وہ بے چارہ مر گیا۔"

"اوہ!" میں نے افسوس کا اظہار کیا۔

"اب میں کسی اور کو ڈھونڈ رہا ہوں صاحب۔" اس نے بتایا۔ "کوئی ایسا جو اکرم کی طرح مجھے بس میں بول سکے۔"

"اوہ تو زیادہ کمائی کی عادت پڑ گئی ہے۔"

"نہیں صاحب یہ بات نہیں ہے۔" وہ جلدی سے بولا۔ "مرنے والے کی بیوی اور اس کے بچے بھی تو ہیں۔ میں اب بھی آدھی کمائی ان دونوں کو دے کر آتا ہوں۔"

اور میں اس کی طرف دیکھتا رہا گیا۔ وہ بھکاری نہیں شہنشاہ تھا۔

سبق آموز

محترم مدیر اعلیٰ
السلام علیکم!
میں کتنا ہی مصروف کیوں نہ رہوں مگر سرگزشت ضرور پڑھتا ہوں صرف اس لیے کہ یہ واحد پرچہ ہے جس کی وجہ سے انسان کی پہچان بہ آسانی ہوتی ہے۔ آپ حیران ہوں گے کہ میں خود بھی نفسیاتی گتھی میں الجھا ہوا شخص ہوں، کس قسم کا، یہ آپ کو میری آپ بیتی میں مل جائے گا۔

مبشر احمد
(کراچی)

وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھا بتا رہا تھا "میرا نام عبدالرشید ہے۔ میں ایک دفتر میں معمولی سا کلرک ہوں۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ کلرک کی تنخواہ بہت تھوڑی ہوتی ہے اور مہینا بہت بڑا، بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ یہ پہاڑ جیسا مہینا گزارنے کے لیے کلرک کی زیرے جیسی تنخواہ انتہائی ناکافی ہوتی ہے۔ البتہ سفید پوش لوگ اسی تنخواہ میں کسی نہ کسی طرح اپنی سفید پوشی کا بھرم قائم رکھتے ہیں۔

میں شادی شدہ ... ہوں اور میرا ایک بارہ سال کا بیٹا

WWW.PAKSOCIETY.COM

بھی ہے جس کا نام کاشف ہے اور وہ ساتویں جماعت میں پڑھتا ہے۔ وہ کافی عرصے سے ایک نئے یونیفارم اور جوتوں کے لیے ضد کررہا تھا لیکن میں باوجود ہزار کوشش کے اپنی تنخواہ میں سے اتنا بچا نہیں پارہا تھا کہ اس کی فرمائش پوری کرسکتا۔ ایسی اور اس جیسی دوسری چھوٹی چھوٹی مشکلات کے باوجود ہماری زندگی خاصی پُرسکون گزر رہی تھی۔ اصل خرابی اس وقت شروع ہوئی جب ایک دن میں ڈیوٹی سے ذرا جلدی گھر واپس آگیا۔ میرے بیٹے کاشف کو بھی اسکول سے گھر آئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس نے نیا یونیفارم اور نئے جوتے پہن رکھے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کا بستہ بھی نیا تھا۔ میں نے اپنی بیوی ارم سے اس بارے میں پوچھا تو اس نے کہا کہ وہ کافی عرصے سے پیسے بچا رہی تھی اور اب انہی پیسوں سے وہ یہ تمام چیزیں لائی ہے۔ ویسے تو میری بیوی بہت اچھی ہے۔ میری زندگی میں آنے سے پہلے وہ جرمنی میں رہا کرتی تھی۔ وہیں اس کے والدین کار حادثے کا شکار ہوئے وہاں اس کا کوئی نہیں تھا اس لیے وہ چچا کے پاس پاکستان آگئی اور انہوں نے اسے میرے سر منڈھ دیا۔ وہ اردو کے علاوہ انگلش، جرمن اور فرنچ بھی روانی سے بول لیتی ہے لیکن دنیا کی اکثر خواتین کی طرح وہ بھی بہت جھوٹی ہے۔ شاید خواتین میری اس بات کا برا منائیں اور کہیں کہ میں بہت ہی بڑا احسان فراموش ہوں کہ اپنی بیوی کو جھوٹا کہہ رہا ہوں۔ حالانکہ اس نے پیسے بچا کر میرا ایک مسئلہ حل کردیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں ایک ایک پیسے کا حساب رکھتا ہوں کہ وہ کہاں اور کیسے خرچ ہوا خواہ وہ میں نے خرچ کیا ہو یا ارم نے۔ میں نے اس وقت تو ارم کو کچھ نہیں کہا لیکن اس کی طرف سے میرے ذہن میں شک بیٹھ گیا اور میں نے حقیقت معلوم کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

اس سلسلے میں، میں نے جو پہلا قدم اٹھایا وہ یہ تھا کہ میں نے باتوں ہی باتوں میں پڑوس والوں سے یہ معلوم کرلیا کہ میری بیوی روزانہ صبح دس بجے سے دوپہر ایک بجے کے دوران کہیں جاتی ہے۔ اب مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ وہ جاتی کہاں ہے۔ اس مقصد کے لیے میں نے اپنے ایک دوست سے اس کی مرحومہ والدہ کا برقع ادھار لیا اور اسے پہن کر اپنی بیوی کا پیچھا کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

میرا یہ تعاقب تین دن پر مشتمل تھا۔ باوجود اس کے کہ برقع میرے دوست کی والدہ مرحومہ کا تھا وہ نہایت اچھی حالت میں تھا اور میری قد و قامت کچھ اس طرح کی ہے کہ میں اس برقع میں کوئی دوشیزہ ہی محسوس ہورہا تھا۔ شاید یہی بات ہمارے ایک محلے دار مرزا صاحب نے بھی محسوس کی اور وہ میرے پیچھے پیچھے چل پڑے، شاید میری حفاظت کے خیال سے، یہ میرا ابتدائی تجزیہ تھا۔ مرزا صاحب کی شہرت ہمارے محلے میں بہت اچھی ہے۔ وہ اکثر محلے کی خواتین بالخصوص بیوہ خواتین کی مدد کرتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ وہ میری اسی قسم کی مدد کے خیال سے میرا پیچھا کرتے ہوئے جب میرے پاس آئے اور انہوں نے ہمدردی میں مجھ سے کچھ الفاظ کہے تو میرا دماغ ایک عجیب و غریب سی کیفیت کا شکار ہوگیا اور نتیجے میں، میں مرزا صاحب کو ایک طمانچہ مار کر فرار ہوگیا۔ اس طرح میرا پہلے دن کا تعاقب مرزا صاحب کی شرافت کی وجہ سے ناکام ہوگیا۔

دوسرے دن میں اچھی طرح اطمینان کرکے کہ مرزا صاحب آس پاس نہیں ہیں جب اپنی بیوی کے تعاقب میں جانے لگا تو دو معصوم سے لفنگے میرے پیچھے لگ گئے اور چونکہ میں ایک باحیا برقع پوش تھا لہٰذا میں نے اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کے لیے انہیں چکما دینے کی بہت کوشش کی لیکن وہ کمبخت بھی دُھن کے پکے تھے۔ انہوں نے میرا پیچھا نہ چھوڑا اور پھر مجبوراً مجھے ان کو ایک پولیس کے سپاہی کے ہاتھوں مرغا بنوانا پڑا جس سے میں نے اپنی شیریں مگر انتہائی دھیمی آواز میں ان نوجوانوں سے بچانے کی درخواست کی تھی۔

تیسرے دن مجھے تعاقب میں کامیابی ہوئی اور میں ارم کا تعاقب کرتے ہوئے کلفٹن کے ایک بنگلے تک پہنچ گیا۔ میں نے وہیں رک کر ارم کی واپسی کا فیصلہ کیا۔ ٹھیک دو گھنٹے بعد اس کوٹھی سے ایک لال کار نکل کر میرے سامنے سے گزری۔ میں نے دیکھا کہ اس میں ارم ایک غیر ملکی کے ساتھ آگے بیٹھی ہوئی تھی۔ کار تو میرے سامنے سے گزر کر چلی گئی لیکن میرے دل و دماغ کو ایک بھیانک طوفان میں پھنسا گئی۔ اس وقت میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اس دنیا کو تہس نہس کردوں۔ جو چیز میرے سامنے آئے اسے آگ لگادوں یا پھر زمین پھٹ جائے اور میں اس میں اپنی محرومی سمیت سما جاؤں۔ اسی قسم کے خیالات کے ساتھ نہ جانے کب اور کیسے میں اپنے گھر کے سامنے پہنچ گیا۔ میرا دل اس گھر میں جانے کو نہیں چاہ رہا تھا جہاں ایک بے وفا عورت اپنی تمام تر خوبصورت بے وفائیوں کے ساتھ موجود تھی۔ جب میں گھر میں داخل ہوا تو ارم نے حسبِ معمول مجھے خوش آمدید کہا۔ اس چالاک عورت کے چہرے پر ذرا

بھی بے اطمینانی نہیں تھی۔ اس کے چہرے سے بالکل محسوس نہیں ہورہا تھا کہ اسے اپنی بے وفائی پر کوئی ملال ہے۔ بات ایسی تھی کہ اس کے بارے میں بات کرنا بھی مجھے گھٹیا پن محسوس ہوا لیکن اس دن کے بعد سے ہماری زندگی جہنم بن گئی اور میرا رویہ ارم کے ساتھ روز بروز بد سے بدتر ہوتا چلا گیا جس کی اس نے مجھ سے شکایت کی پھر وجہ معلوم کرنے کی کوشش کی اور آخر میں مجھ سے لڑ کر کاشف کے ساتھ اپنے چچا کے گھر جا کر بیٹھ گئی اور وہ سناٹا جو میرے ذہن پر تھا میرے گھر پر بھی چھا گیا۔

زندگی اسی طرح گزر رہی تھی کہ میرے بچپن کا لنگوٹیا دوست اقبال دبئی سے کچھ دنوں کے لیے پاکستان آیا۔ اس کی حیثیت گھر کے فرد جیسی تھی۔ وہ مجھ سے ملنے میرے گھر آیا اور مجھ سے گھر کے سناٹے کی وجہ پوچھی۔ میں اسے کیا بتاتا بہرحال وہ مجھ سے مل کر چلا گیا اور پھر ارم سے ملا جسے وہ بہن کی طرح عزیز رکھتا تھا۔ اس کے بعد میرے پاس آکر اس مکار عورت کی ہمدردی میں مجھے لعن طعن کیا اور کہا کہ ساری غلطی میری ہے۔ میں انسان سے جانور بن گیا ہوں اور میں نے ایک عورت پر بہت ظلم و ستم کیا ہے اور یہ کہ اس نے ارم کے ساتھ میری ملاقات کا اہتمام کیا ہے تاکہ بہتری کی کوئی راہ نکل سکے۔ اپنے عزیز ترین دوست کے منہ سے اس بے وفا عورت کی حمایت مجھ سے برداشت نہ ہوسکی اور میں نے اس عورت کو آئینہ دکھانے کے لیے ملاقات کی ہامی بھرلی۔

ہماری ملاقات اقبال کے گھر طے تھی جہاں اقبال کے بوڑھے والدین کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ میں وقت سے کچھ پہلے پہنچ گیا اور ارم کچھ تاخیر سے آئی۔ اس کی صورت دیکھ کر میں اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکا۔ وہ بیٹھی بھی نہ تھی کہ میں نے اپنے اندر کا غبار نکالنا شروع کردیا۔ وہ ہکا بکا کھڑی خاموشی سے میری تمام باتیں سنتی رہی۔ جب میں اپنے دل کی ساری بھڑاس نکال چکا تو اس نے اقبال سے گاڑی نکالنے کے لیے کہا اور اقبال کے پوچھنے پر کہ کہاں جانا ہے اس نے کہا کہ اقبال بھائی میں تمام باتوں کا جواب دوں گی لیکن ابھی کوئی سوال نہ کریں اور میرے ساتھ ان کو لے کر چلیں۔

ہم گاڑی میں بیٹھ کر کلفٹن کے اسی بنگلے میں پہنچے جہاں میں نے ارم کو اس غیر ملکی کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہاں ارم نے ہمیں دو غیر ملکی مرد و عورت سے ملوایا جن میں مرد وہی تھا جسے میں نے ارم کے ساتھ گاڑی میں دیکھا تھا۔ ارم نے ان دونوں کا تعارف مسٹر اور مسز اینڈریو کے نام سے کروایا۔ باقی باتیں مسز اینڈریو سے گفتگو میں واضح ہوگئیں۔ قصہ یہ تھا کہ مسٹر اور مسز اینڈریو جرمن نژاد تھے اور اپنی حکومت کی طرف سے پاکستان میں جرمن سفارت خانے میں تعینات تھے۔ مسز اینڈریو کو مختلف زبانیں سیکھنے کا بہت شوق تھا جس کے لیے انہوں نے اخبار میں اشتہار دیا اور ارم وہ اشتہار پڑھ کر ان کے پاس پہنچ گئی۔ جس دن میں نے اسے مسٹر اینڈریو کے ساتھ دیکھا اس دن مسٹر اینڈریو اسے معمول کے مطابق قریبی بس اسٹاپ تک چھوڑنے گئے تھے۔ ارم کی غلطی صرف یہ تھی کہ اس نے سرپرائز کے چکر میں مجھے کچھ نہیں بتایا۔

ان تمام باتوں کے واضح ہوجانے کے بعد میں نے ارم سے ہاتھ جوڑ کر اپنے رویے کی معافی مانگی اور اس سے گھر واپس آنے کی درخواست کی جسے اس نے اعلیٰ ظرفی کے ساتھ قبول کرلیا اور میری زندگی دوبارہ پُرسکون ہوگئی۔

میری آپ سب سے گزارش ہے کہ اگر آپ کی زندگی میں ایسا کوئی واقعہ پیش آئے تو اس کی مکمل تحقیق کیے بغیر جلد بازی میں ظاہری چیزوں کو دیکھ کر کوئی فیصلہ نہ کریں ورنہ میری ازدواجی زندگی تو سنبھل گئی خدانخواستہ آپ کی

گھر صاف رکھیے
سانس کی بیماری سے بچیں

طبی ماہرین نے کہا ہے کہ گھروں میں باورچی خانے، فرش اور دیگر چیزوں کو صاف ستھرا رکھ کر دمے کی بیماری ختم کی جاسکتی ہے۔ یورپ میں ہونے والی ایک تازہ طبی تحقیق کے مطابق دفتروں، کام کرنے والی جگہوں اور گھروں میں روزانہ صفائی کے معیار کو بہتر بنانے سے دمے کی بیماری کی شرح کو 25 سے 30 فیصد تک کم کیا جاسکتا ہے۔ طبی ماہرین نے دمے کے مریضوں کو 4 ماہ تک بغیر دوا کھلائے صرف صفائی کے عمل سے بہتر بنانے کے کامیاب تجربات کے بعد اعلان کیا ہے کہ دمے کے 90 فیصد مریضوں کی علامات کے اثرات ماحولیاتی صفائی سے ختم ہوسکتے ہیں۔

مرسلہ: نادیہ احسن، حاصل پور

WWW.PAKSOCIETY.COM

ترازو

جناب مدیر اعلی
سلام مسنون!
زندگی تبھی سنورتی ہے جب میاں بیوی میں ذہنی ہم آہنگی ہو۔ اس کی مثال میری بیوی ہے۔ جو بات میں اس سے چھپانا چاہتا تھا، وہ بات اسے اچھی طرح معلوم تھی مگر اس نے ایک لفظ بھی زبان سے ادا نہ کیا۔ اور جب اس نے زبان کھولی تو میں حیران رہ گیا کہ اس نے میرا پردہ رکھنے کے لیے اپنے ہونٹ سی لیے تھے۔
محمد فصاحت انصاری
(فیصل آباد)

میں جانتا تھا کہ وہ مرجائے گی۔ مگر میں اس کی جدائی برداشت نہیں کرسکتا تھا کیونکہ مجھے اس سے اتنی ہی محبت تھی جتنی محبت کی مثال دی جاسکتی ہے۔

اس نے ایک بچے کو جنم دیا تھا اور وہ بچہ صرف چند گھنٹوں تک زندہ رہ سکا تھا۔ ملیحہ نے اس کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ اس بے چاری کو معلوم بھی نہیں تھا کہ اس نے جس بچے کو جنم دیا ہے وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا ہے۔

ڈاکٹر نے انجکشن لگا کر اسے سُلا دیا تھا۔ ویسے اپنی اس عارضی بے ہوشی سے پہلے اس نے مجھ سے بہت سی باتیں کی تھیں۔ اسے یہ خبر دے دی گئی تھی کہ اس نے ایک خوبصورت بیٹے کو جنم دیا ہے اسی لیے اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ اس نے بہت محبت سے میرا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

''فیصل ہم اپنے بیٹے کو خوب ڈھیری تعلیم دلوائیں گے۔'' وہ کہہ رہی تھی۔ ''اس معاملے میں تم بہت بے پروا ہو لیکن میں کیپر و مائز نہیں کروں گی۔''

''ہاں یار۔'' میں نے اس کے بالوں کو سہلا دیا تھا۔

''کیوں فکر کرتی ہو میں بھی باپ ہوں اس کا۔''

''اور دیکھو.. تم اس کی شرارتوں پر اسے ڈانٹ ڈپٹ

نہیں کرو گے' اسے سمجھانا صرف میرا کام ہوگا۔''

''او کے بابا او کے ایسا ہی ہوگا۔''

اس کے بعد ڈاکٹر نے آکر اسے انجکشن لگا دیا تھا۔

وہ ایک گہری بے ہوشی میں چلی گئی اور میں اس کے پاس بیٹھا رہا۔ میری ہمت ہی ختم ہوگئی تھی۔ میرے پورے وجود میں سوائے ایک اذیت ناک سناٹے کے اور کچھ بھی نہیں تھا کیونکہ مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ ملیحہ نے جس بچے کو جنم دیا ہے وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ یہ خبر صرف ملیحہ کو نہیں معلوم تھی اور اسے معلوم ہوتی تو شاید وہ مر چکی ہوتی۔

میں سگریٹ پینے کے لیے اس کے کمرے سے باہر آ گیا۔ دالان کے ایک ستون سے ٹیک لگا کر سگریٹ کے دو چار کش لیے تھے کہ ایک آدمی میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر انسان تھا۔ ''کیا بات ہے بابو' بچے کی موت سے پریشان ہو۔'' اس نے پوچھا۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''حیران مت ہو۔'' اس نے پھر کہا۔ ''میں سب جانتا ہوں۔ میں اسی اسپتال کا ہوں ویسے جو ہوا برا ہوا ہے کیوں۔''

''ہاں بھائی۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

تو خیر کسی طرح برداشت کرلوں گا لیکن میری بیوی۔"

"اگر کہو تو ایک بچے کا بندوبست کردوں۔" اس نے دھیرے سے کہا۔

"کیا.....!" اس کی بات نے مجھے حیران کردیا تھا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو؟"

"ہاں صاحب، صرف دس ہزار خرچ ہوں گے۔"

"کیا بکواس ہے۔ کیا تم دس ہزار روپے لے کر کسی کا بچہ چوری کر کے مجھے دو گے۔"

"ارے صاحب توبہ توبہ..." وہ اپنے کانوں کو ہاتھ لگانے لگا۔ "میں ایسا گناہ نہیں کرسکتا یہ تو بہت بڑا ظلم ہو گا۔ میں تو اس بچے کے ماں باپ کی مرضی سے بچہ لا کر دوں گا بلکہ وہ لوگ خود تم سے مل کر اپنا بچہ تمہارے حوالے کریں گے۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے کوئی ماں باپ اپنے بچے کو کس طرح خود سے الگ کرسکتے ہیں۔"

"یہ زندگی بہت بے رحم ہے بابو۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ اب اس کے لہجے میں سنجیدگی بھی تھی اور دکھ بھی تھا۔ "مفلسی کی مار بہت بری ہوتی ہے۔ گھر میں جب پہلے سے چار بچے موجود ہوں اور کھانے کے لیے کچھ نہ ہو اور جب بچے بھوک سے رو رہے ہوں تو اس وقت پانچویں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اول تو اسے دنیا میں آنا ہی نہیں چاہیے اگر آ گیا ہے تو کہیں اور چلے جانا چاہیے یا تو مر جائے یا پھر کسی ایسے کے پاس چلا جائے جو اس کی پرورش کرسکے۔"

"سمجھ گیا۔ چلو تم مجھے اس آدمی سے ملواؤ۔"

"وہ آدمی خود میں ہوں صاحب۔" اس نے کہا۔

"کیا.....!" میری حیرت اور بڑھ گئی تھی۔ "تم ہو؟"

"جی ہاں۔" اس کی اداسی اور بڑھ گئی تھی۔ "میں ہی ہوں وہ بدنصیب باپ، آپ کی بیوی نے تو اسپیشل روم میں بچے کو جنم دیا ہے جب کہ میری بیوی جنرل وارڈ میں ہے اسی لیے آپ کو اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم لیکن میں آپ کے بارے میں جانتا ہوں۔"

اس آدمی نے مجھے سوچنے پر مجبور کردیا تھا، کیا میں ملیحہ کو ایک بڑے ذہنی صدمے سے بچانے کے لیے ایسا کرسکتا تھا۔ کیا ایسا کرنا چاہیے تھا۔ یہ تو کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے والی بات تھی شاید میں ایسا نہیں کرسکتا۔

"بابو صاحب سب کچھ قانونی طور پر ہوگا۔" اس کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "آپ ایک نظر میرے بچے کو دیکھ لیں آپ کو اس پر پیار آنے لگے گا۔"

نہ جانے میرے دل میں بھی کیا آئی کہ میں اس کے ساتھ ہولیا۔ اس وقت میں خالی الذہن سا ہو رہا تھا۔ وہ آدمی مجھے جنرل وارڈ میں لے آیا۔ یہ حصہ خواتین کے لیے تھا ہر طرف عورتیں۔ ماں بن جانے والی عورتیں یا اس مرحلے سے گزر جانے والی عورتیں، غربت زدہ پریشان حال۔ آنکھوں میں حسرتیں اور مایوسیوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔

وہ ایک بستر کے پاس لے آیا جس پر اس کی بیوی لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہوگی لیکن چہرے پر بے پناہ بھولپن، خوبصورت آنکھیں۔ یہ اور بات ہے کہ مفلسی نے اس کے حسن کو گہنا دیا تھا لیکن اپنے شوہر کے برعکس اس میں ابھی بھی دلکشی اور تازگی تھی۔ اس کا نومولود بچہ اس کے ساتھ تھا۔

ایک خوبصورت گول مٹول سا بچہ جو شاید اپنی ماں پر گیا تھا۔ ابھی سے ایسا لگ رہا تھا جیسے آگے چل کر اس پورے ماحول سے الگ ثابت ہوگا۔

اس عورت نے حسرت بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ "بابو صاحب یہ ہے میری بیوی۔" اس آدمی نے عورت کی طرف اشارہ کیا۔ "اور یہ ہے ہمارا بچہ تم خود دیکھ لو کتنا خوبصورت ہے۔"

دوسرے لمحے میں نے اس بچے کو اپنانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اگر میں اسے لے جا کر ملیحہ کی گود میں دے دیتا تو اسے شبہ بھی نہیں ہوتا کہ یہ بچہ کسی اور کا ہے اور اس کی خواہش پوری ہوجاتی۔

"تم یہ بتاؤ کیا اس بچے کی ماں اس کے لیے تیار ہے۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں صاحب۔" اس عورت نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ "میں تیار ہوں۔ میں نے ہی ان سے کہا تھا کہ کسی شریف آدمی کو دیکھ لو کوئی ایسا جوڑا جو میرے بچے کو اپنی اولاد کی طرح اپنے سینے سے لگا کر رکھے۔"

میں سوچ میں پڑ گیا تھا۔ یہ صورتِ حال ایسی تھی کہ کسی سے مشورہ بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ملیحہ کو تو بتانے کا سوال ہی نہیں تھا لیکن ان تمام کارروائیوں سے پہلے ڈاکٹرز اور

نرسوں کو اعتماد میں لینا ضروری تھا تاکہ وہ لوگ عین وقت پر ملیحہ کو کچھ بتا نہ دیں۔

اس سلسلے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ ڈاکٹرز اور نرسوں کے سامنے سب معاملات طے ہو گئے تھے بلکہ اسپتال کا اسٹاف اس کام میں ساتھ بھی دے رہا تھا کیونکہ ایک طرف تو یہ ملیحہ کی خوشیوں کا معاملہ تھا اور دوسری طرف اس گھر کی ایک ذمے داری بھی کم ہو رہی تھی۔

اسٹاف ہی کی گواہی میں قانونی معاملات طے پائے تھے۔ سب ہی تعریف کر رہے تھے۔ ملیحہ کو ابھی تک کچھ بھی نہیں معلوم تھا۔ میں نے اس خاندان کو پورے پچاس ہزار روپے دے دیے تھے۔

پچاس ہزار پا کر ان کی آنکھیں پھٹی رہ گئی تھیں۔ انہوں نے بچے کو میری گود میں ڈال دیا تھا اور میں نے اسے ملیحہ کی آغوش میں۔

شاید اس اسپتال میں اس قسم کا یہ پہلا واقعہ ہوا تھا اسی لیے سب ہی بہت خوش تھے۔ دعائیں اور مبارکبادیں دی جا رہی تھیں۔ تیسرے دن ہم اس بچے کو لے کر گھر واپس آ گئے۔

میرے علاوہ کسی کو بھی نہیں معلوم تھا کہ اصل کہانی کیا ہے۔ ملیحہ کی خوشی دیکھنے کے قابل تھی۔ وہ موت سے زندگی کی طرف لوٹ آئی تھی۔ اس کے پہلو میں ایک چاند جیسا بچہ تھا۔

ابتدا میں کچھ دنوں تک میں کچھ کشمکش میں رہا۔ اس بچے کو پیار کرتا تو یہ خیال آتا کہ ارے یہ تو کسی اور کا ہے میں کیوں اسے سینے سے لگائے ہوئے ہوں پھر سوچتا نہیں جب میں نے اس بچے کو ایڈاپٹ کرلیا ہے، اس کو اپنا نام دے دیا ہے تو پھر میرا ہے صرف میرا، ہم دونوں کا ہے۔

آہستہ آہستہ اس سے پیار ہوتا چلا گیا۔ یہ بھی ایک فطری بات ہے کہ پیدا کرنے والے سے زیادہ شاید پرورش کرنے والے کو محبت ہوجاتی ہے۔ ملیحہ تو خیر خود کو اس کی ماں ہی سمجھتی تھی۔ اسی لیے اس کے پیار کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا لیکن میں بھی اس کے لیے پاگل ہو رہا تھا۔ ہم نے اس کا نام فیاض رکھا تھا اس کا عقیقہ بھی بہت دھوم دھام سے ہوا تھا۔

ایک دن راستے میں مجھے وہ آدمی دکھائی دے گیا جس نے اپنے بچے کو میرے حوالے کیا تھا۔ میں نے اس کے پاس اپنی گاڑی روک دی تھی۔ وہ بھی مجھے پہچان کر خوش ہو گیا تھا۔ میں نے اس کا حال دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ میں نے اسے جو پیسے دیے تھے ان پیسوں سے اس نے چھوٹا موٹا کاروبار شروع کردیا تھا اور اب اس کی صورتِ حال پہلے سے بہتر تھی۔

میں نے جب بتایا کہ اس بچے کا نام فیاض رکھا گیا ہے اور اس کا عقیقہ بھی ہوگیا ہے تو اس نے کہا۔ "بابو صاحب اب آپ جانیں اور آپ کا بیٹا جانے، اب ہمارا اس سے کیا واسطہ۔ اب تو وہ آپ ہی کا ہے وہ خوش رہے تو سمجھیے کہ ہم خوش ہو گئے۔"

بہت باظرف آدمی تھا اسی لیے اس نے ایسی بے نیازی کی باتیں کی تھیں ورنہ عام طور پر تو لوگ اس قسم کے احسانات کا ہر وقت چرچا کرتے رہتے ہیں اور دباؤ میں

دنیا بھر میں
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی مطبوعات
سسپنس ڈائجسٹ | جاسوسی ڈائجسٹ | پاکیزہ ڈائجسٹ | سرگزشت
منگوانے کیلئے ہمارے مقرر کردہ ایکسپورٹرز
ویلکم ٹریڈرز
سے رابطہ کریں
WELCOME TRADERS
189-E, Block-2,P.E.C.H.S, Karachi,
Pakistan
Tel: (92-21) 34545513, 34520214.
Fax(92-21) 3454885.
Cell # 0333-4315950
Email: zaidi@welcome.com.pk
Website: www.welcome.com.pk

WWW.PAKSOCIETY.COM

رکھنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ خدا کا بندہ ہاتھ ملا کر آگے بڑھ گیا تھا۔

بہرحال کہانی آگے بڑھتی رہی۔

فیاض بڑا ہوتا گیا اور جب وہ دو سال کا تھا تو ایک شام جب میں دفتر سے گھر واپس آیا تو میں نے اسی عورت کو اپنے گھر میں دیکھ لیا۔ وہ فیاض کو گود میں لیے ہوئے تھی۔

یہ وہی عورت تھی فیاض کو جنم دینے والی۔ حالانکہ میں نے اسے ذرا سی دیر کے لیے صرف ایک بار ہی دیکھا ہوگا لیکن اس کی صورت میرے ذہن پر نقش ہو چکی تھی اور اب اتنے دنوں کے بعد اسے گھر میں دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

اس نے مجھے بہت ادب سے سلام کیا اور ایک طرف چلی گئی۔ ''ملیحہ یہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''یہ کہاں سے آ گئی۔''

''بے چاری ضرورت مند عورت ہے۔'' ملیحہ نے بتایا۔ ''میں نے فیاض کی دیکھ بھال کے لیے رکھ لیا ہے۔''

''کیا یہ خود آئی تھی۔''

''ہاں خود ہی آئی تھی۔'' ملیحہ نے کہا۔ ''مجھے اچھی اور شریف لگی اسی لیے میں نے اسے رکھ لیا۔''

میں نے ملیحہ سے تو کچھ نہیں کہا لیکن موقع پا کر میں نے اس عورت کو پکڑ لیا تھا۔ ''تم یہاں کیوں آئی ہو۔ ملازمت کرنی ہو تو کہیں اور جا کر کرو۔''

''میں تو صاحب بس اسی لے آئی تھی کہ اپنے منّے کے پاس رہ سکوں گی۔''

''نہیں، تمہارا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے تم چلی جاؤ یہاں سے۔''

''صاحب میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں، یہ راز زندگی بھر میرے سینے میں رہے گا۔''

''تمہیں یہاں کا پتا کس نے بتایا۔''

''بس کسی طرح پتا چل گیا تھا صاحب۔'' اس نے کہا۔ ''میں آپ سے پھر کہہ رہی ہوں کہ زندگی بھر میرا منہ بند رہے گا۔'' اس نے کہا۔ ''بس مجھے اپنے بچے کے پاس رہنے کی اجازت دے دیں۔ آپ تو بہت بڑے دل کے آدمی ہیں۔''

اس نے کچھ اس انداز سے باتیں کیں کہ میں مجبور ہو کر رہ گیا۔ میں نے اسے رہنے کی اجازت دے دی تھی۔ میں نے بھی یہ سوچا کہ چلو اس بہانے اگر کسی عورت کی مامتا کو سکون مل رہا ہے تو میرا کیا جاتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ وہ کسی دن ملیحہ کے سامنے یہ راز ظاہر نہ کر دے۔

معاملات چلتے رہے۔ اس نے ملیحہ کو اپنے اور بچے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ میں نے یہ دیکھا کہ فیاض اس سے بہت زیادہ مانوس ہوتا جا رہا تھا وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ ملیحہ نے یہ بات محسوس نہ کی ہو لیکن میں تو ان دونوں کے رشتے سے واقف تھا۔ اس لیے فوراً احساس ہو گیا کہ فطری طور پر ملیحہ سے زیادہ اس عورت سے مانوس ہے۔ اس سے پیار کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک نیچرل سی بات تھی۔

اس نے فیاض کی ساری ذمے داریاں اپنے سر لے لی تھیں۔ اس کی خوشی سے خوش ہو جاتی اور اس کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتی تھی۔ بے چاری ملیحہ اس کے اس رویّے کی تعریف کیا کرتی۔ ''بہت اچھی عورت ہے۔ فیاض سے تو پاگلوں کی طرح محبت کرتی ہے۔ میں تو اس کی محبت دیکھ دیکھ کر حیران ہوتی رہتی ہوں۔''

اب میں اسے کیا بتاتا کہ فیاض خود اسی کا بیٹا ہے۔ اسی لیے وہ اس سے اتنی محبت کر رہی ہے۔

ایک دن میں نے موقع پا کر اس عورت سے کہا۔ ''دیکھو میں یہ سمجھتا ہوں کہ تم کس مجبوری کے تحت یہاں آئی ہو اور کس لیے فیاض کو دیکھ رہی ہو۔ ظاہر ہے کہ تم اس کی ماں ہو لیکن تمہارا یہ رویہ خود فیاض کے لیے نقصان دہ ہو جائے گا۔''

''وہ کس طرح صاحب۔''

''وہ اس طرح کہ وہ بڑا ہوگا تو اس کی محبت دو حصوں میں بٹ جائے گی۔ ایک طرف تم ہو گی اور دوسری طرف ملیحہ ہوگی اور فرض کرو اگر بڑا ہو کر کسی طرح اسے پتا چل گیا کہ تم اس کی ماں ہو تو وہ بچہ ذہنی طور پر تباہ ہو جائے گا۔ کیا تم ایسا پسند کرو گی؟''

''نہیں صاحب! اللہ نہ کرے کہ اسے کچھ ہو۔''

''تو بس بہتر یہی ہے کہ تم اسے چھوڑ کر چلی جاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''تمہیں اس بات کا تو اطمینان ہو گیا ہوگا کہ ہم تمہارے بچے سے بہت محبت کرتے ہیں اور اس گھر میں بہت اچھی پرورش ہو رہی ہے۔''

''ہاں صاحب اس میں تو کوئی شک نہیں ہے۔''

''تو بس چھوڑ دو اس کو ہم پر بھروسا کرو۔''

اور وہ چلی گئی۔ شریف اور سمجھدار عورت تھی۔ اس نے میری بات سمجھ لی تھی اسی لیے وہ چھوڑ کر چلی گئی۔ اس کے

چلے جانے کو ملیحہ نے بھی محسوس کیا تھا اور خود فیاض بھی کچھ دنوں تک اپنی خاموش نگاہوں سے اسے تلاش کرتا رہا تھا۔ اگرچہ وہ ابھی اظہار کے قابل نہیں ہوا تھا لیکن احساس ہو رہا تھا کہ وہ اس عورت کے لیے بے چین ہے۔

بہرحال وقت گزرتا گیا۔ فیاض چار سال کا ہو گیا۔ بہت شرارتی اور ذہین تھا۔ ہم نے اس عمر سے اس کی تعلیم پر بھی توجہ دی تھی۔ اسے ایک مونٹیسوری میں داخلہ دلوا دیا تھا اور یہ کیسا اتفاق تھا کہ وہی عورت اس اسکول میں ملازمت کر رہی تھی۔

یعنی فیاض ایک دفعہ پھر اپنی ماں کے پاس پہنچ گیا تھا۔ وہ ایک دن اتفاقاً مجھے اسکول کے گیٹ پر مل گئی تھی۔ میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''میں یہاں کام کرتی ہوں صاحب۔'' اس نے بتایا۔ ''بچوں کو سنبھالتی ہوں۔''

میں اس اتفاق پر سوائے حیران ہونے کے اور کیا کر سکتا۔ بہرحال اس بات کا اطمینان تھا کہ اس اسکول میں فیاض کی دیکھ بھال ہوتی رہے گی کیونکہ خود اس کی ماں وہاں موجود تھی۔

فیاض کو میں خود ہی ہر صبح اپنی گاڑی پر ڈراپ کرنے کے لیے جایا کرتا تھا اور میں یہ دیکھتا کہ وہ عورت اس کے انتظار میں پہلے سے گیٹ پر موجود رہتی ہے اور جیسے ہی گاڑی کو دیکھتی وہ تیزی سے گاڑی کے پاس آتی اور دروازہ کھول کر فیاض کو گود میں اٹھا کر اسے پیار کرتی ہوئی اندر لے جاتی۔

عجیب صورتِ حال تھا۔ جہاں ایک طرف میں چاہتا تھا کہ وہ فیاض سے دور رہے دوسری طرف حالات اسے فیاض کے سامنے لے آتے تھے۔ فیاض اسکول سے واپس آ کر عام طور پر اس کی باتیں کیا کرتا تھا۔ آنٹی بہت اچھی ہیں۔ میرا اتنا خیال رکھتی ہیں۔ مجھ سے اتنا پیار کرتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

ایک دن ملیحہ نے مجھ سے کہا۔ ''آپ کو معلوم ہے یہ جس آنٹی کی بات کر رہا ہے وہ کون ہے؟''

''نہیں، میں نہیں جانتا۔''

''کیسے نہیں جانتے۔ یہ وہی ہے جو بے چاری یہاں ملازمت کرتی تھی، زینب۔'' ملیحہ نے بتایا۔ ''بہت اچھی

''مچھلی کا گوشت، بہتر یادداشت''

طبی ماہرین کے مطابق ''ٹونا'' سمیت مچھلی کی بعض اقسام کا گوشت کھانے سے یادداشت بہتر ہو جاتی ہے جبکہ متعدد بیماریوں کے خطرات بھی کم ہو جاتے ہیں۔ یونیورسٹی آف پیوفن لینڈ کی تحقیقی ٹیم کے سربراہ جیر کی ورٹانی نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ مچھلی کے گوشت میں ''اومیگا 3 فیٹی ایسڈز'' شامل ہوتے ہیں جو دماغی امراض کم کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ قبل ازیں مچھلی کے تیل کو دماغی و دیگر امراض کے لیے مفید قرار دیا گیا تھا۔ تاہم نئی تحقیق میں مچھلی کے گوشت کو براہِ راست استعمال کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ اومیگا 3 فیٹی ایسڈز جسم میں سوجن کم کرنے اور دل کے امراض ختم کرنے کے لیے بھی نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ اس تحقیق کے دوران 65 اور اس سے زائد عمر کے 3 ہزار 220 ایسے لوگوں کو زیرِ مطالعہ رکھا گیا تھا جنہیں دماغی یادداشت کے مختلف امراض لاحق تھے۔

اقتباس: سائنسی خبرنامہ از رانا محمد شاہد
مرسلہ: سلمٰی افتخار

عورت ہے اور اتفاق دیکھیں کہ اس اسکول میں اسے ملازمت مل گئی جہاں فیاض جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے زینب سے فیاض کا کوئی خاص رشتہ ہے۔''

''ہاں ایسا اتفاق ہو جاتا ہے کبھی کبھی۔''

ملیحہ نے یہ بات سرسری طور پر کر دی تھی اور اگر اسے یہ بتا دیا جاتا کہ اس سے کیا رشتہ ہے تو شاید وہ بولنا بھول جاتی۔ اس کے اعصاب شکستہ ہو جاتے۔

میں اس سچویشن سے مطمئن نہیں تھا۔ ایسی بات بھی نہیں تھی کہ میں کوئی بے رحم انسان ہوں جو ماں اور بیٹے کو ایک دوسرے سے دور کرنے کی سازش میں لگا ہوا ہو لیکن میں آئندہ کو دیکھ رہا تھا۔ آئندہ کیا ہونے والا تھا۔

اگر یہ راز کھل جاتا تو اس میں سب کی خرابی تھی۔ ملیحہ کی، فیاض کی اور میری۔ میرا پورا گھر برباد ہو سکتا تھا اس لیے اس عورت کا فیاض سے دور رہنا بہت ضروری تھا۔

میں نے ایک دن بہت خاموشی کے ساتھ فیاض کو ایک دوسرے اسکول میں داخل کروا دیا۔ میں نے اس سلسلے میں ملیحہ سے بھی نہیں پوچھا تھا۔ یہ دوسرا اسکول کچھ فاصلے پر

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھا لیکن اس سے کیا فرق پڑتا۔ ہمارے پاس گاڑی تھی۔ فیاض کے آنے جانے کا ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

میں فیاض کو اسکول پہنچا کر گھر آ گیا تھا۔ میں نے جب ملیحہ کو یہ خبر سنائی تو وہ دنگ رہ گئی تھی۔ ''کیوں کیا آپ نے ایسا۔ فیاض تو اپنے اسکول میں اچھا خاصا ایڈجسٹ ہو گیا تھا پھر آپ نے اسے دوسرے اسکول میں کیوں داخل کیا۔''

''ارے بھئی، یہ نیا اسکول بہت اچھا ہے۔''

''کیا اچھائی ہے اس میں، بچوں کے لیے سارے اسکول ایک جیسے ہوتے ہیں پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس اسکول میں زینب تھی فیاض کی دیکھ بھال کرنے کے لیے۔''

''اس زینب کی وجہ سے تو ہٹایا ہے اس کو۔'' میں روانی میں کہہ گیا تھا۔

''جانتی ہوں میں۔ یہ بات بھی جانتی ہوں۔'' ملیحہ نے کہا۔ ''لیکن آپ ایک ماں کو اس کے بیٹے سے کب تک الگ رکھیں گے۔''

''کیا!'' اب میرے چونکنے کی باری تھی۔ ''یہ کیا کہہ رہی ہو؟''

''وہی جو آپ نے سن لیا ہے۔'' ملیحہ مسکرا دی۔ ''جس طرح آپ اس راز کو چھپائے جا رہے تھے اسی طرح میں بھی چھپا رہی تھی کہ مجھے یہ بات معلوم ہے۔''

''لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا۔''

''میں ماں ہوں اور ماں کو احساس ہو جاتا ہے کہ بچے سے جو خوشبو باہر آ رہی ہے وہ اس کی کوکھ کی نہیں ہے، کسی غیر کی ہے۔ مجھے یہ بات اسپتال میں معلوم ہو گئی تھی لیکن میں نے صرف آپ کی خوشی اور مان اور بھروسے کی خاطر یہ بات چھپائے رکھی۔ اسپتال کی ایک نرس نے سب کچھ بتا دیا تھا مجھے۔ اس کے بعد میں نے زینب کے بچے کو اپنے سینے سے لگا لیا کیونکہ اسے آپ لے کر آئے تھے۔''

''میرے خدا... تم نے تو مجھے حیران کر دیا۔''

''زینب اس گھر میں یونہی نہیں آئی تھی بلکہ اسے میں لے کر آئی تھی۔'' ملیحہ نے مزید بتایا۔ ''اور ایک بات اور کہ فیاض کے اسکول میں اسے ملازمت بھی میں نے دلوائی تھی تاکہ وہ اپنے بچے کے قریب رہ سکے۔''

''ملیحہ، میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم میں اتنا ظرف اور حوصلہ ہوگا۔''

''ماں ہوں اسی لیے احساس ہے مجھے کہ اولاد سے دوری کی بے قراری کیا ہوتی ہے۔'' ملیحہ نے کہا۔ ''اپنے بچے کی موت کی خبر سنتے ہی مجھے یہ احساس ہونے لگا تھا پھر جب فیاض میری گود میں آیا تو میں نے سوچا کہ اس کی ماں کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی۔ یہ اور بات ہے کہ اس نے پریشانی سے گھبرا کر اپنے بیٹے کو چند روپوں کی خاطر آپ کے حوالے کر دیا تھا لیکن مامتا کے جذبات تو اس کے سینے میں ہوں گے وہ ان سے کس طرح دستبردار ہو سکتی تھی اسی لیے میں اس سے ملی۔ اس کی بے قراری محسوس کی اور اسے اپنے گھر میں ملازمہ رکھ لیا پھر جب وہ یہاں سے چلی گئی یا آپ نے اسے جانے پر مجبور کر دیا تو اسے پہلے اس اسکول میں ملازمت دلوائی جہاں ہم فیاض کا داخلہ کروانے والے تھے۔ اب آپ نے فیاض کو دوسرے اسکول بھیج دیا۔ آپ جائیں جا کر زینب کی تڑپ دیکھیں۔''

ملیحہ کی باتیں سن کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ ''اب تمہارا کیا حکم ہے جان۔''

''جائیں زینب کو لے آئیں اس گھر میں۔ فیاض تو اس لحاظ سے خوش نصیب ہوگا کہ اس کی دو مائیں ہیں۔''

''کیا تم یہ برداشت کر لو گی۔''

''کیوں نہیں، عورت میں بہت حوصلہ ہوتا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میرے لیے اس کا آنا بہت اچھا ہوگا۔ وہ میری مددگار ہوگی۔''

میں اس طرح زینب کو گھر واپس لے آیا۔ اب زینب اور ملیحہ ایک ساتھ فیاض کی دیکھ بھال کرتی ہیں۔ اس کی پرورش کر رہی ہیں اور میں نے اپنے اس تجربے سے ایک بات اچھی طرح جان لی ہے کہ ماں اور اولاد کے رشتے کو کبھی الگ نہیں کیا جا سکتا۔

چاہے پرورش کوئی بھی کرے لیکن ان دونوں کا یہ فطری تعلق کیسے ختم ہو سکتا ہے۔ ہم نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ فیاض کے باشعور ہونے پر اس سے کچھ چھپایا نہیں جائے گا بلکہ اسے سب کچھ بتا دیں گے۔

میرا خیال ہے کہ اس قسم کے بچے اس وقت ذہنی طور پر ڈسٹرب ہو جاتے ہیں جب انہیں اچانک پتا چلے کہ ان کے والدین تو کوئی اور ہیں لیکن ابتدا ہی سے انہیں احساس دلا دیا جائے تو پھر وہ اپنے آپ کو سنبھال لیتے ہیں۔

کیا خیال ہے آپ کا؟

سمجھوتا

جناب ایڈیٹر ماہنامہ سرگزشت

السلام علیکم!

کافی عرصہ سے سوچ رہی ہوں کہ سرگزشت کے لیے اپنی آپ بیتی لکھوں لیکن یہ سوچ کر رہ جاتی ہوں کہ ہر کسی کو یقین نہیں آئے گا کیونکہ یہ واقعات ہیں ہی ایسے پُراسرار جس کی توجیہہ پیش کرنا مشکل ہے پھر بھی میں نے لکھ لیا ہے۔ اگر پسند آجائے تو اسے شائع ضرور کریں۔

شائستہ خاور
(کراچی)

خاور نے مجھ سے لو میرج کی تھی۔ اس شادی پر نہ میرے گھر والے راضی تھے، نہ خاور کے۔

امی، ابو اور بھائی جان نے تو دوٹوک الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ آئندہ ہم سے کسی بھی قسم کا رابطہ مت رکھنا شائستہ! آج کے بعد تم ہمارے لیے اور ہم تمہارے لیے مر گئے ہیں۔

یہی حال خاور کے گھر والوں کا تھا۔ خاور نے کسی نہ کسی طرح خوشامد کر کے اپنے ابو کو اس حد تک راضی کر لیا تھا کہ انہوں نے ہمیں گھر میں رہنے کی اجازت دے دی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

شادی سے پہلے میں نے بی اے پاس کرلیا تھا اور وقت گزاری کے لیے ایک اسکول میں پڑھا رہی تھی۔

ایک تقریب میں خاور سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ میرے کالج کی ایک دوست فرزانہ کی منگنی کی تقریب تھی۔ اس تقریب میں خاور بھی شریک تھے۔ فرزانہ کے بھائی سے خاور کی دوستی تھی۔ وہ پہلی ہی نظر میں مجھے اچھے لگے۔ وہ تھے بھی اتنے وجیہہ اور پُرکشش شخصیت کے مالک کہ تقریب میں موجود بہت سی لڑکیاں ان کے قرب کی خواہش مند تھیں۔

ہماری وہ ملاقات دوسری ملاقاتوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اور ہم دونوں محبت کے رشتے میں بندھ گئے۔

خاور نے یونیورسٹی سے ماسٹرز کیا تھا اور ان دنوں ملازمت کی تلاش میں تھے۔ ان کا پروگرام تھا کہ ملازمت ملتے ہی وہ مجھے بیاہ کر گھر لے آئیں گے۔

انہی دنوں میرا ایک رشتہ آ گیا۔ لڑکے کا پورا خاندان امریکا میں تھا، صرف ایک خالہ پاکستان میں تھیں۔ امی، ابو کو اور بھائی جان کو یہ رشتہ بہت پسند آیا لیکن میں نے صاف انکار کردیا۔ میرے انکار سے ابو تو ایک دم مشتعل ہوگئے۔ امی اور بھائی جان نے انہیں سمجھایا کہ زندگی شائستہ کو گزارنی ہے، آپ زبردستی کیوں کررہے ہیں؟

پھر یکے بعد دیگرے جب میں نے مزید اور رشتوں سے انکار کیا تو بھائی جان بھی مجھ پر برس پڑے ''شائستہ! آخر تم چاہتی کیا ہو؟''

''میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔'' میں نے جواب دیا۔

میں یہ باتیں خاور کو بتاتی تھی تو وہ بھی پریشان ہوجاتے تھے۔

آخر خدا خدا کر کے انہیں ایک غیر ملکی کمپنی میں ملازمت مل گئی۔ وہ ملازمت بس گوارا تھی۔ خاور کی سیلری بھی وہاں زیادہ نہیں تھی لیکن ایسی کم بھی نہیں تھی۔ اسّی کی دہائی میں تین ہزار روپے ماہانہ بھی کم آمدنی نہیں تھی لیکن میں نے اور خاور نے تو بہت اونچے خواب دیکھے تھے اس لیے ہم دونوں ہی کو یہ تنخواہ کم لگ رہی تھی۔

خاور نے کہا ''میں نے یہ ملازمت فوری طور پر اس لیے کرلی کہ تمہارے گھر شادی کا پیغام بھجوا سکوں۔''

یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ خاور کی امی ان کی شادی اپنی بہن کی بیٹی سائرہ سے کرنا چاہتی تھیں اور اس سلسلے میں شاید وہ اپنی بہن کو زبان بھی دے چکی تھیں۔

میرے گھر والے بھی اس رشتے پر راضی نہیں تھے۔ اب ہمارے سامنے دو ہی صورتیں تھیں یا تو ہم ایک دوسرے کو بھلا کر اپنے اپنے گھر والوں کی بات مان لیتے یا پھر گھر والوں کی اجازت کے بغیر شادی کرلیتے۔

ہم نے دوسری صورت اختیار کی۔ خاور کے ایک دوست کے گھر میں ہمارا نکاح ہوا اور میں گھر آ گئی۔

میں نے جب امی کو یہ خبر سنائی تو وہ مارے صدمے کے گنگ رہ گئیں۔ ابو اور بھائی جان پر بھی یہ خبر بجلی بن کر گری۔ انہوں نے مزید رسوائی سے بچنے کی خاطر مجھے بہت سادگی سے خاور کے ساتھ رخصت کردیا۔

میری ساس کا رویہ بھی مجھ سے اچھا نہیں تھا۔ نندیں الگ مجھ سے کترائی کترائی سی رہتی تھیں۔ شادی کے تیسرے ہی دن ساس صاحبہ نے پورے گھر کا کام میرے سر تھوپ دیا۔

میں صبح سے شام تک کولہو کے بیل کی طرح کام کرتی اور رات تک اتنی تھک جاتی کہ بستر پر پڑتے ہی بے سدھ ہوجاتی۔

اس دن مجھے بہت شدید بخار تھا۔ صبح اٹھا ہی نہیں گیا۔ خاور بغیر ناشتے کے آفس چلے گئے۔ آفس جانے سے پہلے وہ مجھے پیناڈول کی دو گولیاں ایک گلاس دودھ کے ساتھ دے گئے تھے۔

گولیاں کھا کر میں پھر بستر پر پڑ گئی۔ تھوڑی دیر بعد میری ساس دندناتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں اور بولیں۔

''آج کیا تم جشن منا رہی ہو۔ میرے میاں اور دونوں بیٹے بغیر ناشتے کے گئے ہیں۔ تمہیں اپنی ذمے داریوں کا بالکل احساس نہیں ہے۔''

''امی! میری طبیعت بہت خراب ہے۔ اٹھنے کی بالکل ہمت نہیں ہے ورنہ میں.....''

''بی بی! یہ چونچلے اپنے اماں باوا کو دکھانا، یہاں تو کام کرنا پڑے گا۔ ہم نے کوئی محتاج خانہ نہیں کھلوا رکھا ہے کہ تم پڑے پڑے کھاؤ گی۔''

''امی، آپ کیسی باتیں کررہی ہیں۔'' میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ ''کیا میرے علاوہ گھر میں کوئی ہے ہی نہیں جو کام کرسکے؟''

''مجھ سے زبان درازی مت کر۔'' میری ساس درشت لہجے میں بولیں ''یہاں رہنا ہے تو کام کرنا پڑے گا۔ میرے میاں اور بیٹے بہت محنت سے کماتے ہیں، وہ حرام

خوروں کے لیے نہیں کماتے۔''

''میرا میاں بھی کوئی بھکاری نہیں ہے۔'' میں نے تڑخ کر جواب دیا۔

پھر بات اتنی بڑھی کہ میری ساس زور زور سے چیخنے چلّانے لگیں پھر میری دونوں نندیں بھی شامل ہوگئیں۔ وہ سب بار بار مجھے ہی جتا رہی تھیں کہ ہم شریف لوگ ہیں، یہاں گھر سے بھاگی ہوئی لڑکیوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اس دن خاور میری بیماری کی وجہ سے چھٹی لے کر واپس آ گئے تھے۔ انہوں نے اپنی امی اور بہنوں کی گھٹیا باتیں اپنے کانوں سے سن لیں۔

انہوں نے اسی وقت مجھ سے کہا ''چلو شائستہ! اب میں یہاں نہیں رہوں گا۔ میں اتنا تو کما ہی لیتا ہوں کہ تمہیں دو وقت کی روٹی کھلا سکوں۔''

میری ساس نے انہیں روکنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ نہ مانے، میں نے اپنا ضروری سامان سمیٹا اور ہم گھر سے نکل آئے۔

وہ دن تو ہم نے خاور کے ایک دوست کے گھر گزارہ۔ دوسرے دن چھٹی تھی اس لیے خاور ان کے دوست صمد بھائی اور بھابی زرینہ سر جوڑ کر بیٹھ گئے کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ صمد بھائی اور بھابی کا تو خیال تھا کہ ہم انہی کے ساتھ رہیں لیکن اس کے لیے نہ میں راضی ہوئی، نہ خاور۔

اچانک زرینہ بھابی نے پوچھا ''خاور بھائی، آپ کے پاس پیسے کتنے ہیں؟''

''بھابی، پیسے تو زیادہ نہیں ہیں، مشکل سے پینتیس ہزار روپے ہوں گے۔''

یہ پیسے بھی خاور نے شادی سے پہلے ٹیوشن پڑھا کر پس انداز کیے تھے۔

''لیکن بھابی! اتنے پیسوں میں ہم نہ صرف مکان کا پیشگی کرایہ دے سکتے ہیں بلکہ تھوڑا بہت گھریلو سامان بھی خرید سکتے ہیں۔''

''خاور بھائی!'' بھابی نے کہا ''میں تو اس لیے پوچھ رہی تھی کہ میری ایک جاننے والی اپنا مکان بیچ رہی ہیں۔ مکان کیا ہے، صرف دو کمرے، صحن، کچن اور باتھ روم وغیرہ ہیں لیکن پلاٹ خاصا بڑا ہے، دو سو چالیس گز کا۔''

''وہ اس مکان کا کیا مانگ رہی ہیں؟'' صمد بھائی نے پوچھا۔

''وہ دو لاکھ مانگ رہی ہیں لیکن میں ڈیڑھ لاکھ میں راضی کرلوں گی۔''

خاور ہنس کر بولے ''بھابی! ہمارے پاس ڈیڑھ لاکھ بھی کہاں ہیں؟''

''بھئی پینتیس ہزار تمہارے پاس ہیں۔ شائستہ کے کڑے، چوڑیاں اور زیورات کا سیٹ بھی تقریباً اتنے ہی پیسوں میں بک جائے گا۔'' بھابی نے کہا۔

''اس کے باوجود ڈیڑھ لاکھ نہیں ہوں گے۔'' خاور نے کہا۔

''بھئی کچھ پیسے ہم سے قرض لے لو، بعد میں آہستہ آہستہ دیتے رہنا۔'' بھابی نے کہا۔

خاور تو قرض لینے پر رضامند نہیں تھے لیکن صمد بھائی اور بھابی کے اصرار پر راضی ہوگئے۔

یوں ہم نارتھ کراچی کا وہ مکان بلکہ پلاٹ لینے پر راضی ہوگئے۔

بھابی نے اسی وقت فون پر اپنی ان عزیزہ سے بات کی اور بہت مشکل سے انہیں ڈیڑھ لاکھ پر راضی کیا۔

''مجھے وہ مکان ایک نظر دکھا تو دیں۔ آپ نے تو خود بھی ابھی وہ مکان نہیں دیکھا ہے۔'' میں نے کہا۔

''اگر ڈیڑھ لاکھ میں دو سو چالیس گز کا پلاٹ بھی مل رہا ہے تب بھی بہت سستا ہے۔'' خاور نے کہا۔

''وہاں تو پھر بھی دو کمرے بنے ہوئے ہیں۔'' بھابی نے کہا ''آر سی سی کے کمرے بنوانے میں بھی پچاس ساٹھ ہزار خرچ ہوجاتے ہیں۔ وہاں تو کمروں کے علاوہ برآمدہ، کچن اور باتھ روم بھی ہے۔''

''فی الحال تو ہمارے لیے وہی بہت ہے۔'' خاور نے کہا ''بعد میں آہستہ آہستہ اسے بنوالیں گے۔''

دوسرے دن خاور نے اپنے آفس سے چھٹی لے لی اور مکان کی خریداری کے سلسلے میں کاغذی کارروائیوں میں مصروف ہوگئے۔ میرا زیور خلافِ توقع پچاس ہزار میں فروخت ہوا۔ وہ زیور امی نے کئی سال پہلے بنوایا تھا۔ پینتیس ہزار خاور کے بینک اکاؤنٹ میں تھے۔ بقیہ رقم صمد بھائی نے ہمیں دے دی۔

شام تک تمام کارروائی مکمل ہوگئی۔

خاور تو اسی شام اپنے گھر میں شفٹ ہونا چاہتے تھے لیکن صمد بھائی اور بھابی نے سمجھایا کہ فوری طور پر ہم وہاں کیسے رہیں گے؟ ہمارے پاس تو سوائے کپڑوں اور جوتوں کے کچھ بھی نہیں تھا۔ مکان میں شفٹ ہونے کے لیے

WWW.PAKSOCIETY.COM

گھر گرہستی کا دیگر سامان بھی ضروری تھا۔

صمد بھائی کے اصرار پر ہم وہاں ایک ہفتہ مزید رہے۔ اس دوران میں خاور نے مکان کی اچھی طرح صفائی کرادی۔ صمد بھائی نے کہیں سے دو فولڈنگ چارپائیوں کا بندوبست کردیا۔ ایک بڑا تخت اور دو کرسیاں بھابی نے اپنے پاس سے دیں۔ اس کے علاوہ خاور نے اپنے کسی دوست سے ایک ٹیبل فین بھی لے لیا۔ کچھ ضروری برتن بھی بھابی نے اپنے کچن سے دے دیے۔

اپنے حالات پر مجھے رہ رہ کر رونا آرہا تھا۔ میں اپنے گھر میں شہزادیوں کی طرح رہتی تھی۔ میرے کمرے میں بہترین بیڈ تھا، قیمتی پردے تھے، جدید قسم کی بیش قیمت ڈریسنگ ٹیبل تھی، انتہائی شاندار باتھ روم تھا۔ کہاں اب یہ حال تھا کہ دو معمولی سی فولڈنگ چارپائیاں، ایک بڑا تخت اور پرانی سی دو کرسیاں ہماری کل کائنات تھیں۔

سامان شفٹ کرنے کے بعد خاور نے مجھ سے کہا کہ اپنا نیا گھر دیکھ لو۔

اپنے گھر کی خواہش تو ہر عورت کو ہوتی ہے۔ میں جھٹ پٹ تیار ہوگئی۔ صمد بھائی اور بھابی بھی ہمارے ساتھ گئے۔

نارتھ کراچی کا وہ علاقہ خاصا صاف ستھرا تھا۔ ان دنوں وہاں زیادہ آبادی بھی نہیں تھی لیکن بھائی نے مجھے بتایا تھا کہ ہمارا گھر جہاں واقع ہے وہاں اب اردگرد خاصے مکانات تعمیر ہوگئے ہیں۔

علاقہ دیکھ کر میرا دل خوش ہوگیا۔ وہاں مکان کیا چھوٹے چھوٹے خوبصورت بنگلے تھے لیکن صمد بھائی نے جس مکان کے سامنے گاڑی روکی، اسے دیکھ کر میری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ اس مکان کا آہنی گیٹ خاصا چھوٹا اور بدرنگ سا تھا۔ کبھی اس پر سفید رنگ رہا ہوگا لیکن اب تو اس سفیدی کی صرف جھلک کہیں کہیں باقی رہ گئی تھی۔ بقیہ پورا گیٹ زنگ خوردہ تھا۔ خاور نے تالا کھولا اور پھر ہم سب اندر داخل ہوگئے۔

مکان کیا تھا ایک کھنڈر تھا۔ کمرے کشادہ ضرور تھے لیکن پلاسٹر سے محروم تھے۔ ان کے سامنے بڑا سا ایک طویل برآمدہ تھا اور کچھ فاصلے پر کچن، غسل خانہ اور بیت الخلا ایک لائن میں بنے ہوئے تھے۔ بقیہ خالی جگہ کو صحن کہا جاسکتا تھا۔ وہ صحن اتنا بڑا تھا کہ اس میں بہت آرام سے سائیکل چلائی جاسکتی تھی۔

بھابی ایک بات بتانا بھول گئی تھیں۔ برآمدے میں ایک طرف زینہ بھی تھا اور اوپر بھی سامان وغیرہ رکھنے کے لیے ایک چھوٹا سا کمرا بنا ہوا تھا جسے غالباً اسٹور کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ کمروں اور برآمدے کا فرش جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا تھا اور اس میں گڑھے پڑے ہوئے تھے۔

میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے مکان کا جائزہ لے رہی تھی۔ پورے مکان پر ایک عجیب سی ویرانی اور وحشت کا راج تھا۔ ہاں، دروازے کے ساتھ ہی نیم کا ایک بہت گھنا درخت تھا۔

''شائستہ!'' بھابی نے کہا ''میں جانتی ہوں کہ تمہیں مکان پسند نہیں آیا ہے لیکن اگر تم لوگ چاہو تو ہاؤس بلڈنگ سے قرض لے کر مکان کو جدید انداز میں تعمیر کرا سکتے ہو۔''

''جی بھابی!'' میں نے چونک کر کہا ''گھر جیسا بھی ہے لیکن ہمارا اپنا ہے۔ ہمیں بھلا کیوں پسند نہیں آئے گا؟''

پھر میں نے دائیں بائیں اپنے پڑوس کے دو منزلہ مکانوں پر نظر ڈالی۔ وہ دونوں بنگلے بہت جدید انداز میں تعمیر کیے گئے تھے۔ ان دونوں کے درمیان ہمارا مکان ایک بدنما داغ سا لگ رہا تھا۔ ہمارے سامنے بھی بہت خوبصورت سا ایک ڈبل اسٹوری بنگلا تھا۔ وسیع و عریض مین گیٹ کے دونوں سروں پر بہت خوبصورت بلب موجود تھے۔

بھابی شاید میری نظروں کا مطلب سمجھ گئیں اور ہنس کر بولیں ''فکر مت کرو شائستہ! ایک دن تمہارا بنگلا بھی انہی بنگلوں کی طرح ہوگا۔''

''بھابی!'' خاور نے کہا ''چلیں اندر چل کر بیٹھیں اور شائستہ کے ہاتھ کی چائے پئیں۔ میں مٹھائی .... بھی لے آیا ہوں۔ آخر ہم لوگ اپنے گھر میں شفٹ ہوئے ہیں۔''

''ضرور!'' بھابی نے کہا ''اسی بہانے شائستہ کے کچن کا افتتاح بھی ہوجائے گا۔''

میں نے چولہا جلا کر چائے کی کیتلی اس پر رکھی تو مجھے برابر والے مکان سے گنگنانے کی آواز آئی۔ کوئی لڑکی بہت مترنم آواز میں گنگنا رہی تھی ''کہیں دیپ جلے کہیں دل، ذرا دیکھ لے آکر پروانے۔''

میں بے اختیار مسکرانے لگی۔ گویا پڑوسی خاصے صاحبِ ذوق تھے۔ میں چائے بنا کر کمرے میں لے گئی۔

چائے پینے کے بعد رخصت ہونے سے پہلے بھابی نے ڈھیروں نصیحتیں کر ڈالیں۔ دن میں دروازہ کھلا مت چھوڑنا، کوئی دروازے پر آئے تو نام پوچھے بغیر دروازہ مت کھولنا، وغیرہ وغیرہ۔

ان کے جانے کے بعد میں تھکے تھکے سے انداز میں پلنگ پر بیٹھ گئی اور غور کرنے لگی کہ کس کمرے کو بیڈروم بناؤں گی، کسے ڈرائنگ روم۔ صحن میں کیاریاں کس طرح بناؤں گی اور ان میں پھول کون کون سے لگاؤں گی اور ایک سال بعد جب یہ کھنڈر ایک شاندار بنگلے میں تبدیل ہوجائے گا تو میں اپنی ساس اور نندوں کو اپنے گھر آنے کی دعوت ضرور دوں گی۔

''شائستہ!'' خاور کی آواز پر میں چونک اٹھی ''میرا خیال ہے کہ اس وقت تو میں بازار سے کھانا لے آؤں، تم کل سے کھانا بنانا۔''

مجھے اچانک گھر کی ویرانی اور وحشت کا خیال آیا۔ اس وقت تک اندھیرا پھیل چکا تھا اور کمرے میں ایک بلب روشن تھا لیکن پلاسٹر اور رنگ و روغن سے محروم دیواروں کی وجہ سے بلب کی وہ زرد روشنی ناکافی تھی۔ فوری طور پر خاور صرف تین ہی بلب لائے تھے۔ ان میں سے ایک کچن اور ایک بیت الخلا میں تھا۔

میرا جی چاہا کہ میں خاور کو جانے سے روک لوں۔ میرا دل بہت بری طرح گھبرا رہا تھا لیکن پھر یہ سوچ کر خاموش رہی کہ خاور میری وجہ سے مزید پریشان ہوجائیں گے۔

بازار وہاں سے خاصے فاصلے پر تھا۔ ان دنوں خاور کے پاس سائیکل تک نہیں تھی۔

ان کے جانے کے بعد میں پلنگ پر نیم دراز ہوگئی اور اپنے بیگ سے نکال کر ایک میگزین پڑھنے کی کوشش کی لیکن بلب کی ناکافی روشنی میں پڑھنے کو دل ہی نہ چاہا۔

گھر کی ویرانی اور بوجھل پن میں اچانک اضافہ ہوگیا تھا یا پھر یہ میرا احساس تھا۔ میں نے سناٹا توڑنے کے لیے گانا شروع کردیا۔ میں اسکول اور کالج کے زمانے میں بہت اچھا گاتی تھی اور بہت سے انعامات جیت چکی تھی۔ بعض اوقات اپنی آواز سن کر انسان کا خوف ختم ہوجاتا ہے۔

میں نے بلند آواز میں گانا شروع کردیا۔ ''چھن چھن، چھن چھن، باجے پائل باجے'' پھر میں نے تان لگائی۔ ''سانوریا!''

اچانک دوسری طرف سے کسی نے اس گانے کو آگے بڑھایا ''سانوریا!!''

مجھے ایسا لگا جیسے کوئی لڑکی میرے بہت نزدیک بیٹھی گا رہی ہو۔ میرا دل اچانک زور زور سے دھڑکنے لگا۔ پھر مجھے اپنی اس پڑوسن کا خیال آیا جو اس وقت بھی گنگنا رہی تھی جب میں چائے بنا رہی تھی۔ مجھے اپنے خوف پر ہنسی آگئی اور میں نے سوچا، چلو پڑوسیوں سے تعارف کا یہ انوکھا انداز بھی خوب ہے۔

میں نے دوسرا گانا شروع کردیا ''آپ فرمائیں کیا خریدیں گے، آپ فرمائیں کیا خریدیں گے۔''

دوسری طرف سے بھی گانے کا جواب گانے سے آیا۔ میں جو گانا بھی شروع کرتی، پڑوسن اس گانے کو گنگنانے لگتی۔

اچانک میرے کانوں میں بلی کی کریہہ آواز آئی۔ بلی بہت بھیانک انداز میں رو رہی تھی۔ میں گھبرا کر کمرے سے باہر نکل آئی۔ برآمدے کے سامنے باؤنڈری وال پر سیاہ رنگ کی ایک بلی بیٹھی مکروہ آوازیں نکال رہی تھی۔

میں نے بلی کو زور سے ہشکارا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی اور اسی طرح بیٹھی روتی رہی۔ میں پوری طاقت سے چیخی ''بھاگ یہاں سے۔''

بلی نے اپنی انگارہ جیسی دہکتی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھا تو میری ریڑھ کی ہڈی میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرا جسم بے جان ہوگیا ہے۔ میں مبہوت سی ہوکر بلی کو دیکھے جارہی تھی۔ میں نے سوچا کہ اپنی چپل اتار کر بلی کو ماردوں لیکن میرے تو ہاتھ پاؤں شل ہوچکے تھے۔

میرا جسم شل ہوچکا تھا لیکن دماغ کام کررہا تھا اور میرے ذہن میں طرح طرح کے وسوسے آرہے تھے۔

''کالی بلی کے بھیس میں اکثر جنات بھی ہوتے ہیں۔''

مجھے اپنی نانی جان کی بات یاد آئی۔

میں کبھی ان باتوں پر یقین نہیں کرتی تھی۔ میں نے ہنس کر پوچھا تھا ''نانی جان! اگر بلی کے بھیس میں کوئی جن آہی گیا تو ہم کیا کرسکتے ہیں؟ آئے، سو دفعہ آئے، میاؤں میاؤں کرکے چلا جائے گا۔''

نانی جان نے مجھے گھور کر دیکھا اور بولیں ''بُری گھڑی سے ڈرنا چاہیے بیٹا! بعض جنات بہت شرارتی ہوتے ہیں۔ وہ انسانوں کو نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔ اگر کبھی خدانخواستہ ایسا موقع آئے تو فوراً آیت الکرسی پڑھنا چاہیے۔''

''اس سے کیا ہوگا نانی جان!'' میں نے ہنس کر پوچھا تھا۔

''اس سے یہ ہوگا کہ وہ جن وہاں سے بھاگ جائے گا۔''

''اور اگر وہ بلی ہی ہوئی؟'' بھائی جان نے ہنس کر پوچھا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"تم لوگ اس بات کو مذاق سمجھ رہے ہو؟" نانی جان برا سا منہ بنا کر بولیں "جنات کا ذکر تو قرآن مجید میں بھی ہے۔"

یہ سب باتیں لمحوں میں میرے ذہن میں گونج کر رہ گئی تھیں۔ بلی ابھی تک میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بیٹھی تھی اور اپنی مکروہ آواز میں رو رہی تھی۔

میں نے غیر شعوری طور پر آیت الکرسی کا ورد شروع کردیا۔ اچانک بلی زور سے چیخی اور اچھل کر بھاگی۔ پھر وہ دیوار پر بھاگتی ہوئی نیم کے درخت پر چڑھ گئی اور اس کی گھنی شاخوں میں کہیں غائب ہوگئی۔

میرے دل سے بھی خوف یک لخت دور ہوگیا اور میرے ہاتھ پیر بھی کام کرنے لگے۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی تو میں بری طرح چونک اٹھی لیکن اپنی جگہ سے ہلی نہیں۔ دستک دوبارہ ہوئی اور ساتھ ہی خاور کی آواز سنائی دی "شائستہ! دروازہ کھولو۔"

ان کی آواز سن کر میں جیسے ہوش میں آگئی اور بوجھل قدموں سے دروازے کی طرف بڑھی۔

میں نے دروازہ کھولا تو خاور اندر آئے اور جھنجلا کر بولے "تم کیا سو رہی تھیں؟ میں کب سے دروازہ کھٹکھٹا رہا ہوں۔" وہ مڑ کر دروازہ بند کرنے لگے پھر ان کی نظر میرے چہرے پر پڑی تو وہ چونک اٹھے۔ "کیا بات ہے شائستہ! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"ہاں..... میں ٹھیک ہوں۔" میں نے بہ مشکل تمام کہا۔

"تم ٹھیک نہیں ہو۔" وہ گھبرا کر بولے "اندر چلو۔ تمہیں اتنا پسینا کیوں آرہا ہے؟"

ان کے کہنے پر مجھے احساس ہوا کہ میرا پورا جسم پسینے میں تر ہے۔ پسینا چہرے پر بھی بہہ رہا تھا۔ ہمارے صحن میں اردگرد کے مکانوں سے روشنی آرہی تھی ورنہ ہمارا صحن تو تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہ بھی اچھی بات تھی کہ ہمارے دروازے کے بالکل ساتھ الیکٹرک پول لگا ہوا تھا۔ اس میں لگے ہوئے مرکری بلب کی روشنی بھی خاصی تھی۔

"پسینا..... وہ..... آج..... گرمی بھی تو..... بہت ہے۔" میں نے خاور کو ٹالنے کی کوشش کی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میں انہیں اپنے خوف زدہ ہونے کے بارے میں بتاؤں۔

"گرمی!" انہوں نے حیرت سے کہا "تمہیں گرمی لگ رہی ہے؟"

مجھے خود بھی اپنے احمقانہ جواب کا احساس ہوا۔ ان دنوں اچھی خاصی سردی پڑ رہی تھی۔ خاور نہ جانے اپنے کس دوست سے قرض لے کر کمبل اور گدے وغیرہ بھی لے آئے تھے۔

"اچھا تم اندر تو چلو۔" انہوں نے کہا۔

میں نے اندر جاتے ہوئے اپنے دوپٹے سے پسینا خشک کیا اور قدرے سنبھل کر کمرے میں داخل ہوئی۔

کمرے میں آکر انہوں نے غور سے میرا جائزہ لیا اور بولے "شائستہ! مجھے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔ چلو میرے ساتھ۔"

"کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"ڈاکٹر کے پاس۔" خاور نے کہا۔

"پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے خاور!" میں نے زبردستی ہنس کر کہا "میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"پھر تمہاری یہ حالت.....؟"

"اصل میں آپ کے جانے کے بعد مجھے نیند آگئی تھی۔" میں نے زبردستی ہنستے ہوئے کہا "میں نیند میں ڈر گئی تھی۔"

خاور نے غور سے مجھے دیکھا، پھر پُرتشویش لہجے میں بولے "تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا!"

"اچھا آپ منہ ہاتھ دھولیں، میں کھانا لگاتی ہوں۔"

کھانا کھاتے ہوئے میں بالکل نارمل ہوچکی تھی۔ خاور ہنس کر بولے "میں یہ سمجھ رہا تھا کہ تم اکیلے میں ڈر گئی ہو۔ بھئی نئی جگہ ہے، نیا ماحول ہے، پھر اتنا ویران مکان ہے۔"

"میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں جو چھپکلی اور کاکروچ دیکھ کر چیخیں مارتی ہیں۔" میں نے بھی ہنس کر کہا۔

کھانے کے بعد میں چائے بنانے کچن میں گئی تو اس منحوس بلی کا خوف اپنے ذہن سے جھٹک چکی تھی اور حسب معمول گنگنا رہی تھی۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ میرے گنگنانے پر پڑوسن کی طرف سے جواب نہیں آیا۔ پھر اپنے اس خیال پر مجھے خود ہی ہنسی آگئی۔ اب وہ بے چاری پڑوسن ہر وقت تو کچن میں رہتی نہیں ہوگی اور نہ جانے دوسری طرف پڑوسیوں کا کچن ہی ہوگا یا کسی کا بیڈروم ہوگا؟

میں چائے کے کپ لے کر گنگناتے ہوئے باہر آئی تو

خاور کے چہرے پر بھی اطمینان پھیل گیا۔

پھر میں خاور سے باتیں کرتے ہوئے نہ جانے کب سوگئی۔

اچانک کسی کی آہٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔ اس وقت مجھے شدید سردی کا احساس ہوا۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس کھلے ہوئے دروازے سے ٹھنڈی ہوا اندر آرہی تھی۔

میں نے جھنجلا کر سوچا، یہ خاور بھی عجیب ہیں، کمرے سے باہر نکلے ہی تھے تو کم سے کم دروازہ تو بند کردیتے۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ میں نے کروٹ بدلی تو میری نظر خاور کے پلنگ پر پڑی۔ کھلے ہوئے دروازے سے باہر کی روشنی اندر آرہی تھی۔ خاور اپنے بستر پر بے خبر سو رہے تھے۔

مجھے ایک مرتبہ پھر خوف نے جکڑ لیا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ میں نے دروازہ خود بند کیا تھا، پھر یہ دروازہ کھل کیسے گیا؟ ممکن ہے خاور اٹھ کر باتھ روم گئے ہوں اور دروازہ بند کرنا بھول گئے ہوں۔ میں نے خود ہی اپنے دل کو تسلی دی اور اٹھ کر دروازہ بند کردیا۔

میں بستر پر لیٹی تو مجھے کمرے کے ایک کونے میں دو انگارے سے دہکتے نظر آئے۔ دروازہ بند کرنے کے بعد کمرے میں گھپ اندھیرا ہوگیا تھا۔

اچانک مجھے بلی کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ میرا پورا جسم سن ہوکر رہ گیا۔ میں نے خوف زدہ ہوکر اپنا چہرہ کمبل میں چھپالیا اور آیت الکرسی کا ورد کرنے لگی۔

پھر مجھے یاد آیا کہ نانی جان نے کہا تھا آیت الکرسی کے ساتھ ساتھ چاروں قل بھی ضرور پڑھنا چاہئیں۔

میں نے چاروں قل اور آیت الکرسی پڑھنا شروع کردی اور تھوڑی ہی دیر بعد میں پُرسکون ہوگئی پھر نہ جانے مجھے کب نیند آگئی۔

میری آنکھ کھلی تو کمرے کی کھلی ہوئی کھڑکیوں اور دروازے سے دھوپ اندر آرہی تھی۔ عادت کے مطابق میں نے گھڑی دیکھنے کے لیے دیوار پر نظر ڈالی لیکن وہاں کوئی گھڑی نہیں تھی۔

میں گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ نہ جانے کیا وقت ہوا تھا؟ شاید خاور بغیر ناشتا کیے ہی دفتر چلے گئے تھے۔

اسی وقت خاور چائے کی ٹرے لیے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے اور مسکرا کر بولے "تمہاری نیند پوری ہوگئی شائستہ؟"

"ٹائم کیا ہوا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بھئی ساڑھے دس بج رہے ہیں۔" انہوں نے کہا۔

"آپ..... دفتر....." پھر مجھے خود ہی یاد آگیا کہ خاور نے دو دن کی چھٹی لے رکھی تھی۔ ایک دن ہمیں یہاں شفٹ ہونے میں لگا تھا اور آج دوسرا دن تھا۔

"آپ مجھے اٹھا دیتے۔" میں نے منہ بنا کر کہا۔

"میں نے سوچا، تم ایک دن اور عیش کرلو۔ پھر کل سے تو تمہیں اٹھنا ہی پڑے گا۔"

"بھئی کوئی وال کلاک لاکر تو یہاں لگا دیں۔ اس کے بغیر تو بہت پریشانی ہوجائے گی۔"

"ضرورت تو ابھی بہت سی چیزوں کی ہے۔" خاور نے کہا۔ "کھڑکیوں پر پردے نہیں ہیں، وال کلاک نہیں ہے، کوئی آئینہ نہیں ہے۔ کچن میں بھی ضرورت کی بہت سی چیزیں نہیں ہیں۔"

"پردے وغیرہ تو بعد میں آتے رہیں گے۔" میں نے کہا "پہلے تو آپ ضروری چیزوں کا بندوبست کریں۔"

"میں ابھی اس ضروری سامان کی لسٹ بنا رہا تھا۔" خاور نے کہا۔

میں جواب میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں چونک اٹھی۔ یہاں کون آگیا؟ شاید بھابی اور صمد بھائی ہوں گے۔ میں نے سوچا۔

خاور اٹھ کر دروازے کی طرف چلے گئے۔ وہ کچھ دیر تک باہر ہی کھڑے کسی سے باتیں کرتے رہے پھر واپس آئے تو ان کے ہاتھوں میں بڑی سی ایک ٹرے تھی۔ میرے پوچھنے سے پہلے ہی انہوں نے بتایا کہ پڑوس میں رہنے والے بیگ صاحب تھے۔ وہ ہمارے لیے ناشتا لائے ہیں۔ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ اگر ناشتا کم ہو تو بلاتکلف بتا دیجئے گا۔ مجھے اندازہ نہیں ہے کہ آپ کی فیملی میں کتنے افراد ہیں؟ میں نے کہا کہ آپ نے ناحق زحمت کی۔ ویسے یہ ناشتا ہمارے لیے بہت ہے۔ ہم صرف دو ہی تو ہیں۔ انہوں نے ٹرے پلنگ پر رکھتے ہوئے کہا "آج کسی وقت تم بھی ان کے گھر چلی جانا۔"

ناشتا کرنے کے بعد میں جھاڑو دے کر گھر کی صفائی میں لگ گئی۔ پھر میں نے دونوں پلنگ ذرا سلیقے سے کمرے میں بچھائے، تخت باہر برآمدے میں رکھا اور اس پر بھی چاندنی بچھا کر گاؤ تکیے رکھ دیے۔ یہ چیزیں مجھے بھابی نے دی تھیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

صفائی کے بعد اس گھر کی کچھ شکل نکل آئی۔
گھر کی صفائی ستھرائی میں ہمیں دوپہر کے کھانے کا ہی ہوش نہیں رہا۔ یوں بھی بیگ صاحب اتنا ناشتا دے گئے تھے کہ ہم دونوں نے خوب سیر ہو کر کھالیا تھا۔
میں شام کو نہا دھو کر سوچ ہی رہی تھی کہ رات کو کیا پکایا جائے؟ اب روز روز تو بازار سے کھانا نہیں آسکتا تھا۔
اچانک صمد بھائی اور بھابی آگئے۔ وہ لوگ نہ صرف ہمارے لیے کھانا لائے تھے بلکہ ضرورت کی کچھ دوسری چیزیں بھی لے آئے تھے۔
بھابی نے گھر کا جائزہ لیا اور ہنس کر بولیں "شائستہ! لگتا ہے، تم نے بہت محنت سے گھر کی صفائی کی ہے۔" پھر وہ بولیں "رات کو نیند تو اچھی طرح آئی نا؟"
"جی ہاں، بہت پُرسکون نیند آئی۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "اپنے گھر کی بات ہی اور ہوتی ہے۔"
ہم سب نے ایک ساتھ کھانا کھایا۔ مجھے دن بھر بیگ صاحب کے گھر جانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ان کے برتن البتہ میں نے دھو دیے تھے۔ میں نے سوچا کہ کل جب خاور دفتر جائیں گے تو میں ان کے برتن واپس کر آؤں گی۔
وہ رات پُرسکون انداز میں گزر گئی۔ اور صبح حسب معمول سات بجے میری آنکھ کھلی۔ میں نے اٹھ کر جلدی جلدی ناشتا بنایا۔ خاور بھی اس وقت تک اٹھ چکے تھے۔ انہوں نے ناشتا کرتے ہوئے کہا "شائستہ! تم بیگ صاحب کے برتن واپس کر دینا۔ اس بہانے تمہارا ان کی فیملی سے تعارف بھی ہو جائے گا۔ میں جانتا ہوں، تم تنہائی میں بہت بور ہوتی ہوگی لیکن گزارہ تو کرنا ہے۔ اگلے مہینے کوشش کروں گا کہ تمہیں ایک ٹی وی لا دوں۔"
"آپ پریشان نہ ہوں۔" میں نے کہا "پڑوسیوں سے دوستی ہوگئی تو مجھے اتنی بوریت نہیں ہوگی۔"
خاور کے جانے بعد میں نے برتن دھوئے اور بیگ صاحب کے برتن لے کر ان کے دروازے پر پہنچ گئی۔ میں نے اپنے دروازے پر تالا ڈال دیا تھا۔
اطلاعی گھنٹی کے جواب میں نورانی چہرے والے ایک بزرگ نے دروازہ کھولا۔ میں نے انہیں ادب سے سلام کیا اور بولی "میں آپ کے پڑوس میں آئی ہوں۔ یہ آپ کے برتن....."
"اندر آجاؤ بیٹی!" انہوں نے نرم لہجے میں کہا اور ایک طرف ہٹ کر مجھے اندر آنے کا راستہ دے دیا۔
میں جھجکتی ہوئی اندر داخل ہوگئی۔ اندر سے خاتون کی آواز سنائی دی۔ "کون ہے بیگ صاحب؟"
بیگ صاحب کوئی جواب دیے بغیر مجھے اندر لے گئے۔ ان کا گھر بہت شاندار تھا۔ گھر کے آگے چھوٹا سا خوبصورت لان تھا۔ اس کے ساتھ ہی کار پورچ تھا جس میں ایک گاڑی کھڑی تھی۔ پھر برآمدہ تھا۔ اندر کی طرف خاصا کشادہ ٹی وی لاؤنج تھا۔ وہاں مجھے ایک بزرگ خاتون دکھائی دیں۔ ان کی عمر امی سے بھی زیادہ تھی۔
میں نے انہیں بھی بہت ادب سے سلام کیا اور بولی۔ "آنٹی! میرا نام شائستہ ہے، میں آپ کے ساتھ والے مکان میں آئی ہوں۔"
"جیتی رہو بیٹی!" انہوں نے محبت بھرے انداز میں کہا پھر کسی سے کہا "نسیمہ! یہ برتن کچن میں رکھو اور دو کپ چائے بنالو۔"
"دو کپ کیوں بھئی!" بیگ صاحب نے مسکرا کر کہا۔ "میں بھی چائے پیوں گا۔" پھر وہ نسیمہ سے بولے "بھئی، تین کپ چائے بنانا۔"
نسیمہ اپنے حلیے اور شکل صورت سے ان کی بیٹی تو نہیں لگ رہی تھی۔
"آؤ بیٹھو بیٹی!" آنٹی نے بہت شفیق انداز میں کہا۔
میں ان کے نزدیک ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔
بیگ صاحب اخبار لے کر وہاں سے چلے گئے۔
"بیٹی! تم نے کیا یہ مکان کرائے پر لیا ہے؟" آنٹی نے پوچھا۔
"نہیں آنٹی، ہم نے یہ مکان خریدا ہے۔" میں نے کہا۔
"خریدا ہے؟" وہ چونک کر بولیں "تمہیں ڈر تو نہیں لگا؟" انہوں نے عجیب سے انداز میں پوچھا۔
"ڈر کیوں لگے گا آنٹی!" میں نے ہنس کر کہا۔
"مکان خریدنے سے پہلے تم لوگ یہاں آکر مکان دیکھ تو لیتے؟"
"آنٹی! اصل میں حالات کچھ ایسے تھے کہ ہمیں یہ مکان خریدنا پڑا۔ جو مکان اچھے تھے، ان کی قیمت بہت تھی۔ ہم نے تو یہ مکان بھی قرض لے کر خریدا ہے۔" پھر میں نے انہیں بتا دیا کہ ہم نے کن حالات میں یہ مکان خریدا ہے۔
آنٹی نے کچھ کہنے کی کوشش کی، پھر وہ خاموش ہوگئیں۔

"آنٹی! آپ کی کوئی بیٹی یا بہو....."
"دو بیٹیاں ہیں، دونوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ تین بیٹے ہیں۔ ایک ایک کر کے وہ تینوں پاکستان سے چلے گئے۔ دو بیٹے امریکا میں ہیں اور سب سے چھوٹا بیٹا کینیڈا میں ہے، تینوں ماشاء اللہ شادی شدہ ہیں۔ سال، دو سال میں ایک دفعہ پاکستان آتے ہیں تو گھر میں رونق ہو جاتی ہے۔ بیگ صاحب بینک میں جاب کرتے تھے، وہ کئی برس پہلے ریٹائر ہو چکے ہیں۔" پھر وہ ٹھہر کر بولیں "تمہارے مکان کی بائیں جانب جو مکان ہے، اس میں بھی تمہاری عمر کی کوئی لڑکی نہیں ہے۔ دو میاں بیوی ہیں، چھوٹے چھوٹے تین بچے ہیں اور سرفراز میاں کے والد ایاز صاحب ہیں۔ وہ کاروباری آدمی ہیں لیکن اب تو ان کا کاروبار ان کا بیٹا سنبھالتا ہے۔ ایاز صاحب تو بس نماز ہی کے لیے گھر سے نکلتے ہیں۔ شام کو اکثر وہ بیگ صاحب کے پاس آجاتے ہیں۔" آنٹی مسلسل بول رہی تھیں۔ شاید انہیں بھی بہت دن بعد باتیں کرنے کا موقع ملا تھا۔
ان کی باتوں سے مجھے معلوم ہوا کہ ہمارے بائیں جانب سرفراز صاحب اور ان کی بیگم فرحانہ رہتی ہیں۔ سامنے والے گھر میں البتہ دو لڑکیاں وجیہہ اور جویریہ رہتی ہیں۔ ان کا ایک بیٹا کمال بھی ہے جو کہیں جاب کرتا ہے۔
مجھے اچانک خیال آیا کہ جب یہاں کوئی لڑکی ہے ہی نہیں تو پھر رات کو گانا کون گا رہا تھا؟ میں نے ان سے پوچھا۔
"آنٹی! کیا نسیمہ بھی آپ کے ساتھ ہی رہتی ہے؟"
میرا خیال تھا کہ گانا نسیمہ ہی گا رہی ہوگی۔
"نہیں بھئی!" انہوں نے کہا "آج کل ملازموں کے بھی بہت نخرے ہیں۔ نسیمہ شام کو اپنے گھر چلی جاتی ہے۔" پھر وہ چونک کر بولیں "تم کیوں پوچھ رہی ہو؟ کیا تمہیں بھی کسی ملازمہ کی ضرورت ہے؟"
میں نے انہیں بتایا کہ کل جب میں چائے بنا رہی تھی تو میرے ساتھ ساتھ کوئی لڑکی گانا گا رہی تھی۔
آنٹی کے چہرے پر یکایک خوف کے آثار نمودار ہوئے اور وہ بولیں "اس کا مطلب ہے کہ ابھی وہ یہیں ہیں۔"
"کون؟" میں نے گھبرا کر پوچھا "کون ہے یہاں؟"
"میری ایک بات مانو بیٹی!" آنٹی نے کہا "تم یہ گھر فوراً چھوڑ دو۔"
"چھوڑ دوں؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔ "لیکن کیوں آنٹی! پھر یہ گھر چھوڑ کر میں جاؤں گی کہاں؟"
"تم کہیں بھی کرائے پر کوئی مکان لے لو۔"
"کیوں آنٹی!" میں نے الجھ کر پوچھا "آپ پلیز، صاف صاف مجھے بتائیں، آخر بات کیا ہے؟"
"اس مکان میں بدروحوں کا بسیرا ہے۔" آنٹی نے یوں سرگوشی میں کہا جیسے کوئی بدروح ان کی بات نہ سن لے۔ "اس مکان میں دو دن سے زیادہ کوئی نہیں ٹکتا۔ لوگ خوف زدہ ہو کر یہ مکان چھوڑ دیتے ہیں۔ تم سے پہلے جو کرایہ دار آئے تھے، ان کی بیٹی تو خوف کے مارے اپنا ذہنی توازن ہی کھو بیٹھی۔ مکان سے رات کو عجیب بھیانک قسم کی آوازیں آتی ہیں۔ کبھی گھنگروؤں کی جھنکار اور ڈھولک کی تھاپ سنائی دیتی ہے، کبھی اتنی دھما چوکڑی ہوتی ہے کہ لگتا ہے مکان میں کئی سانڈ ایک دوسرے سے لڑ رہے ہوں۔ کبھی خوف ناک قہقہے سنائی دیتے ہیں اور کبھی عورتوں کے بین کرنے کی منحوس آوازیں گونجتی ہیں۔ ہم تو خود یہ مکان بیچ کر یہاں سے جانے والے ہیں۔"
"لیکن ہمیں تو مکان کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا گیا؟" میں نے کہا۔
"تم نے شاید خود ہی معلومات نہیں کیں ورنہ تم خود سوچو، اس علاقے میں تو اتنا بڑا پلاٹ بھی تین ساڑھے تین لاکھ روپے کا ہے۔ تمہارے ساتھ دھوکا ہوا ہے بیٹی!"
"آنٹی! اب کچھ بھی ہو، مجھے تو اسی مکان میں رہنا ہے۔" میں نے کہا۔
میں بہت خوف زدہ ہوگئی تھی لیکن اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں تھا۔ میں دوبارہ نہ اپنے سسرال جانا چاہتی تھی، نہ صمد بھائی کے گھر۔ کرائے کا مکان بھی فوری طور پر تو مل نہیں سکتا تھا۔ پھر کرایہ اور ڈپازٹ وغیرہ دینے کے لیے ہمارے پاس پیسے بھی نہیں تھے۔
"تمہارے شوہر آئیں تو تم آج ہی کہیں چلی جاؤ۔" آنٹی نے کہا۔
"میں فوری طور پر کہاں جاسکتی ہوں۔ نہ میکے میں میرے لیے کوئی گنجائش ہے نہ سسرال میں۔ کرائے کا مکان ڈھونڈنے میں بھی کچھ وقت تو لگے گا۔" میں نے کہا۔
"تم ایسا کرو، ہمارے گھر میں آجاؤ۔ اوپر کی منزل بالکل خالی ہے۔ میرے بیٹے اور بہوئیں آتی ہیں تو وہ اوپر رہتی ہیں۔ تم وہاں رہ سکتی ہو۔ جب کرائے کا مکان مل

WWW.PAKSOCIETY.COM

جائے تو تم چلی جانا۔"

"آپ کا بہت شکریہ آنٹی!" میں نے کہا "اگر مجھے پریشانی ہوئی تو میں آپ کے پاس آجاؤں گی۔"

وہ مجھے دیر تک سمجھاتی رہیں۔

باتوں میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ جب میں وہاں سے آنے لگی تو آنٹی بولیں "اب کھانے کا وقت ہوگیا ہے بیٹا! کھانا کھا کر ہی جانا۔"

انہوں نے اتنا اصرار کیا کہ مجھے ان کی بات ماننا ہی پڑی۔

میں وہاں سے اٹھی تو وہ بولیں "شائستہ بیٹا! یہ مت سمجھنا کہ میکے میں تمہارے لیے گنجائش نہیں ہے۔ اس گھر کو بھی اپنا میکا ہی سمجھو۔"

میں ان کی شفقت سے بہت متاثر ہوئی اور واپس آگئی۔

ظہر کا وقت تھا۔ میں نے وضو کر کے... با نماز بچھائی اور نماز کے لیے کھڑی ہوگئی۔ نماز سے میرے دل کو بہت سکون ملا۔ پھر میں دیر تک مصلے پر بیٹھی درود شریف پڑھتی رہی۔

اس کے بعد میں ایک رسالہ لے کر لیٹ گئی۔ پھر نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

میری آنکھ کھلی تو مجھے شدید سردی کا احساس ہوا۔ عصر کی اذان ہو رہی تھی۔ میں وضو کر کے پھر نماز کے لیے کھڑی ہوگئی۔

میں نے ابھی نیت باندھی ہی تھی کہ مجھے اپنے عقب میں پھڑ پھڑاہٹ سی سنائی دی۔ پھر کوئی انتہائی مکروہ آواز میں بولا "یہاں سے بھاگ جاورنہ بے موت ماری جائے گی۔" عجیب منمناتی ہوئی سی آواز تھی۔

مارے خوف کے میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے لیکن میں نماز پڑھتی رہی۔

"تیرے پاس آج سانجھ تک کا سمے ہے۔" وہی منمناتی ہوئی آواز پھر سنائی دی۔

میں نے سلام پھیرا اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔

"یا اللہ، تو بہت رحمان و رحیم ہے۔ میں تیری عاجز اور گناہگار بندی ہوں۔ میرے گناہوں کو معاف فرمادے، مجھ پر رحم فرما میرے معبود! میری اور میرے شوہر کی حفاظت فرما۔" دعا مانگتے ہوئے میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

اچانک مجھے انتہائی خوف ناک قہقہہ سنائی دیا پھر کوئی بھیانک آواز میں بولا "تیرا جیون کیول ایک رات کا ہے، پھر تیرے لیے موت ہے..... موت....."

میں نے گھبرا کر دائیں طرف دیکھا تو مجھے انتہائی بھیانک چہرہ دکھائی دیا۔ کالا سیاہ رنگ، سر اور داڑھی کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے، انگاروں کی طرح دہکتی ہوئی آنکھیں اور خوفناک دانت! وہ صرف چہرہ تھا۔ اس کا جسم غائب تھا اور وہ زمین سے چند فٹ کے فاصلے پر تھا۔

خوف کے مارے میرے ہاتھ پیر شل ہوگئے۔ شدید سردی کے باوجود جسم پسینے میں تر ہوگیا اور دل اس بری طرح دھڑکنے لگا جیسے پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔

مجھے آج بھی حیرت ہوتی ہے کہ میں اس وقت دہشت سے مری کیوں نہیں؟

میں نے آنکھیں بند کیں اور چاروں قل اور آیت الکرسی کا ورد شروع کر دیا۔ حیرت انگیز طور پر میرے دل سے خوف کا تاثر زائل ہوگیا اور میں مسلسل ورد کرتی رہی۔

اچانک مجھے انتہائی مکروہ چیخ کی آواز سنائی دی۔ پھر پھڑ پھڑاہٹ گونجی اور مجھے یوں لگا جیسے کمرے کا بوجھل پن اچانک ختم ہوگیا ہو۔ میں نے سکون کا سانس لیا اور مصلے سے اٹھی ہی تھی کہ مغرب کی اذان شروع ہوگئی۔

میں نے گھر کی تمام لائٹیں روشن کر دیں۔ خاور نے ہر جگہ بلب لگا دیے تھے۔

مغرب کی نماز پڑھ کر میں کچن میں گئی اور چولہے پر دال پکنے کو رکھ دی۔

اسی وقت خاور آگئے۔ وہ مسکرا کر بولے "دن کیسا گزرا شائستہ!"

"بہت اچھا!" میں نے جواب دیا۔ "دو تین گھنٹے تو بیگ صاحب کے گھر میں ہی گزر گئے۔" پھر میں نے انہیں بیگ صاحب اور آنٹی کے بارے میں بتایا لیکن یہ نہیں بتایا کہ اس مکان میں بدروحوں کا بسیرا ہے یا میرے ساتھ کل سے لے کر اب تک کس قسم کے واقعات پیش آئے ہیں۔

"چلو اچھا ہوا، تمہاری ملاقات آنٹی سے ہوگئی۔" خاور نے ہنس کر کہا "اب کم سے کم مجھے تمہاری طرف سے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔"

کھانے کے بعد ہم لوگ دیر تک باتیں کرتے رہے، پھر خاور باتیں کرتے کرتے ہی سو گئے۔

میں نے اٹھ کر کھڑکیاں اور دروازہ بند کیا، لائٹ

آف کی اور خود بھی سونے کے لیے لیٹ گئی۔

لیٹ کر مجھے نانی جان کی کہی ہوئی ایک بات اور یاد آئی۔ وہ ہمیشہ یہ کہتی تھیں کہ اگر خوف محسوس کرو تو سونے سے پہلے تین دفعہ آیت الکرسی پڑھ کر اپنے چاروں طرف اس کا حصار کر لیا کرو۔

میں نے آیت الکرسی پڑھی اور نہ صرف اپنے گرد بلکہ خاور کے گرد بھی اس کا حصار کر دیا اور بستر میں گھس گئی۔ پھر جب تک مجھے نیند نہیں آئی، میں درود شریف کا ورد کرتی رہی۔

رات کے کسی پہر پھر اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ کمرے کا دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا لیکن کمرے میں بوجھل پن کا احساس نہیں تھا۔ خاور بے خبر سو رہے تھے۔

اچانک باہر گھنگرو چھنکنے لگے۔ گھنگروؤں کی آواز لمحہ بہ لمحہ تیز ہونے لگی، پھر اس کے ساتھ ہی ڈھولک کی آواز سنائی دی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے باہر ناچ گانا ہو رہا ہو۔ ڈھولک میں مجرے کی جھنکار بھی شامل ہوگئی۔

اچانک خاور بھی اٹھ کر بیٹھ گئے اور حیرت سے چاروں طرف دیکھنے لگے۔ گھنگروؤں اور ڈھولک کا شور بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

خاور جھنجلا کر بولے "یہ کس کے گھر میں ناچ گانا ہو رہا ہے؟ عجیب بدتہذیب لوگ ہیں۔ پورے محلے کو سر پر اٹھا رکھا ہے۔"

وہ اٹھ کر باہر جانے لگے تو میں نے ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔

"مجھے دیکھنے تو دو شائستہ! یہ ہنگامہ ہے کہاں؟"

"جب محلے میں کسی کو اعتراض نہیں ہے تو آپ کیوں اعتراض کر رہے ہیں؟" میں نے انہیں کھینچ کر دوبارہ بستر پر بٹھا دیا۔

"انتہائی جاہل اور بے حس لوگ ہیں۔" خاور نے کہا۔

اچانک فجر کی اذان بلند ہوئی "اللہ اکبر، اللہ اکبر!"

وہ آواز مجھے اپنی روح میں اترتی محسوس ہوئی۔

اس کے ساتھ ہی حیرت انگیز طور پر تمام ہنگامہ ختم ہوگیا اور فضا میں بس اذان ہی کی گونج باقی رہ گئی "بے شک میرا رب بہت عظیم ہے۔" میں نے کہا اور نماز کے لیے اٹھ گئی۔

میں نماز پڑھنے کھڑی ہوئی تو خاور ایک مرتبہ پھر سو گئے۔ نماز کے بعد میں دیر تک درود شریف کا ورد کرتی رہی، پھر اٹھ کر ناشتا بنانے میں مصروف ہوگئی۔

ناشتا کرتے ہوئے خاور نے کہا "محلے میں کہاں شادی ہو رہی ہے؟ رات تو ایسا ہنگامہ تھا جیسے ناچ گانا ہمارے ہی گھر میں ہو رہا ہو۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

چائے پیتے ہوئے خاور نے کہا "شائستہ! اب سبزی، گوشت وغیرہ تم ہی کو لانا پڑے گا۔ مارکیٹ یہاں سے دور ہے لیکن....."

"آپ پریشان مت ہوں، میں مارکیٹ چلی جاؤں گی۔ اب کوئی ملازم تو ہے نہیں جو ہمارے کام کرے گا۔ گھر کے کام تو ہمیں ہی کرنا ہوں گے۔"

خاور نے ممنونیت سے کہا "شائستہ! میری وجہ سے تم بھی کیسی کیسی تکلیفیں اٹھا رہی ہو۔ تم نے تو کبھی....."

"ایسی بات مت کریں خاور!" میں نے ان کی بات کاٹ دی "زندگی میں اچھے برے دن تو آتے ہی ہیں لیکن میں نے بھی تہیہ کر لیا ہے کہ میں اپنے گھر والوں اور تمہارے گھر والوں کو اپنا گھر بنا کر دکھاؤں گی۔ حالات چاہے جیسے بھی ہوں۔"

خاور کے جانے کے بعد میں مارکیٹ جانے کی تیاری کر رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں چونک اٹھی۔ اس وقت کون ہو سکتا تھا؟

میں نے دروازے کے پاس جا کر پوچھا "کون؟"

"بی بی جی! میں بیگ صاحب کا ڈرائیور ہوں احمد خان! بیگم صاحبہ نے آپ کو بلایا ہے۔"

"اچھا، میں آتی ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

میں نے گھر کو تالا لگایا اور بیگ صاحب کے گھر پہنچ گئی۔ دروازہ ادھیڑ عمر کے ایک شخص نے کھولا "جی بی بی!" اس نے پوچھا۔

میں نے آواز سے پہچان لیا کہ وہ آنٹی کا ڈرائیور ہے۔

"مجھے بیگم صاحبہ سے ملنا ہے۔" میں نے کہا اور اندر کی طرف بڑھ گئی۔

آنٹی نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا "شائستہ بیٹا! تم ٹھیک تو ہو؟"

"اللہ کا کرم ہے آنٹی!" میں نے مسکرا کر کہا "میں ذرا مارکیٹ تک جا رہی ہوں۔ واپسی میں آپ کے پاس بیٹھوں گی۔"

"بیٹا، تم کیوں تکلیف کر رہی ہو، ابھی احمد خان مارکیٹ جائے گا، جو کچھ منگانا ہے، اس سے منگا لو۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

"نہیں میری وجہ سے زحمت ہوگی۔" میں نے کہا۔
"زحمت کیسی بیٹا!" آنٹی نے کہا "احمد خان روز صبح مارکیٹ جاتا ہے۔ میں اس سے کہہ دوں گی، وہ روز تمہیں بھی سودا لا دیا کرے گا۔" پھر انہوں نے احمد خان کو بلایا اور اس سے کہا "احمد خان، کل سے شائستہ کا سودا بھی لے آیا کرو۔"
میں ان کا احسان نہیں لینا چاہتی تھی لیکن ان کے اصرار کی وجہ سے مجبور ہوگئی۔ میں نے احمد خان کو پیسے دے دیے۔
اس کے جانے کے بعد آنٹی نے نسیمہ سے چائے کے لیے کہا، پھر مجھ سے بولیں "شائستہ بیٹا! رات تو خیریت سے گزری؟"
"جی ہاں آنٹی!" میں نے ہنس کر کہا "کچھ ڈھول تاشوں اور گھنگروؤں کی آوازیں تو سنائی دی تھیں، پھر وہ خود ہی ختم بھی ہوگئیں۔"
"تم بہت نڈر لڑکی ہو۔" آنٹی نے تعریفی انداز میں کہا۔ "تمہاری جگہ اگر میں ہوتی تو شاید دہشت سے بے ہوش ہو جاتی۔ اللہ تمہاری حفاظت کرے۔"
میں نے انہیں یہ نہیں بتایا کہ کل دن میں میرے ساتھ کیا ہوا تھا ورنہ وہ شاید زبردستی مجھے اپنے گھر لے آتیں۔
اس دن میں آنٹی کے پاس زیادہ دیر نہیں بیٹھی۔ احمد خان سودا لے آیا تھا۔ میں گھر آ گئی۔
اس دن کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں ہوا۔
شام میں خاور آئے تو کچھ فکرمند تھے۔ میں سمجھی شاید انہیں محلے کے کسی آدمی نے مکان کے بارے میں بتا دیا ہے۔ میں نے ان سے پوچھا "خاور! کیا بات ہے، کوئی پریشانی ہے؟"
"ہاں یار! پریشانی تو ہے۔"
"کیسی پریشانی؟" میں نے چونک کر پوچھا۔
"شائستہ! مجھے آفس کے کام سے اسلام آباد جانا ہے۔ میں نے تو بہت چاہا کہ میں وہاں نہ جاؤں لیکن ہمارے جی ایم صاحب نے کہا کہ وہاں جانے سے تمہیں فائدہ ہوگا۔ وہاں مختلف پارٹیوں سے میٹنگ ہے۔ میٹنگ اگر کامیاب رہی تو تمہاری بھی ترقی ہو جائے گی۔"
"اگر یہ بات ہے تو آپ ضرور جائیں۔" میں نے کہا۔
"لیکن تم....."
"میری فکر مت کریں۔ میں دو چار دن آنٹی کے ساتھ رہ لوں گی۔ وہ بے چاری تو ہوں بھی میرا بہت خیال رکھتی ہیں۔ آج مارکیٹ سے سبزی وغیرہ بھی ان کا ڈرائیور لایا تھا۔"
"لیکن شائستہ..... میں....."
"خاور پلیز! آپ میری بالکل فکر مت کریں۔ مجھے کوئی پریشانی ہوئی تو میں صمد بھائی کے گھر چلی جاؤں گی۔"
"ویسے میں فون پر تم سے رابطہ رکھوں گا۔ تم ایسا کرنا، بیگ صاحب کا ٹیلی فون نمبر مجھے دے دینا۔"
کھانے کے بعد میں نے عشا کی نماز پڑھی اور خاور کے پاس جا بیٹھی۔ ان کے ذہن پر ابھی تک میری وجہ سے بوجھ تھا۔ میں نے انہیں بہت مشکل سے قائل کیا کہ مجھے یہاں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔
سونے سے پہلے میں نے اپنا اور خاور کا حصار کیا اور کمبل میں دبک گئی۔ پھر حسبِ معمول جب تک مجھے نیند نہیں آئی، میں درود شریف پڑھتی رہی۔ میں شاید یہ بات بتانا بھول گئی کہ میں سونے سے پہلے بچپن ہی سے درود شریف پڑھتی آئی تھی۔ پھر صبح اسکول جاتے وقت اور واپسی میں سارا وقت میں درود شریف پڑھتی رہتی تھی۔ یہ میری نانی جان کی تربیت کا نتیجہ تھا۔
اس رات بہت پُرسکون نیند آئی۔ نہ ڈھول تاشوں کی آوازیں سنائی دیں، نہ دوسری مکروہ آوازیں۔
اسی دن شام کو خاور کی فلائٹ تھی۔ میں نے ان کا ضروری سامان ایک بیگ میں رکھ دیا۔ احمد خان سودے کے لیے آیا تو میں نے اس سے آنٹی کا ٹیلی فون نمبر بھی پوچھ لیا۔
ایک بجے کے قریب خاور دفتر سے گھر آئے۔ انہوں نے کچھ دیر آرام کیا پھر شام کو مجھے ڈھیروں ہدایات دے کر روانہ ہوگئے۔ میں نے آنٹی کا ٹیلی فون نمبر انہیں دے دیا تھا۔
ان کے جانے کے بعد گھر میں اچانک سناٹا ہوگیا۔ مغرب کی اذان ہو چکی تھی۔ میرے دل پر عجیب سا ایک خوف طاری تھا۔ میں نے نماز پڑھ کر دیر تک اللہ سے اپنی اور خاور کی سلامتی کی دعائیں مانگیں اور ابھی مصلے ہی پر بیٹھی تھی کہ میری نظر کھلے ہوئے دروازے سے سامنے والی دیوار پر پڑی۔ دیوار پر سیاہ رنگ کا خوفناک بلا بیٹھا تھا۔ اس کی جسامت چھوٹے کتے سے کسی بھی طرح کم نہیں تھی۔ اس کے کانوں میں بڑے بڑے کنڈل تھے، سر گنجا تھا اور اس کی کھوپڑی پر ایک چوٹی سی نظر آ رہی تھی۔
حیرت انگیز طور پر مجھے اس سے کوئی خوف محسوس نہیں ہوا بلکہ مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے درشت لہجے میں کہا "دفع ہو جا یہاں سے۔"

جواب میں اس نے اتنا بھیانک قہقہہ لگایا کہ میری جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو شاید اس کا ہارٹ فیل ہو جاتا۔
میں نے چاروں قل اور آیت الکرسی کا وِرد شروع کر دیا۔
وہ چند منٹ تک دیوار پر بیٹھا مجھے گھورتا رہا، پھر اس کے حلق سے ایک بھیانک چیخ بلند ہوئی اور وہ اچانک غائب ہوگیا۔
میں ذہنی طور پر بری طرح تھک گئی تھی اس لیے برآمدے میں پڑے ہوئے تخت پر نیم دراز ہوگئی۔
اچانک مجھے پائل کی چھم چھم سنائی دی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی عورت پائل چھنکاتی زینے سے نیچے اتر رہی ہو۔
پھر وہ میرے سامنے آ گئی۔ وہ انتہائی حسین لڑکی تھی، اس کے جسم پر سفید ساڑی اور بلاؤز تھا۔ لمبے گھنے بال اس کی پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی رنگت دودھ کی طرح سفید تھی۔
وہ میرے سامنے آ کر ٹھہر گئی اور مترنم لہجے میں بولی۔
"تم یہاں سے جاتیں کیوں نہیں؟"
"میں کیوں جاؤں؟" میں نے درشت لہجے میں کہا۔ "یہ میرا گھر ہے، تم لوگ یہاں سے دفع ہو جاؤ۔"
"اب تک اس گھر میں کئی گھرانے آئے اور بھاگ گئے، کسی کو بھی بسنا نصیب نہیں ہوا، پر تو تیرے پاس کوئی ایسی شکتی ہے کہ تجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔"
"اثر آئندہ بھی نہیں ہوگا اس لیے تم لوگ کہیں اور دفع ہو جاؤ اور میرا پیچھا چھوڑ دو۔"
"تو تو یہاں سے نہیں جائے گی؟" اس نے اسی مترنم لہجے میں پوچھا۔
"ہاں، میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔
وہ خوبصورت لڑکی اچانک غائب ہوگئی اور سیڑھیوں کی طرف سے اچانک وہی بلا اچھلا کود مار کے میرے سامنے آ گیا جو کچھ دیر پہلے دیوار پر بیٹھا تھا۔
میں نے فوراً آیت الکرسی کا وِرد شروع کر دیا۔ بلا دانت نکوسے میری طرف بڑھا لیکن میں وِرد میں مصروف رہی۔ کئی دفعہ کے تجربات کے بعد اب مجھ میں بہت اعتماد پیدا ہوگیا تھا۔ اللہ پر یقین مزید پختہ ہوگیا تھا۔
میں نے وِرد کرتے کرتے بلے کی طرف پھونک ماری۔ بلا اچانک اچھلا اور سامنے والی دیوار کی طرف دوڑا، پھر وہ اچانک غائب ہوگیا۔
اس دن میں ذہنی طور پر بہت تھک گئی تھی۔ میں نے الٹا سیدھا کھانا کھایا اور عشا کی نماز کے لیے کھڑی ہوگئی۔
میں نماز سے فارغ ہوئی تو نظر پھر دیوار پر گئی۔ وہاں وہی سیاہ بلا بیٹھا مجھے گھور رہا تھا۔ میں نے اسے جوابی طور پر گھورا تو وہ اٹھا اور درخت کی شاخوں میں غائب ہوگیا۔
میں اس دن ذہنی طور پر تھک گئی تھی اس لیے کھڑکیاں دروازے بند کیے، اپنے گرد آیت الکرسی کا حصار باندھا اور بستر پر گر گئی اور درود شریف پڑھتے پڑھتے سو گئی۔
اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ آنکھ بے سبب نہیں کھلی تھی بلکہ صحن میں ہونے والی دھما چوکڑی سے میری آنکھ کھلی تھی۔ ایسی دھمک ہو رہی تھی جیسے کئی بھینسے آپس میں لڑ رہے ہوں۔ پھر میرے کمرے کے دروازے پر زوردار دھماکا ہوا اور دروازہ چوکھٹ سمیت اکھڑ کر اندر آ گرا۔ ٹوٹے ہوئے دروازے سے ایک پھنکارتا ہوا سانڈ اندر داخل ہوا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے روند کر گزر جائے گا یا پھر اپنی ٹکروں سے اس کمرے کو ملبے کا ڈھیر بنا دے گا۔
میرے ذہن پر ایک مرتبہ پھر خوف نے پنجے گاڑے لیکن میں نے خوف کو ذہن سے جھٹک دیا اور بلند آواز میں آیت الکرسی، سورۂ فلق اور سورۂ ناس کا وِرد کرنے لگی۔ پھر ایسا لگا جیسے اس سانڈ کو کسی نادیدہ قوت نے پکڑ کر کھینچ لیا ہو۔ باہر ایک مرتبہ پھر زوردار دھماکا سنائی دی، پھر دھما چوکڑی مچ گئی۔ میں مسلسل وِرد کرتی رہی۔
اچانک ایسی آوازیں آئیں جیسے بہت سی بدروحیں بھیانک آواز میں بین کر رہی ہوں۔ پھر یوں لگا جیسے ان کا گلا کسی نے دبوچ لیا ہو۔ وہ ہنگامہ آہستہ آہستہ ختم ہوگیا۔
فضا میں اذان کی آواز بلند ہوئی تو میں نے سکون کا سانس لیا اور نماز کے لیے اٹھ گئی۔
نماز کے بعد میں نے ایک کپ چائے بنائی۔ میرا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ چائے کے ساتھ میں نے سر درد کی ایک گولی کھائی اور بستر پر گر گئی۔
میری آنکھ کھلی تو وہی خوبصورت لڑکی برآمدے کے تخت پر بیٹھی تھی۔ دروازہ ابھی تک چوکھٹ سمیت اکھڑا پڑا تھا۔
وہ لڑکی بھی کل کے مقابلے میں بہت زیادہ نڈھال نظر آ رہی تھی۔ اس کے جسم اور چہرے پر کئی جگہ زخم تھے۔ اس کا خوبصورت چہرہ مسخ ہو کر رہ گیا تھا۔
"یہاں سے چلی جا۔" اس کی آواز میں کرب تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"میں نہیں جاؤں گی۔" میں نے اٹل لہجے میں کہا "یہ مکان میرا ہے اس لیے تم یہاں سے دفع ہو جاؤ۔"

"تو بھی اپنی ہٹ کی پکی ہے۔" اس نے کہا "تو کس شکتی پر اتنا گھمنڈ کرتی ہے؟"

"مجھے کسی بات پر گھمنڈ نہیں ہے۔" میں نے درشت لہجے میں کہا "لیکن میں کیوں جاؤں ....؟ میں یہاں سے ہرگز نہیں جاؤں گی۔" یہ کہہ کر میں نے آیت الکرسی کا ورد شروع کر دیا۔

وہ ایک دم بے چین ہو گئی اور گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

"میری بات..... سن..... بھگوان کے لیے..... یہ..... یہ جاپ بند کر دے..... میں تجھے..... کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گی..... میری بات سن لے۔"

میں نے آیت الکرسی کا ورد بند کر دیا۔

اس نے کہنا شروع کیا۔ "میں..... یہاں برسا برس سے رہ رہی ہوں۔ اب تو یہاں ہر طرف مکان بن گئے ہیں۔ ایک زمانے میں یہاں دور دور تک جنگل تھا، گھنا اور تاریک جنگل۔ دشمنوں نے میرا اور میرے پریمی کا اسی جگہ خون کیا تھا۔ میری آتما اس وقت سے یہاں بھٹک رہی ہے جہاں تمہارا گھر ہے۔ میرے پتی کی آتما کو دشمنوں نے یہیں قید کر دیا تھا۔ مرنے کے بعد بھی ان کی دشمنی ختم نہ ہوئی اور ان کی پلید آتمائیں یہاں بھی پہنچ گئیں۔ ہر پورن ماشی کی رات کو میں اپنے پریمی کو اس بندی خانے سے مکت کرانے کا پربند کرتی ہوں لیکن دشمنوں کی شکتی مجھ سے بہت زیادہ تھی۔ وہ ہر دفعہ میرے رستے میں آ جاتے تھے۔ میں برسوں سے زخم کھا رہی ہوں لیکن کل رات..... کل رات میں نے اپنا انتقام لے لیا ہے۔ ایک کے علاوہ تمام دشمنوں کو نشٹ کر دیا ہے۔"

میں حیرت سے آنکھیں پھیلائے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ یہ باتیں اگر دوسرا مجھے بتاتا تو مجھے کبھی یقین نہ آتا۔ ایسی الف لیلوی کہانیاں تو بس کتابوں میں ہوتی ہیں۔

میں نے پوچھا "اب تم کیا چاہتی ہو؟"

"میرا انتقام ابھی باقی ہے۔ ابھی مہاویر سنگھ کی آتما باقی ہے۔ میں جب تک اسے بھی ختم نہیں کر دوں گی، مجھے اور میرے پریمی کو مکتی نہیں ملے گی۔" پھر وہ پھیکے سے انداز میں مسکرا کر بولی "تم جانتی ہو، میں نے اپنے دشمنوں کو کیسے نرک میں پہنچایا؟ تمہارے جاپ کے کارن ان کی شکتی ختم ہو گئی تھی۔"

"میرا جاپ؟" میں نے حیرت سے دہرایا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ وہ میرے آیت الکرسی، چاروں قل اور درود شریف کے وِرد کی بات کر رہی ہے۔

"تم سے ایک بنتی ہے۔" وہ انتہائی عاجزانہ لہجے میں بولی "مجھے اس سے تک اس گھر میں رہنے دو جب تک میں مہاویر کی آتما کو بھسم نہیں کر دیتی۔"

"اور میں مسلسل اس ذہنی عذاب میں مبتلا رہوں؟" میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"میں..... راج کماری کوشلیا..... تمہیں وچن دیتی ہوں کہ آج کے بعد تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ بس تم اوپر والا کمرا استعمال مت کرنا۔"

"تم..... تم..... راج کماری ہو؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"میں کبھی راج کماری تھی۔" اس نے افسردگی سے جواب دیا "اب تو بھٹکی ہوئی، انتقام کی آگ میں جھلستی ہوئی ایک آتما ہوں۔"

"لیکن تم یہیں کیوں رہنا چاہتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"یہیں تو میرے پریمی کی آتما قید ہے۔ جب تک میں مہاویر کی آتما کو بھسم نہیں کر دوں گی، میرے پریمی کو مکتی نہیں ملے گی..... دیکھو..... مجھے نراش مت کرنا..... تم مجھے پہلے ہی دن سے اچھی لگی ہو..... تمہارے پاس سنگیت کی کلا ہے اور کلاکار کبھی پتھر دل نہیں ہوتے۔" اس کی خوبصورت آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

میں نے نہ جانے کیا سوچ کر اثبات میں گردن ہلا دی۔

اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا اور اس نے میرے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ لیے۔ پھر وہ زینے کی طرف جا کر غائب ہو گئی۔

میں نے اردگرد نظر دوڑائی تو مجھے حیرت ہوئی۔ جو دروازہ چوکھٹ سمیت اکھڑ کر گر پڑا تھا، وہ اس وقت اپنی جگہ موجود تھا۔

میں نے اٹھ کر برتن دھوئے، گھر کی صفائی کی اور منہ دھو کر نکلی ہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

میں نے دروازے کے پاس جا کر پوچھا "کون؟"

"بی بی! میں احمد خان ہوں، مارکیٹ جا رہا ہوں، آپ کو کچھ منگانا ہو تو بتا دیں۔"

میں نے کمرے میں جا کر اپنے پرس سے پیسے نکالے

اور احمد خان کو سودے کے بارے میں بتایا۔

"بی بی! آپ کو بیگم صاحبہ نے بلایا ہے۔" اس نے کہا۔

"میں ابھی آتی ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

احمد خان کے جانے کے بعد میں نے کپڑے بدلے، بال سنوارے اور گھر کو تالا لگا کر بیگ صاحب کے یہاں چلی گئی۔

"شائستہ بیٹی! تم خیریت سے تو ہو نا؟" آنٹی نے پوچھا۔ "رات تو تمہارے گھر سے بہت خوفناک آوازیں آ رہی تھیں۔ میرا تو دل دہل رہا تھا کہ نہ جانے تمہارا کیا حال ہو گا؟ بیگ صاحب تو تمہاری طرف آنے کو بھی تیار ہو گئے تھے لیکن کل سے ان کی طبیعت بھی بہت خراب ہے اس لیے آ نہ سکے۔"

"آپ کیا کہہ رہی ہیں آنٹی!" میں نے انجان بن کر پوچھا "کیا ہوا تھا رات میں؟"

"تمہیں کچھ معلوم نہیں؟"

"نہیں۔" میں نے کہا "میں نے کھانا کھا کر عشا کی نماز پڑھی پھر سوئی تو صبح ہی آنکھ کھلی۔"

انہوں نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا پھر بولیں۔ "رات میں کسی بھی وقت تمہاری آنکھ نہیں کھلی؟"

"ایک دفعہ میری آنکھ کھلی تھی، میں پانی پی کر پھر سو گئی۔"

"میں پھر تم سے یہی کہوں گی کہ تم وہ مکان چھوڑ دو۔" آنٹی نے کہا۔

"مجھے کوئی تکلیف یا پریشانی ہوئی تو میں فوراً وہ مکان چھوڑ دوں گی۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

نسیمہ حسبِ معمول چائے لے کر آئی تو اس کے چہرے پر بھی تشویش تھی۔

میں چائے پی کر فارغ ہوئی تو احمد خان مارکیٹ سے لوٹ آیا۔ میں نے سودا لیا اور اپنے گھر آ گئی۔

☆☆☆

مجھے اس مکان میں آئے تین مہینے گزر چکے تھے۔ خاور نے اس عرصے میں حیرت انگیز ترقی کی تھی۔ کمپنی کے مالکان ان سے بہت خوش تھے اور وہ صرف چھ مہینے کے اندر کمپنی میں ڈپٹی منیجر ہو گئے تھے۔ اب ہمارے حالات قابلِ رشک تھے۔ خاور کو کمپنی سے نئے ماڈل کی گاڑی مل گئی تھی۔ انہوں نے گھر کے کمروں میں نہ صرف پلاسٹر کرا لیا تھا بلکہ دونوں کمروں میں اٹیچ باتھ روم بھی بنوا لیے تھے۔ انہوں نے مکان کو ہر طرح سے آراستہ کر لیا تھا۔ ہاں، ابھی سعد بھائی کا قرض باقی تھا۔

ایک دن خاور گھر میں داخل ہوئے تو خوشی سے پاگل ہو رہے تھے۔ میں نے ہنس کر کہا "کیا بات ہے، آج بہت خوش نظر آ رہے ہیں؟"

"بات ہی ایسی ہے جان!" وہ ہنس کر بولے "میرے آفس کے ایک دوست عرفان نے مجھے ایک پرائز بانڈ بیچا تھا۔ اسے پیسوں کی ضرورت تھی۔ اس پرائز بانڈ پر پانچ لاکھ روپے کا انعام نکل آیا ہے۔"

مارے خوشی کے میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

اس رات ہم دیر تک مستقبل کے منصوبے بناتے رہے۔

خاور چاہتے تھے کہ صحن میں کھڑا ہوا نیم کا درخت کٹوا دیں اور نیچے مزید دو کمرے بنوا لیں۔ وہ اوپر بنا ہوا اسٹور روم بھی توڑ کر اوپر کی منزل تعمیر کرنا چاہتے تھے۔

وہ آفس گئے تو کوشلیا زینے سے اتر کر میرے پاس آ گئی اور بولی "شائستہ! میں بنتی کرتی ہوں کہ نیم کا یہ پیڑ ابھی مت کٹواؤ اور اوپر والے کمرے کو بھی ابھی مت توڑو ورنہ..... ورنہ..... میرا اور اجے کا نہ جانے کیا ہو گا؟"

"اجے کون؟" میں نے پوچھا۔

"میرا پریمی اجے کمار۔" کوشلیا نے پہلی دفعہ اس کا نام مجھے بتایا "بس کچھ دن اور ٹھہر جاؤ۔ اجے کی مکتی میں اب زیادہ دن نہیں ہیں۔ وہ مورکھ مہاویر سنگھ ایک مرتبہ پھر یہاں آئے گا۔ اب وہ آیا تو واپس نہیں جا سکے گا۔" اس کی آواز میں عجیب سی غراہٹ تھی۔

"میں کوشش کروں گی۔" میں نے کہا۔

"کوشش نہیں شائستہ!" اس نے سخت لہجے میں کہا۔ "تمہیں یہ کام کرنا ہو گا۔ تم اپنے وعدے سے نہیں پھر سکتیں۔ اگر ایسا ہوا تو میں بھی اپنے دیے ہوئے وچن سے آزاد ہو جاؤں گی۔" یہ کہہ کر کوشلیا زینے کے پاس جا کر غائب ہو گئی۔

نیم کے اس درخت سے ہر وقت پتے جھڑتے تھے اور بار بار صحن کی صفائی کرنا پڑتی تھی لیکن میں نے خاور کو بہت مشکل سے روکا اور ان سے کہا "ہمیں فوری طور پر اتنے بڑے مکان کی ضرورت ہی کیا ہے۔ جب ضرورت ہو گی تو بنا لیں گے۔"

وہ فوری طور پر میری بات مان تو گئے لیکن میں جانتی تھی کہ وہ بالائی منزل بنانے کا فیصلہ کر چکے ہیں اس لیے ایک

WWW.PAKSOCIETY.COM

آدھ مہینے بعد پھر وہ اپنے فیصلے پر عمل کریں گے۔

گرمیوں کا موسم تھا۔ مجھے کمرے میں عجیب سی گھٹن اور بے چینی کا احساس ہوا حالانکہ اس وقت کمرے میں پنکھا بھی چل رہا تھا۔

میں گھبرا کر باہر نکل آئی۔ باہر چاند کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے آسمان پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ اس دن پورے چاند کی رات تھی۔

اچانک کوشلیا میرے سامنے آگئی اور بولی ''شائستہ! اپنے کمرے میں جاؤ۔ آج اس مورکھ مہادیو سنگھ سے میرا آخری یودھ ہے۔ اندر جا کر جاپ کرو اور دعا کرو کہ وہ ظالم آج ختم ہو جائے۔''

اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ میں فوراً کمرے میں واپس آگئی۔ میں نے وضو کیا اور مصلّے پر بیٹھ گئی۔ باہر اچانک پھر دھما چوکڑی شروع ہوگئی۔ چیخ پکار کی بھیانک آوازیں اور اذیت ناک کراہیں۔

میں نے حسبِ معمول کلام الٰہی کا وِرد شروع کر دیا۔

اس دھما چوکڑی سے خاور بھی اٹھ بیٹھے۔ وہ بہت پریشان اور بوکھلائے ہوئے نظر آرہے تھے۔ انہوں نے باہر جانے کی کوشش کی لیکن میں نے اشارے سے انہیں روک دیا۔

''میں پولیس کو فون کرتا ہوں۔'' انہوں نے جھنجلا کر کہا۔

اچانک شور تھم گیا۔ اسی وقت فجر کی اذان شروع ہوگئی۔ اذان ختم ہوتے ہی میں نماز کے لیے کھڑی ہوگئی۔

صبح خاور نے مجھ سے کہا ''شائستہ! اس گھر میں واقعی بدروحوں کا ڈیرا ہے۔ کئی محلے والوں نے مجھے بتایا تھا لیکن میں نے تمہیں یہ بات اس لیے نہیں بتائی کہ تم خوف زدہ ہو جاؤ گی۔''

''آپ بھی کیا باتیں کرتے ہیں؟'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''کوئی بدروح یا آسیب یہاں نہیں ہے۔ ہم لوگ چار، پانچ مہینے سے اس مکان میں رہ رہے ہیں۔ ہمیں تو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔''

''لیکن میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ میں اب یہاں نہیں رہوں گا۔ ہمارے پاس پیسا ہے، ہم کسی دوسرے علاقے میں اس سے اچھا مکان خرید سکتے ہیں۔''

وہ آفس تو چلے گئے لیکن بہت فکرمند تھے۔ ان کے جاتے ہی کوشلیا میرے پاس آگئی۔ وہ بہت تھکی اور نڈھال نظر آرہی تھی لیکن اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا ''شائستہ! میں جیت گئی۔ اجے کی آتما کو مکتی مل گئی۔ ہم آج یہاں سے جا رہے ہیں۔ ہم سے کوئی بھول ہوگئی ہو تو معاف کر دینا۔'' پھر اس نے مٹھائی کا بڑا سا ایک ڈبا اور پھلوں کی ایک ٹوکری مجھے دی اور بولی ''میری اور (طرف) سے یہ سوئیکار کر لو۔'' پھر وہ بلند آواز میں بولی۔ ''آجاؤ اجے!''

دوسرے ہی لمحے سیڑھیوں پر ایک نوجوان وہاں نمودار ہوا۔ وہ مردانہ حسن کا نمونہ تھا۔ اس کا رنگ سرخ و سفید تھا جس پر گھنی مونچھیں بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ قد دراز اور جسم کسرتی تھا۔ اس نے پرانے دور کا راج درباری لباس پہن رکھا تھا۔

اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا ''شائستہ جی! میں اور کوشلیا آپ کے ابھاری ہیں۔ ہم کوشش کریں گے کہ یہاں سے جانے کے بعد بھی آپ کی سہائتا کرتے رہیں۔''

وہ دونوں زینہ چڑھ کر دوبارہ اوپر چلے گئے۔

مجھے ان کے جانے کا بہت افسوس تھا۔ آپ حیران ہوں گے کہ میں ایک بدروح کے جانے پر اتنا افسوس کر رہی ہوں۔ کوشلیا روح ضرور تھی لیکن وہ بدہرگز نہیں تھی۔

میں جانتی تھی میری اس بات پر کسی بھی صاحب عقل شخص کو یقین نہیں آئے گا اور کسی کو یقین آئے یا نہ آئے، مجھے اس کا یقین ہے۔

میں اب بھی اسی مکان میں ہوں۔ اب وہ اس علاقے کا سب سے بہترین بنگلا ہے۔ خاور کی مزید ترقی ہو چکی ہے اور وہ کمپنی کے جنرل منیجر ہیں۔

خوشی کی بات یہ ہے کہ نہ صرف میری سسرال والے میرے گھر آتے ہیں بلکہ امی، ابو اور بھائی جان بھی مجھ سے راضی ہو گئے ہیں۔

میرے دو بچے ہیں، ایک بیٹی اور ایک بیٹا۔ دونوں بچے کراچی کے بہترین اسکولوں میں پڑھ رہے ہیں۔

اللہ میرے گلشن کو یوں ہی شاد و آباد رکھے۔ ہاں، میں نے اپنے بچوں کو خاص طور پر یہ تاکید کی ہے کہ ہر وقت درود شریف پڑھتے رہا کریں۔ اگر آپ کو میری بات کا یقین نہیں ہے تو آپ بھی درود شریف کثرت سے پڑھا کریں، اس کے فائدے دیکھ کر آپ بھی میری بات کا قائل ہو جائیں گے۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام آپکو تمام ڈائجسٹ ناولز اور عمران سیریز بالکل مفت پڑھنے کے ساتھ ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ لنک کے ساتھ ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت دیتا ہے۔
اب آپ کسی بھی ناول پر بننے والا ڈرامہ آنلائن دیکھنے کے ساتھ ڈائریکٹ ڈاؤنلوڈ لنک سے ڈاؤنلوڈ بھی کر سکتے ہیں۔
For more details kindly visit
http://www.paksociety.com
WWW.PAKSOCIETY.COM